سنسنی خیز موضوعات پر دُنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

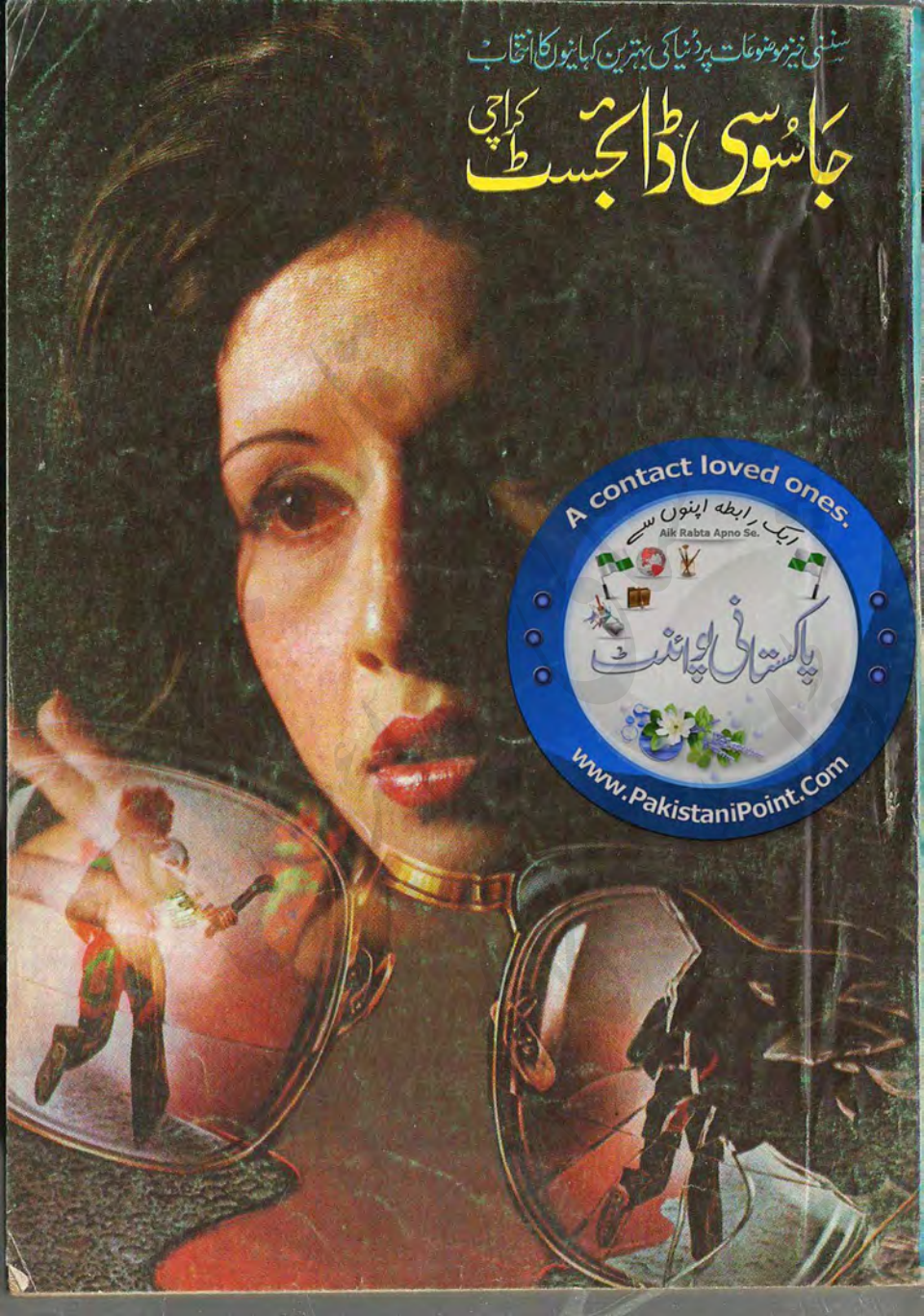

A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

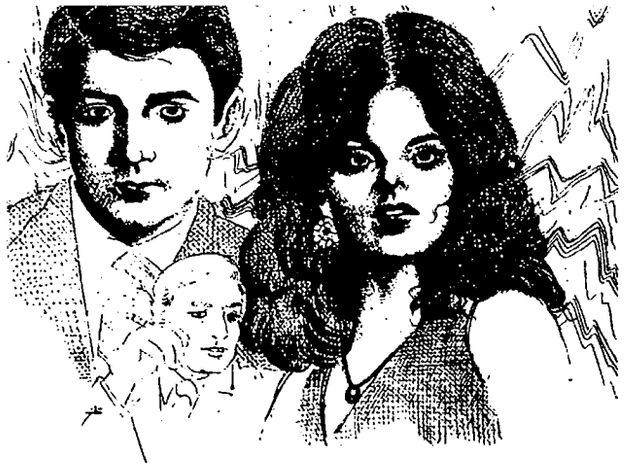

۸ — چٹنی اور نکتہ چینی — قارئین و ادارہ
جاسوسی ڈائجسٹ کے بارے میں قارئین کے رنگا رنگ تبصرے اور خطوط

۱۰ — ریشم تنگی — اقلیم علیم
جذبۂ حب الوطنی سے سرشار وطن پرستوں کی داستان

۳۹ — بھٹکتا آدمی — ابوسلمان
دو مجسمہ سازوں کے فن کا عجیب و غریب مظاہرہ

۴۲ — بیداری — نوید بصیر
امریکہ سے تازہ ترین ایک عجیب کہانی

۴۶ — خون کا کھیل — افروزہ اقبال
انسانیت کے کام آنے والوں کا انسانیت سوز کارنامہ

۵۳ — بڑی بھول — شہلا پاریکھ
کہنے کو تو وہ ایک چھوٹی بھول تھی مگر اسے بڑی بھول کہنا مناسب ہوگا

۵۰ — غلط قدم — ناہید اختر
بہت سوچ سمجھ کر اٹھائے ہوئے اقدامات کا انجام کبھی کبھی غیر متوقع بھی ہوتا ہے

۵۸ — مفرور — اقلیم علیم
ایک کیمیا داں کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات

۸۲ — بیراک — صفدر صدیقی
ایک سرد اور ٹھٹھرے ہوئے موسم میں پیش آنے والا گرما گرم واقعہ

۹۱ — بیس لفظ — انجم نوید
ایک مختصر اور خیال افروز تحریر

۹۲ — صدیوں کا بیٹا — ایم اے راحت
وقت کی کہانی، صدیوں کے بیٹے کی زبانی

۱۲۱ — جھوٹی قسم — ش، م، جمیل
ایک بے اعتبار شوہر کا قصہ

۱۲۸ — بیمار کا قاتل — ابوالمنصور
ایک مظلوم عورت کی تاثرانگیز کہانی

۱۳۷ — پیمانۂ عمر — محی الدین نواب
آپ کے جانے پہچانے قلم سے سرورق کی پہلی کہانی

۱۶۰ — ہیرے کا جگر — اثر نعمانی
سرورق کے موضوع پر جرم و سزا کی نیم سائنسی کہانی

۱۷۲ — عینک — شائستہ وحید
اس عجیب عنوان کا مطلب تو آپ کی سمجھ میں کہانی پڑھ کر ہی آئے گا

پبلشر: عبدالغفار — مقام اشاعت 7/14 V.E ناظم آباد کراچی — پرنٹر: منظور احمد خان — مطبوعہ: جاوید پریس آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

جلد نمبر ۷ — شمارہ نمبر ۴ — اپریل ۱۹۷۷ء

قیمت: چار روپے — زرِ سالانہ معہ رجسٹری خرچ: ۵۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۲۲۹ کراچی

اِس مرتبہ ہمارے صفحے کی ابتدا، محمد عمران الحق صاحب اورنگی کے خط سے ہو رہی ہے، عمران الحق صاحب رقم طراز ہیں۔

"جناب چینی فروخت کرنے والے صاحب! السلام علیکم! خیریت کے بعد عرض ہے کہ میں نے مارچ کا شمارہ خصوصی پڑھا۔ یوں تو ہر کہانی اپنی مثال آپ ہوتی ہے لیکن مارچ کے ڈائجسٹ میں مجھے سب سے زیادہ "ناخدا" اور "عبدل لائبریری" پسند آئیں۔ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ "صدیوں کا بیٹا" اور "مفرور" جاسوسی ڈائجسٹ کی جان ہیں، آپ سے التجا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کی کہانی ضرور شائع کریں اور ہاں شمارۂ خصوصی بند کیجیے، تین روپے ہی بھلا۔"

عمران الحق صاحب! صدیوں کا بیٹا، مفرور، ناخدا، اور عبدل لائبریری کی خصوصی طور پر پسندیدگی کا شکریہ! متعلقہ مصنفین تک آپ کی مبارک باد پہنچا دی جائے گی، جنگِ عظیم کی کہانی انشاء اللہ اگلے ماہ پیش کی جائے گی۔ ہمارے زیادہ تر قارئین کی رائے چار روپے والے پرچے کی تائید میں ہے اس لئے جمہور کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ہمارے ساتھ آپ بھی سرِ تسلیم خم کر دیں اور ہاں یہ آپ نے کیا لکھ دیا "چینی فروخت کرنے والے"! بھیا ہم تو چینی وصول کرتے ہیں فروخت نہیں کرتے، اس لئے آپ کا خطاب غلط ہے۔

ہرنائی سے لائس نائک غلام مصطفےٰ رضا صاحب لکھتے ہیں: "السلام علیکم! میں اپنے پیارے ڈائجسٹ کا پانچ سال سے قاری ہوں۔ اس دفعہ کا شمارہ اتنا پسند آیا کہ سرورق دیکھ کر خط لکھنے بیٹھ گیا۔ مارچ کے شمارے میں آپ نے کاغذ بھی بہت عمدہ استعمال کیا ہے، خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ہمیں تو کہانیوں سے غرض ہے، سو وہ اتنی لاجواب ہوتی ہیں کہ بس مزہ ہی آ جاتا ہے، آپ نے اس مرتبہ میرے پسندیدہ کردار جبران پر کہانی لکھوا کر دل باغ باغ کر دیا ہے، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ہر ماہ میرے پسندیدہ کردار جبران کی کہانی ضرور شائع کیا کریں۔ سلسلے وار کہانیاں "مفرور" اور "صدیوں کا بیٹا" بہت اچھی جا رہی ہیں، انہیں اور طویل کر دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقلیم علیم صاحب اور ایم۔ اے راحت صاحب کو ان کی کوششوں پر مبارک باد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہوں گی (میں ابھی تک صرف چار کہانیاں پڑھ سکا ہوں) ناواقف بے حد پسند آئی، وسیلہ خاتون کی خدمت میں مبارک باد۔"

غلام مصطفےٰ صاحب! جاسوسی ڈائجسٹ کی غیر معمولی پسندیدگی کا شکریہ! پرچہ حاصل کرنے میں آپ کو جو پریشانی ہوتی ہے، اس پر ہمیں افسوس ہے لیکن آپ کا مسئلہ بھی اقبال صاحب سے ملتا جلتا ہوا ہے، اس لئے ہم کچھ کرنے سے معذور ہیں۔

بورے والا سے جاوید احمد صاحب کپتانی تحریر فرماتے ہیں: "آداب! اس مرتبہ کا ڈائجسٹ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی حسبِ معمول ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح تھا۔ ایک بات یہ ہے کہ "مفرور" کی کہانی کا اینڈ آپ اس طرح اور ایسے واقعہ پر کرتے ہیں کہ دل بے اختیار مچل سا جاتا ہے اور ایک ماہ کا انتظار کرنا بے حد مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

جاوید احمد کپتانی صاحب خدا آپ کی کپتانی کو دوام بخشے، ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ! آپ کی تجاویز پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے معذرت قبول فرمائیے۔

گوجرانوالا سے سید زاہد حسین جعفری صاحب نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے: "پیارے جاسوس بھیّا! السلام علیکم، میں آپ کا جاسوسی ڈائجسٹ ہر ماہ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس کی سلسلہ وار کہانی "مفرور" بہت اچھی جا رہی ہے، "صدیوں کا بیٹا" بھی کچھ کم نہیں ہے، مارچ کے شمارے کا سرورق بہت ہی پیارا تھا۔ اثر نعمانی صاحب کی "سراب" بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ میری طرف سے ان کو مبارک باد دیجیے گا۔ آپ کے رسالے کی پابندیٔ وقت پر میں بہت خوش ہوں، میرے تمام گھر والے بھی جاسوسی ڈائجسٹ بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں جن سے آپ کے رسالے کی تعریف کر دوں۔ مختصر یہ کہ یہ بہت ہی پیارا رسالہ ہے، میری دعا ہے کہ یہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔ اچھا اب اجازت دیجیے کیونکہ کالج جانا ہے۔"

زاہد حسین صاحب! ہم جاسوس نہیں ہیں بلکہ جاسوسی ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں۔ رسالے کی پسندیدگی کے سلسلے میں آپ کا اور آپ کے گھر والوں کا شکریہ! آپ کی مبارک باد اثر نعمانی صاحب کو پہنچا دی جائے گی۔

محمد آباد راجپوت صاحب نے سکرنڈ سے تحریر فرمایا ہے: "آپ کے دونوں ڈائجسٹ سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ میرے پسندیدہ ڈائجسٹ ہیں۔ ان کی کہانیاں اتنی دلچسپ اور پیاری ہوتی ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ "مفرور" اور "صدیوں کا بیٹا" کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ اس ماہ کی کہانیاں "سراب" "عقبی کھڑکی" اور "دوسری عورت" خاص طور پر بہت پسند آئیں۔ دوسری کہانیاں بھی اتنی اچھی تھیں کہ نکتہ چینی کا کوئی جواز نہیں ہے۔"

راجپوت صاحب! دونوں پرچوں کی پسندیدگی کا شکریہ! آپ کی مبارک باد متعلقہ حضرات تک پہنچا دی جائے گی۔

مردان سے سید زاہد حسین کاظمی نے ایک نئے انداز سے پھول برسائے ہیں۔ "ڈیئر جاسوسی ڈائجسٹ! آداب۔ اے جاسوسی ڈائجسٹ میں پہلی بار تیری محفل میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کہیں مجھ سے ہی جاسوسی نہ کر بیٹھنا۔ مجھے اپنے خط کا عبرتناک انجام معلوم ہے لیکن پھر بھی اپنے جذبات حوالۂ قرطاس کر رہا ہوں۔ ڈیئر! تو بہترین اور انوکھی کہانیوں کا مرقع ہے، تو وہ گلدستہ ہے جس میں ہر قسم کے پھول ہیں، آج کل مارکیٹ میں نت نئے ڈائجسٹ ہیں لیکن تیری شان ہی نرالی ہے۔ جناب اقلیم علیم کی قسط وار کہانی "مفرور" ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور اس کے خیال سے مفر ناممکن ہے۔ جناب ایم۔ اے۔ راحت کی بہترین کہانی "صدیوں کا بیٹا" ایسی دلکش اور لاجواب ہے کہ ہمارے ذہنوں پر سینکڑوں برس تک محیط رہے گی۔ اثر نعمانی کی کہانی "سراب" اچھی رہی، لیکن جبران کو کوئی بڑا کارنامہ سرکرنا چاہیے۔ "ناخدا" اچھی اور موضوع کے اعتبار سے انوکھی ہے۔ میری طرف سے شائستہ وحید کو مبارک باد۔ "دوسری عورت" دلکش اور بہترین کہانی ہے۔ محی الدین نواب کی کہانیاں انوکھی اور بے مثال ہوتی ہیں، سرورق بھی اچھا ہے۔ قیمتوں کے بارے میں فیصلہ جو بھی ہو قابلِ قبول ہے، اور میرے خیال میں تمام لوگوں کو آپ کا فیصلہ منظور ہوگا۔ ہمیں جاسوسی ڈائجسٹ سے عشق ہے۔ اگر گرانی اور مہنگائی کی آگ پھیل رہی ہے تو پرواہ نہیں۔ امید ہے کہ ہم اس آزمائش میں پورے اتریں گے۔"

زاہد کاظمی صاحب! آپ کے تبصرے کا شکریہ! معاف کیجیے جاسوسی ڈائجسٹ کے تعلق سے ہمیں آپ کی "مہنگائی" والی بات سے اتفاق نہیں ہے، جاسوسی ڈائجسٹ کی قیمت بڑھانے کو مہنگائی سے تعبیر کرنا اس لئے درست نہیں ہے کہ قیمت کے ساتھ اس کے صفحات میں بھی اضافہ کیا گیا ہے اور اسی تناسب سے جس تناسب سے قیمت بڑھائی گئی تھی۔ جاسوسی ڈائجسٹ کو مہنگا اس وقت کہا جا سکتا ہے جب اس کی قیمت میں تو اضافہ کیا جاتا اور صفحات وہی رہتے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اور دوسرے بہت سے قارئین جو غلط فہمی میں مبتلا ہوئے تھے، ان کی غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔ چینی اور نکتہ چینی میں الفاظی مقابلہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ ہمارے خیال کے مطابق ہر ماہ نہیں تو ہر دوسرے ماہ آپ ضرور الغام لے جائیں گے (آپ کا موجودہ خط یہ خیال پیدا کرتا ہے) بلکہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

چکوال سے محمد منیر اعوان صاحب نے کئی اچھے لطیفے بھیجے ہیں اور لطیفہ نما یہ خط لکھا ہے: "بھائی صاحب! السلام علیکم! عرض ہے کہ آپ کے ڈپو میں پہلی مرتبہ بغیر راشن کارڈ کے حاضر ہوا ہوں۔ لیکن گھبرائیے نہیں، چینی لوں گا نہیں بلکہ دوں گا۔ "صدیوں کا بیٹا" جس انداز سے شروع ہوئی تھی، اب اس سے مختلف ہو گئی ہے۔ کافی عرصہ کے بعد سرورق کی تین کہانیاں پڑھنے کو ملیں، اس کا شکریہ! "مفرور" دلچسپ جا رہی ہے، "یقینی" اور "عقبی کھڑکی" نے متاثر کیا۔ آپ کی لگن اور محنت ایک ایک لفظ سے عیاں ہے، اس قدر میٹھا پرچہ شائع کرنے پر آپ کے منہ میں گھی شکر۔ آپ کو چند ٹوٹے بھجوا رہا ہوں، اگر پسند آئیں تو اور بھیجوں گا۔"

محمد منیر اعوان صاحب! آپ کے روانہ کردہ ٹوٹے پسند آئے۔ ارے ارے یہ آپ نے کیا کیا۔ بتائے بغیر ہماری چھوٹی سی تھیلی میں اتنی بہت سی چینی ڈال دی۔ بہت تیرے کی، یہ تو تھیلی ہی پھٹ گئی۔ دیکھا، ساری چینی گر گئی نا، خیر اب بڑی تھیلی لا کر اور ساری چینی سمیٹ کر اس میں بھرنی پڑے گی، بہر حال آپ کی چینی کا شکریہ!

عبدالرشید صاحب، لاہور۔ صدیوں کا بیٹا اور مفرور کی پسندیدگی کا شکریہ۔ متعلقہ حضرات کو آپ کی مبارکباد پہنچا دی گئی ہے۔ خلیل احمد نازصاحب لاہور۔ "چینی اور نکتہ چینی" کا سلسلہ آپ پسند کرتے ہیں، اس کے لئے ہمارا شکریہ قبول فرمائیے۔ بے شک اگر لطیفہ یا اقتباس اچھا ہو تو ضرور شائع کیا جائے گا ـــــ نجیب اللہ صاحب سوات۔ لیجیے جناب مئی کے بجائے اپریل کے شمارے ہی میں جواب حاضر ہے۔ اب تو غصہ ختم ہو گیا نا۔ تعریف کے لئے شکریہ قبول فرمائیے ـــــ ملک مسعود احمد صاحب، فاران۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ نے تین لطیفے بھیجے ہیں۔ ان میں سے بمشکل ایک ہی کام کا نکلا۔ ذرا اچھے اچھے لطیفے روانہ کریں اور زیادہ تعداد میں۔ ـــــ سید گل باز کاظمی صاحب، حسن ابدال۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ہمارے بیشتر قارئین آپ کی تجویز سے متفق نہیں، اس لئے ہم اس پر عمل نہیں کر سکیں گے ـــــ محمد یوسف صاحب لاکھو، شہداد پور۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی

کا شکریہ۔ اچھی تحریروں کے لئے خوش ذوق لوگ اسی طرح بے تاب ہوتے ہیں۔ "صدیوں کا بیٹا" اور "ناخدا" کے مصنفین کو آپ کی مبارکباد پہنچا دی گئی ہے۔ وہ بھی آپ کے شکر گزار ہیں۔ ——— امان خان صاحب، پشاور۔ مفرور اور صدیوں کا بیٹا آپ کو بہت پسند ہیں۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ سرورق کی کہانیاں بھی آپ کو بہت اچھی لگیں تو گویا ہماری اور مصنفین کی محنت وصول ہو گئی۔ شکریہ! ——— عبدالسلام شیخ صاحب، خیرپور میرس۔ بھیا آپ کے لطیفے تو بار بار کے چھپے ہوئے ہیں، کچھ نئے لطیفے بھیجیں ——— امتیاز علی صاحب، سیدو شریف۔ سابقہ شمارے فراہم کرنا تو ہمارے لئے ناممکن ہے۔ آپ ڈرافٹ بنا کر بھیج دیں۔ اچھا ہوا تو ضرور شائع کیا جائے گا۔ آپ کا ارسال کردہ لطیفہ اچھا ہے۔ کسی قریبی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔ ——— طاہر صاحب، حیدرآباد۔ صدیوں کا بیٹا اور مفرور کی پسندیدگی کا شکریہ! یہ بتانا تو بڑا مشکل ہے کہ اس کی کتنی قسطیں اور باقی ہیں۔ آپ کا روانہ کردہ لطیفہ تو بار بار کا شائع شدہ ہے۔ اس لئے اس کے سلسلے میں معذرت! ——— محمد شریف صاحب، سیالکوٹ۔ بھیا آپ کے لطیفے میں مزا نہیں آیا۔ کچھ اور اچھے اچھے لطیفے بھیجیں ——— خلیل اللہ خلیل صاحب، صوابی۔ بھائی خلیل آپ نے تو کمال کر دیا۔ چار روپے والے پرچے میں آپ کو "خصوصی شمارہ" کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آیا۔ میرے بھائی اس میں ۴۸ صفحات زیادہ ہیں ۴۸۔ آپ کہاں کھوئے ہوئے ہیں۔ عام شمارہ ۲۴۶ صفحات کا ہوتا ہے اور قیمت تین روپے۔ خصوصی شمارے کے صفحات ۲۹۴ اور قیمت چار روپے ہوتی ہے۔ اب فرمائیے! جو چیز آپ کے ہاتھ میں ہے اس کے بارے میں تو آپ کی معلومات اتنی ناقص ہیں، بھلا دنیا کے دور دراز علاقوں کے بارے میں آپ کی معلومات پر کس طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ بہرحال معلومات شائع ہو جائیں گی۔ لطیفہ پرانا ہے ——— محمد اقبال صاحب، پی۔ این۔ ایس بابر۔ بھائی اقبال! آپ نے تو ہمیں بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ آپ نے ایک طرف تو یہ لکھا ہے کہ آپ کبھی کہیں ہوتے ہیں اور کبھی کہیں اور دوسری طرف سالانہ خریدار بننے کی خواہش کا بھی اظہار کیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ! ——— عرفان بشیر صاحب، کوئٹہ۔ آپ کے لطیفوں پر ہنسی نہیں آئی۔ اس لئے کہ وہ کئی بار کے شائع شدہ ہیں۔ کچھ نئے لطیفے بھیجیں ——— قاسم کاظمی صاحب، پاکستان ایئر فورس۔ آپ کے خیال افروز خط کا شکریہ! یقین مانیے یہ پڑھ کر کہ "مفرور" آپ کو پسند نہیں آئی ہمیں بڑی حیرت ہوئی ہے۔ بلا مبالغہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں خطوط میں آپ کا خط پہلا ہے جس میں مفرور کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ آپ کے دوسرے اعتراض کے بارے میں اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ کسی شاعر نے غلط نہیں کہا کہ: "وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ"۔ آپ اس کائنات کو بے رنگ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ "احساس کی آگ" سو فیصد طبعزاد ہے۔ آپ کا مطالعہ تو خاصا وسیع معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ گھسا پٹا اقتباس کیوں؟ آپ سے تو اچھے اچھے اقتباسات کی توقع ہے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کے پابندی سے مطالعہ کا شکریہ! ——— انتصار علی صاحب، کراچی۔ "پیشگی" کے بارے میں آپ کا یہ خیال کہ وہ چھپی ہوئی ہے ممکن ہے صحیح ہو۔ مترجم سے معلوم کئے بغیر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اگر آپ کا خیال صحیح ہے تو ہم معذرت خواہ ہیں۔ سرورق کے آرٹسٹ اور شائستہ وحید کو آپ کی مبارکباد پہنچا دی جائے گی ——— اشتیاق احمد صاحب، جھڈو۔ لیجئے حضرت جواب حاضر ہے۔ جی ہاں! آپ لطیفے بھیج سکتے ہیں۔ اچھے ہوئے تو شکریہ کے ساتھ شائع کئے جائیں گے ——— چودھری غلام رسول صاحب، ساہیوال۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ جاسوسی ڈائجسٹ کے خریدار بن سکتے ہیں۔ جس پتے پر آپ نے خط لکھا ہے اسی پتہ پر پچاس روپے کا منی آرڈر بھیج دیں۔ آپ کو ہر ماہ گھر بیٹھے رسالہ ملتا رہے گا ——— فرحت ہاشمی صاحب، لاہور۔ بھیا ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے ارسال کردہ لطیفے شائع نہیں کئے جا سکیں گے۔ یہ سب کے سب بار بار کے شائع شدہ ہیں۔ کچھ نئے لطیفے بھیجیں ——— حسین خان آفریدی، پشاور۔ بھیا قیمت بڑھائی ہے تو صفحات بھی بڑھا دیئے ہیں۔ آپ کو پڑھنے کے لئے کہانیاں بھی تو زیادہ مل رہی ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ ——— محمد تقی صاحب، مکہ مکرمہ۔ صدیوں کا بیٹا اور مفرور کی پسندیدگی کا شکریہ! ابھی تو یہ دونوں کہانیاں قسط وار جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع کی جا رہی ہیں۔ مکمل ہونے پر کتابی صورت میں شائع کی جائیں گی ——— اسلم پرویز صاحب، میرپور خاص۔ ماہ رخ، سرورق، مفرور، صدیوں کا بیٹا، سراب، ناخدا، عبدل لائبریری اور دوسری عورت کی پسندیدگی کا شکریہ! آپ کی مبارکباد مصنفین کو پہنچا دی جائے گی۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا روانہ کردہ لطیفہ کئی بار کا چھپا ہوا ہے اس لئے شائع نہیں کیا جا سکتا ——— فدا محمد، مردان۔ آپ نے خط میں اتنی تعریف کر دی ہے کہ اسے شائع کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ اقبال پاریکھ صاحب کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ہم تصویر کھنچوانے سے بڑے الرجک ہیں۔ دراصل جب ہم کیمرے کے سامنے بیٹھتے ہیں تو

وہ ہمیں آنکھ مارتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہم شرما کر سر جھکا لیتے ہیں اور تصویر خراب ہو جاتی ہے۔

۔۔ اس لئے ہم نے تصویر کھنچوانی ہی چھوڑ دی ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا کیمرہ ایجاد نہیں ہوا جس کی دونوں

آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہوں... اور اب آخر میں جن حضرات کے خطوط کے جوابات نہ دیئے جا سکے ان سے معذرت کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ!!

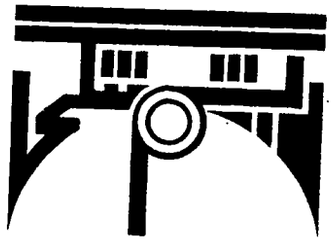

خان

اقلیم علیم

خان دوراں نے اس سرکش لڑکے کو خونخوار نظروں سے گھورا مگر وہ اتنے انہماک سے داہنے ہاتھ میں تھامی ہوئی قہوے کی پیالی کی طرف متوجہ تھا۔ جیسے اس میں اٹھتی گرم گرم، مہکتی ہوئی بھاپ میں سے اسے کسی بھی لمحہ ایک حسین وجمیل دوشیزہ کے نکل پڑنے کی امید ہو!

"حیرت خان! مجھے تیرے جواب کا انتظار ہے!" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد کچے کمرے کی بلند دیواروں میں خان دوراں کی غراہٹ ابھری۔

"بابا میں تمہیں تو نہیں روکتا۔" لڑکا قدرے جھلا کر بولا۔ "تم جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ میں کھیتوں کی دیکھ بھال کروں گا۔ وہاں بھی تو کام ہو رہا ہے!"

خان دوراں ہونٹ بھینچے طیش کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ حیرت خان جواب دے کر ایک بار پھر قہوے کی پیالی میں ڈوب گیا تھا۔

معاً خان دوراں کے جھریوں دار چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ نرم آواز میں بولا۔ "میں زندگی بھر حکمراں نہیں رہوں گا بیٹا۔ میرے بعد سرداری تجھے ملے گی۔ میں اسی لئے اہم جرگوں میں تجھے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں اٹھارہ بیس بارسوخ سردار جمع ہو رہے ہیں پھر سردار علی جان پڑھا لکھا ہے۔ اس نے دنیا دیکھی ہوئی ہے، پہاڑوں سے باہر اس کی آواز سنی جاتی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ بے شمار تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ وہاں جا کر تجھے کچھ حاصل ہی ہوگا!"

حیرت خان نے غصے میں پیالی کا سارا کھولتا ہوا قہوہ ایک ہی گھونٹ میں اپنے معدے میں انڈیل لیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ "بابا! سردار علی جان مکار ہے وہ پہاڑوں سے باہر اپنی قوت اور رسوخ کی کہانیاں سنا کر ہم پر حکومت کر رہا ہے مجھے وہاں نہ لے جاؤ بابا! میں اس سے الجھ پڑا تو طعنے تم ہی کو سننے پڑیں گے۔ میزبان کی چھت کے نیچے مہمان کا اونچی آواز میں بولنا بھی ہمارے یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

"تو جائے گا۔ تیرا تو باپ بھی جائے گا۔ یہ میرا حکم ہے!" خان دوراں کی مصلحت آمیز مسکراہٹ غصہ میں بہہ گئی۔ اس نے اپنے سامنے رکھا ہوا قہوہ دان اٹھا کر پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا۔

"ٹھیک ہے چلوں گا" حیرت خان نے مردہ سی آواز میں کہا۔ وہ اپنے باپ کے لہجوں سے خوب واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ اب بھی انکار پر اڑا رہا تو خان دوراں اسے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر باندھ کر وہاں سے لے جائے گا۔ وہ خان کی ضد کے نتیجہ میں رونما ہونے والے بے شمار عجائبات بچپن سے اب تک اپنی آنکھوں سے دیکھتا آیا تھا۔

خان دوراں اس کا سگا باپ تھا۔ چار بیویوں کا شوہر! اس کی تین بیویوں سے کوئی اولاد نہ تھی۔ بس دوسری کی کوکھ سے اس اکلوتے لڑکے نے جنم لیا تھا۔ دوسری بیوی سے اپنا ولی عہد حاصل کر کے اسے خوشی ضرور ہوئی مگر اس کے بعد جب چار برس کسی خبر کے بغیر گزر گئے تو اس نے تیسری شادی کر ڈالی۔ وہ علاقہ کا طاقتور سردار تھا اور اسے بڑا ارمان تھا کہ وہ چھ سات بیٹوں کا باپ بنے۔ ان دنوں وہ تصور میں خود کو اپنے کڑیل اور خوبرو بیٹوں کے سہارے بڑھاپے کی سرداری چلاتے دیکھتا تھا۔ تیسری کے بعد چوتھی شادی بھی ہوئی مگر خان دوراں کے نصیب میں شاید ایک ہی بیٹا لکھا گیا تھا۔ وہ تو پانچویں شادی کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا مگر صوفی مردان خان نے اسے شرعی مسئلہ سے آگاہ کیا اور خان دوراں کو سینہ پر صبر کی سل رکھنی پڑی۔ وہ لاکھ خودسر اور ضدی سہی مگر مذہبی معاملات میں بے انتہا کٹر تھا۔

صوفی مردان خان ان کی بستی کوہاک میں واحد شخص تھا جسے شرعی معاملات میں معمولی سی شد بد تھی۔ مردان خان نے بستی میں کبھی اپنی مصنوعی علمیت کا سکہ جمانے کی کوشش نہیں کی مگر پورے کوہاک میں کوئی اس قابل بھی نہ تھا کہ اپنا نام ہی لکھ لیتا۔ شادی بیاہ کے مواقع پر قرآن شریف کے نسخے بڑے اہتمام اور احترام کے ساتھ نئے جوڑے کے حوالے کئے جاتے تھے مگر وہاں کوئی نہ تھا جس نے ایک بار بھی اس مقدس کتاب کو کھولا ہو۔ ہاں سینہ بہ سینہ لوگ کچھ آیات حفظ کرتے آ رہے تھے۔ بعض کو سورتیں بھی یاد تھیں جو عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ یادداشت میں پختہ ہوتی جا رہی تھیں کیونکہ بستی کے تقریباً سب لوگ پنجگانہ نماز کے عادی تھے جو عذر کے بغیر اذان کے بعد مسجد میں نظر نہ آتا، لوگ کئی کئی دن اسے تیکھی اور ملامت آمیز نظروں سے گھورتے رہتے تھے۔ اس ماحول میں خان دوراں کو پانچویں شادی کے مسئلہ پر رائے کی ضرورت ہوئی تو یہ عزت صوفی مردان کے حصہ میں آئی۔ اور یوں اس کی خواہش کے بغیر لوگوں نے اسے ملا کا درجہ دے دیا۔ صوفی مردان میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ کبھی کسی مسئلہ میں اپنی کم فہمی کا اعتراف نہیں کرتا تھا۔ سنی سنائی آرا میں ذاتی فیصلہ کا پیوند لگا کر چٹکیاں بجانے میں پیچیدہ سے پیچیدہ موضوع پر اپنی "مستند رائے" صادر کر دیتا تھا!

صوفی مردان، خان دوراں کے مقربین میں تھا۔ حیرت خان بھی ہمیشہ سے اسے بے ضرر سمجھتا آیا تھا۔ وہ جب بھی صوفی مردان کو کچھ لکھتے پڑھتے دیکھتا۔ اس کے دل میں شدید خواہش ابھرتی کہ کاش وہ بھی پڑھا لکھا ہوتا مگر کوہاک سے ڈیڑھ

سو میل دور تک مدرسہ کا نام و نشان نہیں تھا۔ ایک آدھ سردار نے باہر سے استاد بلا کر اپنے بچوں کو پڑھوایا۔ اپنی رعایا کو استاد کی ہوا بھی نہ لگنے دی اور جب کام ختم ہوا تو خاموشی سے ایسے ہر استاد کو باہر پہنچا دیا گیا مگر خان دوراں اصولوں کا آدمی تھا۔ وہ اپنی روایات کے خول میں بند رہ کر زندگی گزارنے کو فخر سمجھتا تھا۔ اسے کوہاک کی سرزمین پر کسی ایسے اجنبی کا وجود کسی بھی مقصد سے گوارا نہیں تھا۔ جو پہاڑوں سے باہر پیدا ہوا یا پلا بڑھا ہو۔

مگر ایک مرحلہ پر حیرت خان کے دل میں صوفی مردان کی طرف سے نفرت کا ایسا بیج پڑا کہ ہوتے ہوتے وہ ایک تناور درخت میں بدل گیا۔

کوہاک پیشہ ور، جفاکش انسانوں کی بستی تھی۔ صدیوں پہلے ان کے بزرگوں نے پتھروں کا سینہ چیر کر ان کے نیچے چھپی ہوئی زرخیز زمین دریافت کی تھی اور اسی وقت سے سارا ماحول جوں کا توں چلا آ رہا تھا۔ جن کے بزرگوں نے پہاڑ چیر کر لہلہاتی کھیتیاں کھڑی کی تھیں۔ وہ پشت ہا پشت گزرنے کے باوجود کسان چلے آ رہے تھے۔ سرداری اور ملکیت ہمیشہ سے خان دوراں اور اس کے بزرگوں کی میراث رہی تھی۔ پیدا ہو کر ہوش سنبھالنے والا ہر بچہ غیر ارادی بلکہ موروثی طور پر حالات کو جوں کا توں قبول کرتا چلا آ رہا تھا۔ کوہاک والوں کی بے لوث شب و روز محنت زمین سے خاصا غلہ اگاتی تھی۔ خوراک کے معاملہ میں وہ بستی خود کفیل تھی۔ دوسری ضروریات پوری کرنے کے لئے وہ اپنے حصہ کی فصل کا ایک حصہ بیچ دیتے تھے اور اس کے عوض باہر سے آنے والا امدادی سامان سستے داموں خرید لیتے تھے پھر ایک بار یوں ہوا کہ خان دوراں سردار علی جان کے ہمراہ تنگ کھیلتا سرحد کے اس پار نکل گیا۔ وہاں اس کی ملاقات سردار علی جان کے چند غیر ملکی دوستوں سے ہوئی۔ واپسی پر وہ خلاف معمول متفکر اور اداس تھا۔

ایک روز اس نے صوفی مردان سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا اور اس نے بے دھڑک کہہ دیا کہ جس کام کو خان دوراں گناہ تصور کر رہا ہے۔ وہ ایماندارانہ تجارت ہے اور اسی روز خان دوراں نے بستی کے بازار میں پھیلا ہوا سارا سامان

خرید لیا اور خچروں پر لاد کر کہیں روانہ کر دیا۔ اس کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ برائے نام قیمت پر آنے والا سارا امدادی سامان خان دوراں اسی قیمت پر خرید لیتا۔ اور چند ہی دن میں اس سامان سے لدے ہوئے خچروں کی طویل قطاریں سرحد پر کھڑے فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں کہیں روپوش ہو جاتیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد کوہاک والوں میں بے چینی پھیلنے لگی۔ انہیں اپنی چیزیں دیکھنے کو نہ ملتی تھیں قہوہ، تمباکو، گرم کپڑا، اونی کمبل، صابن، گھی غرض ہر وہ چیز جو کوہاک میں نہ بنتی تھی۔ وہاں نظر ہی نہ آتی تھی پھر کچھ لوگ فریادی بن کر خان کے ڈیرے پر پہنچے اور دبی زبان میں اس سے التجا کی کہ وہ باہر سے آنے والا سارا امدادی سامان نہ خریدا کرے۔ اس پر ان کا بھی حق ہے!

خان دوراں یہ سنتے ہی غصہ میں آپے سے باہر ہو گیا تھا! "میں یہ سامان قیمت دے کر خریدتا ہوں اور جہاں زیادہ نفع ملتا ہے۔ بیچ دیتا ہوں۔ یہ تجارت ہے تجارت!"

"خان دوراں! تم ہمارے سردار ہو!" ایک معمر شخص گڑگڑایا تھا، "سردار تو اپنی رعایا پر اللہ کا سایہ ہوتے ہیں!"

"خنزیر! میں تم پر کیا ظلم کر رہا ہوں جو مجھے یہ یاد دلانے آئے ہو!" سردار کی آنکھیں ابلنے لگیں اور دہانہ سے کف اڑنے لگا! "یہ جائز تجارت ہے میں صوفی مردان سے فتویٰ لے چکا ہوں!"

اور اسی شام حیرت خان نے صوفی مردان کو جا لیا تھا۔

"مردان خان! تم نے بابا کو کیا پٹی پڑھائی ہے؟" وہ غصہ ضبط کرنے کے باوجود اپنے لہجہ کی تلخی نہ چھپا سکا تھا!

"کیسی پٹی؟ کیا کہہ رہا ہے تو؟" صوفی مردان کے تیور بگڑ گئے۔

"بابا کہتے ہیں کہ امدادی سامان سستے داموں خرید کر بھاری قیمت پر سرحد پار بھیج دینے کو تم نے اپنے فتوے میں ایماندارانہ تجارت قرار دیا ہے؟"

"فتویٰ میں کیسے دے سکتا ہوں۔ میں نہ مفتی نہ قاضی!"

"مگر بابا تمہاری ہر رائے کو سند مانتے ہیں!"

"ویسے یہ درست ہے حیرت خان!" صوفی مردان نے نرم لہجہ میں کہا تھا! "تیرے بابا نہ چوری کرتے ہیں نہ زبردستی مال چھینتے ہیں۔ وہ بیچنے والے کو پوری قیمت دے کر مال اٹھاتے ہیں اور وہ تو اتنے ایماندار ہیں کہ گاہک جو دام دے لے لیتے ہیں۔ نہ خریدنے میں دھاندلی نہ بیچنے میں زبردستی اسے تم تجارت نہیں تو اور کیا کہو گے!"

"یہ تجارت ہے؟" حیرت خان نفرت اور غصہ سے پاگل ہو گیا تھا "ہمارے لوگ ان چیزوں کو ترسیں اور خان دوراں ان پر بھاری نفع کمائے۔ اسی کو تجارت کہتے ہیں!"

"ہر آدمی کو ہر چیز نہیں ملتی حیرت خان!" صوفی مردان خان نے عالمانہ لہجہ میں کہا تھا! "یہ قدرت کا قانون ہے اور اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔"

"مگر ہمارے دردمند، پہاڑوں کے اس پار سے یہ چیزیں ہمارے لئے بھیجتے ہیں، بابا کی تجارت کے لئے نہیں!" حیرت خان کو اپنا ہاتھ روکنا دشوار ہو گیا تھا

"اگر انہیں علم ہو جائے کہ یہ چیزیں ان کے بھائیوں کے بجائے خان دوراں کی نفع اندوزی کے کام آتی ہیں تو یہ سلسلہ رک بھی سکتا ہے!"

"حیرت خان عقل کے ناخن لے!" صوفی مردان خان ملامت آمیز لہجہ میں بولا تھا! "تیرا بابا یہ سامان دشمنوں کو تو نہیں دیتا۔ پہاڑوں کے اس پار سے بھیجنے والے بھی ہمارے بھائی ہیں اور سرحد کے پار بسنے والے بھی! کیا تو نہیں جانتا کہ مسلمانوں کا باہمی رشتہ کیا ہوتا ہے!"

"میں سب کچھ جانتا ہوں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں!" حیرت خان غصہ سے آتش فشاں کی طرح کھولتا ہوا واپس لوٹ گیا تھا۔ وہ مردان خان سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

وہ خان دوراں کا بیٹا تھا مگر اسے بھی یہ حق نہ تھا کہ سردار کے معتبرین میں سے کسی کی توہین کرے۔ اگر صوفی مردان خان سردار سے شکایت کر دیتا تو خان کے ایک اشارہ پر اس کے وہ دونوں دیوہیکل جانثار اسے اٹھا لے جاتے جن کی نہ قامت کا کوئی ہمسر تھا نہ جسامت کا! زنگی اور تورسم طاقت میں تو بہر حال ہر ایک سے افضل ہی مانے جاتے تھے۔

اور وہ دونوں جن اسے اٹھا کر کسی آرام دہ طاق میں نہ رکھتے۔ وہ صرف سردار کی غلامی پر مامور تھے اور اس کے حکم پر اپنے ہونے والے سردار کو دامن کوہ میں واقع اپنے مسکن میں لے جاتے۔ ان اطراف میں سردار کے سوا ان کی مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔

حیرت خان انیس برس کی عمر میں صرف ایک بار وہاں لیجایا گیا تھا۔ بات معمولی سی تھی۔ حیرت خان ایک شام سردار کے مقرب خاص میر افضل خان کے دیوار پر پڑتے ہوئے مضحکہ خیز سائے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا میر افضل ناراض ہو کر فوراً خان دوراں کے ڈیرہ سے چلا گیا اور خان اپنا چابک لے کر دوست کی خاطر اکلوتے بیٹے پر ٹوٹ پڑا۔

حیرت خان کی کربناک چیخوں نے پورے گھرانہ کو متوجہ کر لیا۔ اس کی چاروں مائیں خان کے قدموں میں گر گر کر گڑگڑانے لگیں مگر خان کا غصہ کم نہ ہوا۔ عورتوں کو حمایت پر کمربستہ پا کر حیرت خان بھی چیخ چیخ کر اپنی مظلومیت کا اظہار کرنے لگا۔ اس روز شاید خان دوراں پر خون سوار تھا مگر وہ باوضع آدمی تھا۔ جنون کے اس عالم میں بھی اپنی بیویوں پر ہاتھ نہ اٹھا سکا اور ان سے زور آزمائی ہوئے بغیر حیرت خان پر دل کی بھڑاس نکالنی ممکن نہ رہی۔

اس وقت سردار کی آواز پر وہ دونوں عفریت نظریں جھکائے گھر میں گھسے اور کسی عورت پر نظریں ڈالے بغیر حیرت خان کو شیرخوار بچہ کی طرح اٹھا لے گئے اس روز حیرت خان نے ان کا وہ مسکن دیکھا جہاں میلوں دور کسی فریاد سننے والے کا گزر نہ تھا۔

پھر زنگی نے کسی بے رحم قصاب کی طرح حیرت خان کو زمین میں گڑی چوبی کڑیوں کے سہارے الٹا لٹکا دیا۔ اس دوران میں خان بھی وہاں آ پہنچا۔ غصہ سے اس کی حالت غیر تھی مگر اس وقت اس نے ذرا بھی دخل نہ دیا اور تورسم خان چابک لے کر خان دوراں کے جانشین پر پل پڑا۔ اس ہولناک عتاب سے حیرت خان

کی گلوخلاصی اس وقت ممکن ہوئی جب اس نے گڑگڑا کر تورسم کے روبرو اپنی غلطی اور میر افضل خان سے معافی مانگنے کا اقرار کیا۔

وہ اسی ماحول میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا مگر اسے حکمرانی کے یہ اطوار بالکل پسند نہیں تھے۔ اس کی خو اپنے بیشتر دوں سے مختلف تھی۔ وہ انسان کو انسان سمجھنے کا قائل تھا۔ خان دوراں کے جابرانہ اور سخت گیر رویہ نے اسے دبا تو دیا تھا مگر اس کی رگوں میں بھی اسی کا خون تھا۔ وہ سرکشی پر تل گیا مگر زنگی اور تورسم کے لگائے ہوئے زخموں نے اسے مصلحت آشنا بنا دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کو اسی حد تک زچ کرتا تھا جہاں زنگی اور تورسم کی قلمرو شروع نہ ہوتی تھی۔ خان دوراں کے تیور حد سے زیادہ بگڑنے سے قبل ہی وہ اچانک ہتھیار ڈال دیتا اور خان کے بشرے پر اپنے لخت جگر کے لئے محبت کے نور میں ڈوبی مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔

بستی کا تو جو حال تھا سو تھا۔ گھر کے درو دیوار بھی خان دوراں کی ہیبت سے لرزتے تھے اور اسی ہیبت نے خان کی خانگی زندگی پر سکون کا خول منڈھا ہوا تھا۔ اس کی چاروں بیویاں ایک دوسرے سے دلی پرخاش رکھتی تھیں مگر ان کا خطرناک سے خطرناک تصادم بھی سرگوشیوں میں ہی طے ہو جاتا۔ خان کو ایسے کسی ٹکراؤ کی خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ کوہاک میں بیشتر گھرانے ایسے تھے جہاں ایک مرد کے ساتھ دو یا تین عورتیں ازدواج کے رشتہ میں منسلک تھیں۔ شرعی اعتبار سے وہ بیک وقت چار شادیوں کو بھی جائز سمجھتے تھے لیکن صدیوں سے بستی کی یہ ریت چلی آ رہی تھی کہ رعایا میں سے کوئی مرد سردار کے احترام میں چار بیویوں کی حد کو نہیں چھوتا تھا۔ یہ حق ایک مقدس روایت کے طور پر ہمیشہ سردار ہی کو حاصل رہا تھا!

پھر کوہاک کی سرزمین پر خان دوراں کے مزاج کا کوئی شخص پیدا ہی نہیں ہوا تھا لہٰذا کثیر الازدواج مردوں کے خانگی جھگڑے آئے دن خان کے جرگے میں پیش ہوتے تھے۔ ہر معاملہ کی سماعت کے دوران میں سردار فخریہ اپنی ذات کا حوالہ دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی عورتوں کو قابو میں رکھنا مرد کا خالص نجی معاملہ ہوتا ہے جسے وہ مثالی خوش اسلوبی سے نمٹا رہا تھا پھر جو فیصلہ بھی صادر کر دیتا لوگ اسے نوشتۂ تقدیر مان کر سر جھکائے لوٹ جاتے۔

کوہاک کی ساری زمین خان دوراں کی ملکیت جانی جاتی تھی مگر اس کے بھائی بھتیجے زمینوں پر کام کرنا کسر شان سمجھتے تھے۔ یہ رنگ دیکھ کر حیرت خان کو یقین تھا کہ پتھروں اور پہاڑوں کے سینہ سے لہلہاتی کھیتیاں پروان چڑھانے میں اس کے خاندان کا کوئی حصہ نہ رہا ہو گا مگر دن رات ان زمینوں پر کام کرنے والے خود کو سردار کا پشتینی غلام سمجھتے تھے اور کھلے بندوں اقرار کرتے تھے کہ ملکیت سردار ہی کا حق ہے۔ سارا سال وہ خود محنت کرتے اور جب فصلیں کٹ جاتیں تو خان دوراں اس کا ایک حصہ ان کو مزدوری کی صورت میں دے کر سارا غلہ اپنے ڈیرے سے ملحقہ گودام میں اٹھوا لیتا۔ چند ہزار نفوس پر مشتمل اس بستی کے رہنے والوں پر سردار کی خاندانی عظمت کا ایسا سکہ جما ہوا تھا کہ عملی طور پر لوگ خدا کے بعد اسی کی بات کو افضل اور درست مانتے تھے۔

حیرت خان کے ہوش میں خان دوراں نے کبھی اپنے کسانوں پر ظلم نہیں

ماہرِ نفسیات

ایک ماہرِ نفسیات کی تعریف کیا ہے؟

"ماہرِ نفسیات وہ شخص ہے کہ جب کلب میں کوئی عورت برہنہ رقص کر رہی ہو تو وہ تماشائیوں کا ردِعمل نوٹ کرنے میں مصروف ہو۔"

کیا مگر اس نے لوگوں سے سنا تھا کہ اس کا دادا بڑا پُرجلال آدمی تھا۔ وہ اپنے مخالفین کو سرِعام گھوڑے کے سم سے باندھ کر اس وقت تک سنگلاخ گھاٹیوں میں شہسواری کرتا رہتا تھا جب تک ان کے سانس کی لڑی نہ ٹوٹ جاتی بستی والے جب لرزتی آواز میں سہمی ہوئی نظروں کے ساتھ ماضی کی وہ کہانیاں دہراتے تو حیرت خان کے دادا کی درندگی اور سفاکی کو بڑائی اور جلال کی صورت میں بیان کرتے۔ ان کے محتاط الفاظ میں توہین یا غصہ کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا! حیرت خان کی دانست میں وہ لوگ انسانوں کے بجائے سدھائے ہوئے جانوروں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔

حیرت خان اپنے باپ سے خوب واقف تھا۔ خان دوران کے ہاتھ اپنے کسی مخالف کے لہو میں اس لئے آلودہ نہیں ہوئے تھے کہ اس کے باپ کے لرزہ خیز جور و ستم نے چند نسلوں کے لئے عبرت کا وہ سامان فراہم کر دیا تھا کہ باغی بچے اپنی ماؤں کے بطن ہی میں دہشت سے ٹھٹھر کر مر جاتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جس دن کوہاک کی سرزمین پر کوئی باغیانہ آواز بلند ہوئی۔ خان دوراں اپنے باپ کی داستانوں کو بھلا دے گا! اسے اپنے باپ سے نفرت نہیں تھی۔ وہ اپنے بابا کو جوانی کی عمر میں بھی معصوم بچوں کی طرح والہانہ چاہتا تھا مگر اسے خان دوراں کے اس روپ سے کراہت آتی تھی جس میں وہ ظل اللہ بن کر اپنے جیسے معصوم انسانوں کا لہو چوستا تھا۔ اسے خان دوراں کے مشیر صوفی مردان خان سے ازلی نفرت تھی جو خان کے بدترین گناہوں کے شرعی حیلے گھڑ کر اسے گمراہ کرتا رہتا تھا۔ اسے زنگی اور تورسم سے عداوت تھی جو اپنی شہ زوری سے ظلم کا پلڑا بھاری کئے جا رہے تھے۔

حیرت خان کو وہ دن اب بھی یاد تھا جب فصلوں کی کٹائی کے موقع پر خوشی سے سرشار، گاتے گنگناتے کسانوں کے جوش سے مغلوب ہو کر وہ بھی درانتی لے کر کھیتوں میں گھس گیا۔ وہ زندگی میں ڈوب جانا چاہتا تھا پھر اسی وقت کہیں سے خان دوراں ادھر آ نکلا جب اس کی نظر حیرت خان کے خاک آلودہ لباس، دھوپ سے تمتمائے ہوئے چہرے اور پسینوں میں شرابور چمکیلے بدن پر پڑی تو اس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور وہ خاموشی سے حیرت خان کو ساتھ لے گیا۔

ڈیرے پر پہنچ کر خان دوراں نے تلخ اور تیز لہجہ میں بُری طرح پھٹکارا۔ اس کی دانست میں حیرت خان نے درانتی ہاتھ میں لے کر اس کے خاندانی تقدس کو پامال کیا تھا۔ مٹی، دھوپ، محنت، پسینہ، درانتی — یہ سب کسانوں کا مقدر تھا۔ اس روز خان دوراں کا رویہ ایسا تھا کہ اس کے بعد حیرت خان بارہا

خواہش ابھرنے کے باوجود کسانوں کے ساتھ کام کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔

اپنے گھر پر حیرت خان کا دل نہ لگتا تھا۔ اس کی سوچ ہر ایک سے مختلف تھی۔ اس کے رشتہ کے بھائی دنیا سے بے خبر اپنے مشاغل میں کھوئے رہتے تھے خان دوراں کے پورے خاندان کو شکار سے جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ حیرت خان کی دانست میں وہ صرف لہو کے پیاسے تھے۔ زندہ جسموں سے رستا اور بہتا ہوا گرم گرم خون دیکھ کر ان کے کسی جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ اس نسل کا شکار بے زبان حیوان اور پرندے تھے۔ پچھلی نسل نے تو اس تسکین کے لئے انسانوں کو نشانہ بنایا تھا مگر حیرت خان کو یقین تھا کہ کوہاک کے یہ شب و روز ضرور بدلیں گے۔ اس کا پورا خاندان سمجھتا تھا کہ حالات ہمیشہ یوں ہی رہیں گے بستی والے تو اس ماحول کے ایسے خوگر ہو چکے تھے کہ ان کی زبانیں شکایت سے ناآشنا ہو چکی تھیں۔

حیرت خان سارا دن بستی کے گلی کوچوں میں گھومتا رہتا چوپالوں میں بیٹھتا۔ اس نے محتاط انداز میں بستی کے تقریباً ہر شخص کو چھیڑا مگر ان کی تو روحوں تک میں مظلومیت مزاج بن کر رچی ہوئی تھی۔ ان کی زبانوں سے تنقید کا کوئی لفظ نہ سنائی دیتا تھا۔ اس صورت حال پر حیرت خان کڑھتا رہتا تھا۔ اسے حیرت اس بات کی تھی کہ وہ لوگ اپنا ناکافی حق بھی بھیک بنا کر لیتے ہیں۔ اور چپ ہیں اسے ظلم کا احساس تھا مگر وقت کی چکی میں بے حقیقت ریزوں کی طرح بسنے والے محض قسمت پر شاکر تھے۔

اور اب تو وہ تقریباً ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگتا تھا کہ وہ بستی والوں کو حالات کا شعور بخشے یا اس کو بھی ان ہی کی طرح بے حس بنا دے تاکہ وہ ذہنی کرب سے بچ سکے۔ وہ تنہا تو کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ایک لمحہ کو اسے خیال آتا کہ خان دوراں کے مرنے کے بعد وہ خود سردار ہوگا اور جو چاہے گا کر سکے گا مگر دوسرے ہی لمحہ میں اسے یاد آتا کہ خان دوراں اس کا باپ بھی ہے وہ یتیمی کے خوف سے کانپ اٹھتا اور اس کا رواں رواں اپنے باپ کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگتا۔ اس کے دو بالکل متضاد جذبے ایک ذات سے وابستہ تھے اور اس چیز نے اسے ذہنی کرب میں مبتلا کیا ہوا تھا اگر خان دوراں صرف سردار ہوتا تو حیرت خان کسی بھی لمحہ اس کا کام تمام کردیتا مگر مشکل یہ تھی کہ مصائب کا وہ مخرج اس کا باپ بھی تھا!

سردار علی جان نپے تلے، نرم اور دل میں اتر جانے والے لہجے میں بولتے بولتے سانس لینے کے لئے رکا پھر کہنے لگا "میں نے یہ طویل تمہید صرف اس لئے اٹھائی ہے کہ آپ لوگوں کو صورتحال کا صحیح اندازہ ہوسکے بڑے شہروں میں رہتے ہوئے میرے تعلقات سرکاری حلقوں میں بہت گہرے ہیں بظاہر ہم جمہوری دور میں رہ رہے ہیں لیکن حکومت ہمارے دسیع علاقہ کے خلاف سازشیں کرتی رہتی ہے مگر میں بھی آپ کے مفادات سے غافل نہیں ہوں۔ میں ہر خفیہ فیصلے کے نفاذ سے قبل اس سے واقف ہو جاتا ہوں۔"

سردار علی جان کے ڈیرے پر علاقہ کے سینتالیس بااثر اور طاقتور سردار موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو چھوٹے بڑے قبائل میں بٹی ہوئی لاکھوں کی آبادی پر پورا اختیار رکھتے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جن کے درمیان مدتوں سے نفرت اور رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ جہاں ایک دوسرے کا سامنا کرتے۔ رائفلیں نکال کر فوراً رزم آرا ہو جاتے تھے اور دو سرداروں کی ذاتی دشمنی ان علاقوں میں ہمیشہ دو قبائل کی دشمنی کا روپ دھار لیتی تھی۔ سادہ لوح گرجری قبائلیوں کی صدیوں سے اس طرح ذہنی تربیت ہوتی آرہی تھی کہ ہر شخص اپنے سردار کی توہین کو اپنی ذاتی تذلیل سمجھتا تھا مگر یہ سردار علی جان کی سحر انگیز شخصیت اور اس کے ذاتی رسوخ کا کمال تھا کہ اس نے ایسے تمام عناصر کو مشترکہ مفاد کے نام پر اس خفیہ جرگے میں جمع کرلیا تھا۔ اس وقت ڈیرے کے گرد اس کی ذاتی فوج کے دو سو مسلح آدمی پہرے پر مامور تھے تاکہ اس جرگہ میں کہا ہوا کوئی لفظ باہر نہ سنا جاسکے۔

اس اجلاس میں حیرت خان اپنے بابا خان دوراں کے ساتھ بیٹھا حیرت سے علی جان کی تقریر سن رہا تھا حیرت خان واحد شخص تھا جو کسی بستی کا سردار نہ ہونے کے باوجود سردار علی جان اور خان دوراں کے خصوصی مراسم کی بنا پر جرگے میں شریک تھا ورنہ ہر سردار کے ساتھ آیا ہوا وفد علی جان کے مہمان خانے میں مقیم تھا اور کسی کو جرگے میں شرکت کی اجازت نہیں ملی تھی۔

اس بھیڑ میں ایک سے ایک خود سر اور زبان دراز شخص موجود تھا مگر مجمع پر سردار علی جان کی ذات کا ایسا طلسم طاری تھا کہ سب سانس روکے پورے انہماک سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہے تھے۔

"اور اس بار میں نے اتنی رازداری کے ساتھ آپ سب کو میلوں دور سے یہاں آنے کی زحمت صرف اس لئے دی ہے کہ میرے پاس ہماری تاریخ کی ایک بدترین خبر موجود ہے!" سردار علی جان کہہ رہا تھا۔ اس کے ان الفاظ پر ان لوگوں میں سنسنی پھیل گئی۔ حیران اور کسی حد تک خوفزدہ نگاہیں دوسرں پر پھسلنے لگیں۔ ہر ایک کے اعصاب پر کشیدگی سوار ہونے لگی۔ بیشتر سرداروں نے بے چینی سے اپنی جگہوں پر پہلو بدلنے مگر سانسوں کے دھیمے آہنگ اور علی جان کی نرم آواز کے سوا کچھ نہ سنائی دیا۔

وہ کہہ رہا تھا "حکومت نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ملک سے سرداری نظام کا مکمل خاتمہ کیا جائے گا!"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے!" میر اکبر اضطراب کی حالت میں مٹھیاں بھینچتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس کا لہجہ بہت زیادہ بپھرا ہوا تھا۔

"ہمارے جیتے جی یہ ناممکن ہے" کسی اور نے کہا۔

پھر بیک وقت ان سب نے بولنا شروع کردیا۔ سکوت اور سکون کی فضا درہم برہم ہوگئی۔ دوست اور دشمن کی ہر تمیز مٹ گئی۔ وہ غضبناک لہجوں میں بات کررہے تھے۔

"یہ نہیں ہونا چاہیئے!" علی جان انہیں خاموش کرانے کی کوشش میں قدرے اونچی آواز میں بولا۔ چند سیکنڈ میں آوازیں دم توڑ گئیں مگر ہر چہرے کے تیور بگڑ چکے تھے۔ صرف حیرت خان ہی سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے!" خاموشی ہو جانے پر علی جان نے پُرزور الفاظ میں فقرے کی تکرار کی "یہ فیصلہ کرنے والے احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں وہ اس علاقہ کے مزاج سے ناواقف ہیں۔ سرداری نظام کے بغیر یہاں زندگی درہم برہم ہو جائے گی مگر فیصلہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ فیصلہ کرنے والے دوسرے لوگ ہیں اگر ہم نے ان پر اپنی شدید مزاحمت کا دباؤ نہ ڈالا تو وہ ہم پر اپنا فیصلہ تھوپ دیں گے۔ اس وقت ہمیں اپنے سارے اختلافات بھلا دینے چاہئیں۔ ہماری ذرا سی غلطی ہماری اور ہمارے بزرگوں کی صدیوں کی محنت کو خاک میں ملا دے گی۔ ہمارا اقتدار چھن جائے گا ہم بے حیثیت کردیئے جائیں گے۔ ہمیں اپنے ہاتھوں سے کام کرنے پر مجبور کردیا جائے گا۔ ہمارے چہرے اپنی ہی زمینوں کی مٹی سے آلودہ نظر آئیں گے.....!"

"خاموش ہو جاؤ سردار علی جان!" خان دوراں کرب اور غصے کے عالم میں چیخ پڑا "ایسی منظر کشی نہ کرو کہ حکم آنے سے پہلے ہی ہم صدمہ سے حواس کھو بیٹھیں!"

علی جان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک اداس اور ماتمی مسکراہٹ پھیل گئی "میں تمہیں ڈرا نہیں رہا خان دوراں میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم لوگ اندھیرے میں نہ مارے جائیں۔ ہمیں آنے والے سنگین حالات کا پورا پورا اندازہ ہونا چاہیئے۔ قانون بن گیا تو ہم بے بس ہوں گے۔"

"قانون سے سرداری ختم نہیں ہوتی!" سردار اعظم خان کی آواز غصہ سے کانپ رہی تھی "انگریز کا قانون ہم پر نہ چل سکا تو کون سا قانون چلے گا جب تک طاقت ہمارے قبضہ میں ہے۔ ایسے کسی قانون کی حیثیت کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہ ہوگی!"

"اس بار قانون بنانے والے اسے نافذ کرنے کا بھی عزم رکھتے ہیں" علی جان کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"ہم پہاڑوں کو خون میں نہلا دیں گے۔ ایسا کوئی بھی قانون ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی نافذ کیا جاسکے گا" کسی نے کہا۔

"اگر ان کا منصوبہ کامیاب رہا تو اس کی نوبت ہی نہ آئے گی!" سردار علی جان ہر ایک کو بڑے سکون سے جواب دے رہا تھا۔

"اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ قبیلے کے لوگ ایسے قانون کا خیر مقدم کریں گے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ علی جان!" ایک بوڑھی مگر سرکش آواز سنائی دی "وہ لوگ گردن گردن ہمارے احسانوں کی دلدل میں غرق ہیں۔ وہ ہماری مرضی کے خلاف نہ جاسکیں گے!"

"آج ہم ان کے سردار ہیں۔ وہ اپنا حق بھی ہم سے بھیک کی صورت میں وصول کرتے ہیں مگر انسان کی فطرت ہمیں نہ بھولنی چاہیئے۔ جس دن ہمارے سروں پر قانون کا سایہ نہ رہا۔ وہ ہمارے گریبانوں میں ہاتھ ڈال دیں گے اور صدیوں پرانے حساب چکائیں گے اور اچانک انہیں احساس ہونے لگا کہ ان کے سردار انہیں ان آسائشوں سے محروم رکھ کر ان پر بڑے مظالم ڈھاتے رہے ہیں بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے مفادات میں کھلا تصادم ہے۔"

"علی جان کی بات درست ہے!" کسی نے اعتراف کیا۔

ارباب خان طیش کے عالم میں بولنے والے پر برس پڑا "میں اپنی فوج رکھتا ہوں، میرا نجی اسلحہ خانہ ہے اگر میرے قبیلہ نے مجھ سے بغاوت کی تو میں بچے بچے کو مروا دوں گا!"

"مسئلہ بہت سنگین ہے" علی جان نے جلدی سے دخل اندازی کی "مگر اس کا حل ہمیں جذبات کے بجائے عقل سے سوچنا ہے یہ درست ہے کہ ہم میں سے بیشتر کے پاس نجی فوج ہے مگر ہمارے جوان ہمارے قبیلوں ہی سے تعلق رکھتے ہیں اپنے گھر پر کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ بالفرض محال ایسا ہو بھی جائے تو ہم سرداری کس پر کریں گے؟ ہماری زمینوں اور شکارگاہوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ یہ میرا یقین ہے کہ ایک بار اعلان ہوگیا تو اس کے بعد تشدد کے ذریعہ اپنی سرداری چلانے کی کوشش کرنے والے بیشتر سردار ہولناک خسارے سے دوچار ہوں گے!"

"تو کیا ہمیں آنے والے حالات کو قبول کرلینا چاہیئے؟" ارباب خان زہریلے لہجہ میں پھنکارا۔

"یہ میں نے کب کہا؟" علی جان جلدی سے بولا "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ان کا منصوبہ شروع ہی سے بُری طرح ناکام بنا دیا جائے!"

"منصوبہ، منصوبہ!" اکبر یز خان دہشت کے عالم میں جھلا کر بڑبڑایا پھر اونچی آواز میں بولا "یہ کیوں نہیں بتاتے کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔"

"میں وہی بتا رہا ہوں" سردار علی جان تحمل کے ساتھ بولا "آپ لوگوں کو خوب یاد ہوگا کہ ہمارے دشمنوں نے بارہا اس علاقہ میں اسکول اور شفاخانے وغیرہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح وہ ہمارے درمیان کالی بھیڑیں چھوڑنی چاہتے تھے مگر ہم سختی سے اپنی بات پر اڑے رہے۔ اپنے اپنے علاقہ میں ہمارا اختیار اسی وقت تک قائم ہے جب تک ہم نے اپنی بستیوں کے گرد نادیدہ آہنی حصار قائم کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ یہی کہا کہ تم علاقہ کی ترقی کے لئے جو رقم خرچ کرنی چاہتے ہو۔ وہ سرداروں کے حوالے کردو۔ ہم اس پیسے سے جو مناسب اور ضروری سمجھیں گے۔ کریں گے۔ اسی اصول کی وجہ سے آج ہمارے اسلحہ خانوں میں ہر قسم کے ہتھیار بھرے ہوئے ہیں مگر اب لوگ یہ اصول ماننے سے منکر ہیں۔ وہ یہاں جابجا اسکول اور ہسپتال بنانے پر تل گئے ہیں۔ ہمارے پاس نہ استاد ہیں، نہ ڈاکٹر، نہ نرسیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ادارے قائم ہوں گے تو ان کے لئے شہروں سے عملہ بھیجا جائے گا۔ یہ لوگ ہمارے قبیلوں میں سازشوں کو ہوا دیں گے۔ ان سے لوگوں کو یہ پتہ چلے گا کہ صحیح آزادی کیا ہوتی ہے۔ شہروں میں لوگ کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ دور سے یہ خواب بہت سہانے اور دلفریب نظر آتے ہیں پھر تعلیم ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو گمراہ کرے گی۔ ان میں سوئی ہوئی انا کو بیدار کرے گی اور یوں ہر دل میں یہ آرزو پیدا ہوگی کہ قبیلوں میں بھی شہری سہولتیں میسر آئیں اور اچانک انہیں یہ احساس ہونے لگے گا کہ ان کے سردار انہیں ان آسائشوں سے محروم رکھ کر ان پر بڑے ستم ڈھاتے رہے ہیں اور سب سے خراب چیز یہ ہے کہ وہ لوگ اس علاقہ میں سڑکوں کا جال بچھانے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ اس وقت پہاڑ ہمارے مفادات کے امین ہیں۔ دشوار گزار راستوں پر ہمارا مکمل کنٹرول ہے۔ ہماری مرضی کے بغیر ان راستوں پر

آنے والے اجنبی نادیدہ گولیوں کا شکار ہو جاتے ہیں عالم یہ ہے کہ خان دوراں کے قبیلے کوہاک کے قریب واقع ریشم تنگی کے تنگ پہاڑی راستے کے دونوں طرف پہاڑیوں پر ایک ایک آدمی مسلح ہو کر بیٹھ جائے تو چار ہزار مربع میل کے علاقے کا دفاع کیا جا سکتا ہے، ہزاروں کا لشکر بھی ان دو آدمیوں سے بچ کر نہیں نکل سکتا مگر لوگ چاہتے ہیں کہ بارود سے ان پہاڑوں کو اڑا دیں۔ ہر قبیلے میں جانے کے لئے کشادہ اور پختہ سڑکیں ہوں تاکہ دو ٹکے کا کوئی بھی پولیس افسر اپنی جیپ میں کسی سردار کے ڈیرے پر دھاوا بول کر اسے ہتھکڑیاں لگا کر لے جا سکے۔ جس روز یہاں سڑکیں تیار ہو گئیں ہم محفوظ و مامون نہ رہیں گے اور اسی وقت سرداری بھی ختم کی جائے گی تاکہ مزاحمت کرنے والوں سے نمٹنے کے لئے پولیس بھیجی جا سکے۔ یہ سڑکیں ہمارے لئے تابوت کا کام کریں گی!"

ہم سڑکیں تو کیا انہیں اپنے علاقوں میں ایک اینٹ بھی نہ لگانے دیں گے۔"

سردار خضر خان غرایا۔

حیرت خان یہ ساری گفتگو بڑی حیرت کے ساتھ سن رہا تھا اور اب یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے باپ کے ساتھ اس جرگے میں شرکت کر کے اس نے بہت عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ابھی تک تو وہ محض اپنے تجزیہ کی بنا پر صرف خان دوراں کو قبیلہ والوں کا ظالم حکمران سمجھتا آیا تھا مگر یہاں سرداروں کی بے لاگ گفتگو نے اس کا دماغ روشن کر دیا تھا۔ خان دوراں تو دوسروں کے مقابلے میں خاصا نرم خو اور مہربان ثابت ہو رہا تھا۔ سرداروں کی نسل کا صحیح نمائندہ تو ارباب خان تھا جو تھوڑی دیر قبل اپنے پورے قبیلے کے قتل عام کے ارادے کا اظہار کر چکا تھا۔ ان سب کے نزدیک ذاتی مفادات ہر چیز پر افضل تھے۔ انہیں اپنے قبیلوں یا علاقوں کی بہبود و سلامتی سے کوئی غرض نہ تھی بلکہ غور کیا جائے تو اپنے ذاتی مفادات کی بنا پر وہ عام لوگوں کی ترقی کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اسکول، ہسپتال، سڑکیں یہ سب ترقی کے زینے ہی تھے۔

حیرت خان کو کئی بار ان کی عقل دشمن باتوں پر غصہ بھی آیا۔ وہ انہیں شرم دلانی چاہتا تھا مگر وہ کچھ دیکھ رہا تھا کہ اس بھیڑ میں وہ سب ہم آواز ہیں۔ ان کے مفادات مشترک ہیں پھر وہاں کی فضا پر تشدد اور بربریت کے سائے محیط تھے اگر وہ بولتا تو سب ہی اس کے دشمن ہو جاتے بلکہ شاید اسے جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جاتے جو لوگ صدیوں کے جانثار ساتھیوں اور قبائلی جانثاروں کے قتل عام پر تلے ہوئے تھے۔ وہ بھلا حیرت خان سے ساتھ کیوں رعایت سے کام لیتے!

"میرا ابھی یہی مقصد ہے!" سردار علی جان کہہ رہا تھا۔ "سڑکوں کی تعمیر کے ابتدائی سروے کے لئے ٹھیکوں کے ٹنڈر جاری کئے گئے تھے مگر ان دشوار گزار علاقوں میں سرکاری نرخوں پر کام کرنا بہت مشکل ہے۔ یہاں کوئی چیز میسر نہیں ہے۔ راستے مخدوش اور خطرناک ہیں۔ مواصلات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے لہٰذا کوئی بھی ٹھیکیدار نقصان کے اس سودے پر راضی نہیں ہوا۔ اب جلد ہی کوئی سرکاری ادارہ یہ کام شروع کرے گا۔ وہ لوگ سب سے پہلے خان دوراں کے علاقہ پر توجہ دیں گے کیونکہ ریشم تنگی کی سڑک بن جانے پر ہزاروں مربع میل کے علاقے سے رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔"

"وہ درہ صدیوں سے کوہاک والوں کی ملکیت ہے۔ میں اس کی پوری طرح حفاظت کروں گا۔" خان دوراں کے الفاظ پُرعزم تھے۔

"اب شب و روز اس درے کی نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک بار ہم نے اسے کھو دیا تو ہم برباد کر دیئے جائیں گے۔" علی جان نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو، واپس لوٹتے ہی پورا بندوبست کروں گا۔" خان دوراں بولا۔

"اور اگر وہ اس راستے سے گزرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم اپنی بستیوں میں رہ کر ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ ہمیں ہتھیار سنبھال کر پہاڑوں پر چڑھنا ہو گا۔ ذلت کی زندگی سے بہتر ہے کہ ہم اپنے عظیم مقصد کی خاطر لڑتے ہوئے جان دے دیں۔ جرأت، بہادری اور بے خوفی ہماری آبائی میراث ہے اور اگر ہمارے امتحان کا وقت آ ہی جائے تو ہمیں دنیا کو بتانا ہو گا کہ ہم اس ورثے کے امین ہیں!" علی جان نے کہا۔

"انشاءاللہ!" کئی آوازوں کا جوشیلا آہنگ بیک وقت گونج اٹھا۔ "ہمارے اقتدار پر اٹھنے والی انگلیاں توڑ دی جائیں گی۔ ہمارے دشمنوں کو پہاڑوں صحراؤں جنگلوں میں کہیں پناہ نہ مل سکے گی!"

سردار علی جان کا قبیلہ نہ بہت بڑا تھا نہ طاقتور مگر محض علی جان کی وجہ سے علاقے میں اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ ان پہاڑوں کی گود میں رہنے والوں نے کبھی باہر کی دنیا نہ دیکھی تھی، سدا سے اپنے خول میں مگن رہتے آئے تھے مگر علی جان شہروں میں رہتا تھا۔ اس نے وہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے گفتگو کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ جب وہ کسی جرگے میں فاضلانہ انداز میں ملکی معاملات پر بے تکان تقریر کرتا تو بڑے بڑے خرانٹ اور سرکش سردار بھی یوں توجہ سے اس کی بات سنتے تھے جیسے علی جان کی زبان سے الہامی باتوں کا نزول ہو رہا ہو۔

حیرت خان مدت سے سردار علی جان کی سحر انگیز شخصیت کے بارے میں سنتا آیا تھا اور اب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ علی جان سرداروں کو مٹھی میں لینے کا فن جانتا تھا۔

اجلاس ختم ہونے کے بعد حیرت خان نے اپنے باپ سے بے شمار سوالات کئے۔ اسے سردار علی جان کے الفاظ میں انسانی لہو کی بو محسوس ہوئی تھی۔ اس نے خان دوراں پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار تو نہ کیا مگر اپنے پے در پے بے رحمانہ سوالات سے اسے زچ کر دیا۔

اور یہی وجہ تھی کہ خان دوراں اسے ساتھ لے کر سردار علی جان سے تنہائی میں ملنے گیا تھا۔

علی جان نے اس خوبرو جوان کی ذات میں بے حد دلچسپی محسوس کی جو خان دوراں کے بعد علاقے کے اہم ترین قبیلے کوہاک کا حکمران بننے والا تھا۔

"یہ بہت جلد باز اور جذباتی لڑکا ہے!" خان دوراں علی جان سے کہہ رہا تھا۔ "اسے صرف سامنے کی باتیں نظر آتی ہیں۔ پوشیدہ باتوں پر اس کی نظر نہیں جاتی!"

"عقل آ جائے گی!" سردار علی جان مسکراتے ہوئے بولا۔ "چھوٹے موٹے فیصلوں کا اختیار اسی کو دے دو، آہستہ آہستہ ہر بات سمجھنے لگے گا!"

"اس میں عقل کی کمی نہیں، بس رہنمائی کی ضرورت ہے!" خان دوراں نے کہا۔

"کوہاک ہمارا قلعہ ہے حیرت خان!" اس بار سردار علی جان براہ راست اسی سے مخاطب ہوا۔ "یہاں والوں کا کوئی بھی غلط فیصلہ ان پہاڑوں کا مقدر بگاڑ سکتا ہے۔ تمہیں خان دوراں کے طویل تجربے سے سبق لینا چاہیے۔ تمہارے اقتدار کے لئے حالات شاید اتنے سازگار بھی نہ رہیں جو آج نظر آتے ہیں!"

"میں نے ہمیشہ بھلائی کے لئے سوچا ہے چاچا!" حیرت خان نے دھیمی آواز میں کہا۔ "بابا مجھے ابھی تک چھ برس کا کھلنڈرا لڑکا سمجھتے ہیں!"

سردار علی جان زور سے ہنسا۔ "اولاد بوڑھی بھی ہو جائے تو ماں باپ کی نظروں میں شیرخوار رہتی ہے مگر تمہاری نگاہ ہر آن مستقبل پر ہونی چاہیے!"

"علی جان میری تم سے ایک التجا ہے!" اچانک خان دوراں بولا۔

"التجا نہیں، حکم دو خان!" سردار علی جان کے چہرے پر انکسار پھیل گیا۔ "تم میرے دوست ہی نہیں، عمر کے لحاظ سے بزرگ بھی ہو!"

"حیرت خان کو کچھ دن کے لئے اپنی غلامی میں لے لو۔" خان دوراں نے کہا

سردار علی جان کی نگاہیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہونٹ دائرے کی صورت میں سکڑ گئے پھر وہ تاسف آمیز لہجے میں بولا۔ "خان دوراں، رشتوں کی بات یوں بچوں کے سامنے نہیں کی جاتی!"

حیرت خان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور خان دوراں اپنی رانیں پیٹ پیٹ کر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ سردار علی جان مترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"اوئے خانا، دامادی تو ساری عمر کی غلامی ہوتی ہے۔" جب خان دوراں کی ہنسی کچھ کم ہوئی تو وہ بولا۔ "میں نے تو کچھ دن کی غلامی کی درخواست کی ہے۔ تمہاری صحبت میں جب یہ سرداری کے آداب سیکھ کر کوہاک لوٹے گا تو میں بھی اس پر فخر کر سکوں گا!"

خان دوراں کی اس بات پر سردار علی جان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ذرا سی غلط فہمی نے اس پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ قصور دراصل اس کے ذہن کا تھا جس وقت خان دوراں نے اپنی بات کہی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اگر حیرت خان پڑھا لکھا ہوتا تو اس کی بیٹی کا بے مثال جوڑ ہوتا۔

"معاف کرنا خان دوراں، میرے سننے میں غلطی ہوئی تھی!" سردار علی جان خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "ویسے تمہاری تجویز معقول ہے۔ چند ہفتوں بعد میں شہر جاؤں گا تو تمہیں پیغام بھجوا دوں گا، تم اسے میرے پاس بھیج دینا۔ شہروں میں رہ کر یہ بہت جلد ہوشیار ہو جائے گا!"

خان دوراں نے گرمجوشی سے سردار علی جان کو گلے سے لگا لیا۔

چھ سلنڈروں والا انجن رکاوٹوں سے سر ٹکرانے کے باوجود پوری قوت سے غرا رہا تھا۔ جیپ کا انجن پچھلے تین گھنٹوں سے مسلسل گاڑی کے چاروں پہیوں کو گھما رہا تھا تاحد نظر پہاڑی چٹانوں، تودوں، پتھروں اور خندقوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ثمر گل نور دھیل ڈرائیو میں ہلکی رفتار پر گاڑی چلا رہا تھا جیپ ان راستوں پر اچھلتی لرزتی دھیمے دھیمے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ راستہ اب اس قدر خراب تھا کہ ہر چند سو گز بعد پہاڑوں سے لڑھکی ہوئی کسی چٹان کے باعث انہیں راستہ مسدود ملتا اور ثمر گل کو جیپ واپس گھما کر طویل چکر کاٹنا پڑ جاتا اگر وہ ان علاقوں کا کیڑا نہ ہوتا تو کبھی کا بھٹک چکا ہوتا۔ ان راستوں پر مشینی سواری کا گزر ناممکن سی بات تھی مگر جب اس کو پوری مہم کا علم ہوا تو اس نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس بہانے کم از کم وہ اپنی بچھڑی ہوئی بستی کی زیارت تو کر سکتا تھا جہاں سے بیس برس پہلے اسے فرار ہونا پڑا تھا۔

جیپ میں ثمر گل کے ہمراہ ملٹری انجینئرنگ سروس کا کرنل جہاں داد موجود تھا جس کے جسم پر مکمل فوجی وردی موجود تھی خود ثمر گل بھی فوجی یونیفارم میں تھا جیپ کے عقبی حصے میں پیٹرول اور پانی سے بھرے ہوئے جیری کین اور خشک غذا کے سربند ڈبے موجود تھے جو بدترین حالات میں بھی شورگر اور کوہاک کے درمیان دو طرفہ سفر کے لئے کافی ہوتے۔

اس سفر میں ثمر گل کی شمولیت قطعی اتفاقی تھی۔

وہ اپنے یونٹ کے ہمراہ شورگر کی چھاؤنی میں مقیم تھا جو قبائلی علاقوں سے چند میل دور پہاڑوں کی گود میں واقع تھی۔ کرنل جہاں داد اس چھاؤنی میں ملٹری انجینئرنگ سروس کے دستوں کا کمانڈر تھا۔ کرنل کو ہیڈ کوارٹر سے احکام ملے تھے کہ ریشم تنگی اور کوہاک کے راستے شورگر کو آخری سرحدی قبیلے خورشارہ سے ملانے کے لئے ایک شاہراہ کی تعمیر کے سلسلے میں ابتدائی سروے کا انتظام کیا جائے۔

شورگر سے چند میل دور تک ناہموار مگر قابل سفر کچا پہاڑی راستہ تھا۔ جسے جیپ میں طے کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد ریشم تنگی نامی درہ آتا تھا جسے عبور کرتے ہی کوہاک کی بستی سامنے آ جاتی تھی۔

اس طویل راستے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے قبائل آباد تھے مگر وہ ایک دوسرے سے بہت دور اور مختلف راستوں پر پڑتے تھے۔ پھر وہاں عام دنوں میں بھی رسد کی قلت رہتی تھی لہٰذا خچروں وغیرہ کے ذریعے یہ طویل راستہ طے کرنے کا خیال کرنل نے شروع ہی سے خارج از بحث رکھا تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ سروے کے انتظامات طے کرنے والی جماعت ہیلی کاپٹر کے ذریعے براہ راست کوہاک میں جا اترے مگر کرنل جہاں داد تجربہ کار افسر تھا۔ وہ ان جنگجو اور سادہ دل قبائلیوں کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ وہ لوگ انکسار پسند تھے اور مہمان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے مگر انہیں کسی مہمان پر شبہ بھی ہو جاتا کہ وہ جاہ و جلال، امارت، سطوت یا طاقت کے مظاہرے کے ذریعے انہیں مرعوب کرنا چاہتا ہے تو اسے زمین پر امان ملنی مشکل ہو جاتی تھی اسے ان علاقوں کے سفر کا کوئی موقع تو نہیں ملا تھا مگر خان دوراں کے بارے میں سنی ہوئی کہانیوں سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ افسرانہ شان سے کوہاک میں اترنے والوں کو کسی قیمت پر سروے کی اجازت نہیں ملے گی۔

وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں ایسے راستے کا متلاشی تھا کہ کوہاک والوں کی انا کو مجروح کئے بغیر کوہاک میں سروے کیمپ قائم کرنے کی اجازت حاصل کر سکے کیونکہ یہ منصوبہ ان علاقوں کی قسمت بدل سکتا تھا۔ جدید زندگی کی ہر سہولت ان جانباز قبائلیوں کے دروازے تک پہنچائی جا سکتی تھی جو بیسویں صدی میں بھی

تیرہویں صدی میں زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس سروے کے سلسلے میں بھی اداروں کی جانب سے مسلسل معذرت کے بعد یہ تاریخ ساز کام اس کے سر ڈالا گیا ہے۔ وہ اس امتحان میں سرخرو ہونا چاہتا تھا اور کسی بھی ایسے اقدام سے گریز کر رہا تھا جو کوہاک والوں کے اشتعال کا سبب بن سکے۔ سفر کی صعوبتیں اور ذاتی مصائب اس کے لئے ہیچ تھے!

اپنے ساتھی افسروں سے طویل بحث اور مشورے کے بعد آخر کرنل نے طے کیا کہ وہ خود دو آدمیوں کے ہمراہ خچر پر سفر کرے گا۔ اسی کے ساتھ اس نے جانوروں وغیرہ کے انتظام کا حکم دے دیا۔

جب ثمر گل کو پتہ چلا کہ اس کا کرنل خچروں پر کوہاک کے دور افتادہ قصبے میں جا رہا ہے تو وہ بے چین ہو گیا۔ اس کی بے چینی کے دو واضح اسباب تھے اوّل اسے اپنے مخلص افسر کی شدید دشواریوں کا احساس تھا۔ دوئم کوہاک اس کا آبائی قبیلہ تھا۔

آخر ڈرتے جھجکتے وہ کرنل کے دفتر میں پہنچ ہی گیا۔

"صاحب! تم نے خچر پر کوہاک جانے کا فیصلہ کیا ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کرنل جہاں داد سے پوچھا۔

کرنل کی تیوریاں پل بھر کے لئے چڑھ گئیں۔ فوج کے نظم و ضبط میں ایسی گنجائش کہاں کہ یونٹ کا ڈرائیور اپنے کرنل کے کسی فیصلہ پر سوال اٹھا سکے مگر اسی وقت اسے ثمر گل کے لہجے میں چھپی ہوئی ہمدردی کا احساس ہوا، تیوری کے بل خلیقانہ مسکراہٹ میں معدوم ہو گئے "ہاں ثمر گل، مگر اس بات سے تمہیں کیا دلچسپی ہے؟"

"صاحب کوہاک میرا قبیلہ ہے!" ثمر گل نے سر جھکا کر کہا۔

"تمہارا قبیلہ ہے؟" کرنل جہاں داد حیرت سے بولا "مگر میں نے کبھی یہ بات نہیں سنی۔ نہ تم کبھی اپنے قبیلے میں گئے!"

ثمر گل اس بات پر اداس ہو گیا "میں بیس برس پہلے کوہاک سے فرار ہوا تھا۔ میرا وہاں کوئی نہیں ہے۔ میں جاتا تو کس لئے جاتا؟"

کرنل کو اس کی باتوں میں گہری دلچسپی محسوس ہوئی اور اس کے کریدنے پر ثمر گل نے ماضی کی داستان چھیڑ دی۔ جسے وہ بیس برس سے سینے میں دبائے ہوئے تھا۔

کوہاک پر ان دنوں بھی خان دوراں کی حکمرانی تھی قبیلے میں مشہور تھا کہ خان دوراں اپنے اجداد کے مقابلے میں نرم خو ہے۔ نرم خوئی تو اسے چھو کر بھی نہ گزری تھی مگر لوگوں کی اس رائے کا سبب محض اتنی بات تھی کہ خان کے ہاتھ اپنے کسی مخالف کے خون سے آلودہ نہ تھے۔ وہ بس نماز کے بعد گڑگڑا کر اپنے دشمن کی بربادی کی دعائیں کرتا تھا اور قدرت اس پر اتنی مہربان تھی کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کا مخالف اچانک غائب ہو جاتا۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ خان کی دعاؤں کی قبولیت کا راز ثمر گل پر اس روز کھلا جب ایک اندھیری رات میں خان دوراں کے دو دیو ہیکل خادموں نے اسے بیہوش کر کے ایک اجنبی سے مقام پر پہنچایا۔

ثمر گل کی ماں مر چکی تھی اور وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ باپ بیٹے خان دوراں کی زمینوں پر کام کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ ایک روز یوں ہوا کہ اس کا بوڑھا باپ عصر کے وقت کام چھوڑ کر تپتی ہوئی زمین پر نماز پڑھ رہا تھا کہ خان دوراں کھیتوں کی طرف آ نکلا۔ جب اس کی نظر ثمر گل کے باپ پر پڑی تو وہ سجدے میں تھا خان قہر بھری نگاہوں سے اسے گھورتا رہا جب سجدہ طویل ہو گیا تو اس نے نمازی بوڑھے کی پیشانی پر ٹھوکر ماری اور اسے نماز کے بہانے حرام خوری کا طعنہ دیا۔

بوڑھے کی پیشانی سے جیتے جیتے لہو کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ اس کی سفید داڑھی خون میں سرخ ہوتی رہی مگر اس نے نیت نہ توڑی۔ ہاں نماز ختم کر کے وہ لرزتی ہوئی آواز میں برس پڑا۔

"خدا کے قہر سے ڈرو خان دوراں، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ نمازوں کی خاطر میں تمہاری زمین پر ہر روز دو گھنٹے زیادہ کام کرتا ہوں۔" وہ اپنے زخم کو صاف کرتے ہوئے تقریباً رو دیا تھا "خدا تمہیں اس ٹانگ سے معذور کر دے جس سے تم نے مجھے زخمی کیا ہے۔"

دوسرے لوگ خوف زدہ نظروں سے یہ سب دیکھتے رہے کسی میں مجال نہ تھی جو دخل دیتا۔ ان ہی تماشائیوں میں بارہ سالہ ثمر گل بھی تھا۔ اس کا دل تڑپ رہا تھا مگر وہ باپ کی مدد کی ہمت نہ کر سکا۔

ادھر خان دوراں کو اپنی غلطی کا تھوڑا سا احساس ہوا۔ اس نے قہر کی نظروں سے زخمی بوڑھے کو دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس واقعہ کے چند ہی دن بعد بستی والوں نے سنا کہ خان دوراں کی بددعائیں باپ بیٹے کو چاٹ گئیں۔ وہ پر اسرار طریقے پر کہیں لاپتہ ہو گئے تھے۔

مگر خان کی بددعاؤں کو قبولیت بخشنے والے فرشتے زنگی اور تورسم ان دونوں باپ بیٹوں کو خان کے اس قید خانے میں لے گئے جس کے وجود سے کوہاک والے بھی بے خبر تھے۔ ان سے پہلے وہاں دو دہشت زدہ قیدی موجود تھے "انہیں کافی عرصے قبل خان کی بددعا لگی تھی۔

ثمر گل کا باپ ذلت اور تشدد کو زیادہ دن نہ جھیل سکا۔ ایک ہی ہفتے میں زنگی کے چرمی چابک نے زخموں کے راستے بوڑھے کی روح نچوڑ لی۔ ثمر گل کا قصور قدرے کم تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کی اولاد تھا جس نے خان دوراں کی شان میں گستاخی کی تھی اور اس بے چارے کو اپنی ولدیت پر کوئی اختیار نہ تھا۔ شاید اس کی اسی مجبوری کے پیش نظر اسے صرف قید رکھا گیا۔ تشدد سے وہ بچا رہا۔

پھر ایک روز اسے وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔ وہ پورے علاقے سے خوب واقف تھا۔ لہٰذا انسانوں سے بچتا بھوکا پیاسا آگے بڑھتا رہا اور آخر کار شہری علاقوں میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان دنوں وہ ہر وقت خان دوراں سے انتقام لینے کے منصوبے بناتا رہتا تھا پھر اس نے ایک مل میں نوکری کی۔ وہاں اس کے خیالات میں ایک اچھے دوست کی وجہ سے انقلاب آیا اور ثمر گل انتقام سے نفرت کرنے لگا۔ اب اس کی دانست میں انتقام ایک کمینہ جذبہ تھا جو انسان کو مسلسل تخریب پر اکسائے رہتا ہے۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے فوج میں ملازمت کر لی۔ ثمر گل کی دانست میں یہ اس کی با مقصد زندگی کی معراج تھی۔ وہ بچپن ہی سے خود کو فوجی وردی میں دیکھتا چلا آیا تھا۔

"کیا تم میرے ساتھ کوہاک چلنا چاہتے ہو؟" کرنل جہاں داد نے پوری کہانی سننے کے بعد پوچھا۔

"صاحب! وہ راستے میرے دیکھے بھالے ہیں!" ثمر گل نے اعتماد سے کہا تھا "وہ دشوار گزار بھی ہیں اور خطرناک بھی مگر مجھے چھ سلنڈر والی جیپ مل جائے تو میں تم کو خان دوراں کے ڈیرے پر پہنچا دوں گا!"

"تم عجیب دعویٰ کر رہے ہو ثمر گل۔ ان راستوں پر آج تک کوئی گاڑی نہیں گئی ہے!"

"صاحب خچر پر تم پریشان ہو جاؤ گے اور یہ میرے لئے فخر کی بات ہو گی۔ کہ میں ان راستوں پر جیپ لے جانے والا پہلا ڈرائیور کہلاؤں گا!" اس کے لہجے میں امید اور التجا تھی جسے کرنل جہاں داد نظر انداز نہ کر سکا۔

"مگر تم خان دوراں کی قید سے بھاگے تھے؟" کرنل نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"صاحب بیس برس کی مدت بہت لمبی ہوتی ہے!" ثمر گل نے کہا تھا "میں نے یہ عرصہ کوہاک کے پہاڑوں میں نہیں، شہروں میں گزارا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ خان دوراں ہی نہیں۔ ہر قبائلی فوج کی بڑی عزت کرتا ہے کسی کو اپنا جانی دشمن بھی فوج کی وردی میں نظر آ جائے تو خون آشام نگاہیں محبت کے نور سے جگمگانے لگتی ہیں! اور ان بیس برس میں تو میرا حلیہ ہی بدل چکا ہے۔ وہ مجھے پہچان بھی نہ سکیں گے!"

اس گفتگو کے بعد منصوبہ پر نظر ثانی ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں ثمر گل اور کرنل جہاں داد جیپ کے ذریعے شور گڑھ کی چھاؤنی سے کوہاک کے لئے روانہ ہوئے کرنل نے محض ایک ریوالور ساتھ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسلحے کی غیر موجودگی میں خان دوراں سے سروے کی اجازت حاصل کرنے میں آسانی رہے گی۔ وہ دوستی محبت اور بھائی چارے کا مشن لے کر جا رہا تھا۔ جس کے لئے نہ اسلحے کی ضرورت تھی نہ بھاری نفری کی۔

وہ لوگ سورج نکلنے سے کئی گھنٹے قبل شور گڑھ سے روانہ ہوئے تھے اور اب دوپہر کا سورج ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ کرنل جہاں داد کی گود میں علاقے کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ ساتھ ہی وہ کمپاس سے سمت کا بھی تعین کرتا جا رہا تھا۔ رکاوٹیں عبور کرنے کے لئے انہیں بارہا میلوں طویل چکر کاٹنے پڑے تھے مگر کرنل کو اطمینان تھا کہ وہ صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ اس دوران میں وہ دو مرتبہ طاقتور وائرلیس پر شور گڑھ چھاؤنی سے بھی رابطہ قائم کر چکا تھا۔ وہاں والے ان دونوں کی جانب سے بہت زیادہ فکر مند تھے۔

تھوڑی دیر بعد ثمر گل کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور وہ چلایا "صاحب ہم اندھیرا پھیلنے سے پہلے کوہاک میں ہوں گے، ہماری منزل قریب آ گئی ہے!"

اور ہوا بھی یہی۔ جس وقت سورج کا آتشیں گولہ تیزی سے پہاڑوں کی جانب جھکتا جا رہا تھا جیپ ایک تنگ راستے میں داخل ہوئی جس کے دونوں طرف تقریباً کھڑی ڈھلانوں والے اونچے پہاڑ ایستادہ تھے۔ اس گھاٹی میں راستہ اس قدر تنگ تھا کہ ہر لمحے جیپ کے کسی چٹان سے ٹکرا جانے کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ انجن کا تیز شور ڈھلانوں سے ٹکرا کر وادی میں دور تک مہیب گونج پیدا کر رہا تھا۔

رقص کے دوران عورت نے اپنے ہم رقص سے کہا: "میرے شوہر نے صرف بدصورت اور بدہیئت مردوں کے ساتھ رقص کی اجازت دی ہے۔"
"کتنی عجیب بات ہے۔ میری بیوی کی بھی یہی شرط ہے"

"ہم درہ ریشم میں داخل ہو چکے ہیں صاحب!" ثمر گل کی آواز فرط جذبات سے کانپ رہی تھی "کوہاک اب بمشکل تین چار میل رہ گیا ہے!"

"ہیڈ لیمپس روشن کر لو ثمر گل" کرنل نے گھاٹی میں دھندلکا پھیلتے دیکھ کر کہا حالانکہ ابھی سورج غروب ہونے میں بہت دیر تھی مگر درے میں سورج کی روشنی کا گزر نہیں تھا۔

ثمر گل نے کرنل کی ہدایت پر ہیڈ لیمپس روشن کر دیئے۔

"رک جاؤ!" اچانک داہنی جانب کی چوٹیوں سے کوئی للکارا اور آواز دیر تک درے میں گونجتی رہی۔

کرنل کے اعصاب پر تناؤ آ گیا ثمر گل جلدی سے بولا "صاحب سفید پرچم!"

کرنل نے جلدی سے جیپ کے عقبی حصہ سے سفید پرچم اٹھایا اور چوبی دستہ جیپ کے آہنی ڈھانچے میں لگے ہوئے پائپ میں پھنسا دیا۔ صلح کا نشان تیزی سے پھڑپھڑانے لگا۔ پرچم غیر معمولی حد تک بڑا رکھا گیا تھا تاکہ دور ہی سے نظر آ سکے۔

"رک جاؤ!" وہی آواز دوبارہ گونجی اور ابھی اس کی بازگشت ڈوبنے بھی نہ پائی تھی کہ درہ رائفل کے ہولناک دھماکے سے لرز اٹھا۔

ایک گولی جیپ کے بانٹ پر لگ کر اچٹ گئی۔ دوسری نے سفید پرچم میں سوراخ کر دیا۔

"خنزیر کے تخم!" ثمر گل کے منہ سے غصے میں بے اختیار نکلا اور اس نے ایک جھٹکے سے جیپ روک دی۔ انجن بیدار رہا مگر ثمر گل نے روشنیاں بجھا دیں۔ ہینڈ بریک کھینچ کر وہ پھرتی سے نیچے اترا اور اپنی ڈرائیونگ سیٹ الٹ کر اس کے نیچے سے کوئی چیز نکالی۔

پھر جوں ہی ثمر گل نے زمین پر لیٹ کر اسٹین گن کی نالی داہنی چوٹیوں کی طرف اٹھائی، کرنل جہاں داد جیپ سے نیچے کود پڑا۔

"اسٹین گن پھینک دو ثمر گل!" وہ اضطراری لہجے میں غرایا۔

ثمر گل نے کرب کے عالم میں اس کی طرف دیکھا "سفید پرچم کے باوجود ہم پر گولی چلائی گئی ہے صاحب، وہ شرارت پر تلے ہوئے ہیں!"

"ہم فائر نہیں کریں گے!" کرنل کے چہرے پر تشویش کے سائے لرزاں تھے مگر اس کا لہجہ مضبوط تھا "جیپ میں یہ اسٹین گن کہاں سے آئی؟"

"میں احتیاطاً چھپا لایا تھا!" ثمر گل کا لہجہ ندامت آمیز تھا۔

"تم نے حکم کی خلاف ورزی کی ہے ثمر گل۔ شور گڑھ پہنچ کر تمہارا کورٹ مارشل کراؤں گا!" کرنل نے اس کے ہاتھ سے اسٹین گن لیتے ہوئے کہا "ہم یہاں کسی جنگی

مہم پر نہیں آئے۔ اپنے بھائیوں سے ان کے فائدے کی بات طے کرنے آئے ہیں۔"
"مگر وہ ہم پر گولی چلا رہے ہیں صاحب۔" ثمر گل نے احتجاج کیا۔
"تم نے خود ہی کہا تھا کہ یہ لوگ فوجیوں کی عزت کرتے ہیں، ان پر کبھی ہتھیار نہیں اُٹھاتے۔" کرنل کا لہجہ تائید طلب تھا۔
"مگر... مگر..." ثمر گل ہکلا کر رہ گیا۔
"شاید اس درّے کے نگرانوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" کرنل کا لہجہ دھیما تھا۔ "نیچے اندھیرا ہونے کے سبب انہیں پتہ نہ چل سکا ہوگا کہ ہم فوجی ہیں اور سفید پرچم کے سائے میں آئے ہیں۔ دیکھ لو اب کوئی فائر نہیں ہوا۔ شاید وہ نیچے آ رہے ہیں۔ غلطی ہم ہی سے ہوئی، ہمیں پہلی للکار پر رُک جانا تھا۔"
ثمر گل نے دل ہی دل میں دُعا مانگی کہ کرنل کے اندیشے سچ ہی ہوں مگر اتنا وہ بھی جانتا تھا کہ درّے میں اتنا گہرا اندھیرا نہیں تھا کہ اوپر والے فوجی جیپ کو نہ پہچان سکیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو آنے والی گولیاں جیپ اور پرچم کا نشانہ نہ لے پاتیں۔
کرنل کی نگاہیں داہنی ڈھلانوں پر کسی اُترتے ہوئے انسانی ہیولے کی تلاش میں تھیں اور وہ وائرلیس پر شور گرد والوں کو بتا رہا تھا کہ درّۂ ریشم میں کسی غلط فہمی کے سبب اس کا سفر رُک چکا ہے مگر جلد ہی معاملہ صاف ہو جانے کی اُمید ہے۔
ثمر گل سوچ رہا تھا کہ شاید اس کی موت کوہاک والوں کے ہاتھ ہی لکھی ہوئی ہے۔ وہ بارہ سال کی عمر میں سردار کے زنداں سے نکل بھاگا تھا مگر بیس سال بعد موت کے بے رحم ہاتھ اسے کوہاک ہی کی سرزمین پر دھکیل لائے تھے۔
"جیپ رُک تو گئی ہے شمر خان!" تورسم نے پہاڑوں کے درمیان تنگ سے راستے پر نظریں جما کر کہا۔ "تمہاری دونوں گولیاں نشانے پر لگی ہیں۔"
"رُکتی ہے تو رُک جائے مگر وہ زندہ نہیں بچیں گے۔" شمر خان رائفل کا کندہ شانے سے ٹکاتے ہوئے بولا۔ "جس طرح میں نے سفید پرچم کے چیتھڑے اُڑائے ہیں، اسی طرح ان کے جسم بھی میرے نشانے پر ہیں۔"
"تو پھر قصّہ پاک کرو، اندھیرا پھیل گیا تو وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔" زنگی انتظار سے اُکتایا ہوا نظر آ رہا تھا۔
"ایسے مزا نہیں آئے گا۔" شمر خان کا لہجہ لذت آمیز تھا۔ "ذرا وہ مشتعل ہو کر دو چار فائر کر دیں پھر میں انہیں تگنی کا ناچ نچاؤں گا۔"
مگر نیچے سکوت چھایا رہا۔ وہ دونوں بار بار ڈھلانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بانٹ کے سہارے ٹِکا کھڑا تھا اور بڑے سکون سے سگریٹ پی رہا تھا۔
شمر خان نے انہیں اشتعال دلانے کے لئے مزید دو فائر کئے گولیاں پتھروں سے ٹکرا کر اُچٹ گئیں۔ ریشم تنگی دھماکوں سے لرز اُٹھا مگر جوابی فائر پھر بھی نہ ہوا۔ پل بھر کے لئے وہ دونوں جیپ کی آڑ میں غائب ہوئے پھر وہ جیپ کی دوسری جانب کھڑے نظر آئے۔
ان تینوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ان کی رائفلوں کی نالیں درّے میں رُکی ہوئی جیپ اور دونوں فوجیوں کی طرف جُھک گئیں۔
بیک وقت فائر ہوئے۔ پہاڑ ہولناک انسانی چیخوں سے لرز اُٹھے، رائفلوں کا شور وادی میں دُور تک گونجتا چلا گیا۔ پھر دوسری باڑ ماری گئی اور ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ جیپ کا عقبی حصہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔
نیچے اب کوئی آواز باقی رہی تھی نہ کوئی ہیولیٰ سرک رہا تھا۔ ہاں جیپ بُری طرح شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ گھاٹی سے چوٹیوں کی طرف لپکتے شعلوں کی تپش وہ تینوں بھی محسوس کر رہے تھے اور روشنی سے ساری ڈھلانیں جگمگا رہی تھیں۔
وہ تینوں تیزی سے واپس پلٹے۔ تھوڑی ہی دُوران کے گھوڑے موجود تھے۔ رائفلیں شانوں سے لٹکا کر وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور راسیں ڈھیلی چھوڑ کر انہیں کوہاک کی راہ پر ڈال دیا۔
جب وہ خان دوراں کے ڈیرے پر پہنچے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ اور خان مغرب کی نماز ادا کرنے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تسبیح کے دانے سرکاتا وہاں آیا تو شمر خان لپک کر اس کے قریب جا پہنچا۔
"دو فوجی ایک موٹر میں ریشم تنگی میں آ گھسے تھے، ہم نے انہیں مار دیا خان!" وہ ہیجان آمیز مگر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔
"موٹر؟" خان دوراں یہ خبر سُن کر بھونچکا رہ گیا۔ "موٹر وہاں کیسے پہنچ گئی؟"
"پتہ نہیں خان — مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ہم واپس آئے تو اس میں آگ لگی ہوئی تھی۔" شمر خان نے بتایا۔
پوری تفصیل سُن کر خان کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ "فوجیوں پر ہتھیار اُٹھا کر تم نے بہت بُرا کیا شمر خان! ہمارے لوگ فوجیوں سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔"
"تمہارا حکم تھا خان کہ ریشم تنگی میں گھسنے والے کسی اجنبی کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔"
"مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے حکم کا نشانہ بننے والے فوجی ہوں گے۔" خان دوراں پشیمان ہو رہا تھا۔ "پھر وہ تو سفید پرچم لہرا چکے تھے۔ تم انہیں زندہ پکڑ سکتے تھے۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو خان!" شمر خان رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "کیا پتہ یہ اُن کی چال رہی ہو۔ کیا پتہ کہ نیچے اُترتے ہی ہم ان کے ہاتھوں مارے جاتے۔"
وہ چاروں سر جوڑے کافی دیر مشورے کرتے رہے اور اندھیرا گہرا ہونے پر وہ تینوں ڈیرے سے گھوڑے دوڑاتے کہیں غائب ہو گئے۔ خان دوراں کافی دیر تک سر تھامے وہیں بیٹھا رہا۔ آخر اس نے سوچا کہ تیر کمان سے نکل ہی چکا ہے تو اب تن بہ تقدیر ہو کر آنے والے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس وقت اس کی ذرا سی غلطی پوری آبادی کو اس کے خلاف

مشتعل کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔

اگلی صبح کوہاک کی فضا جنگی نقارے سے گونجنے لگی۔ بستی میں ہر طرف سنسنی اور جوش کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے خان دوراں کے ڈیرے پر جمع ہونے لگے۔
جب پوری بستی وہاں جمع ہو گئی تو خان دوراں شمر خان کے ساتھ باہر آیا۔ صوفی مردان خان اور حیرت خان پہلے سے باہر موجود تھے۔
خان نے چبوترے پر آ کر سب کو سلام کیا۔ پورے مجمع نے ہم آواز ہو کر وعلیکم السّلام کہا۔ پھر خان کی نظریں بے چین چہروں کا جائزہ لینے لگیں۔
"آج آدھی رات کے وقت کوہاک کی سرزمین پر ہماری تاریخ کا ایک بدترین واقعہ پیش آیا ہے لوگو!" خان دوراں نے دل گرفتہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ہمیں ان پر ہتھیار اُٹھانے پڑے جو ہمیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ جن کی حُرمت کی پاسبانی کے لئے ہم اپنی جانیں نچھاور کرنے کو تیار رہتے ہیں۔"
وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش ہوا تو مجمع میں بے چین سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ حیرت خان اپنے باپ کے لہجے اور الفاظ پر چونک پڑا تھا اور فضا میں کسی بڑے خطرے کی بُو سُونگھ رہا تھا۔
"کیا قبلہ خان تم لوگوں میں موجود ہے؟" خان دوراں نے سوال کیا۔ مجمع میں ایک بار پھر بے چینی پھیل گئی اور چند ثانیوں بعد "نہیں" کی ایک متفقہ آواز سُنائی دی۔
"جانتے ہو وہ کہاں ہے؟ وہ نیک اور شریف انسان کہاں ہے؟" خان دوراں کی آواز پر اندوہناک رقّت طاری ہو گئی تھی۔
"نہیں۔ تم بتاتے کیوں نہیں کہ وہ کہاں ہے؟" کئی آدمی بے چین ہو کر چیخ پڑے۔
"وہ فوجیوں کے ہاتھوں بربریت اور درندگی کا شکار ہو چکا ہے۔" خان دوراں نے مجمع کی حیرت اور بے چینی کا جائزہ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میرے آدمی علاقے کی حفاظت کے لئے دن رات ریشم تنگی کی نگرانی پر مامور رہتے ہیں۔ پچھلی رات نہ جانے کس طرح دو فوجی ایک موٹر پر سفید پرچم لہراتے ریشم تنگی سے گزرے۔ میرے آدمیوں نے کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ ہم ان فوجیوں کی عزت کرتے ہیں مگر آج صبح سویرے فوجیوں کی موٹر ریشم تنگی سے واپس گزری تو ایک آدمی رسّی کے ذریعے موٹر کے پیچھے بندھا ہوا تھا اور وہ اسے سنگلاخ زمین پر گھسیٹتے نہ جانے کہاں لے جا رہے تھے۔ شمر خان نے اندازہ لگا لیا کہ بے رحمی سے پتھروں پر گھسیٹا جانے والا آدمی کوہاک ہی کا ہو سکتا ہے۔ شمر خان نے غصے میں انہیں للکارا تو انہوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ شمر خان ہمیشہ سے فوج کی عزت کرتا آیا ہے۔ ہم ان کا احترام کرتے رہے ہیں مگر انہوں نے ہمارے آدمیوں پر ہتھیار اُٹھائے تو مجبوراً شمر خان کو ان پر حملہ کرنا پڑا۔ وہ فوجی مارے گئے۔ ان کی موٹر جل کر تباہ ہو گئی۔ اور شمر خان خبر لایا ہے کہ موٹر کے پیچھے پتھروں پر گھسیٹا جانے والا شخص قبلہ خان ہے۔ وہ مر چکا ہے۔ خدا اس کی مغفرت کرے، وہ میرا بھی محسن تھا۔" خان دوراں کی آواز رُندھ گئی۔
مجمع میں سے غم، غصّے اور حیرت کی ملی جُلی چیخیں اُبھریں۔ قبلہ خان کوہاک کا مقبول ترین بوڑھا تھا۔ وہ بے لوث ہر ایک کے کام آتا تھا۔ قبیلے کی سیاست سے دُور رہتا تھا۔ ہر وقت خوش و خرم رہتا اور دوسروں کے دُکھ بانٹنے کی کوشش کرتا۔ اگر کوہاک والوں کو اپنا سردار بدلنے کا اختیار ہوتا تو وہ قبلہ خان ہی کو اس مسند پر بٹھاتے۔
پھر خان دوراں کی سربراہی میں یہ مشتعل جلوس ریشم تنگی کی طرف روانہ ہو گیا۔ لوگوں کو حیرت اس بات پر تھی کہ فوجیوں نے قبلہ خان جیسے معصوم اور بے ضرر شخص کو ایسی وحشیانہ سزا کیوں دی مگر اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔
یہ جلوس ریشم تنگی پہنچا تو بے اختیار لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ کئی آدمی بلک کر رو پڑے اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس میں نمی نہ تیر رہی ہو۔
قبلہ خان کی لاش کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے دونوں ٹخنے رسّی سے بندھے ہوئے تھے اور رسّی کا دوسرا سِرا جیپ کے اگلے بمپر سے بندھا ہوا تھا۔ کوہاک والوں نے زندگی میں کوئی موٹر نہ دیکھی تھی۔ نہ انہیں یہ معلوم تھا کہ یہ کس رُخ پر چلتی ہے۔ اگلے بمپر سے بندھی ہوئی رسّی نے کسی کے ذہن میں شبہات کو جنم نہ دیا۔ پھر پچھلی رات شمر خان نے بھی کوئی احتیاط نظر انداز نہیں کی تھی۔ وہ قبلہ خان کو گھوڑے سے باندھ کر سنگلاخ زمین پر گھسیٹتا ریشم تنگی لایا اور رسّی اگلے بمپر سے باندھنے کے بعد رسّی کے اس حصّے کو جلا ڈالا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جیپ میں آگ لگنے کے ساتھ ہی رسّی کا بندھا ہوا سِرا بھی جل گیا ہو۔
قبلہ خان کا لباس خون آلود چیتھڑوں میں بدل چکا تھا۔ جن میں سے ان کا ننگا بدن نظر آ رہا تھا۔ اس کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں، جگہ جگہ سے کھال اُدھڑنے کے بعد خون اور مٹّی میں آلودہ گوشت کے لوتھڑے نظر آ رہے تھے۔ سر کا عقبی حصہ پاش پاش ہو چکا تھا۔ چہرے پر بے شمار خراشیں تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر ہر آنکھ میں نفرت کے جہنم سُلگ اُٹھے۔
پھر وہ ماتمی جلوس ان دو لاشوں کی طرف بڑھا جو فوجی وردیوں میں جیپ سے کافی دُور پڑی ہوئی تھیں اور نفرت سے انہیں ٹھوکریں ماری جانے لگیں۔ فضا میں بُزدلی، درندگی اور بہیمیت کے زہر آلود طعنے گونج رہے تھے۔
"لاشوں کی بے حُرمتی نہ کرو۔" کامیاب سازش کے باوجود یہ منظر دیکھ کر خان دوراں کانپ اُٹھا۔ "مُردوں کی بے حُرمتی ہمارے مسلک میں ناروا ہے۔"
"ہم ان ظالموں کی لاشیں جلا کر خاک کر دیں گے۔" ایک نوجوان چیخا۔
خان دوراں دونوں ہاتھ پھیلا کر لاشوں کے سامنے آ گیا۔ "اب کسی نے ان لاشوں پر تھوکا یا ان پر ٹھوکر ماری تو میں اس کی گردن مروڑ

دول گا۔ لاش سے دوستی اور دشمنی کے حساب چکانا بزدلی ہے۔ یہ نامردوں کا شیوہ ہے۔ لاش صرف لاش ہوتی ہے جس کا احترام کرنا چاہیئے۔" ضمیر کی خلش خان دوراں کو حد سے بڑھتے ہوئے ظلم کے سامنے ڈھال بننے پر مجبور کررہی تھی اور مجمع میں کئی سمجھدار لوگوں نے خان دوراں کی تائید کی۔ ان کا سردار کس قدر عظیم انسان تھا کہ دشمن کی لاش کی بھی حفاظت کررہا تھا۔

پھر وہ تینوں لاشیں چادروں پر اُٹھالی گئیں اور یہ ماتمی جلوس واپس کی طرف روانہ ہوگیا۔

شمر خان دل ہی دل میں اپنی مکارانہ سازش پر بہت خوش تھا۔ دقتی مصلحت کے تحت اس نے ان فوجیوں کو مار تو دیا تھا مگر یہ جانتا تھا کہ اگر بستی والوں کے سامنے ان فوجیوں پر حملے کا کوئی جواز پیش نہ کیا گیا تو وہ سب اس کے ٹکڑے اُڑا دیں گے اور شاید خان دوراں بھی اقتدار سے محروم کردیا جائے۔ کیونکہ صرف کوہاک ہی نہیں، ہر قبیلے والے فوجیوں سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی فوجی قافلہ کہیں جانکلتا قبائلی ان کی راہوں میں آنکھیں بچھاتے تھے۔

مگر شمر خان کی سازش نے نہ صرف اسے عتاب سے بچالیا تھا بلکہ فوجیوں کی جانب سے کوہاک والوں کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکا دی تھی۔

جوں ہی یہ جلوس بستی میں پہنچا، قبیلہ خان کی سفاکانہ موت کی خبر آگ کی طرح بستی میں پھیل گئی اور ہر گھر سے عورتوں کے گریہ و بین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عورتیں کلکلا کلکلا کر ان فوجیوں کو کوس رہی تھیں جو محافظ کے رُوپ میں قاتل اور بھیڑیئے ثابت ہوئے تھے۔

فضا میں ایک بار پھر کشیدگی چھانے لگی اور نوجوانوں کے ایک جتھے نے قبیلہ خان کی لاش کو چھو کر قسم کھائی کہ جب تک وہ فوجیوں سے قبیلہ خان کے لرزہ خیز قتل کا انتقام نہ لے لیں، چین سے نہ بیٹھیں گے۔

جب کرنل جہان داد کے آخری پیغام کو بیس گھنٹے گزر گئے تو شورگر چھاؤنی میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

کرنل جہاں داد سے رابطہ قائم کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تو فوری طور پر ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایک امدادی پارٹی روانہ کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

شورگر میں عام خیال یہی پایا جارہا تھا کہ ریشم تنگی میں پیدا ہوجانے والی غلط فہمی فریقین کے درمیان نزاع کا باعث بن گئی اور شاید کرنل کو قید کیا جاچکا ہے۔ وہاں کسی کو وہم بھی نہ تھا کہ درۂ ریشم میں کرنل جہانداد اپنے لہو سے صبر، شجاعت اور رواداری کی ایک درخشاں کہانی کو جنم دے چکا ہے۔ اسلحہ اُٹھانے پر اپنے ڈرائیور کو کورٹ مارشل کی دھمکی دینے والا دشمن کے اسلحے کا شکار ہوچکا ہے۔

ہیلی کاپٹر زمین سے بہت کم بلندی پر پرواز کرتا آگے بڑھا جارہا تھا۔ آخرات کے اندھیرے میں سرچ لائٹ روشن کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

تھوڑی دیر بعد ہیلی کاپٹر درۂ ریشم پر پرواز کررہا تھا۔ دو بلند پہاڑوں کی کھڑی ڈھلانوں سے گھرا ہوا وہ چند فٹ چوڑا راستہ بل کھاتا چلا گیا تھا۔

درۂ ریشم پر پرواز کے چند ہی منٹ بعد جیپ کا جلا ہوا ڈھانچہ نظر آگیا۔ یہ منظر ان لوگوں کے لئے غیر متوقع اور ذہنی صدمے کا باعث ثابت ہوا۔

فوری طور پر شورگر چھاؤنی کو اس دریافت سے باخبر کردیا گیا۔ وہاں سے حکم ملا کہ اُترنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ نیچی پرواز کے ذریعے جیپ کے قرب و جوار کا جائزہ لے کر فوری واپسی اختیار کی جائے۔ شورگر والوں کی دانست میں حالات سنگین ہوچکے تھے۔

ریشم تنگی پر جوں ہی ہیلی کاپٹر کی گونج سُنائی دی، ان تینوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ جہاں موجود تھے اس جگہ ہیلی کاپٹر سے پھینکی جانے والی تیز روشنی سے بچنا محال تھا۔

انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی جہاز کو قریب سے نہ دیکھا تھا۔ تورسم کی خواہش تھی کہ کہیں چھپ کر وہ جہاز دیکھیں لیکن شمر خان نے ایک نہ مانی۔

اس کی دانست میں ہر فوجی جہاز بمبار ہوتا تھا جس کے ذریعے ان کے جیتھڑے اُڑائے جاسکتے تھے۔ وہ ان دونوں کو لے کر نہایت بدحواسی کے عالم میں کوہاک کی طرف روانہ ہوگیا۔

بستی میں خان دوراں ڈیرے کے باہر کچھ لوگوں میں گھرا ہوا تھا، ان سب کی نگاہیں ریشم تنگی کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

انہیں دیکھتے ہی خان دوراں ان کی طرف لپکا۔ "ریشم تنگی سے گڑگڑاہٹ کیسی سُنائی دے رہی ہے۔ کبھی کبھی روشنی بھی ہوجاتی ہے؟"

"ریشم تنگی پر بمبار جہاز اُڑ رہے ہیں خان!" شمر خان ہانپتے ہوئے بولا۔ "اگر ہم یونہی بیٹھے رہے تو وہ کوہاک کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔"

اس خبر نے سب کو بدحواس کردیا۔

اسی وقت ریشم تنگی کے پہاڑوں کے اوپر روشنی دکھائی دی پھر گڑگڑاہٹ قریب آنے لگی۔ وہ سب خوفزدہ ہوکر خان کے ڈیرے میں گھس گئے۔

چند ثانیوں تک وہ آواز قریب آتی رہی پھر دُور ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی۔ شاید وہ جہاز ریشم تنگی کے قرب و جوار کا چکر کاٹ کر واپس جاچکا تھا۔

یہ صورتِ حال خان دوراں کے لئے بہت تشویشناک تھی۔ اس نے کوہاک میں اعلان کرادیا کہ سب لوگ اپنا سامان سمیٹ کر کوچ کے لئے تیار ہوجائیں۔ کوہاک کی فضاؤں پر موت منڈلا رہی ہے اور جلد یا بدیر وہاں بمبار جہازوں کے حملے کا خطرہ ہے۔

ساتھ ہی اس نے تورسم خان کو نہایت رازدارانہ طریقے پر خفیہ پیغام دے کر سردار علی جان کے قبیلے کی طرف روانہ کردیا۔

کوہاک والوں نے وہ رات خوف اور ہیجان کے عالم میں کوچ کی تیاریاں کرتے بسر کی۔ انہیں کسی بھی لمحے بمبار طیاروں کی یورش کا خطرہ لگا ہوا تھا مگر ایک خاص بات یہ تھی کہ دو فوجیوں کے قتل پر ان میں سے کوئی بھی نادم نہیں تھا۔ ان کی دانست میں قبیلہ خان کو بربریت کا نشانہ بنانے والے اس سے بھی بُرے انجام کے مستحق تھے اور اگر اب ان کی بستی پر خطرات منڈلا رہے تھے تو یہ ان کا نوشتۂ تقدیر تھا جو کسی طرح نہ ٹل سکتا تھا۔

اگلی صبح تورسم خان واپس آیا تو سردار علی جان کے بے پناہ تعریفی کلمات ساتھ لایا۔ خان دوراں نے فوج کی عزت ختم کرکے ایسا کارنامہ انجام دیا تھا جس کی مثال ملنی مشکل تھی۔ اس نے پیغام بھیجا تھا کہ خان دوراں اپنے قاصد بھیج کر آس پاس کے سارے قبائل کو اس ہولناک صورتحال سے آگاہ کردے تاکہ وہ بے خبری میں بمبار جہازوں کا نشانہ نہ بن جائیں۔ سردار علی جان نے اسے تنبیہ کی تھی کہ اب کوہاک والوں کی کھلی جنگ شروع ہوچکی ہے۔ وہ فوجی افسروں کی کسی چال میں پھنس گئے تو ان کی نسلیں انہیں معاف نہ کریں گی۔

خان دوراں نے فوری طور پر آس پاس کے قبیلوں میں اپنے ایلچی دوڑا دیئے۔ دوست اور دشمن کی تمیز مِٹ چکی تھی۔ اب سارے قبائل کے مشترکہ مفاد کا معاملہ درپیش تھا۔ کم از کم عام لوگوں کو یہی معلوم تھا کہ فوج نامعلوم مقاصد کی خاطر ان سے تصادم پر تُل گئی ہے۔

اور خان دوراں دل ہی دل میں سردار علی جان کی پیش بینی کی داد دے رہا تھا۔ اس نے کئی ہفتے قبل انہیں اپنے اندیشوں سے آگاہ کردیا تھا

"یہ کوہاک میں کیا ہورہا ہے بابا؟" اسے تنہا پاتے ہی حیرت خان نے آلیا۔ وہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پر سخت پریشان اور متوحش تھا۔

"کیا تو علی جان کی باتیں بھول گیا؟" خان دوراں اس کا شانہ دبا کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "شاید یہاں سڑک بنانے کا کام فوج کو سونپا گیا ہے اور اب وہ ہمیں دبانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔"

"کیا وہ دونوں واقعی قبیلہ خان کو کھینچتے لے جارہے تھے؟" حیرت خان کا لہجہ اشتباہ آمیز تھا اور وہ براہِ راست خان دوراں کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، ہاں — تو کیا شمر خان جھوٹا ہے؟" خان دوراں جھلا گیا۔

"شمر خان کی گھوڑی کی ایک پچھلی ٹانگ سُم سے اوپر بُری طرح زخمی ہے بابا!" حیرت خان نے معنی خیز سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"سُور کا بچہ!" خان دوراں نے اچانک اس پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ "اگر آئندہ بکواس کی تو زبان کھینچ لُوں گا۔"

حیرت خان اپنا سُرخ گال سہلاتے ہوئے کرب آمیز انداز میں مُسکرا دیا اور خلافِ معمول وہاں سے جانے کے بجائے بولا۔ "انہیں وہاں رُکنے کی کیا ضرورت تھی بابا! پتہ نہیں وہ کس لئے ادھر آرہے تھے، پھر قبیلہ خان جیسے معصوم آدمی کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟"

"اگر یہ باتیں تُو نے دوبارہ زبان سے نکالیں تو گولی ماردوں گا۔" خان دوراں اسے جھنجوڑتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "میرے خلاف شبہات پھیلا کر ابھی سے سردار بننے کے خواب دیکھ رہا ہے؟"

"میں تمہارا بیٹا ہوں بابا — دشمن نہیں۔" وہ سر جھکا کر بولا۔ "اگر فوجی آستے ہیں تو آنے دو نا انہیں۔ ہمیں معلوم تو ہو کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔"

"سردار علی جان سب کچھ بتا چکا ہے۔" خان دوراں غرایا۔ "وہ سڑک بنانے کی اجازت مانگیں گے اور ہم نے انکار کیا تو طاقت کے بل پر من مانی کرنے کی کوشش کریں گے۔ کوہاک والوں کو گھروں میں محصور کرکے وہ ایک کیا دس سڑکیں بنا سکتے ہیں مگر اب ہم جوہے دان میں نہیں پھنس سکتے۔ ہم پہاڑوں سے ان کا مقابلہ کریں گے۔ پھر وہ ابھی کہاں رہے ہیں، بمبار جہاز اُڑا کر ہمیں اپنی طاقت سے ڈرا رہے ہیں۔"

"پھر تم پہاڑوں پر چلے جانا۔ میں یہیں رُک کر ان کا انتظار کروں گا۔ میں ان کی زبان سے سُننا چاہتا ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ میں ان کے ہاتھوں مارا گیا تو تم صبر کرلینا۔ اور ان کی بات معقول معلوم ہوئی تو میں ان کا پیغام لے کر تم سے ملنے پہاڑوں میں آؤں گا۔"

"کوہاک کا بچہ بچہ میرے ساتھ چلے گا۔" خان دوراں کا لہجہ اٹل تھا۔ "تو چاہتا ہے کہ وہ تجھے یرغمال بنا کر مجھے مجبور کرسکیں۔ کان کھول کر سُن لے کہ میں اولاد کی خاطر غداری کا طعنہ نہیں سنوں گا۔"

"تو پھر جانے سے پہلے مجھے گولی ہی ماردینا۔" حیرت خان میں نہ جانے کہاں سے ہمت آگئی تھی۔ "میں زندہ رہوں گا تو کوہاک میں اور مروں گا تو کوہاک کی زمین پر۔"

خان دوراں چند ثانیوں تک خالی الذہنی کے عالم میں اسے گھورتا رہا۔ پھر سر جھکا کر وہاں سے اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔

جلی ہوئی جیپ کی دریافت شورگر میں سخت تشویش کا باعث بن گئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہاں تصادم ہوا تھا اور اگر تصادم ہوا ہی تھا تو انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ یکطرفہ رہا ہوگا۔ کیونکہ کرنل جہانداد شورگر سے بالکل غیر مسلح روانہ ہوا تھا۔

حالات بتا رہے تھے کہ کرنل جہان داد نے رضاکارانہ طور پر ہتھیار نہیں ڈالے ہوں گے۔ اگر ایسا ہی ہوا ہوتا تو کرنل جہاں داد اور ثمر کو گرفتار کرنے کے علاوہ وہ لوگ جیپ جیسے محیر العقول عجوبے کو بھی صحیح سلامت لے جاتے۔ دوسری طرف یہ بات بھی عجیب تھی کہ کرنل نے کس طرح ان کا مقابلہ کیا ہوگا۔ جلی ہوئی جیپ پر گولیوں کے کئی نشانات تھے۔ دو نہتے آدمیوں پر ایسی وحشیانہ فائرنگ کوئی دیوانہ ہی کرسکتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ کرنل کو گفتگو کا موقع دیئے بغیر ہی ناگہانی حملہ کیا گیا ہوگا۔ پھر دشمن کی

فائرنگ سے پٹرول سے بھرے جیری کین جل اُٹھے یا یہ بھی ممکن تھا کہ فرار کی راہ اختیار کرنے سے پہلے کرنل نے خود ہی جیپ کو آگ لگادی ہو۔ دونوں صورتوں میں ان کی قسمت نامعلوم تھی۔ وہ مارے گئے یا پہاڑوں میں فرار ہو گئے اور یہ معمہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کوہاک والوں سے بات نہ کی جائے کیونکہ حملہ آور ان میں سے تھے یا ان کی مدد سے آئے تھے کیونکہ عملاً وہ درّہ کوہاک والوں کی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔

عام حالات میں قبائلی فوجیوں کا ہمیشہ احترام کرتے آئے تھے۔ اگر انہوں نے کرنل پر ہتھیار اُٹھائے تھے تو یقینی طور پر وہ بجید مشتعل تھے اور ادھر جانے والی کسی بھی فوجی جماعت کو نہ بخشتے۔

کرنل کے زندہ سلامت فرار کی اُمید پر کئی امدادی پارٹیاں پہاڑی علاقوں میں بھیجی گئیں۔ ایک ہیلی کاپٹر صرف اس مقصد سے روانہ کیا گیا کہ اس راستے کا سُراغ لگائے جس کے ذریعے ثمر گل حیرتناک طریقے پر جیپ ریشم تنگی تک لے گیا تھا۔ اگر ایسا کوئی بھی راستہ دریافت ہو جاتا تو ایک مضبوط جماعت اس طرف روانہ کی جا سکتی تھی۔

مزید چھتیس گھنٹے گزر گئے۔ ہر جماعت واپس لوٹ آئی۔ کرنل اور ثمر گل کا کہیں سُراغ نہ مل سکا۔ ریشم تنگی سے میلوں دُور کا علاقہ چھان ڈالا گیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے۔ ریشم تنگی تک کا راستہ بھی دریافت نہ ہو سکا۔ چند میل بعد ہر راستہ کسی ہولناک گھاٹی پر ختم ہوتا تھا یا ٹنوں وزنی چٹانیں راستہ مسدود کر دیتی تھیں۔

آخرکار جنرل ہیڈکوارٹر کو پوری صورتحال کی تفصیلی اطلاع دے دی گئی۔

وہاں سے طویل غور و خوض کے بعد احکام آگئے۔ شور گڑھ چھاؤنی کے بیس مسلح جوانوں کو درّۂ ریشم کے دونوں طرف کھڑی ہوئی پہاڑیوں پر اُتار کر اس راستے پر قبضہ کرنا تھا۔ اسی کے ساتھ دو سو جوانوں پر مشتمل نفری ٹرکوں کے ذریعے روانہ کی جانی تھی۔ انجینئرنگ کا ایک دستہ اس جماعت کا ہراول ہوتا تاکہ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دُور کر کے راستہ قابلِ گزر بنایا جا سکے۔ درّہ ریشم پر مامور جماعت کو صرف اس بات پر نظر رکھنی تھی کہ کوئی بڑا مسلح گروہ درّے کی ناکہ بندی کر کے آنے والوں کو نہ گھیر سکے۔ جب یہ دونوں جماعتیں مل جاتیں تو بریگیڈیئر علی نواز کو خان دوراں سے تنہا مذاکرات کرنے تھے۔ مذاکرات میں پہلا نکتہ کرنل جہاں داد اور ثمر گل کی بازیابی سے متعلق تھا۔ اگر وہ مارے بھی جا چکے تھے تو قبائلیوں سے ان کی لاشیں حاصل کرنی تھیں۔ دوسرا نکتہ سڑک کی تعمیر کی اجازت پر مشتمل تھا۔

سارے احکام میں شدید الفاظ میں طاقت کے استعمال کی ممانعت کی گئی تھی۔ فوجیوں کو آبادی سے دُور اور غیر جانبدار رہنے کا حکم دیا گیا تھا اور ہر حال میں خان دوراں کے آخری فیصلے کو مان لینا تھا۔ دستوں کی درّۂ ریشم میں موجودگی کو محض نفسیاتی دباؤ کے لئے استعمال کرنا مقصود تھا تاکہ کوہاک جانے والوں کی جانوں کو خطرہ نہ رہے۔ ورنہ فوج کے نامعلوم دشمن کسی بھی جماعت کو گھیر کر ختم کر سکتے تھے۔

ان احکام کے بعد ایک بار پھر ایک ہیلی کاپٹر درّۂ ریشم کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ سفر کے لئے عارضی پُلوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکے ساتھ ہی راستے کی رکاوٹیں اُڑانے کے لئے بارود بھی ضروری تھا۔

ان احکام سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جنرل ہیڈکوارٹر کو کرنل جہان داد اور ثمر گل کی زندہ یا مُردہ بازیابی سے دلچسپی ہے۔ اگر خان دوراں سڑک کے معاملے میں نرمی برتنے پر آمادہ نہ ہوا تو یہ کام شہری حکام کو لوٹا دیا جائے گا۔

سارا دن کوہاک اور گرد و نواح کا علاقہ ہیلی کاپٹروں کے شور سے گونجتا رہا۔ خان دوراں کی پھیلائی ہوئی نفرت کے نتیجے میں ساری آبادی جوشِ انتقام سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ کوہاک پر بمباری سے قبل ساری آبادی پہاڑوں میں پناہ لے لے۔

آخر خان دوراں نے بیس جوشیلے اور مضبوط جوانوں کو اپنے اسلحہ خانے سے اسٹین گنیں دے کر شمر خان کی سربراہی میں ریشم تنگی کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ انہیں حکم تھا کہ وہاں جو بھی ذی رُوح نظر آئے اسے بیدریغ چھلنی کر دیں۔

پھر شام کے دھندلکے میں مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل کارواں نے کوہاک کو خیرباد کہہ دیا۔ ہر شخص اس ہجرت پر دل گرفتہ اور آداس تھا۔ ڈیڑھ ہزار سے زائد نفوس پر مشتمل کارواں پر موت کا سا کربناک سکوت چھایا ہوا تھا۔ بچوں کے رونے کی آوازوں اور قدموں کی چاپ کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ کچھ سوچ رہا تھا۔

انہوں نے وہ زمین چھوڑ دی تھی جسے انہوں نے خان دوراں کے لئے ہی سہی، مگر اپنے ہاتھوں سے گلزار بنایا ہوا تھا۔ وہ گھر جہاں وہ صدیوں سے نسل در نسل رہتے اور پروان چڑھتے آئے تھے، ویران پڑے ہوئے تھے گھروں کے دروازے وا تھے مگر مکین پہاڑوں پر جا رہے تھے۔

اس روانگی سے چند گھنٹے قبل بستی والوں نے پہلی بار خان دوراں کا اسلحہ خانہ دیکھا اور حیرت سے ان کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ خودکار رائفلیں، اسٹین گنیں، ہلکی مشین گنیں، دستی بم، آگ لگانے والے چھوٹے بم — ہر چیز وہاں موجود تھی۔ کارواں کے ہر شخص کو بھرپور طریقے پر مسلح کرنے کے بعد اسلحے کی باقی ماندہ چوبی اور آہنی پیٹیاں خچروں پر بار کر دی گئیں اور رات کے اندھیرے میں وہ اپنے ہی گھروں سے چوروں کی طرح قطار در قطار نکل پڑے۔ اس وقت بہت سی آنکھیں اشکبار تھیں۔ بہتیرے دل مچل رہے تھے کہ اپنے گھروں میں رہیں اور اگر وقت آ ہی جائے تو اس کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دیں۔

مگر کوئی وہاں نہیں رُک سکا۔ خان دوراں رائفل لئے اس وقت تک بستی میں رُکا رہا جب تک اسے یقین نہ ہو گیا کہ میر افضل خان کی رہنمائی میں ہر شخص جا چکا ہے۔ پھر اس نے اپنے سفید گھوڑے کی پُشت پر سوار ہو کر

بستی کا ایک طوفانی چکر لگایا مگر اب وہاں آوازوں کا رنگیلا آہنگ دم توڑ چکا تھا۔ ویران مکانوں کی کھڑکیوں، دروازوں سے گزرنے والی تیز ہواؤں کا آسیبی شور تھا یا گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک تال۔

خان دوراں نے صورتحال سے مطمئن ہو کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جلوس کے پہلو سے گزرتا چند ہی لمحوں میں میر افضل سے جا ملا۔

"سب آ چکے خان؟" میر افضل نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔

"ہاں — وہ آئیں گے تو انہیں وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ کوہاک ویران ہو چکا ہے۔" خان دوراں کا لہجہ فاتحانہ مسرت سے سرشار تھا۔

"نقدی، اسلحہ، لباس، کھانے پینے کی اجناس، سب کچھ ہی تو ہم نے ساتھ لے لیا ہے۔" میر افضل خان بڑبڑایا۔ "وہاں آوارہ کتوں اور بلیوں کے سوا رہ گیا ہے۔ وہ بھی چند روز کی مہمان ہیں، پتھر چبا کر تو وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"تم اداس ہو میر افضل؟" خان دوراں نے چونک کر اندھیرے میں اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"پچھلے ہی برس میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر میں دو نئے کمروں کا اضافہ کیا تھا خان۔" میر افضل بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "میری بہو سات مہینے کی حاملہ ہے۔ اسے گھر پر آرام کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں تو کوئی پاگل ہی خوش ہو سکتا ہے۔ میں نے تمہارے حکم کے سامنے سر جھکا لیا ہے۔"

"پریشان نہ ہو میر افضل!" خان دوراں نے اسے دلاسہ دیا۔ "ہم بہت جلد اپنے گھروں کو واپس ہوں گے۔ آزادی اور آبرو کے لئے بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔"

"حیرت خان نظر نہیں آیا۔" اچانک صوفی مردان خان نے کہا۔

"اسے میں نے زبردستی سردار علی جان کے پاس بھجوا دیا۔" خان دوراں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔ "وہ جوشیلا لڑکا ہے، اسے پکڑ کر وہ یرغمال بنا سکتے تھے۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔" صوفی مردان خان رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "جب سے یہ قصہ اُٹھا ہے وہ تم سے بپھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔"

ابھی وہ کوہاک سے تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ ریشم تنگی کے پہاڑوں پر وہی جانا پہچانا بھیانک سا شور سنائی دیا۔ عورتیں سہم گئیں، مردوں کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھنے لگیں۔ ہر ایک ہراساں ہو گیا تھا۔

چند لمحوں بعد اس جانب سے رائفلوں کا گونجیلا شور سنائی دیا۔ بچے ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹ کر رونے لگے۔ لوگوں کی رفتار یک بیک تیز ہو گئی۔ ناہموار پتھریلی زمین پر گرتے پڑتے وہ تیزی سے پہاڑی سلسلوں کی طرف بڑھنے لگے جہاں بے شمار غار اور کھاٹیاں ان کا مسکن بننے والی تھیں۔

رائفلوں کا شور ختم ہونے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد انہیں کسی جانب سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں اور کارواں میں افراتفری پھیل گئی۔ بہت سی عورتیں خوفزدہ ہو کر رونے لگیں۔ خان دوراں کے حکم پر وہ سب رُک گئے اور حیرت انگیز تیزی کے ساتھ مسلح مردوں نے عورتوں اور بچوں کو اپنے نرغے میں لے لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہانپتے ہوئے گھوڑے قریب آ گئے اور اُٹھی ہوئی رائفلوں کے دہانے نیچے جھک گئے۔ وہ کوہاک کے وہ نوجوان تھے جنہیں ریشم تنگی کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔

"ریشم تنگی پر جہازوں سے آدمی اُتر گئے۔ ہم نے دو کو مار ڈالا۔" ان میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے، خان دوراں کو بتایا۔

"تم میں سے ایک آدمی کہاں ہے؟" خان دوراں نے تاریکی میں ان کے ہیولوں کی تعداد گنتے ہوئے سوال کیا۔

"جمال خان راستے میں گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔" اس مرتبہ شمر خان آگے بڑھ آیا۔ "ہم نے اسی جگہ اس کی قبر بھی بنا دی، وہ نہ مرتا تو ہم بہت پہلے آ گئے ہوتے۔"

"خدا اس کی مغفرت کرے۔" خان دوراں بڑبڑایا پھر پوچھا۔ "تم وہاں سے بھاگ کیوں آئے؟"

"وہ عجیب جادوئی جہاز تھا خان۔" شمر خان بولا۔ "وہ ایک پہاڑی سے اوپر فضا میں ایک ہی جگہ معلق ہو گیا۔ پھر اس میں سے ایک رسّی کی سیڑھی نیچے لٹکائی گئی اور مسلح آدمی نیچے اُترنے لگے۔ ہم نے گولیاں چلا کر دو کو مار دیا۔ اسی وقت جہاز سے کسی نے پوری قوت سے چیخ کر کہا کہ ہم باز آ جائیں ورنہ بھون ڈالے جائیں گے۔ رسّی کے ساتھ جہاز ان ٹیلوں کی طرف آیا جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ اور ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔ اگر ہم وہیں رُکے رہتے تو بے موت مارے جاتے۔" شمر خان بہت زیادہ خائف نظر آ رہا تھا۔

"انہوں نے دو آدمی مرنے کے باوجود تم پر گولی نہیں چلائی؟" خان دوراں نے حیرت سے پوچھا۔

"شاید وہ ہمیں دیکھ نہیں سکے۔" شمر خان بولا۔ "دیکھ لیتے تو ہم زندہ نہ بچ پاتے۔"

جمال خان کی موت کی خبر سب نے صبر سے سُنی۔ اس جواں مرگ کا صدمہ ہر ایک کو تھا مگر یہ وقت رونے پیٹنے کا نہ تھا۔ اس لڑکے کی ماں بلک کر رو پڑی تھی مگر اس کا شوہر اپنے سینے پر صبر کی سِل رکھے اسے تسلی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کارواں پہاڑوں کی مہیب بھول بھلیوں میں داخل ہوا۔ ریشم تنگی سے فرار ہونے والے بھی ان کے ہمراہ تھے۔

زرغنگی سے اور تورسم اسے لیکر وہاں پہنچے تو سردار علی جان نے حیرت خان کو دیکھ کر قہقہہ مارا۔ "تم آ گئے لڑکے! چلو اچھا ہوا۔ اب کل تم میرے ساتھ شہر چلو گے۔"

تورسم نے تنہائی میں سردار علی جان سے کچھ رازدارانہ باتیں کیں

اور دونوں واپس لوٹ گئے۔ اب حیرت خان کے سامنے صرف سردار علی جان رہ گیا تھا۔

"کیا خان نے تمہیں زبردستی یہاں بھیجا ہے؟" علی جان نے بیش قیمت خوشبودار سگار سلگاتے ہوئے حیرت خان سے پوچھا۔

"جب مرضی نہ ہو تو زبردستی ہی سمجھو۔ میں نے اپنی مرضی کے خلاف بابا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔" حیرت خان لاپروایانہ لہجے میں بولا۔

"کچھ عرصے کے لئے تم کوہاک اور خان دوراں کو بھول جاؤ۔" سردار علی جان نرم لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں تربیت دے کر علاقے کا سب سے طاقتور سردار بنا دوں گا۔"

"پہاڑوں میں چھپ کر خون کی ہولی کھیلنے سے بہتر ہے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔" حیرت خان تلخ لہجے میں بولا۔ "تمہارے مشورے خونریز ہوتے ہیں چاچا۔"

"تاریخ دوات سے نہیں، انسانی خون سے لکھی جاتی ہے بیٹے!" علی جان سگار کا کش لیتے ہوئے بولا۔ "موجودہ وقت کے دھارے کو پہچان لیتے ہیں وہی زندہ رہتے ہیں ورنہ جیتے جی مُردوں سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ جس دن ان علاقوں میں سرداری ختم کی گئی، یہاں نحوست راج کرے گی۔"

"مگر اس روز جرگے میں تمام سردار ذاتی مفاد کی بات کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو اپنے قبیلے والوں سے ہمدردی نہ ہو۔"

"غریبی اور امیری مقدر کے کھیل ہیں۔ اس فرق کو دُور کرنے کا دعویٰ کرنے والے قدرت سے لڑ رہے ہیں اور تم اپنے لوگوں کو نہیں پہچانتے۔ انہیں صرف ہوس ہے۔ کھانا وہ کھاتے ہیں، ننگے بھی نہیں گھومتے، رہنے کو مکانات ملے ہوئے ہیں۔ اگر تم ان سے مشقت لئے بغیر انہیں پیسہ سونپ دو تو یہ حرام خور ہو جائیں گے، کام سے جی چرانے لگیں گے اور ان کی للچائی ہوئی نظریں ہر وقت سردار کی تجوری پر رہیں گی۔ سرداروں کے خوف سے یہ کام بھی کر لیتے ہیں، سرداری نہ رہی تو یہ کام چھوڑ دیں گے۔ پہلے قبیلے قحط اور بربادی کا شکار ہوں گے پھر ملک بھی نہ بچ سکے گا۔"

حیرت خان کو علی جان کی یہ دلیل کمزور محسوس ہوئی مگر وہ اَن پڑھ تھا اس میں بحث کی صلاحیت نہیں تھی، خاموش بیٹھا علی جان کا چہرہ تکتا رہا۔

اگلا دن حیرت خان کے لئے بے پناہ خوشی کا دن تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایسی جگمگاتی ہوئی شاندار موٹر دیکھی۔ جھلسا ہوا ڈھانچہ تو وہ دو روز پہلے ہی ریشم تنگی میں دیکھ چکا تھا۔

لمبی سی سیاہ موٹر گیراج سے نکالی گئی اور علی جان اسے ساتھ لیکر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کار کی آرام دہ اور نرم نشست پر بیٹھ کر حیرت خان خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس کے دل میں علی جان کے لئے ہمدردی اور لگاؤ کی ہلکی سی لہر زور مارنے لگی۔

شہر پہنچ کر تو حیرت خان کی حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔ اُونچے اُونچے مکانات، پختہ اور سیاہ سڑکیں، مصروف زندگی ـــ یہ سب چیزیں اس کے لئے نئی تھیں۔ اسے اچانک ہی اپنی بے مائگی کا احساس ہونے لگا۔ کوہاک میں رہ کر وہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر کوہاک کے لئے سڑک بن گئی ہوتی تو وہاں والے بھی یہ ساری چیزیں دیکھ سکتے تھے۔

شہر میں علی جان کا مکان بہت وسیع و عریض تھا جہاں اس کی بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی تھی۔ حیرت خان نے اس کی لڑکی کو دیکھا تو اس کا منہ یوں حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا جیسے وہ کھڑے کھڑے بے ہوش ہو گیا ہو۔

"یہ میری بیٹی کوثر جان ہے اور یہ میری بیوی۔" سردار علی جان کی آواز سن کر حیرت خان چونک پڑا۔ "اور یہ کوہاک کے سردار کا اکلوتا بیٹا حیرت خان ہے۔"

"شاید پہلی بار شہر آیا ہے۔" کوثر نے معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکا کر رائے ظاہر کی۔

"کیا تم یقین کر سکتی ہو کہ اس نے آج پہلی بار کار دیکھی ہے۔" علی جان ہنس کر بولا۔

"نہیں۔" کوثر کا لہجہ حیرت اور بے یقینی کا مظہر تھا۔

"ہاں۔ اور اب میں اسے یہاں سے ایک مختلف انسان بنا کر کوہاک بھیجوں گا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرنا ہے۔"

"یہ سب مجھ پر چھوڑ دو ڈیڈی!" کوثر جان ایک ادا کے ساتھ بولی۔ "تم ویسے ہی بہت مصروف رہتے ہو، میں اسے بدل کر رکھ دوں گی۔"

علی جان اس تجویز پر مسکرا کر رہ گیا۔

اس رات حیرت خان نرم اور آرام دہ مسہری پر لیٹا تو کوثر کا حسین اور شگفتہ سراپا اس کی نظروں میں ناچنے لگا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا دلآویز چہرہ اور ایسا گداز بدن نہیں دیکھا تھا۔ کوہاک میں لڑکیوں تو دُور کی بات ہے، عورتیں تک ایسا بھرپور پردہ کرتی تھیں کہ نامحرم کے لئے ان کے جسم یا چہرے کا کوئی حصہ دیکھنا محال تھا۔

اگلے روز علی جان صبح سویرے کہیں چلا گیا اور ناشتے کے بعد ہی کوثر جان اس کے پاس آگئی اور اس کے شکن آلود لباس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ارے، رات تم یہی لباس پہن کر سوئے تھے؟"

"ہاں۔ میرے صندوق کی چابی کھو گئی ہے۔"

"سلیپنگ سوٹ ہے تمہارے پاس، میرا مطلب ہے سونے والا لباس؟" حیرت خان کے چہرے پر اُلجھن کے آثار دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں۔" اس نے سادگی سے اقرار کیا۔

"وہ میں تمہیں دلوا دوں گی۔ اب تمہاری پڑھائی شروع ہو گی۔" کوثر نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس کے پورے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"نامحرم عورتوں سے ڈر لگتا ہے؟" کوثر نے کھلکھلا کر اس کی بوکھلاہٹ پر طنز کیا۔

"مجھے پڑھانے سے پہلے تم اپنا لباس بدل لو۔" حیرت خان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ، میرے لباس میں کیا خرابی ہے؟ یہ اعتراض تو مجھے کرنا چاہیئے تھا تم پر۔" وہ تنک کر بولی۔

"گریبان میں سے تمہاری چھاتیاں نظر آتی ہیں، میں پڑھ نہ سکوں گا۔" حیرت خان نے ٹھوکر سے قالین کو کریدتے ہوئے صاف اور سادہ الفاظ میں اپنے اعتراض کی وضاحت کی۔

کوثر جان دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے وہاں سے بھاگ گئی۔ ایک اَن پڑھ خان زادے نے پہلے ہی وار میں اسے چت کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو بند گریبان والی قمیص میں تھی۔ بیل باٹم کے بجائے شلوار پہنے تھی اور سر پر دوپٹہ نظر آ رہا تھا۔ شاید چہرے سے میک اَپ بھی صاف کر دیا تھا کیونکہ ہونٹوں کی گلابی رنگت قدرے ہلکی پڑ گئی تھی اور رخساروں کی مصنوعی سُرخی کی جگہ قدرتی تازگی چمک رہی تھی۔

وہ تین دن گھر میں محدود رہا۔ اس دوران بارہا کوثر جان سے نوک جھونک بھی ہوئی اور اس نے اندازہ لگایا کہ علی جان کی بیٹی بھی اسے پسند کرنے لگی ہے۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح اس کے آس پاس منڈلاتی رہتی تھی اور تعلیم و تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔

چوتھے روز شام کے وقت وہ حیرت خان کو سیر کے لئے لے گئی۔ اسے موٹر چلاتے دیکھ کر حیرت خان کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ نازک اندام لڑکی اس دیوہیکل مشینی عفریت کو اپنے اشاروں پر نچا رہی تھی۔

"تمہارا نام کس نے رکھا تھا؟" دو رویہ باغات کے درمیان ایک پُرسکون شاہراہ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے کوثر نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔" حیرت خان نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ اسے قدرت نے مردانہ وجاہت اور دلربائی سے مالامال کیا تھا مگر وہ عورتوں سے گھبراتا تھا۔ اسے کبھی عورتوں کی صحبت نہیں ملی تھی اور وہ ان سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں سیکھ سکا تھا۔ بات میں بات نکال کر گفتگو کو نازک جذباتی موڑ دینا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔ اس کے خیالات اس کے چہرے پر فوراً ہی اُبھر آتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ کوثر جان کی باتوں پر چڑ گیا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ کوثر کے منہ پر بھرپور ہاتھ مارے مگر غنیمت یہ ہوا کہ ایسے ہر مرحلے پر اسے بروقت یاد آجاتا تھا کہ کوثر جان عورت ہے اور وہ عورتوں پر ہاتھ اُٹھانے کو بزدلی کی بدترین قسم سمجھتا تھا۔

اس کے دو ٹوک جواب پر کوثر کھلکھلا کر ہنس دی۔ "تمہیں کیوں پتہ نہیں؟" وہ لڑکی اس سادہ لوح نوجوان کو چڑا کر خوب لطف اندوز ہوتی تھی۔

"اس لئے کہ میں اُس وقت اتنا سا بچہ تھا۔" اس نے دونوں ہتھیلیاں ایک فٹ کے فاصلے پر متوازی پھیلا کر جواب دیا۔

"پھر بھی کسی سے سُنا تو ہو گا۔"

حیرت خان نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا اور چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "میرے بابا نے رکھا تھا یہ نام، کوئی اعتراض ہے تمہیں؟"

کوثر جان نے میٹھی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم اس طرح اپنے بابا کا ذکر کرتے ہو کہ میری نظروں میں پالنے میں کھیلتا ہوا ننھا سا بچہ اُبھر آتا ہے۔" پھر وہ سنجیدگی سے بولی۔ "یہ نام بھی عجیب سا ہے، حیرت کے جذبے کو انسانی شکل دی جائے تو وہ تم سے مختلف ہو گی۔"

حسبِ معمول وہ پھر تنک گیا۔ "جہنم میں گئی حیرت اور اس کی انسانی شکل۔ بابا نے میرا یہ نام رکھا ہے۔ میں حیرت خان ہوں اور حیرت خان ہی رہوں گا۔"

"میں تمہارا نام بدلنا چاہتی ہوں۔" اس نے التجا کی۔

"اوئے علی جان کی بیٹی! اگر آئندہ تُو نے ایسی بات کی تو میں کوہاک چلا جاؤں گا۔ مجھے ویسے ہی اپنا قبیلہ بہت یاد آ رہا ہے۔" وہ غرّایا۔

اور مردانگی کے اس گورے چٹے، پُرکشش شاہکار کی شخصیت سے ہم آہنگ بیسیوں خوبصورت نام لبوں پر آنے سے پہلے کوثر جان کے ذہن میں دم توڑ گئے۔

شہر آنے کے بعد حیرت خان پوری طرح کوثر جان کے رحم و کرم پر تھا۔ قبائل میں سُست رو اور پُرسکون زندگی گزارنے والا سردار علی جان تو شہر آکر چھلاوہ بن گیا تھا۔ ہفتے میں وہ بمشکل چند گھنٹوں کے لئے اسے نظر آتا اور وہ بھی ملاقاتیوں وغیرہ کی بھیڑ میں۔ حیرت خان سوچتا ہی رہ جاتا کہ علی جان کو فرصت ملے تو وہ اس سے بات کرے۔ مگر فرصت میسّر آنے سے پہلے ہی سردار علی جان پھر غائب ہو جاتا۔

"تیرا بابا گھر میں کیوں نہیں ٹکتا؟" ایک روز حیرت خان کوثر سے پوچھ ہی بیٹھا۔

"میرے ڈیڈی بہت مصروف آدمی ہیں۔" کوثر نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔

"تُو چاچا کو میرے سامنے ڈیڈی نہ کہا کر۔" حیرت خان بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "اس لفظ سے اُبلے ہوئے پوست کے ڈوڈوں کی بُو آتی ہے۔"

"تمہیں ڈیڈی کی فکر کیوں ہو گئی؟"

"میں یہاں عیش کی روٹیاں توڑنے نہیں آیا۔ چاچا مجھے تربیت دینے کے لئے لایا تھا۔"

"تربیت ہو تو رہی ہے تمہاری۔" کوثر جان مسکرا کر بولی۔

"کیسی تربیت؟" اس نے حیرت سے دیدے نچائے۔ "اگر تُو سارا دن اپنے ساتھ آنکھ مچولی کو تربیت کہتی ہے تو میرا اللہ ہی حافظ ہے۔"

"میں سارا دن تمہارے ساتھ سر کھپاتی ہوں۔" وہ یک بیک اداس ہو گئی۔ "جب تک تم شہری آداب، لباس اور طور طریقے سے مانوس نہیں ہو جاتے تمہارا محفلوں میں جانا مناسب نہیں۔ لوگ تمہارا مذاق بنائیں گے کہ کوہاک کا ہونے والا سردار اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتا۔"

"میں کتنے دنوں میں لکھنا پڑھنا سیکھ لوں گا؟" حیرت خان نے اُمید اور حسرت کے ساتھ پوچھا۔

"تمہارے شوق پر منحصر ہے، میں تو کسر نہیں رکھتی۔" کوثر جان نے کہا۔

"کیا چاچا کے سارے دوست پڑھے لکھے ہیں؟" حیرت خان کے لہجے میں دل کو تڑپا دینے والی حسرت رچی ہوئی تھی۔

"میرے بابا بہت بڑے لیڈر ہیں۔ ان کے سارے دوست ہی بہت ہوشیار اور تعلیم یافتہ ہیں۔ جب تم ان کے ساتھ نکلو گے تو دیکھنا کہ وہ کس قدر مقبول ہیں۔ ہر ایک ان کی عزت کرتا ہے۔" باپ کی تعریف کرتے ہوئے کوثر جان کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

حیرت خان سر جھکائے وہاں سے اٹھا اور کتاب لے آیا۔

کوثر جان اس کے قریب کھسک آئی اور اسے حروفِ تہجی کی شناخت سمجھانے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ جھلا گئی اور تیز لہجے میں بولی۔ "پتہ نہیں آج تمہارا دماغ کہاں ہے۔ میں بتاتی کچھ ہوں تم پڑھتے کچھ اور ہو۔"

حیرت خان نے غصے میں غراتے ہوئے کتاب کے یوں پرزے اڑا دیئے جیسے اپنے کسی دشمن کی ٹانگیں چیر رہا ہو پھر اس نے کوثر جان کی طرف دیکھا تو وہ سہم گئی۔ حیرت خان کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں میں خمار کے ڈورے تیر رہے تھے اور اس کے تنفس کی رفتار بہت تیز تھی۔

"میں تجھ سے نہ پڑھ سکوں گا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مم۔۔۔ مگر میں نے کیا کیا ہے؟" وہ بدستور سہمی ہوئی تھی۔

"تیرے بدن سے پھوٹنے والی مہک مجھے پاگل کر دیتی ہے۔" حیرت خان اس پر نظریں جما کر بولا۔ "تنہائی میں بھی تیرا ہی خیال لگا رہتا ہے۔"

کوثر جان عجیب انداز میں ہنس دی۔ سہمی ہوئی عورت اچانک بے خوف ہو گئی۔ "میرا خیال کیوں لگا رہتا ہے تجھے؟"

"بس میں چاچا سے کہہ دوں گا۔" حیرت خان کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ "چار گھنٹے تیرے ساتھ گزارتا ہوں تو بیس گھنٹے تو ہی دماغ پر چھائی رہتی ہے۔"

"تو ڈیڈی سے یہی کہے گا؟"

"ہاں۔۔۔ چاچا کو میرے لئے کسی اور استاد کا بندوبست کرنا پڑے گا۔" حیرت خان بار بار اضطراری انداز میں پوری قوت سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ "تیرے بارے میں سوچ سوچ کر میری کنپٹیاں پھٹنے لگتی ہیں جب سے شہر میں آیا ہوں ایک رات بھی پوری نیند نہ لے سکا۔"

"ڈیڈی کو بھنک بھی مل گئی کہ تو تنہائی میں میرے بارے میں سوچتا ہے تو تیری چمڑی اُدھیڑ ڈالیں گے۔" کوثر جان اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ حیرت خان کے کھرے اور بے لاگ الفاظ نے اس کی انا کو ناقابلِ بیان تسکین پہنچائی تھی۔

"میں تیرے بارے میں نہیں سوچتا۔" حیرت خان چوبی میز پر مکا مار کر غرایا۔ "میں تو تیرے تصور کو بھی ذہن سے جھٹک دینا چاہتا ہوں مگر کیا کروں میں اپنا ذہن کھرچنے پر قادر نہیں ہوں۔"

"اس کا مطلب سمجھتا ہے تو؟" کوثر جان تخوت آمیز انداز میں مسکرائی۔ یہ انکشاف اس کے غرور کو معراج پر لے گیا تھا کہ وہ اپنے پُرجلال اور قوی ہیکل محبوب کے ذہن پر پوری طرح حاوی ہے۔

"مطلب کی ایسی کی تیسی۔" وہ اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "میں زیادہ دنوں یہ عذاب نہ جھیل سکوں گا کسی دن جنون چڑھ گیا تو اپنے دانتوں سے تیرے ملائم بدن کی بوٹیاں اُڑا دوں گا۔"

کوثر جان نے لذت کے تصور سے آنکھیں موند لیں۔ "تجھے مجھ سے محبت ہو گئی ہے حیرت خان! تُو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

حیرت خان دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹنے لگا۔ "لعنت ہو اس مرد و دپر جو تجھ سے محبت کرتا ہو۔ سچا مسلمان صرف اپنی عورت سے محبت کرتا ہے۔"

کوثر جان نے حیرت سے آنکھیں کھول دیں۔ جنس کے معاملے میں حیرت خان کی عمر کسی طرح دس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ لطیف کنائے تو درکنار، وہ تو کھلی کھلی باتیں بھی سمجھنے اور ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ "تیری عورت ہی کہاں ہے؟" کوثر جان قدرے سکوت کے بعد بولی۔

"بابا میری شادی کرے گا تو عورت بھی آجائے گی میری۔" اس کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں میں دُور تک گناہ کا سایہ نہ تھا۔ وہ کچے اور سچے آدمی کی طرح کوثر جان کی بوجھل ہوتی ہوئی آنکھوں میں براہِ راست دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہاری عورت بننے کو تیار ہوں حیرت خان!" کوثر جان نے بے خودی کے عالم میں سسکتی ہوئی سرگوشی کی اور حیرت خان آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورنے لگا۔

اب کسی حد تک معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ بے اختیار اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ "یہ بہت مشکل ہے کوثر جان! کوہاک والیوں کی آواز بھی مکان کے باہر نہیں سُنی جاتی اور تو پردہ تک نہیں کرتی۔"

"مگر اب تو وہ پہاڑوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔"

عشق دلیلوں پر آمادہ تھا۔

"جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔" حیرت خان نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"محبت میں بھی سب کچھ جائز ہے۔" کوثر جان کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

"میں کوہاک لوٹا تو خان دوراں سے کہوں گا۔ جب تک میرے اور تیرے بزرگ راضی نہ ہوں، ہم ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہیں۔" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد حیرت خان نے نرم آواز میں کہا۔

"مگر تو بارہا مجھے چھو چکا ہے۔" وہ دوڑ کر اس کے سامنے پہنچ گئی اور اس کے فولادی بازوؤں کو بتقام کر بھرائی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں بولی۔ "صرف ایک بار مجھے اپنی چھاتی سے لگا لے۔ تیری آغوش کی لذت مجھے ہمیشہ تیری بارات کا منتظر رکھے گی۔"

حیرت خان کے حلق سے وحشیانہ غراہٹ اُبھری اور اس نے

کوثر جان کے رخسار پر تھپڑ رسید کر دیا۔ کمرہ چٹاخ کی آواز سے گونجا۔ کوثر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر اس نے منہ سے اُف تک نہ کی اور حیرت خان دوبارہ اس کی طرف دیکھے بغیر آندھی کی طرح کمرے سے نکل گیا۔ کوثر جان اپنے محبوب کا تھپڑ کھا کر بھی مسکرا رہی تھی۔ اس پر ہاتھ اُٹھا کر حیرت خان نے شکست مان لی تھی اور ایک طرح اس پر اپنا حق بھی جتا دیا تھا۔

قیں سے بے کفن لاشیں سنگلاخ زمین کے سینے پر دبا کر انہوں نے فاتحہ پڑھی اور وہاں سے واپس چل دیئے۔ ان سب کے چہروں سے تکان اور تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

"قسم رب العزت کی! ہم ان پہاڑوں کو خون میں نہلا دیں گے، مرنے والوں کا قصاص ہم پر واجب ہے اور ہم اپنے دشمنوں سے خوفناک انتقام لیں گے۔" خان دوراں کے تیور غضبناک تھے۔

"ہمارے مورچے چوٹیوں پر ہیں، وہ گھاٹیوں پر قابض ہیں۔" میر افضل خان تفکر آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اپنی بہتر پوزیشن کی وجہ سے ہم ہمیشہ فائدے میں رہے ہیں۔ ان کے سینکڑوں آدمی مار کر آج تک ہم نے سترہ آدمی کھوئے ہیں۔ پھر بھی دن گزرنے کے ساتھ تیزی کے ساتھ سڑک کا نقشہ واضح ہوتا جا رہا ہے۔"

"سترہ نہیں اٹھارہ کہو میر افضل!" خان دوراں تیز لہجے میں بولا۔ "قبلہ خان ہماری اس جنگ کا پہلا شہید تھا جو ان کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"چھ مہینے۔" میر افضل سوچتے ہوئے بڑبڑایا۔ "ہم نے کوہاک کی سرزمین چھوڑی تو میری بیوی سات مہینے کی حاملہ تھی اور اب وہ چار مہینے کے ایک یتیم بچے کی ماں ہے۔"

"یہ جنگ انشاء اللہ بہت جلد ہمارے حق میں ختم ہو گی۔" خان دوراں پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ان کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ سترہ قبیلے پہاڑوں پر چڑھ چکے ہیں۔ ان کی بربادی انہیں کوہستانوں پر لائی ہے۔ ان میں سے ایک بھی زندہ واپس نہ لوٹ پائے گا۔"

"ہمیں جنگ تیز کرنی چاہیئے۔" صوفی مردان خان داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "طویل جنگ ہمارے لئے مہلک ثابت ہو گی۔ برفباری کا موسم شروع ہو گیا تو رسد ختم ہونے کے بعد ہم ان ہی پہاڑوں میں ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ ہمارا اسلحہ بھی ایک نہ ایک دن جواب دے جائے گا۔ گولیوں کے بغیر رائفلیں اور مشین گنیں سب بیکار ہو کر رہ جائیں گی۔"

"آنے والے دنوں کی ایسی بھیانک منظر کشی نہ کرو مردان خان!" خان دوراں نے اسے گھورا۔ "تم جانتے ہو کہ جنگ تیز کرنے کی ہماری ہر کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ ہم نے ایک دن میں دس دس حملے کئے ہیں مگر وہ صرف دفاع کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی پہل نہیں کی اور نہ پہاڑوں میں گھس کر ہمارے مورچوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار پہاڑوں میں گھس آئیں تو ہم ان کے پورے ڈویژن کا صفایا کر سکتے ہیں۔"

"انہیں شور گر سے مسلسل رسد مل رہی ہے۔" صوفی مردان خان بولا۔ "وہ تو موسم کی ہر سختی جھیل جائیں گے اور پھر سڑک کے لئے چٹانیں اُڑا کر انہوں نے اتنا راستہ بنا لیا ہے کہ اب ان کی رسد سے بھری ہوئی لاریاں بھی رشیم تنگی تک آنے لگی ہیں۔"

اسی وقت کسی جانب سے رائفل کا فائر ہوا۔ دھماکے کی آواز اُونچے نیچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکرا کر دُور تک گونجتی چلی گئی پھر کئی رائفلیں مسلسل چلنے لگیں۔ ایک ہولناک دھماکا ہوا اور داہنی طرف چوٹیوں کے اس پار گھاٹی سے سیاہ دھوئیں کا بادل اُمڈ پڑا۔ اسی کے ساتھ مشین گن کی مہیب آوازیں گونج پیدا کر کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں۔

"شاید شمر خان نے تیل والی لاری میں آگ لگا دی۔" خان دوراں سیاہ دھواں دیکھتے ہی خوشی سے ناچنے لگا۔ "آؤ چل کر اس کا ہاتھ بٹائیں۔"

اُونچی نیچی چٹانوں پر دوڑتے تھوڑی ہی دیر میں وہ ساتوں اپنے مورچے پر پہنچ گئے۔ شمر خان بیس مسلح آدمیوں کے ساتھ ڈیڑھ سو فٹ اُونچی پہاڑی پر مورچہ جمائے بیٹھا تھا۔ نیچے وادی میں ہر طرف شعلوں سے اُمڈتا سیاہ دھواں پھیلا ہوا تھا جس کے سائے میں تین جلتی ہوئی لاریاں نظر آ رہی تھیں۔ دھوئیں کی آڑ میں سے اندھا دھند مشین گن کا فائر آ رہا تھا لیکن ساری گولیاں ڈھلانوں سے ٹکرا کر اُچٹ رہی تھیں۔

"رسد لانے والے ہمارا نشانہ بنے ہیں خان!" سردار کو دیکھتے ہی شمر خان کھل اُٹھا۔ "دو تیل کی ٹنکیاں تھیں اور ایک لاری خیموں سے لدی ہوئی تھی۔"

مگر خان دوراں نے کچھ نہ سُنا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

پہاڑوں میں فرار کے تیسرے دن خان دوراں نے اپنا ایک مخبر روانہ کیا تھا۔ وہ بڑی عجیب خبریں لایا۔ فوجیوں نے کوہاک کی ویران

بستی کو تاراج کرنے کے بجائے اس وسیع علاقے کو خاردار تاروں کی عارضی باڑھ میں گھیر لیا تھا اور اس کے گرد مناسب فاصلوں سے محافظ مقرر کر دیئے تھے۔

ان کی باقی نفری کو ہاک اور ریشم تنگی کے درمیان ایک وسیع میدان میں خیمہ زن ہو گئی۔ فوجیوں نے بستی والوں کا کھوج نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہے۔ انہیں ہزاروں نفوس کے یوں اچانک غائب ہو جانے پر سخت حیرت تھی۔

ریشم تنگی کی دونوں پہاڑیوں پر فوجیوں کا پہرہ تھا۔ کوہاک والے نہ ان پر حملہ کر سکتے تھے، نہ کھلے میدان سے گزر کر ان کے خیموں کو آگ لگا سکتے تھے لہٰذا خان دوراں نے ریشم تنگی کو آنے والے راستے کے سہارے پہاڑیوں پر اٹھارہ مضبوط مورچے قائم کرا دیئے۔

ساتویں دن یوں ہی اس راستے پر فوجی گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دی اور ایک بڑا فوجی قافلہ ریشم تنگی کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ خان دوراں کے آدمی ہوشیار ہو گئے۔ جوں ہی لاریاں زد پر آئیں، پہاڑیوں سے وزنی چٹانیں نیچے لڑھکا دی گئیں۔ کئی لاریاں اُلٹ گئیں، بہت سے فوجی چٹانوں کے نیچے کچلے گئے اور جو زندہ بچے انہیں سنبھلنے سے پہلے کوہاک والوں کی رائفلیں چاٹ گئیں۔ باقی ماندہ فوجیوں کو جوں ہی صورتِ حال کا اندازہ ہوا، انہوں نے چٹانوں کی اوٹ میں مورچے سنبھال لئے اور وہاں سے طرف بارود کی بُو پھیل گئی۔

ہولناک تصادم ہوا۔ کوہاک والوں نے آتش گیر بموں سے لاریوں میں آگ لگا دی۔ فوجیوں کے حملے میں جارحانہ شدت کے بجائے مدافعت کا انداز نمایاں تھا۔ پھر بھی اس روز سات آدمی مارے گئے۔ جب شام کو ان کی لاشیں کمین گاہ میں پہنچیں تو وہاں عورتوں کا کہرام بپا ہو گیا۔

پھر سروے کے بجائے وہاں راستہ بنانے کا کام شروع ہو گیا۔ فوجی جوان کدالوں اور ہلکے بارودی دھماکوں کے ذریعے راستہ ہموار کرنے لگے۔ اس کارروائی کا دائرہ میلوں دُور تک پھیلا ہوا تھا جو علاقے زد میں آئے وہاں کوہاک والوں نے آگ اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی۔

بڑی بڑی چٹانیں لڑھک کر راستے مسدود کرنے لگیں۔ دستی بموں نے کئی جانوں کی بھینٹ لی، بہت سے فوجی معذور ہو گئے۔ پھر ان کو ریشم تنگی سے کمک آ پہنچی۔ بلندی پر ہونے کے باوجود کوہاک والوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

پھر تو یہ معمول ہو گیا کہ مسلح دستوں کے حفاظتی کور میں غیر مسلح جوان ناہموار پہاڑوں کے سینے میں سڑک کا روپ نکھارنے لگے۔ کوہاک والوں نے انہیں زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا مگر وہ لوگ بھی دُھن اور جذبے کے پکے تھے۔ ایک کے مقابلے میں آٹھ اور دس کا جانی نقصان اُٹھانے کے باوجود اپنے کام میں لگے رہے۔

پھر خان دوراں کو رسد کا انتظام کرنے والوں سے پتہ چلا کہ ریشم تنگی اور شورگر کے درمیان جہاں بھی راستہ خطرناک یا مسدود تھا، وہاں چھوٹی چھوٹی فوجی جماعتیں کام میں مصروف ہیں تاکہ سڑک کی تعمیر کے لئے بھاری سامان وہاں تک لایا جا سکے۔

اس پر خان دوراں کو ایک انوکھی تجویز سُوجھی۔ اس نے اپنے آدمیوں کی کئی چھاپہ مار جماعتیں بنائیں جو ان چھوٹے فوجی کیمپوں پر شب خون مار کر اسلحہ اور رسد لُوٹنے پر مامور تھیں۔ ایسی چند کامیاب کارروائیوں نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے اور وہ رسد لانے والے غیر مسلح فوجی قافلوں کو بھی لُوٹنے لگے۔ اسی دوران سڑک بنانے والی بھاری مشینیں وہاں پہنچنے لگیں۔

ابتدا میں انہیں خلافِ اُمید معمولی نقصان کے نتیجے میں بھاری رسد ہاتھ لگی مگر تین قافلوں کے لُٹنے کے بعد رسد والے بھی مسلح فوجیوں کی حفاظت میں سفر کرنے لگے اور رسد کے معاملے میں کوہاک والوں کو صرف اپنے وسائل پر انحصار کرنا پڑا۔

خان دوراں کی بھڑکائی ہوئی آگ کوہاک کے آس پاس کے قبیلوں کو بھی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ اس کی فرمئی کہانیوں پر ایمان لا کر وہ بھی پہاڑوں میں چھُپ گئے تھے اور یوں کوہاک والوں کو رسد کے لئے میلوں دُور جا کر انتظام کرنا پڑتا تھا۔

جو وقت گزر گیا وہ بہتر تھا مگر آنے والے دن واقعی عذاب معلوم ہو رہے تھے۔ پورا منصوبہ بناتے ہوئے خان دوراں یہ بھُول گیا تھا کہ گوریلا جنگ طویل ہو جانے کی صورت میں وہ برفانی موسم کیسے گزاریں گے؟ بھاری برفباری کے بعد جنگ تو درکنار، اجنبی راستوں پر چلنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ دوسری طرف دشمن روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔

بھاری بھرکم دیوہیکل مشینیں شورگر کی جانب سے شفاف سیاہ سڑک تعمیر کرتی آہستہ آہستہ ریشم تنگی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ راستہ صاف کرنے کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور چند ہی روز میں بارود کے دھماکوں سے ان پہاڑوں کا سینہ شق ہونا تھا جن کے درمیان درّہ ریشم واقع تھا۔ پھر اس تنگ، ناہموار گزرگاہ کی جگہ بھی ایک پختہ اور ہموار سڑک چمکنے لگتی۔ اس سڑک کا خیال آتے ہی خان دوراں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے اور اسے اپنی سرداری خاک میں ملتی نظر آنے لگتی۔

چھ

ماہ کے عرصے میں حیرت خان اتنا کچھ سیکھ چکا تھا کہ اسے دیکھنے والے اسے شہری سمجھتے تھے۔ اس نے شہر کی تہذیب کا ہر پہلو اپنا لیا تھا مگر اپنا لباس نہ بدلا تھا۔ اور اس تربیت کے نتیجے میں اس کے ذہن میں بھی انقلاب آ گیا تھا۔ اس نے جس دن کوثر جان کے رُخسار پر تھپڑ مارا تھا، اس کے بعد کوثر جان نے اس سے کبھی اس موضوع پر بات نہ کی، وہ گھنٹوں ساتھ رہتے، باہر جاتے مگر اس موضوع پر ایک لفظ بھی کسی کی زبان پر نہ آتا۔ محبت کے نام سے چڑنے والے حیرت

خان کو اپنے سابقہ رویّے پر بڑی پشیمانی تھی۔ مگر مشکل یہ آ پڑی تھی کہ وہ مرد تھا اور کسی عورت کے سامنے غلطی کے اعتراف کو مردانگی کی ہتک سمجھتا تھا۔ ویسے اب وہ بار بار آرزو کرتا کہ کاش کوثر جان ایک بار پھر اس سے محبت کی باتیں کرے مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس باب کو دیس ختم کر چکی ہو۔

حیرت خان کی خلش کا دوسرا سبب سردار علی جان کا رویّہ تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا، حیرت خان سے کترانے کی کوشش کرتا۔ حیرت خان نے کئی بار کھُل کر اس سے کہا کہ وہ اسے بھی اپنے دوستوں کے حلقے میں متعارف کرائے مگر علی جان ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے ٹال دیتا۔

ایک دن کوثر جان خوشی سے چہکتی اس کے پاس آئی اور اسے بتایا کہ اس کا باپ دو دن بعد شہر میں ایک جلسے سے خطاب کرنے والا ہے۔ یہ سُن کر حیرت خان کا دل دھڑک اُٹھا۔ اب وہ سردار علی جان کی آواز کا جادو دیکھ سکتا ہے۔ ہزاروں کے مجمع میں لکنت کے بغیر چند برمحل جملے بولنا بھی حیرت خان کی دانست میں بہت بڑا کمال تھا۔

اس نے کوثر جان سے کہا کہ وہ اپنے چاچا کی تقریر سُننے ضرور جائے گا۔

اس رات وہ دیر سے سویا۔ صبح ناشتے کے بعد کوثر جان ملی تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

"تو اداس ہے کوثر؟" اس نے کوثر کے لئے اپنے دل میں کسک محسوس کی۔

"ہاں — ڈیڈی ناراض تھے کہ میں نے تجھے ان کی تقریر کے بارے میں کیوں بتایا۔" وہ اُداس لہجے میں بولی۔ "تو وہاں نہیں جائے گا، یہ ان کا حکم ہے۔"

"مگر کیوں؟" اس نادر شاہی حکم پر اس کی حیرانی بجا تھی۔

"یہ وہی جانیں مگر تو اب اُدھر ہرگز نہ جائے گا۔"

"میں تو ضرور جاؤں گا۔" وہ اڑ گیا۔

"ڈیڈی کو معلوم ہو گیا تو میری شامت آ جائے گی!"

"وہاں ہزاروں آدمی ہوتے ہیں نا؟" اس نے کسی فوری خیال کے تحت پوچھا اور کوثر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ چاچا کی نظروں میں نہ آؤں گا۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "میں بھیڑ میں اس طرح دبک کر بیٹھوں گا کہ چاچا مجھے دیکھ ہی نہ سکے گا۔"

"مگر یہ اچھی بات نہ ہو گی۔"

"ایسی بُری بھی نہ ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

اس شام حیرت خان جلسہ گاہ میں پہنچا تو وہاں انسانوں کا ایک سیلاب اُمڈا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنا بڑا مجمع نہ دیکھا تھا۔ جلسہ گاہ کے آخری سرے پر بنا ہوا اسٹیج روشنیوں، جھنڈیوں اور پرچموں سے سجا ہوا تھا۔ وہاں ایک آدمی کھڑا ہوا جوشیلے انداز میں تقریر کر رہا تھا۔

بھروسا

تھانیدار نے اُن دو جیب کتروں سے جنہیں ابھی ابھی گرفتار کیا گیا تھا۔ پوچھا "تم دونوں ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو؟" اُن میں سے ایک بولا:

"تین ماہ سے۔"

"خوب! ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"ایک ہوٹل میں۔ اُس نے گفتگو کے دوران کہا تھا کہ وہ سات بار جیل جا چکا ہے۔"

"اچھا — تو پھر؟"

"پھر — مجھے اس پر بھروسا ہو گیا۔"

جھگڑالو خاندان

ایک شیخی خور امریکی اپنے انگریز دوست سے کہہ رہا تھا۔

"میرے پردادا نے جنگِ آزادی میں حصّہ لیا تھا، میرے باپ خانہ جنگی میں مارے گئے۔ میں خود اسپین کے انقلاب میں شریک رہا ہوں۔ میرا بیٹا جنگِ عظیم دوئم میں دادِ شجاعت دے چکا ہے اور اب میرا پوتا ویت نام سے کئی تمغے لے کر آیا ہے۔"

انگریز زیرِلب بولا ——— "خوب تو آپ کے خاندان میں پشت ہا پشت سے کوئی امن سے رہنا جانتا ہی نہیں۔"

اس کی آواز لاؤڈ اسپیکرز پر پوری جلسہ گاہ میں گونج رہی تھی۔

حیرت خان طویل چکر کاٹ کر اسٹیج کے قریب ایک ایسا گوشہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں پھیلی ہوئی نیم تاریکی اسے سردار علی جان کی نظروں سے بچا سکتی تھی۔ وہ وہیں دبک کر دری پر بیٹھ گیا اور پوری توجہ سے تقریر سننے لگا۔

سردار علی جان کھدر کے کُرتے اور شلوار میں ملبوس اسٹیج پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس کی گود میں ہاروں کا ایک مہکتا ہوا انبار رکھا ہوا تھا۔

علی جان کی باری آئی تو حیرت خان ہمہ تن گوش ہو گیا۔ تالیوں کی گونج میں مائیک کے سامنے آ کر سردار علی جان نے پورے اعتماد سے مجمع کا جائزہ لیا۔ حیرت خان نے اپنا چہرہ ایک آدمی کی اوٹ میں چھُپا لیا۔ وہ کوثر جان کو اس کے باپ کے سامنے شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر ہوا کے دوش پر سردار علی جان کی نرم اور دل میں اُتر جانے والی آواز گونجنے لگی۔ وہ حکمرانوں کی بدنیتی اور بے ایمانی پر تنقید کر رہا تھا۔ دھیمے دھیمے اس کا لہجہ بلند ہوتا جا رہا تھا پھر اس نے دردانگیز لہجے میں قبائلی علاقوں کی پسماندگی کا ذکر کیا تو حیرت خان چونک پڑا۔ خفیہ چرچے میں علی

جان نے خود سرداروں کو ترغیب دی تھی کہ وہ اپنے علاقوں میں اسکول، ہسپتال، کارخانے اور سڑکیں نہ بننے دیں۔ اس سے ان کی سرداریاں ختم ہو جائیں گی اور اب خود ہی قبائلی علاقوں میں سہولتوں کے فقدان کا شکوہ کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ جگر خراش تھے، جیسے نفرت کے زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے مسلح فوجیوں پر نہتے اور بے گناہ قبائلیوں کے قتل عام کا الزام لگایا۔ اس نے کہا کہ سڑک بنانے کی آڑ میں فوجیوں نے قبائلی علاقے میں قتل و دہشت گردی کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ آبادیوں پر طیارے بم برسا رہے ہیں، مشین گنوں سے سینے چھلنی کیے جا رہے ہیں!

اس کے الفاظ سے رستا ہوا زہر کانوں کے راستے ہر ذہن میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ وہ لوگوں کے جذبات کا دھارا اپنے حق میں موڑ چکا تھا اور اب کھل کر ان کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ اسی وقت فضا میں کوہاک اور اس کے نواحی قبائل کے نام گونجے۔

سردار علی جان نے دُکھ بھرے لہجے میں لوگوں کو کوہاک والوں کی مظلومیت کی کہانی سنانی شروع کی جن کو مسلح اور سخت گیر فوجیوں نے سنگینوں کی نوک پر گھروں سے باہر ہانک دیا تھا اور جو بنجر پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ اس نے کھل کر الزام لگایا کہ کوہاک میں فوجیوں کی موجودگی کے لیے سڑک کی تعمیر کی آڑ لی گئی ہے، اصل مقصد قبائل کا شیرازہ بکھیرنا ہے اور جلسہ گاہ میں ظلم کے خلاف فلک شگاف نعرے گونجنے لگے۔

سردار علی جان اخباری نمائندوں کو دعوت دے رہا تھا کہ وہ خود کوہاک جائیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ نئی سڑک ضرور بن چکی ہے مگر بھری پڑی بستیوں میں ویرانی کا راج ہے۔ ظلم کی چکی میں پسنے والے قبائلی ہتھیار اٹھا کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے ہیں۔

حیرت خان کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ جوش و خروش کے ساتھ نعرے لگا رہے تھے مگر وہ پتھر کے بُت کی طرح بے جان بیٹھا سردار علی جان کی من گھڑت کہانیاں سُن رہا تھا۔ وہ خود کوہاک سے آیا تھا اور خوب جانتا تھا کہ وہاں کیا ہوا ہے۔ وہ علی جان کے دوغلے پن سے بھی واقف ہو چکا تھا مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر اس چیختے چنگھاڑتے ہجوم کے سامنے جھوٹ کی پول کھول دے۔ وہ جان چکا تھا کہ سرداروں کی اندھی تقلید اور قوت کے سہارے علی جان نے شہروں کی سرداری ہتھیائی ہوئی ہے۔ اس کی دانست میں وہ آگ سے کھیل رہا تھا جو خود اسے جلا کر بھسم کر سکتی تھی۔

گھن گرج والی تقریریں ہوتی رہیں، نعرے گونجتے رہے مگر حیرت خان بہرا ہو چکا تھا۔ اس کے کان کچھ نہیں سن رہے تھے، اس کا ذہن پہاڑوں میں بھٹک رہا تھا جہاں کوہاک والے نادانستگی میں کسی بھیانک سازش کا ایندھن بنائے جا رہے تھے۔

وہ اچانک وہاں سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔

شہر آ کر اس نے بہت وقت ضائع کیا تھا، نہ جانے کوہاک کے کیسے کیسے حیالے مارے جا چکے تھے۔ انھیں سازش کر کے ان لوگوں سے لڑایا گیا جن کے احترام میں ہر قبائلی کا سر جھک جاتا ہے۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے پہلے ہی کیوں نہ علی جان کی مصروفیات کا سُراغ لگایا۔

اب وہ ایک پل بھی وہاں نہیں رُک سکتا تھا، اس کا قبیلہ، اس کے لوگ اسے پکار رہے تھے۔

اس کے ذہن میں نہ کوئی ترجمان کا خیال آیا نہ راستے کی صعوبتوں نے سر اُبھارا، وہ ایک اٹل عزم لیے کر چلا جا رہا تھا۔ اسے ہر قیمت پر جلد از جلد شور گھر پہنچ کر کوہاک کی طرف روانہ ہونا تھا۔

معاً اسے سردار علی جان کی تقریر کے الفاظ یاد آئے۔ اس نے کہا تھا کہ شاہراہ تعمیر ہو چکی ہے مگر بستیاں ویران ہیں، اگر سڑک واقعی بن چکی تھی تو وہ کئی دن کی پیدل مسافت چند گھنٹوں میں طے کر سکتا تھا۔

شہر سے چلنے والی آخری لاری اسے مقدر سے تیار ملی اور وہ اس میں سوار ہو گیا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی آندھیاں چل رہی تھیں، اور بس رات کے اندھیرے میں تیزی سے اسے منزل سے قریب تر لیے جا رہی تھی۔

لاری شور گھر سے آگے تاراپلی نامی گاؤں تک جاتی تھی، پرانی سڑک وہاں ختم ہو جاتی تھی جس وقت لاری وہاں پہنچی صبح کے چار بج رہے تھے۔

سردار علی جان کی گاڑی میں اس کے قبیلے سے شہر جاتے ہوئے حیرت خان نے یہ جگہ دیکھی تھی۔ قبیلے سے تاراپلی تک پتھریلا اور ناہموار راستہ تھا، مگر اب وہاں تارکول کی پختہ اور شفاف سڑک موجود تھی۔ جب بس کے عملے کو پتہ چلا کہ حیرت خان کوہاک جا رہا ہے تو انھیں شدید حیرت ہوئی۔ انھوں نے اس سے بہت سے سوالات کیے مگر وہ بہروں کی طرح خاموش کھڑا رہا۔

"وہاں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔" ڈرائیور اسے سمجھانے لگا۔ "پورے پورے قبیلے پہاڑوں میں روپوش ہو چکے ہیں تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

"میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔" حیرت خان نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ابھی سڑک کھُلی نہیں ہے۔ یہیں انتظار کرو، شور گھر سے آنے والے کسی فوجی قافلے کے ساتھ ہو لینا، ہر دوسرے تیسرے دن فوجی گاڑیاں ریشم تنگی جاتی ہیں۔" اسے مشورہ دیا گیا۔

مگر اس میں اب انتظار کی تاب نہیں تھی۔ وہ صبح صادق کے تاروں بھرے آسمان کی چھاؤں میں نئی سڑک پر پیدل ہی چل پڑا۔

سورج طلوع ہونے کے بعد اسے اپنے پیچھے کسی گاڑی کے انجن کا شور سنائی دیا۔ وہ سڑک سے پتھریلی زمین پر اتر گیا اور رُک کر آنے والی گاڑی کے لیے ہاتھ ہلانے لگا۔

بھاری فوجی ٹرک اس کے قریب آ کر رُک گیا۔

"کیا بات ہے؟" ایک فوجی نے کھڑکی سے سر نکال کر حیرت خان کی مادری زبان میں پوچھا۔

"کیا تم کوہاک جا رہے ہو؟" حیرت خان نے قریب جا کر امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کوہاک؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "جا تو ادھر ہی رہے ہیں مگر تمھیں وہاں کیا کام ہے، آ جاؤ، آ گئے ہی آ جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا اور حیرت خان اُچھل کر ٹرک میں سوار ہو گیا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔" حیرت خان کو خاموش پا کر ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے ہوئے فوجی نے پوچھا۔

"کوہاک میرا قبیلہ ہے۔" یہ اعتراف کرتے ہوئے فرطِ جذبات سے حیرت خان کی آواز بھر آ گئی اور اس نے کسی مجرم کی طرح نظریں جھکا لیں، وہ لاکھ بے بس سہی مگر اسی قبیلے کا فرد تھا جس نے فوج کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں پہل کی تھی۔

"میں سات مہینے پہلے شہر آیا تھا، اب واپس جا رہا ہوں۔" قدرے توقف کے بعد وہ خود بولا۔

"تم واپس کہاں جاؤ گے، بستی تو مہینوں سے ویران پڑی ہے۔"

"میں پہاڑوں میں بھی ان تک پہنچ جاؤں گا، وہ میرے لوگ ہیں میں ان کی بُو پہچانتا ہوں۔"

"ہمارے کمانڈر تمھارے قبیلے سے رابطہ قائم کرنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔" وہ فوجی کھڑکی سے باہر بھورے پہاڑوں کو گھورتے ہوئے اداس لہجے میں بولا۔ "پہاڑوں پر لہو کی سُرخی روز بروز گہری ہوتی جا رہی ہے۔"

"تم مجھے تو اپنا دشمن نہیں سمجھتے؟" حیرت خان کا اندیشہ سوال بن کر لبوں پر آ گیا۔

"دشمن؟" اس نے حیرت سے دُہرایا، پھر دُکھ بھرے انداز میں ہنس دیا۔ "تم تو نہتے ہو اور مسافر بھی۔ تمھارے قبیلے والے رائفلیں لیے ہمارے نشانوں کی زد میں مورچوں میں ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت ہم پر گولی چلا دیں گے پھر بھی ہم اس وقت تک فائر نہیں کرتے جب تک وہ پہل نہ کریں۔"

"خدا خان وراں کو عقل دے۔" حیرت خان ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔

"ہمیں تو شہادت کا جذبہ ہی فوج میں لاتا ہے، بامقصد موت ہمارے پیشے کی معراج ہے مگر دُکھ اس وقت ہوتا ہے جب ہماری گولی دشمن کے بجائے اپنوں پر چلتی ہے اور وہ بھی مجبوراً۔" وہ فوجی بہت حساس اور ذہین معلوم ہوتا تھا۔

حیرت خان دل گرفتہ ہو گیا۔ اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے وہ کھڑکی سے باہر پیچھے بھاگتے ہوئے مناظر دیکھنے لگا۔

فلک بوس پہاڑوں کو کاٹ کر اور ہولناک کھائیوں کو پاٹ کر بنائی جانے والی وہ سڑک غیر محسوس ڈھلان کے ساتھ اوپر اٹھتی جا رہی تھی۔ بل کھاتی ہوئی سڑک کے ایک کنارے پر خودرو جھاڑیوں سے لدے ہوئے بھورے پہاڑ تھے اور دوسری جانب مہیب گھاٹیاں۔ بعض بعض جگہ دراڑ کی شکل میں پھٹی ہوئی کھائیاں اتنی گہری تھیں کہ ان کی تہہ بھی نظر نہ آتی تھی۔

ذمہ دار افسر

ایک بہت بڑی کمپنی کا ڈائریکٹر میٹرنٹی ہوم میں اپنے ہاں بچے کی پیدائش کا منتظر تھا۔ بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنا بریف کیس کھولا اور دفتر کی فائل نکال کر اسے پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔

کچھ دیر بعد نرس نے آ کر اطلاع دی — "جناب لڑکا ہے۔"

ڈائرکٹر صاحب نے فائل سے نظریں اٹھائے بغیر تحکماً کہا —

"اُسے کہو پھر آئے۔ میں مصروف ہوں۔"

فرق

دو پاگل اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"ہاتھی اور ٹوتھ برش میں کیا فرق ہے؟"

دوسرا کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "— کوئی فرق نہیں ہے۔"

"کوئی فرق نہیں ہے؟" پہلے نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ دونوں سائیکل چلانا نہیں جانتے۔"

مرسلہ: فاطمہ بی بی
کراچی

وہ فوجی بتا رہا تھا کہ کوہاک تک سڑک کے تعمیر کے دوران حادثات کے نتیجے میں سات فوجی افسر اور جوان شہید ہوئے اکیس زخمی ہوئے جب کہ جنگ آزما قبائلیوں کے ہاتھوں دو سو فوجی شہید ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد اسی تھی۔ فوجیوں نے جوابی کارروائی میں بے انتہا تحمل سے کام لیا تھا، انہوں نے کبھی قبائلی مورچوں پر بھرپور حملے نہیں کیے اس کے افسران کا اندازہ تھا کہ فوجیوں کے ہاتھوں صرف دس بارہ قبائلی مارے گئے تھے۔ یہ سُن کر حیرت خان انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کے قبیلے کے ہاتھوں اتنا بھاری نقصان اٹھانے کے باوجود وہ فوجی اس کے ساتھ اتنے خلوص سے پیش آ رہا تھا۔

جب ان کا رسد بردار ٹرک ریشم تنگی سے چار میل دور تھا تو اچانک داہنی جانب کے پہاڑ سے رائفل کا فائر ہوا۔ ڈرائیور نے فوراً ٹرک روک کر انجن بند کر دیا اور وہ تینوں ٹرک کے بائیں جانب کود گئے۔

ہولناک دھماکوں کے ساتھ پے در پے پھر کئی فائر ہوئے۔ ایک گولی کہیں سے اچٹ کر حیرت خان کی پنڈلی میں لگی اور وہ چیخ مار کر زمین پر الٹ گیا۔ دونوں فوجی تیزی سے اس کی طرف لپکے اور چند ہی منٹ میں انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ گولی جلد اور گوشت کو پھاڑتی ہوئی گزری ہے، ہڈی محفوظ تھی۔

پھر فضا میں سب مشین گن کی ہولناک چنگھاڑ گونجنے لگی۔ پہاڑوں سے

گھری اس وادی میں فائروں کی آوازیں اور ان کی بازگشت نے مہیب سماں باندھ دیا تھا۔ سب مشین گن کے فائر کا رخ یقینی طور پر مورچہ زن حملہ آوروں کی طرف تھا کیونکہ داہنی جانب کی ڈھلانوں سے سنگریزے فضا میں اڑنے لگے تھے۔ شاید رسد لانے والوں کی حفاظت پر مامور فوجی شدید فائرنگ کا دباؤ ڈال کر حملہ آوروں کو فرار پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ وہ ٹرک صحیح سلامت منزل پر پہنچ سکے۔

سب مشین گن کی آواز سن کر فوجیوں کے چہروں پر سکون کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے اپنی اٹھی ہوئی رائفلیں گولی چلائے بغیر جھکا لیں۔ چند منٹ تک دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوتی رہی مگر پہاڑوں میں کوئی انسانی چیخ نہ سنائی دی۔ فضا میں بارود کی تیز بُو پھیل چکی تھی۔ کئی گولیاں ٹرک کی فولادی چادر سے بھی ٹکرائیں پھر اچانک رائفلوں کا شور تھم گیا۔

چند منٹ بعد سب مشین گن بھی خاموش ہو گئی اور فضا پر اچانک غیر فطری سناٹا چھا گیا جس کے پس منظر میں دُور کہیں فائروں کی دم توڑتی ہوئی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ویرانے میں دور دور کسی ذی رُوح کا وجود نہ ہو مگر زمین پر ایک غیر مرئی سایہ دوڑ رہا ہو۔

"چلو" فوجی ڈرائیور نے حیرت خان کو بغل میں سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "حملہ آور بھاگ گئے ہیں ہمیں یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیے۔"

"میں یہیں رکوں گا۔" حیرت خان نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں تم دونوں کا احسان کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

"تمھارے زخم سے خون بہہ رہا ہے۔" ایک فوجی حیرت سے بولا۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ یہاں تم کیا کرو گے، کوئی دوسری نادیدہ گولی جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔"

حیرت خان مسکرا دیا۔ "وہ میرے اپنے ہیں، مجھے دور ہی سے پہچان لیں گے، اب تم میری فکر نہ کرو میں کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچ جاؤں گا۔"

"ان میں ملنے کے بعد تم بھی ہمارے دشمن ہو گے مگر ابھی ہمارے دوست ہو، تمھارا یہاں رہنا کھلی نادانی ہے۔ اوپر والوں پر اس وقت سورج کی تیز روشنی پڑ رہی ہے۔ اتنے فاصلے سے وہ تمھیں نہ پہچان سکیں گے اور تم کو ہمارا جاسوس سمجھ کر ہلاک کر دیں گے۔"

"بس اتنا کرم کرو کہ ٹرک میں دوا موجود ہو تو میرے زخم کی مرہم پٹی کر دو، اور اتنا یاد رکھنا کہ کوہاک والوں میں سب ہی انسان فراموش نہیں ہیں، میں مر کر بھی تم پر ہتھیار نہ اٹھاؤں گا۔ میں خود جنگجو ہوں اور بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔"

حیرت خان کی باتیں ان دونوں کے لیے ناقابل فہم تھیں مگر زیادہ دیر وہاں رک کر اسے سمجھانے کی کوشش انہیں مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اس وقت وہ ایسے پہاڑوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انھیں نہ دشمن نظر آتا تھا نہ دوست بس فائروں کے رُخ سے ہی دوست دشمن کی تمیز ہو سکتی تھی۔

ان دونوں نے اس کا زخم صاف کر کے مرہم پٹی کی اور ٹرک میں رشیم تنگی کی طرف بڑھ گئے۔ حیرت خان اس وقت تک انھیں دیکھتا رہا، جب تک وہ ٹرک پہاڑی شاہراہ کے پیچ و خم میں نہ کھو گیا۔ پھر بھی اس کے کانوں میں ٹرک کے انجن کی آوازوں کی دم توڑتی ہوئی بازگشت دیر تک گونجتی رہی۔

حیرت خان سڑک پر یکہ و تنہا کھڑا امید اور حسرت بھری نظروں سے بھورے بے آب و گیاہ پہاڑوں کو تکتا رہا جن کے دامن میں گھومتے اس نے بچپن گزارا تھا، وہ ان علاقوں کے ایک ایک پتھر کو پہچانتا تھا۔ بس چمکتی ہوئی سیاہ سڑک اس کے لیے اجنبی تھی اور سڑک کی تعمیر نے پہاڑوں میں اتنی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں کہ اسے چوٹی پر پہنچنے کی راہ تلاش کرنے میں خاصی دیر ہو گئی۔

وہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم کی ٹیسیں برداشت کرتا، لنگڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا پھر اسے ایک پگڈنڈی نظر آ ہی گئی اور وہ سنبھل سنبھل کر خوفناک ڈھلان عبور کرنے لگا۔

شام ہو چلی تھی، وہاں دُور سے فائرنگ کی تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان پہاڑوں میں کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جب ایک آدھ بار کوہاک والے فوجیوں سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ وہ کسی بھی فوجی ٹولی کو دفاعی اعتبار سے کمزور پاتے تو اس پر آگ، پتھروں اور بموں کا جہنم برسانے لگتے۔ پھر پہاڑوں میں پوشیدہ فوج کی کوئی نگراں چوکی انہیں تاک لیتی تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ورنہ گھنٹوں پہاڑ فائرنگ کے شور سے گونجتے رہتے۔ کوہاک والے مسلح ٹولیوں میں بٹ کر میلوں وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور موت کے فرشتوں کی طرح ناگہاں کہیں بھی کارروائی کر گزرتے تھے!

ملوک خان اپنے آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ غار میں بیٹھا الاؤ پر شکار کیے ہوئے پرندوں کا گوشت بھون رہا تھا کہ صاحب عالم تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہاں پہنچا۔ بیک وقت ساری نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ اس وقت وہی باہر پہرے پر مامور تھا!

"فوج کا کوئی جاسوس ہمارے علاقے میں گھس آیا ہے!" صاحب عالم نے جوش سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں ڈیڑھ گھنٹے سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ بے مقصد آس پاس کے علاقے میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔"

"خدا تجھے غارت کرے، تو یہ بتانے آیا ہے!" ملوک دانت پیس کر بولا۔ "تیری بندوق ایک جاسوس کا بھی کام تمام نہیں کر سکتی۔"

"میں نے سوچا کہ شاید تم اسے زندہ پکڑنا چاہو۔" صاحب عالم شاباشی کے بجائے پھٹکار سن کر سست نظر آنے لگا۔

"جب تک ہم وہاں نہ پہنچیں گے وہ ہمارا انتظار کرے گا!" ملوک خان طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اور تو خان دوراں کا حکم بھول گیا، اس نے ہمیں زندہ قیدیوں تک کو مار ڈالنے کی ہدایت دی ہے۔ اس جاسوس کے لیے تو رسد کہاں سے لائے گا۔"

"رازق خدا ہے ملوک خان، اگر وہ زندہ رہا تو اپنا رزق بھی ساتھ لائے گا" صاحب عالم نے اعتماد سے کہا۔ "اسے مذاق نہ سمجھنا، وہ واقعی تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں ابھی جا کر اسے ہلاک کر آتا ہوں۔ اس کی حالت ایسی ہے کہ گولی بھی ضائع نہ کرنی پڑے گی!"

"کیا زخمی ہے؟" اس بار ملوک کا لہجہ تعجب خیز تھا۔

"بری طرح لنگڑا رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں میں نے صاف دیکھا کہ اس کے بدن پر چیتھڑے جھول رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس نے ہمیں دھوکہ دینے کے لیے بھیس بدلا ہوا ہو۔"

"جاؤ اور اس کا گلا گھونٹ دو" ملوک نے حکم دیا۔ "ہمیں کسی جاسوس سے بازپرس کی ضرورت نہیں، خان دوراں ان پہاڑیوں کے ارد گرد ہونے والی ہر بات سے باخبر ہے!"

صاحب عالم جانے کے لیے اٹھا تو بیک وقت ان سب کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں اور دہانوں سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔

غار کے دہانے پر حیرت خان جما کھڑا تھا۔ اس کا شاداب اور شگفتہ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ الاؤ اور مشعلوں کی روشنی میں اس کے ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لباس خاک آلودہ اور تار تار تھا۔ دھجیوں میں اس کے گورے اور فولادی بدن کی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ شلوار کا بایاں پائنچا خون کے خشک رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

"میرا گلا نہیں گھونٹ دو صاحب عالم!" اس کے ہونٹوں سے نقاہت بھری آواز ابھری۔ "اپنوں کے ہاتھوں معذور تو ہو گیا ہوں، سر بھی گیا تو دکھ نہ ہو گا۔"

ان پر چھایا ہوا سکتہ دور ہوا تو وہ خوشی سے حیرت خان سے لپٹ گئے۔ اپنے سردار کے اکلوتے بیٹے کو یوں تباہ حال دیکھ کر ان کے دل کانپ اٹھے تھے۔

حیرت خان نے سب سے پہلے خان دوراں کے بارے میں ہی دریافت کیا۔ اسے بتایا گیا کہ خان دوراں کبھی ایک جگہ نہیں ٹکتا وہ باری باری ہر مورچے اور کمین گاہ کا چکر لگاتا ہے۔ وہ ڈھونڈنے سے عقیدت والوں کو ہی ملتا تھا ورنہ چھلاوے کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا تھا۔

حیرت خان ڈھائی دن سے ان پہاڑوں میں بھوکا پیاسا مارا مارا پھر رہا تھا۔ ان کی کمین گاہیں اتنی خفیہ تھیں کہ حیرت خان جیسا ان راستوں کا کیڑا بھی ان میں سے کسی کو نہ ڈھونڈ سکا۔ غار سے ابھرنے والی آوازوں کی گونج اور چودھویں کی چاندنی رات نے اس غار تک حیرت خان کی رہنمائی کی تھی ورنہ وہ واقعی اپنوں کے ہاتھوں ناگہانی مارا جاتا۔

زخم کی صفائی اور دیکھ بھال سے پہلے حیرت خان نے قریبی چھاگل سے چشمے کا میٹھا پانی پیا۔ پہاڑی تیتر کے بھنے ہوئے گوشت سے آتشِ شکم سرد کی اور غار کے سرد پتھریلے فرش پر دراز ہو گیا۔

دو آدمی حیرت خان کی پٹی بدلنے لگے اور اس نے تارا پلی سے وہاں تک پہنچنے کی کہانی چھیڑ دی۔ اس سے پہلے کے واقعات گول کر گیا سب لوگ حیرت سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ ان کی دانست میں لاری میں بیٹھ کر تیز رفتاری سے پختہ سڑک پر سفر کرنا عجوبے سے کم نہیں تھا۔ خان دوراں ان پہاڑوں میں آنے کے بعد ہمیشہ کہتا آیا تھا کہ رشیم تنگی کے پہاڑوں کو اڑا کر بنائی جانے والی سڑک کوہاک والوں کی آزادی اور عزتِ نفس کو نگل جائے گی۔ اس کے ہولناک اندیشوں نے کوہاک کے ہر قبائلی کو اس سڑک کا دشمن بنا دیا تھا مگر وہ لوگ پھر بھی اس سڑک کو چھونے اور دیکھنے کی آرزو پر قابو نہیں پا سکے تھے۔ آخری چاند کی اندھیری راتوں میں ان کی ٹولیاں چوپایوں کی طرح ڈھلانیں اتر کر سڑک کے تیار شدہ حصے پر پہنچ جاتی تھیں۔ سڑک بنانے، پتھر کوٹنے اور تار کول پگھلانے والی بھاری مشینیں تارا پلی سے سڑک بناتی وہاں تک بڑھتی آئی تھیں، اس مشینی کارواں کے آگے مہیب اور ناقابل گزر پہاڑی سلسلے تھے اور پیچھے چمکیلی سڑک بڑھتی آ رہی تھی اور چند ہفتوں قبل یہ کارواں سڑک بناتا کوہاک سے کئی فرلانگ آگے نکل گیا تھا۔

رات کے اندھیرے میں وہ لوگ بچوں کی طرح ننگے پیر سڑک پر دوڑتے تھے۔ جب ان کے سانس چڑھ جاتے تو وہ تاروں بھرے تاریک سائے میں سڑک کی ٹھنڈی سطح پر لیٹ جاتے۔ ایسے لمحوں میں انھیں عجیب سی لذت ملتی پھر ذرا سی آہٹ سنتے ہی وہ بھڑک کر ڈھلانوں پر چڑھ جاتے۔

اور جب حیرت خان نے انھیں اپنے زخمی ہونے کا قصہ سنایا تو انھوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔ رسد لانے والی فوجی لاری پر ملوک خان کی ہی جماعت نے حملہ کیا تھا۔

غار کے باہر پہرہ دینا ضروری تو نہیں تھا کیونکہ فوجیوں نے کبھی اس طرف گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر خان دوراں کی ہدایت کے مطابق کمین گاہ کے باہر باری باری ایک آدمی پہرے پر مامور رہتا تھا جب ملوک خان کی باری آئی تو حیرت خان نے رائفل کی نال تھامی اور اس کا کندہ زمین پر ٹیکتا، لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ لوگوں نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

چاندنی رات میں خوابیدہ پہاڑوں کا منظر بڑا ارمان انگیز ہو رہا تھا حیرت خان ایک بلند ٹیلے پر بیٹھا ملوک خان سے باتیں کر رہا تھا۔ پل بھر کے لیے اسے کوثر جان یاد آ گئی اور اس نے اس سیمیں بدن دوشیزہ کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ اب اس کے دشمن کی بیٹی تھی اور قبائلی اپنی عورتوں سے زیادہ دشمن کی عورتوں کا احترام کرتے تھے۔ کوثر جان اس کے لیے اب محبت کے قابل نہیں رہی تھی، ہاں اس لڑکی کی ناموس کا تحفظ حیرت خان کا فرض بن گیا تھا۔

دھیمے دھیمے سرکتی ہوئی رات کے پُر سکون لمحات میں حیرت خان نے آنے والے کٹھن دنوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ جب ان علاقوں میں ہر طرف برف ہی برف پھیل جاتی تھی۔ برف باری کے موسم میں وہاں انسان کی خوراک تو کجا مویشیوں کا چارہ تک میسر نہ آتا تھا پھر بھلا وہ پہاڑوں میں گھر کر اپنی جنگ کیسے

جاری رکھ سکتے تھے۔ حیرت خان نے ملوک کی باتوں میں تشویش کے سائے لرزاں محسوس کیے۔ اسے اندازہ ہوا کہ ان دنوں کوہاک کا ہر قبائلی برفانی موسم میں عورتوں اور بچّوں کی سلامتی کی طرف سے پریشان تھا۔ ان کے پاس نہ پہننے کو مناسب اُونی کپڑے تھے، نہ پیٹ بھرنے کو خوراک اور نہ جلانے کو ایندھن! کوہاک کے قرب و جوار کے سارے قبائل کے برسرِپیکار ہونے کے سبب رسل و رسائل کا سارا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ جنگ جوں جوں طویل ہوتی جا رہی تھی، ہر ایک یہ سوچنے پر مجبور ہوتا جا رہا تھا کہ وہ لوگ اجتماعی طور پر خود ہی جو ہے داؤں میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

لوہا گرم تھا، حیرت خان نے موقع دیکھ کر بھرپور چوٹ لگائی، اور سردار علی جان کی کمینگی اور خود غرضی کے ذاتی تجربات الفاظ میں ڈھلنے لگے۔

ملوک خان کو یہ باتیں سُن کر سخت صدمہ ہوا۔ جو جنگجو اور دلیر تھا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے بھی نہ گھبراتا تھا مگر دو غلے پن سے اسے نفرت تھی۔ اس خیال ہی نے اسے چراغپا کر دیا کہ پچھلے سات مہینے اس نے بیوقوف بنتے گزارے ہیں۔ کوہاک کی سرزمین پر مارے جانے والے پہلے دو فوجیوں کے بارے میں وہ حقائق سُن کر بے چین ہو گیا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے شمر خان کا حشر خراب کرے گا۔ شہر جانے کے بعد حیرت خان پوری تفصیل سے جان چکا تھا کہ موٹریں کس رُخ پر چلتی ہیں اور ملوک کو اچھی طرح یاد تھا کہ قبلہ خان کی مسخ شدہ لاش موٹر کے اس حصّے سے بندھی ہوئی تھی جہاں روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ دراصل اس نے آج تک اس موضوع پر سوچا ہی نہ تھا اور نہ پچھلے سات مہینوں میں کوہاک کا ہر قبائلی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ موٹریں کس رُخ پر چلتی ہیں اور اب انھیں یہ بات باآسانی سمجھائی جا سکتی تھی کہ انھیں فریب دے کر فوجیوں کے خلاف صف آرا کیا گیا ہے۔

شمر خان نے بدترین جرائم کا ارتکاب کیا تھا، اس نے کوہاک کی زمین پر فوجیوں کا خون بہایا۔ قبلہ خان جیسے انسان دوست بزرگ کو قتل کیا۔ اس کی لاش کی بے حرمتی کی پھر مظلوم فوجیوں کو ظالم کا روپ دے کر کوہاک والوں سے ان کے بے جان جسموں کی حرمت پامال کرائی۔

حیرت خان پنڈلی کے زخم کی وجہ سے چلنے سے معذور تھا۔ وہ اسی غار میں مقیم رہا مگر اس کے کان بدلے ہوئے حالات کی غیبی ندا سُن رہے تھے۔

فضا سے بارُود کا دھواں چھٹ رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا مگر کسی جانب سے گولی چلنے کی آواز نہ اُبھری۔ ملوک خان نے اپنے ساتھیوں کو ساری تفصیلات سے باخبر کر کے صبح سویرے ہی مختلف سمتوں میں دوڑا دیا تھا اور خود رائفل لیکر شمر خان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔

شام کے وقت غار کے باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ اس وقت وہ غار میں تنہا تھا۔ رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتا غار سے باہر آیا تو چار خچر سوار اسے اپنی جانب آتے نظر آئے۔ سب سے آگے خان دوراں تھا۔ اس کے کندھے سے رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ شانوں سے فاضل کارتوسوں کی دو چرمی پیٹیاں لٹکی ہوئی تھیں اور گلے میں دوربین جھول رہی تھی۔ شاید وہ معمول کے مطابق ملوک خان کی جماعت کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے آیا تھا۔

جوں ہی خچر قریب آئے خان دوراں نے اسے پہچان لیا اور بیٹا کہہ کر خچر کی پشت سے کود پڑا۔ حیرت خان کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی، وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا اور دیوانہ وار اپنے بابا کی چھاتی سے لپٹ گیا جو اس عمر میں بھی کسی چٹان کی طرح سخت اور تنی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے خون کے جذبے سے سرشار ہو کر ایک دوسرے کو پوری قوت سے بانہوں میں بھینچا ہوا تھا۔

"میری آنکھیں تیری دید کو ترس گئی تھیں بیٹے!" خان دوراں فرطِ جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے خوشی کے آنسو اس کی داڑھی کو تر کر رہے تھے "اس جنگ میں تیری کمی میں شدّت سے محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک وقت تو میرا ہم نوا بن کر میرے شانہ بشانہ یہ جنگ لڑے گا۔"

"میں تمھیں پل بھر کو بھی نہ بھلا سکا بابا!" حیرت خان آنسو پینے میں تو کامیاب ہو گیا مگر آواز کی رقت پر قابو نہ پا سکا "شہر میں میری آنکھیں ہر وقت تمھیں ڈھونڈتی رہتی تھیں۔"

محبتِ پدری کے ستائے ہوئے باپ نے کسی پاگل کی طرح کئی بار حیرت خان کے رخسار چُوم لیے پھر اس نے آہستگی سے اسے سینے سے الگ کیا تو حیرت خان کی زخمی ٹانگ بوجھ نہ سہار سکی اور وہ کراہتا ہوا ایک ٹانگ پر جھک گیا۔

"تو زخمی ہے؟" خان دوراں نے تڑپ کر پوچھا۔

حیرت خان نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور ایک بار پھر رائفل کا کندہ زمین پر ٹیک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ زنگی اور تور سم خان سے بغل گیر ہوا جن کے برسائے ہوئے چابکوں کے نشانات اس کی جلد پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو کر رہ گئے تھے مگر اب حیرت خان انھیں معاف کر چکا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے کیا تھا، عقل سے محروم وہ دیو ہیکل؛ انسان نما عفریت کسی فیصلے کے مجرم نہیں ٹھہرائے جا سکتے تھے۔

پھر حیرت خان شمر خان سے بات کر ہی رہا تھا کہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے ملوک خان نمودار ہوا۔ شمر خان کو دیکھتے ہی وہ غصّے سے پاگل ہو گیا۔ اس سے قبل کہ کوئی اس کے عزائم سے آگاہ ہوتا اس نے رائفل سیدھی کی، تیز دھماکہ گونجا اور شمر خان کا بھیجہ پاش پاش ہو گیا۔ اس کا چہرے سے محروم جسم سرکس کے کسی مسخرے کی طرح زمین پر تڑپنے لگا۔

"ملوک خان!" خان دوراں غضبناک لہجے میں دھاڑا اور اس نے اپنی رائفل اس کی طرف تان لی۔

"رائفل پھینک دو خان دوراں!" اسی لمحے ایک سرد اور بے رحم آواز گونجی۔ خان دوراں نے آواز کی سمت میں سر گھمایا تو حیرت سے اس کا

منہ کھل گیا اور رائفل ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔

گرنے کے سبب خان دوراں کی رائفل چل گئی، گولی زنگی کی ٹانگوں کے درمیان لگی اور وہ ایک کریہہ چیخ مار کر زمین پر گر گیا۔ رائفل دھماکے کے باعث وہاں سے اُڑ کر دور جا گری۔ تور سم خان دہشت سے زنگی اور شمر خان کے بے جان جسموں کو گھور رہا تھا۔

"حیرت خان.... تو؟" خان دوراں کو ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں سردار۔ میں؛ ورنہ کوہاک والوں میں کس کی جرأت تھی جو تم کو للکارتا۔ میرے بدن میں تمھارا ہی خون دوڑ رہا ہے مگر نہ جانے تم بھیڑیے کیسے بن گئے۔" حیرت خان کا لہجہ سرد تھا، آواز میں نفرت رچی ہوئی تھی، آنکھوں میں خون کی پیاس جھلک رہی تھی۔

ملوک خان کے ساتھ آتے ہوئے بیس بائیس آدمی ٹیلوں کی اوٹ سے وہاں آ پہنچے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حالات اتنی جلدی نیا موڑ لیں گے۔

"میں تیری کھال اُتار دوں گا خنزیر کے تخم!" اچانک خان دوراں غرّاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بڑھ کر اسے روکتا۔

"وہیں رُک جاؤ!" حیرت خان سفاکانہ لہجے میں بولا اور خان دوراں کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ حیرت خان کا لہجہ ہی کچھ ایسا بھیانک تھا "شاید میری ولدیت ٹھیک ہی بتائی ہے تم نے۔" حیرت خان زہریلے لہجے میں بولا "تخم تو شاید خنزیر کا ہی ہوں مگر شریف ہوں۔ میں زندگی بھر شرمسار رہوں گا کہ تم میرے باپ تھے۔"

"شاید علی جان نے تجھے بھڑکا کر بھیجا ہے۔" خان دوراں کا چہرہ غصّے کی شدّت سے مسخ ہوا جا رہا تھا "وہ تیرے ذریعے کوہاک پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"وہ صرف غدّار ہے خان دوراں!" حیرت خان کے وجود میں نفرت اور انتقام کا جوالا مکھی اُبل رہا تھا۔ "اس نے صرف اپنے ضمیر سے غدری کی ہے مگر تم غدارِ اعظم ہو۔ تم نے اپنا ضمیر بیچا، اپنا قبیلہ بیچا اور اپنے اقتدار کی خاطر ہزاروں انسانی جانوں کو داؤ پر لگا دیا۔ تم نے ان حسین وادیوں کو انسانی لہو سے داغ دار کیا ہے خان دوراں! بھائی کو بھائی کے خلاف صف آرا کیا ہے۔ کوہاک والوں کی نسلیں تمھارے نام پر تھوکتی رہیں گی۔"

"تو سمجھتا ہے کہ مجھے راستے سے ہٹا کر تو خود کوہاک کا سردار بن جائے گا؟" خان دوراں تڑپ کر بولا "میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا مگر میں اس سڑک کو نہ روک سکا۔ یاد رکھ جس دن تاراپلی سے کنارک تک یہ سڑک تیار ہو گئی اس روز سرداری ختم ہو جائے گی۔ کوہاک میں اسکول اور ہسپتال کی عمارت بن چکی ہے، تیرے خلاف وہیں سے شورشیں جنم لیں گی۔"

حیرت خان بھیانک انداز میں ہنس دیا "سرداری ختم ہو یا نہ ہو، کوہاک میں اب کوئی سردار نہ ہو گا۔ میں نے تو صرف اپنے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے یہ سفر کیا ہے —— اور سنو خان دوراں! تم ہی ان لوگوں کو اکسا کر پہاڑوں میں لائے تھے اب تم ہی صلح کا سفید پرچم لہراتے نیچے اترو گے کوہاک والے تمہارے پیچھے ہوں گے۔"

"تو سازشی کتا ہے حیرت خان!" خان دوراں چیخ پڑا "میں جان دے دوں گا، ہر ایک کو فنا کر دوں گا، میری زندگی میں کوہاک کا کوئی بسنے والا صلح کا پرچم نہیں اٹھا سکتا، میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا، یہ کھلی ذلت ہے۔ میں اپنے بزرگوں کی روایات خاک میں نہ ملنے دوں گا۔"

"ملوک خان! سفید پرچم لاؤ اور جنگ کے خاتمے کا اعلان کرا دو۔" حیرت خان نے اٹل لہجے میں کہا "جو لوگ موجود ہیں وہ ابھی نیچے اتر کر فوج کے سامنے بلاشرط ہتھیار ڈالیں گے، ہم واپس آ کر ساری آبادی کو ساتھ لے جائیں گے!"

حیرت خان سردار پر رائفل تانے کھڑا رہا۔ جوش میں وہ یہ بھی فراموش کر چکا کہ اس کی ایک پنڈلی بری طرح زخمی ہے!

ملوک خان ایک سفید چادر لکڑی سے باندھ کر لے آیا۔

"یہ خان دوراں کو تھماؤ!" حیرت خان نے اسے حکم دیا۔

ملوک کے قدم بڑھے۔ پھر خان دوراں کی آگ برساتی آنکھوں کا سامنا ہوا تو اس کے قدم رک گئے۔ صدیوں پرانی سرداری کا خوف اس پر غالب آ گیا!

"بڑھو!" حیرت خان اتنی قوت سے چیخا کہ اس کی آواز بھرا گئی۔

ملوک خان نے صلح کا سفید پرچم خان دوراں کی طرف بڑھایا۔ خان دوراں غصّہ میں بے قابو ہو گیا۔ اس نے حقارت سے سفید پرچم پر تھوک دیا اور پوری قوت سے ملوک خان کی کلائی پر ٹھوکر ماری۔ سفید پرچم زمین پر جا گرا۔

سفید پرچم گرتے ہی حیرت خان کی انگلی لبلبی پر دب گئی اور گولی خان دوراں کا سینہ چیرتی آر پار نکل گئی۔ خان دوراں کا خون میں نہایا ہوا جسم سنگلاخ زمین پر تڑپنے لگا۔ وہاں موجود ہر فرد کو سانپ سونگھ گیا تھا!

اچانک حیرت خان کو یاد آیا کہ اس کی پنڈلی زخمی ہے۔ اس نے رائفل کی گرم نالی مٹھی میں تھامی اور کندہ زمین پر ٹیک دیا۔

جب تک خان دوراں کے بدن میں زندگی کی ذرا بھی رمق باقی رہی، خان اسے نفرت اور قہر بھری نظروں سے گھورتا رہا اور جب آخری ہچکی لے کر بدن بے جان ہوا تو یکایک حیرت خان کا دل بھر آیا۔

اس نے بابا کہہ کر ایک جگر خراش چیخ ماری اور خان دوراں کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔

اس نے کوہاک کے خود غرض، سفاک اور مکّار سردار کو تو ہلاک کر دیا تھا مگر خود بھی یتیم ہو گیا تھا!

ان پہاڑوں سے ہر صبح موت اور تباہیوں کا پیغام لے کر طلوع ہوتی

تھی مگر اس روز چشم فلک نے عجیب منظر دیکھا۔

ایک سوگوار نوجوان لنگڑاتا ہوا سفید پرچم اپنے سر سے اونچا اٹھائے ان اجل خیز پہاڑوں کے ایک درّے سے نکل رہا تھا۔ اس چوکی کے فوجی کمان کو بھی اپنی دوربین پر یقین نہ آیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس نوجوان کے پیچھے مرد، عورتیں اور بچے ساز و سامان اٹھائے درّے سے نکل رہے ہیں تو چوکی پر نقیب نے پوری قوت سے صلح کا بگل بجا دیا۔ اس کی آواز پہاڑوں میں میلوں دور تک گونجتی چلی گئی۔

جنگ آزما قبائلیوں کا کارواں دوربین سے دیکھ لیا گیا تھا۔ مگر اسے چوکی تک پہنچنے کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ فوراً موا اصلاتی رابطے حرکت میں آگئے اور قرب و جوار سے چاق و چوبند فوجی دستے ڈبل مارچ کرتے وہاں پہنچنے لگے۔

ہر فوجی کا چہرہ مسرّت سے دمک رہا تھا۔ نگاہوں میں عجیب رونق سمٹ آئی تھی۔ پھر فوجی دستے قطار بند ہو کر اس طرف بڑھنے لگے جہاں کارواں کے آنے کی امید تھی۔ پھر تمام لاریاں بھی فوری طور پر ادھر روانہ کر دی گئیں۔

جس وقت وہ لوگ باہر آئے تو فوجی کمانڈر نے بڑھ کر حیرت خان کا استقبال کیا۔ اس کے ہاتھ سے سفید پرچم لے لیا گیا۔ اس وقت حیرت خان کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ باپ کے غم میں ساری رات لاش کے سرہانے بیٹھا رو تا رہا۔ اس کی آنکھیں ورم آلود ہو گئی تھیں اور آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہے جا رہے تھے اسے یتیمی کا صدمہ ضرور تھا مگر وہ اپنے ضمیر سے مطمئن تھا!

اس کے پیچھے چند لوگ چادر میں لپٹی ہوئی ایک لاش لا رہے تھے باقی لوگ اپنا اسلحہ ایک طرف ڈھیر کرنے لگے تو کمانڈر کی آواز گونجی "اسلحہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں مہمان ہیں۔ ان علاقوں کے اصل محافظ آپ ہیں صرف ہمیں وے دیتے جائیں!"

کوہاک والے اس اعلان پر ششدر رہ گئے۔

"تم زخمی ہو نوجوان، تمہاری حالت بھی غیر ہے، جیپ میں بیٹھ جاؤ" کمانڈر حیرت خان سے کہہ رہا تھا "اور یہ لاش کس کی ہے!"

حیرت خان نے متورم آنکھیں اٹھائیں۔ وہ بولا تو اس کی آواز بھر بھرانے لگی "یہ شخص زندہ تھا تو کوہاک کا سردار، خان دوراں تھا۔ میں نے اسے مار دیا۔ اب یہ میرے بابا کی لاش ہے، میں اسے کوہاک کی مٹی ہی میں دفن کروں گا"

کمانڈر کی نظریں حیرت خان کے احترام میں جھک گئیں پھر اس نے پھرتی سے ایڑیاں ملائیں، زمین پر دھمک گونجی اور اس نے حیرت خان کو سیلوٹ پیش کیا۔

پھر زخمی اور بوڑھوں کو لاریوں میں بٹھا لیا گیا۔ جو جگہ باقی رہی اس میں کچھ عورتیں آگئیں مگر ہزاروں کا وہ ہجوم چند لاریوں میں کہاں سماتا۔

خان دوراں کی لاش اسی جیپ کے عقبی حصے میں تھی جس میں حیرت خان سوار تھا۔ گاڑیوں کے انجن بیدار ہوتے اور قافلہ دھیمے دھیمے آگے بڑھنے لگا۔ فوجیوں کا ایک دستہ سب سے آخر میں تھا!

پہاڑی راستوں سے گزر کر جب یہ کارواں پختہ سڑک پر پہنچا تو کوہاک والوں میں ہیجان سا پھیل گیا بچے بے قابو ہو کر شور مچاتے سڑک پر دوڑنے لگے۔

ریشم تنگی کی پہاڑیاں صاف کی جا چکی تھیں اور اب کئی لاریاں پہلو بہ پہلو اس سڑک سے گزر سکتی تھیں۔ پھر انہیں خاردار تاروں کی باڑھ میں گھری ہوئی کوہاک کی ویران بستی نظر آئی جو کئی مہینے گزرنے کے باوجود جوں کی توں کھڑی تھی۔ ہر گھر کے دروازے اپنے مکینوں کے انتظار میں وا تھے!

بچھڑی ہوئی بستی کو دیکھتے ہی لوگ بے قابو ہو گئے۔ بچے اور عورتیں بستی کی طرف بڑھ گئیں، مرد حیرت خان والی جیپ کے پیچھے چلتے رہے۔ اس بدنصیب کے بابا کی آخری رسوم ادا کیے بغیر وہ اپنے گھروں میں گھسنا نہ چاہتے تھے مگر جیپ ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گئی!

جب وہ لوگ کوہاک سے نکلے تو یہ عمارت وہاں نہ تھی۔ کمانڈر حیرت خان کو اندر لے گیا تو پتہ چلا کہ وہ مختصر سا ہسپتال ہے۔ نوجوان فوجی ڈاکٹر نے اپنے ہسپتال کے پہلے شہری مریض کو خوش آمدید کہا اور زخم کا تفصیلی معائنہ کرنے لگا۔

"یہاں اسکول کب کھلے گا؟" یہ سوال کرتے ہوئے حیرت خان اپنے دکھ بھول کر مسکرا اٹھا۔

"بستی آباد ہو گئی ہے۔ اب پہلا کام یہی ہوگا" کمانڈر نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا۔

جب حیرت خان مرہم پٹی کرا کے ہسپتال سے باہر آنے لگا تو پہلی ہی سیڑھی پر اس کے قدم رک گئے اس کی نگاہ بستی پر جمی ہوئی تھی بستی کی ویران گلیوں کی بہاریں لوٹ آئی تھیں۔ رائفلوں، مشین گنوں اور بموں کی جان لیوا گھن گرج کے سائے میں دہشت کے دن گزارنے والے بچے شور مچاتے کھیلتے کودتے پھر رہے تھے۔ کچھ بچے ان فوجیوں کو تنگ کر رہے تھے جو احکام پاتے ہی بستی کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ ہٹانے میں مصروف ہو گئے تھے!

کوہاک کے مکین لوٹ آئے تھے وہ خود اپنے گھروں کے محافظ تھے، فوج کا کام ختم ہو چکا تھا۔

حیرت خان کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر وہ باپ کی موت کا صدمہ بھول گیا۔ اس نے اپنے سینے پر یتیمی کا داغ لے کر کوہاک کے نہ جانے کتنے بچوں کو یتیمی سے بچا لیا تھا۔ اس کا سر غرور سے تن گیا اور وہ رائفل کا کندہ ٹیکتا جیپ کی طرف ہو لیا جو آتش و آہن کی بوچھاڑ میں تعمیر کی جانے والی شاہراہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس چمکیلی اور پختہ سڑک نے ریشم تنگی کے بلند و بالا پہاڑوں کا صدیوں پرانا غرور خاک میں ملا دیا تھا حیرت خان کو فخر تھا کہ اب اس کا قبیلہ اس سڑک کا نگہبان ہوگا جو اس کے ڈیرے کو تقریباً چھوتی ہوئی ایک طرف تا دابل تک چلی گئی تھی اور دوسری طرف کنارک تک پہنچنے والی تھی!

دو مجسمہ سازوں کا عبرتناک قصہ

جرم و سزا کی اس کہانی کا انجام آپ کی توقع کے بالکل خلاف ہے

پگھلتا آدمی

ابو سلمان

جیری رمن کو وہ گفتگو اچھی طرح یاد تھی جو اس کے اور نیڈ اپیکلے کے درمیان اُس شام ہوئی تھی جب اس کی آرٹ گیلری کا افتتاح ہوا تھا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑے ہوئے مصوّر ڈیو بوفٹ کے رنگین اور تجریدی آرٹ کی شاہکار تصویروں کی تعریف کر رہے تھے۔

"تمہاری گیلری اگرچہ چھوٹی ہے مگر بہت اچھی ہے۔" نیڈ نے گیلری کے بیرونی باغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں فن سنگ تراشی کے بہترین نمونے سلیقے اور ترتیب سے رکھے ہوئے تھے "اگر مجھے یہاں اپنے فن کی نمائش کرنے کا موقع مل سکا تو یہ میرے لئے فخر کی بات ہوگی۔"

جیری کسی قدر نشے میں تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ نیڈ جیسے مشہور سنگ تراش کے مجسموں کی نمائش کے موقع کو ہاتھ سے جانے دیتا۔

"کیا تم ابھی معاہدہ کرنے کے لئے تیار ہو؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"اوہ ابھی نہیں جیری۔ ابھی میرے پاس اتنی تعداد میں اچھے مجسمے نہیں ہیں کہ تم صرف میرے مجسموں کی نمائش کر سکو۔" نیڈ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "لیکن میں آج کل ایک بڑا مجسمہ بنا رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ میرا شاہکار ثابت ہوگا۔ میں نے اس کا نام نیم رکھا ہے جو کہ تھائی لینڈ کے ایک دریا کا نام ہے لیکن اگر تم اسے الٹا پڑھو تو مین بن جاتا ہے جس کے معنی آدمی کے ہیں۔ یہ فطری قد و قامت کے مطابق ایک آدمی کا عریاں مجسمہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب وہ مکمل ہو جائے گا تو انسان کی ارتقائی کیفیتوں کی بڑی اچھی نمائندگی کرے گا۔"

ایک ایسے مجسمے کی نمائش کے تصوّر نے جیری کو جوش سے بھر دیا۔ اگر اس کی گیلری میں نیڈ کے آئندہ شاہکار کی نمائش ہو سکے تو یہ اس کی آرٹ گیلری کی شہرت کے لئے ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگا۔

"تم وہ مجسمہ کس چیز سے بنا رہے ہو؟" اس نے پوچھا "پتھر ہے یا مٹی ہے؟"

وہ جانتا تھا کہ نیڈ اپنی مجسمہ سازی میں دونوں ہی چیزیں استعمال کرتا ہے۔ اس نے بڑے بڑے مجسمے بھی مٹی سے تیار کئے تھے جبکہ دوسرے مجسمہ ساز مٹی کو یا تو چھوٹے مجسموں کے لئے یا پھر ابتدائی ماڈلوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔

"اس مرتبہ میں نہ تو مٹی استعمال کر رہا ہوں اور نہ پتھر۔" نیڈ نے بتایا "نیم ایک نئی طرح کے پلاسٹک سے تیار کیا جا رہا ہے جس کے بارے میں مجھے حال ہی پتہ چلا ہے۔ یہ پلاسٹک سو ڈگری فارن ہائٹ سے کچھ زیادہ درجۂ حرارت پر نرم پڑ جاتا ہے اور صرف ۱۲۵ ڈگری پر اس قدر نرم ہو جاتا ہے کہ اسے آسانی سے اپنی مرضی کے مطابق ہر شکل دی جا سکتی ہے اور یہ حرارت اتنی زیادہ بھی نہیں ہوتی کہ اسے ہاتھوں سے بنانا مشکل ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ پلاسٹک تکمیل کے بعد مجسمہ میں ایک ایسی جِلا پیدا کر دے گا جو مجسمہ کا بنیادی تاثر بڑھانے اور اس تاثر کی وضاحت کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔"

"کیا تم اپنا مجسمہ تین ہفتوں میں مکمل کر سکتے ہو؟"

"شاید۔ لیکن تین ہفتوں کی کیا خصوصیت ہے؟"

"بات یہ ہے کہ تین ہفتے بعد ایک انعامی مقابلہ ہو رہا ہے جس میں شرکت

کے لئے کئی نامور مجسمہ سازوں کو دعوت دی جاچکی ہے۔" جیری نے بتایا" انعام بھی خاصا معقول ہے۔ مقصد اس مقابلہ کا یہ ہے کہ میری آرٹ گیلری کو کچھ اچھی پبلسٹی مل جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے مجسمے کو اس انعامی مقابلے میں ضرور رکھو۔"

" بڑی خوشی سے۔ بشرطیکہ وہ اس مدت میں تیار ہو جائے۔" نیڈ نے جواب دیا" انعام کی رقم کتنی ہے؟"

" پانچ ہزار ڈالر۔ اور اگر کوئی اپنا شاہکار فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دس ہزار ڈالر۔"

اتنی بڑی رقم سن کر نیڈ بہت خوش ہوا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اُسے اس مقابلے سے دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ان کی گفتگو کچھ دوسرے مہمانوں کی مداخلت کی وجہ سے دوسرے موضوعات پر ہونے لگی۔ سارے ہی مہمان جیری کی آرٹ گیلری سے متاثر معلوم ہوتے تھے۔

" بہت اچھی گیلری ہے۔" کسی نے کہا" میں دل سے تمہاری کامیابی کا متمنی ہوں۔"

" اس قصبہ کو ایک ایسی ہی آرٹ گیلری کی ضرورت تھی۔" دوسرے نے کہا۔

جیری فطری طور پر ان تعریفی کلمات سے مست محسوس کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ دولت مند لوگ جو اس وقت دعوت اڑانے اور تعریفیں کرنے میں پیش پیش ہیں، کاش اسی جذبے کے ساتھ بعد میں ان شاہکاروں کو خریدنے کے لئے آنے کی زحمت بھی گوارا کرلیں۔ جیری نے اس آرٹ گیلری میں اپنا سرمایہ لگا دیا تھا اور اب اس کی کامیابی ہی سے اس کی تمام تر توقعات وابستہ تھیں۔

اسی شام اس کی نیڈ سے مزید گفتگو ہوئی۔ نامور مجسمہ ساز اس وقت تک کافی شراب پی چکا تھا اس کے بال پریشان تھے اور وہ منہ ہی منہ میں اپنی بیوی کے بارے میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

" فران کیسی ہے؟" جیری نے پوچھ ہی لیا" میرا تو خیال تھا کہ تم آج شام اُسے اپنے ساتھ لاؤ گے۔"

" فران کچھ اچھی عورت ۔۔۔ ۔۔۔" نیڈ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر بولا" وہ غالباً اس وقت کارلٹن کے ساتھ ہو گی۔"

" کیا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے؟" جیری نے پوچھا۔

کارلٹن ایک نقاد تھا اور قصبہ کے اکلوتے اخبار میں آرٹ کے بارے میں اس کی تنقیدیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ وہ چھوٹے قد اور معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا کوئی اُسے دل سے پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر کچھ عورتوں میں وہ بہت مقبول تھا جو شاید اس سے محبت بھی کرتی تھیں۔" ہاں اب تک چل رہا ہے۔" نیڈ نے اثبات میں سر ہلایا" لیکن اب یہ کھیل میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ کسی نہ کسی دن میں اسے قتل کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ جیری کچھ دوسرے مہمانوں سے باتیں کرنے لگا۔ ایک دولتمند شخص ایک تصویر خریدنا چاہتا تھا اور جیری اس سے معاملہ طے کرنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ وقتی طور سے اس کے ذہن سے نیڈ کی ازدواجی زندگی کے جھگڑے یا اس کے مجسمے نیم کے بارے میں سب کچھ نکل گیا۔

دو ہفتے بعد نیڈ نے فون پر بتایا کہ مجسمہ مکمل ہو چکا ہے اور یہ کہ وہ ہفتہ عشرہ کے لئے چھٹی منانے باہر جا رہا ہے مگر فران اپنے ٹرک میں مجسمہ گیلری تک پہنچا دے گی۔

" تمہیں اسے ٹرک سے اتارنے کا انتظام کرنا پڑے گا۔" اس نے کہا۔

" وہ کتنا وزنی ہے؟"

" وزن دو سو پونڈ سے زیادہ ہی ہے۔"

" اچھی بات ہے۔ میں اسے اتارنے کا انتظام کروں گا۔" جیری نے جواب دیا۔

اس گفتگو کے دو دن بعد فران ٹرک میں مجسمہ لے آئی۔ جیری کے خیال میں فران ایک دلچسپ عورت تھی۔ طویل القامت اور تندرست و توانا۔ نہ صرف جسمانی اعتبار سے بھی بلکہ ذہنی اعتبار سے بھی۔ چہرہ خوبصورت اور بچوں جیسی معصومیت لئے ہوتے تھا۔ آنکھیں بڑی اور سوچ کی گہرائی لئے ہوئے اور وہ خود بھی ایک آرٹسٹ تھی اور جیری کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اگر نیڈ اسے کام کرنے کا موقع دیتا تو فران بھی ایک نامور آرٹسٹ بن سکتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے کچلے ہوئے جذبات کی تسکین کے لئے دوسروں کے بازوؤں کا سہارا تلاش کرتی تھی۔

" میں اسے لے آئی ہوں۔" فران نے کہا" مگر وہ بھاری بہت ہے۔"

" تم تو خیریت سے ہو؟" جیری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

" ہاں ٹھیک ہی ہوں۔" فران نے ٹرک سے اترتے ہوئے جواب دیا" تمہارے پاس کوئی آدمی ہے جو اُسے ٹرک سے اتارنے میں مدد دے سکے۔"

" دو آدمی اندر موجود ہیں۔" جیری نے بتایا" تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔"

" ہاں تھکی ہوئی ہوں۔ نیڈ خود تو چلا جاتا ہے اور اپنا کام مجھ پر چھوڑ جاتا ہے۔"

" پیر کی رات کو جج صاحبان اوّل انعام کے مستحق مجسمہ کے بارے میں فیصلہ دیں گے۔ کیا نیڈ پیر تک واپس آجائے گا؟"

" مجھے اس میں شبہ ہے۔" فران نے کہا" وہ کل ہی دوپہر کے طیارے سے مانٹریال گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اُسے ایک ایسی جگہ معلوم ہے جہاں اگست کے مہینے میں مچھلیوں کا شکار بہت اچھا ہوتا ہے۔"

جب مجسمہ حفاظت سے اتار کر اندر گیلری میں پہنچا دیا گیا تو جیری نے لکڑی کے تختوں سے بنائے گئے اس کیس کو کھول کر جس میں مجسمہ رکھا ہوا تھا مجسمہ باہر نکالا۔ جو کچھ اس نے دیکھا وہ بہت ہی حیرت انگیز تھا۔ بلاشبہ یہ مجسمہ نیڈ کے فن کا شاہکار تھا۔ وہ تقریباً سات فٹ لمبا تھا اور اس سے بے پناہ قوت کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ ایک عریاں آدمی تھا جو گھٹنوں تک جیسے پانی کی لہروں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسے تاثرات کا اظہار ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے شانوں پر کوئی نادیدہ بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ تہذیب انسانی کے ابتدائی دور کے انسان کا ایک مثالی نمونہ تھا۔

" حیرت انگیز!" جیری نے تعریف کی" نیڈ نے اب تک جتنے مجسمے بنائے ہیں یہ ان سب میں بہترین ہے۔"

" واقعی بہت اچھا ہے۔" فران نے تائید کی" مجھے خوشی ہے کہ نیڈ نے ایک نادر شاہکار تخلیق کیا ہے۔"

" میں اسے موقع و محل کے اعتبار سے بہترین جگہ نصب کروں گا جہاں جج صاحبان اس کے تمام خدوخال نمایاں طور سے دیکھ سکیں۔"

" ججوں کے فیصلے سے مجھے مطلع کرنا نہ بھولنا۔"

" سب سے پہلے تمہیں اطلاع دوں گا۔" جیری نے یقین دلایا۔

اس نے فران کو ٹرک میں بیٹھ کر جاتے دیکھا۔ اور پھر مجسمے کا مزید تنقیدی جائزہ لینے اندر چلا گیا۔ پھر پیر کی رات کو جب ججوں کی کمیٹی نے" نیم" کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اسے پہلے سے اس کی توقع تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کے دوست نے ایک شاہکار مجسمہ تخلیق کیا ہے اور یہ کہ یہ شاہکار مجسمہ اس کی آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ حسب وعدہ فیصلے کے اعلان کی تقریب ختم ہوتے ہی اس نے فران کو فون کیا۔

" جیسا کہ میں نے کہا تھا نیم کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

" اوہ یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ نیڈ سنے گا تو بے حد مسرور ہو گا۔"

" کیا تمہیں اس کا کینیڈا کا پتہ معلوم ہے؟" جیری نے پوچھا" میں اسے تار دینا چاہتا ہوں۔"

دوسری صبح اس نے نیڈ کو مبارکباد کا تار روانہ کیا۔ پھر گیلری میں آکر بڑی دیر تک مجسمہ کو تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ بہت اچھی جگہ رکھا تھا مگر جیری پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ گیلری میں داخل ہوں تو سب سے پہلے ان کی نظریں انعامی مجسمے پر ہی پڑیں۔ مجسمہ ایسی جگہ ہونا چاہیئے جہاں دیکھنے والے اسے کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد دیکھیں اور ایسی جگہ باہر باغ میں ہی ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے دن صبح کو، جو کہ گرمی کی تازہ آئی ہوئی لہر کا پہلا دن تھا۔ اس نے مجسمہ اٹھوا کر باغ میں رکھوا دیا۔ مجسمہ باغ میں تین دن تک کھڑا رہا اور عجیب بات یہ تھی کہ ان تین دنوں میں کسی نے بھی اس کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ جمعرات کی رات کو جبکہ جیری گیلری بند کر رہا تھا، بالکل اتفاق سے اسے ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ وہ مجسمہ کو صاف کر رہا تھا کہ اس نے کچھ چپک سی محسوس کی اور تب اس نے دیکھا کہ مجسمہ کا دایاں بازو پگھلنا شروع ہو گیا ہے۔

جیری سہم کر رہ گیا۔ بعد از وقت اسے یاد آیا کہ نیڈ نے اس نئی قسم کے بارے میں جس سے وہ مجسمہ بنا رہا تھا، کہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ پلاسٹک سو ڈگری فارن ہائٹ کی گرمی میں نرم پڑنے لگتا ہے اور گزشتہ تین دن سے دن میں درجہ حرارت سو ڈگری سے کہیں زیادہ رہا تھا۔ خاص طور سے اس کھلی جگہ میں جہاں دھوپ بھی آتی تھی اور دھوپ کی تمازت نے پلاسٹک کو پگھلا دیا تھا۔

جیری کچھ زیادہ توجہ سے نقصان کا جائزہ لے رہا تھا کہ اُسے پلاسٹک کی سطح کے نیچے غیر معمولی سختی محسوس ہوئی۔ کیا مجسمہ کے اندر کسی قسم کا کوئی فریم رکھا گیا ہے؟ اس نے سوچا۔ وہ ایک ٹارچ لے آیا اور ٹارچ کی تیز روشنی میں پگھلے ہوئے بازو کو زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔ اندر کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی۔

اور تب اسے یقین ہو گیا۔ مجسمہ کے ہاتھ کے اندر ایک انسانی انگلی نظر آرہی تھی۔ وہ ایکدم کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ سوچ رہا تھا لیکن ...... وہ مجسمے کے دوسرے ہاتھ کی طرف گیا۔ جیب سے اپنا سگریٹ لائٹر نکالا اور اسے جلا کر شعلے کو دوسرے ہاتھ کی انگلی کے بہت قریب لے گیا۔ چند سیکنڈ کے اندر سطح کے اوپر چڑھا ہوا پلاسٹک پگھل گیا اور دوسرے ہاتھ کی انگلی نے جھانک کر ایک خوفناک حقیقت کا انکشاف کیا۔ نیڈ کے مجسمے کے اندر ایک انسانی جسم پوشیدہ تھا۔

جیری بڑی دیر تک فون کے پاس بیٹھا رہا۔ اسے احساس تھا کہ اسے فوراً اس معاملہ کی رپورٹ پولیس میں کرنی چاہیئے۔ اور اس نے ایک مرتبہ تو ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل بھی کرنا شروع کر دیا تھا لیکن پھر رک گیا۔ اس خوفناک انکشاف کے سلسلہ میں جو پبلسٹی ہو گی، وہ اس کی آرٹ گیلری کے لئے تباہ کن ثابت ہو گی۔ اور نیڈ تو یقیناً ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائے گا۔ لاش کی برآمدگی بذاتِ خود کچھ کم خطرناک نہیں تھی۔ پھر اس کا اوّل انعام یافتہ مجسمے کے اندر پوشیدہ ہونا کریلا اور نیم چڑھا کے مصداق تھا۔

انہی خیالات کے دوران اسے اچانک کارلٹن کا خیال آیا۔ کارلٹن ججوں کے فیصلہ کی تقریب میں موجود نہیں تھا۔ اب جو اس نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اس نے کئی ہفتوں سے نہ کارلٹن کو دیکھا ہے اور نہ اخبار میں اس کا کالم پڑھا ہے، اور کسی خیال کے زیر اثر اس نے اخبار کے دفتر فون کیا اور کارلٹن سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

" کارلٹن کو تو میں نے بہت دن سے نہیں دیکھا۔" کسی نے جواب دیا" میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک اپنی رخصت سے واپس نہیں آیا۔ غالباً اس ہفتہ تک آجائے گا۔"

" شکریہ!" جیری نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

وہ دوبارہ باہر باغ میں گیا اور دیر تک مجسمہ کو دیکھتا رہا۔ اسے نیڈ کے وہ الفاظ یاد آرہے تھے جو اس نے آخری ملاقات میں کہے تھے۔

" وہ غالباً اس وقت کارلٹن کے ساتھ ہو گی۔ اب یہ کھیل میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ کسی نہ کسی دن میں اسے قتل کر دوں گا۔"

اور فران بذاتِ خود مجسمہ لے کر آگئی تھی۔ کیا اسے اس بارے میں معلوم ہے؟ کیا اسے کچھ بھی شبہ ہے؟ یہ بظاہر ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ جیری دوبارہ اپنے آفس میں آیا اور فران کا نمبر ڈائل کیا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا بہتر تھا۔

" فران، میں جیری بات کر رہا ہوں۔"

" جیری، کیسے ہو۔ نمائش کیسی جا رہی ہے؟"

" ٹھیک ہے، مگر فران ایک مشکل پیش آگئی ہے۔ کیا نیڈ کینیڈا سے واپس آگیا ہے؟"

" نہیں، ابھی نہیں آیا۔ آج شام ہی میں نے اس سے فون پر بات کی تھی۔ اس کا ارادہ ابھی کچھ دن اور ٹھہرنے کا ہے بلکہ وہ تو مجھ سے بھی اصرار کر رہا تھا کہ میں بھی مانٹریال آجاؤں۔"

' وہ یہی کہے گا' جیری نے دل میں سوچا' وہ واپس آتے ہوئے ڈرتا ہے۔'

" بات یہ ہے فران کہ مجسمے کے سلسلہ میں ایک پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اسے نمائش سے اس وقت تک ہٹا لیا جائے جب تک کہ نیڈ اس کی ضروری مرمت نہ کر دے۔"

" اوہ!"

" دراصل میں نہیں چاہتا کہ اس کا شاہکار مجسمہ مزید خراب ہو۔ تم سمجھ رہی ہو؟"

" اچھی بات ہے۔ میں ٹرک لے کر آجاؤں گی۔ تم اسے ٹرک میں رکھوا دینا۔ جب نیڈ واپس آئے گا تو خود ہی جو مناسب سمجھے گا کرے گا۔"

جیری کے نزدیک بھی پولیس کو اطلاع دینے کے بجائے یہ ترکیب زیادہ مناسب تھی۔ کم سے کم اس کی آرٹ گیلری تو بدنامی سے بچ جائے گی۔ پھر نیڈ جانے اور اس کا کام۔

" ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا" کل صبح پہلا کام یہی کرنا ہے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ گیلری کے اسٹور روم میں گیا تاکہ کوئی ایسا کپڑا یا پردہ وغیرہ تلاش کرے جسے مجسمہ پر ڈال کر اُسے ڈھکا جا سکے۔

فران وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح ہی پہنچ گئی۔ نیڈ ہیوں والی گاڑی کے ذریعے کپڑے سے ڈھکا ہُوا مجسمہ ٹرک میں رکھ رہا تھا کہ فران اس کے پاس آئی:

"میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ مجسمہ کو کیا نقصان پہونچا ہے۔" اس نے کہا۔

ان دونوں کی نظریں ایک ثانیہ کے لئے ملیں اور جیری کو یقین ہو گیا کہ فران بھی اس راز کو جانتی ہے۔ اس نے مجسمہ کے ایک ہاتھ پر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا۔

"میں اسے کسی صورت اپنی گیلری میں نہیں رکھ سکتا۔" اس نے فران سے کہا "اور نہ کسی طرح اس معاملہ میں ملوث ہونا چاہتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" فران نے سنجیدگی سے کہا۔

"آخر اُس نے کیا سوچ کر یہ خطرناک اقدام کیا۔" جیری نے کہا

فران نے کوئی جواب نہ دیا اور ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گئی مجسمہ ٹرک میں رکھا جا چکا تھا اور ابھی جیری کو کچھ اور بھی کہنا تھا۔ وہ فران کے پیچھے چلا۔

"میں چاہتا تو پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا" وہ بولا "بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ آخر میں نے ایسا کیوں نہیں۔"

"مجھے جلد ہی گھر واپس پہونچنا ہے۔" فران نے بات ٹال دی۔

"نیڈ کینیڈا سے کب واپس آ رہا ہے؟"

"مجھے امید نہیں کہ وہ اب کبھی بھی واپس آئے گا۔"

"شاید یہی اس کے لئے مناسب بھی ہے۔" جیری نے کہا۔

ٹرک ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔

بہت کم لوگوں نے نمائش میں اوّل انعام یافتہ مجسمہ "نیم" کی عدم موجودگی کو محسوس کیا اور جنہوں نے پوچھا بھی انہیں جیری نے کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے مطمئن کر دیا۔ پورا ایک ہفتہ کسی خاص واقعہ کے بغیر خاموشی سے گزر گیا۔ لیکن جیری جانتا تھا کہ جلد یا بدیر کارلٹن کی گمشدگی پر ضرور چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی۔

اس روز پیر کا دن تھا۔ فران کو مجسمہ لے جائے ہوئے دس دن گزر چکے تھے۔ صبح کے وقت جیری نے اخبار کا تازہ پرچہ کھولا اور سردی کی ایک لہر سی اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اُترتی محسوس ہوئی۔ اخبار میں کارلٹن کا تنقیدی کالم مع اس کی مسکراتی ہوئی تحریر کے موجود تھا۔

وہ فوراً اخبار کے دفتر پہونچا۔ ایک چپراسی کو روک کر اس نے پوچھا۔

"میں نے سنا ہے کہ کارلٹن اپنی رخصت سے واپس آگیا ہے۔"

"ہاں، وہ اپنے دفتر میں ہے۔" چپراسی نے اشارے سے بتایا۔

اور سچ مچ وہ اپنے آفس میں موجود تھا جیری کے قدموں کی آواز سن کر وہ اس کی طرف گھوما۔

"ہیلو جیری!" وہ مسکرایا "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری انعامی تقریب میں شریک نہ ہو سکا۔"

"مجھے بھی اس کا افسوس ہے۔"

"دراصل میں کینیڈا میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔"

اسے کینیڈا ہی میں ہونا چاہئے تھا۔ جیری نے دل میں کہا۔ آخر کسی کو تو وہ تار وصول کرنا تھا جو اس نے بھیجا تھا۔

"کیا اب وہ وہاں چلی گئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کون؟"

"فران۔ کیا وہ کینیڈا میں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔" کارلٹن نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا "مجھے معلوم ہُوا ہے کہ ججوں نے نیڈ کے مجسمے کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔"

"وہ ان کی غلطی تھی۔" جیری نے سنجیدگی سے کہا "انعام تو حقیقت میں فران کو ملنا چاہئے تھا۔ یا پھر تم نے بھی اس کی مدد کی تھی؟"

"میں سمجھا نہیں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔" جیری سخت لہجے میں بولا "نیڈ اس مجسمہ کو مکمل کر ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ خود اس کے اندر تھا۔"

"تم شاید پاگل ہو گئے ہو۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں یہ بات بھول گیا تھا کہ فران بھی بڑی اچھی مجسمہ ساز ہے۔ غالباً اپنے شوہر سے بھی اچھی۔"

کارلٹن نے اُسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"کیا تم نے کسی اور سے بھی یہ بات کہی ہے؟" اس نے پُوچھا۔

"نہیں۔"

"اور عقلمندی کا تقاضا ہے کہ تم کسی سے اس کا ذکر بھی نہ کرو۔" کارلٹن نے کہا۔ جیری مُسکرانے لگا۔

"مجھے تعجب ہوگا اگر فران اس مجسمہ کو ضائع کرنے کے بارے میں سوچے۔ وہ اُس کے فن کا مکمل ترین نمونہ ہے۔ شاید نیڈ بھی اس سے بہتر مجسمہ بنانے کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا۔ اور فران یہ بات جانتی ہے۔ کیا تمہارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ وہ اس مجسمہ کو ضائع کر کے دوسرا مجسمہ بنانے کی کوشش کرے۔"

"چلے جاؤ یہاں سے۔ میں اس بارے میں کوئی مزید بات سننا نہیں چاہتا۔"

"میرا خیال ہے کہ اگر پولیس اب بھی اس کے گھر پہنچ جائے تو اسے وہ مجسمہ مل سکتا ہے۔" جیری نے کارلٹن کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی "اور پولیس کو یہ معلوم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ وہ مجسمہ نیڈ کی لاش پر پلاسٹک چڑھا کر بنایا گیا ہے۔"

کارلٹن نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ اس کمرے میں تنہا ہیں۔ "آخر تم چاہتے کیا ہو؟" اس نے پُوچھا "کیا روپیہ؟"

"میں۔۔۔" اس نے کہنا شروع کیا۔

"دس ہزار ڈالر کافی ہوں گے۔" کارلٹن جلدی سے بول اُٹھا۔

جیری نے ایک گہری سانس لی اور کارلٹن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجھے کیا چاہیئے۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "اگر فران اس مجسمہ کے پگھلے ہوئے بازو اور انگلی کو اس طرح درست کر سکے کہ دیکھنے والوں کو کوئی فرق محسوس نہ ہو تو میں اس مجسمہ کو دوبارہ اپنی آرٹ گیلری میں نصب کرنا چاہتا ہوں۔"

اگر کسی کی بیوی اٹھارہ گھنٹے سوتی ہو تو اسے کیا کرنا چاہیئے

امریکہ سے تازہ ترین ایک عجیب کہانی

نوید بصیر

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے لیکن ہیلن نے شاید یہ مقولہ کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں صرف آٹھ گھنٹے جاگتی تھی، اور پھر پورے چودہ گھنٹے گہری نیند سوتی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہر رات نو بجے بستر میں گھستی، اور پھر دوسرے دن گیارہ بجے تک سوتی رہتی، ایک دن جب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو میں نے جھنجھلا کر اس سے پوچھا "تم اتنا کیوں سوتی ہو، پینتیس سالہ عورت کے لئے اتنی طویل نیند قطعی غیر ضروری ہے۔"

"کیا کروں مجھے اپنی نیند پر قابو نہیں رہا ہے۔" اس نے میرے چہرے کے قریب منہ لا کر ایک جماہی لی اور پھر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کسی ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔" میں نے کہا "ممکن ہے تمہیں کسی قسم کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو۔"

"میں شاید بوڑھی ہو رہی ہوں۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "اب میں پہلے جیسی خوبصورت نہیں رہی۔ کم از کم ویسی تو نہیں ہوں جب تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔ میرے دانت خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"دندان ساز کے پاس چلی جاؤ۔ وہ تمہارے دانتوں کو ٹھیک کر دے گا۔"

"مجھے دانتوں کی پرواہ نہیں ہے۔"

"اگر تمہارے دانت خراب ہو گئے تو تم پھر خوبصورت کس طرح رہ سکتی ہو۔"

"میرے دانت اگر ٹھیک رہیں تب بھی حُسن قائم تو نہیں رہے گا۔" اس نے اپنے منہ سے سگریٹ کا گاڑھا ملگجی دھواں اگلتے ہوئے کہا "کیا خیال ہے؟" لیکن میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دانتوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے پھر ایک جماہی لی اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ میں نے اسے کندھوں سے جکڑ لیا "آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیا تم اپنی زندگی اسی طرح سو کر گزار دینا چاہتی ہو۔"

"کیسی زندگی؟"

"دیکھو ہیلن! ہم بہت سا وقت ایک ساتھ بہتر انداز میں گزار سکتے ہیں...!"

"نہیں فل۔" اس نے شکوے کے انداز میں کہا "تمہیں اب میری ضرورت نہیں رہی ہے شاید۔ تمہیں صرف ٹی وی پر کھیل دیکھنے سے دلچسپی رہ گئی ہے۔"

"اور تمہیں سونے سے فرصت نہیں ملتی۔" میں جل کر جواب دیا۔

"نیند ایک نعمت ہے۔ کیا تم زیادہ نہیں سوتے؟"

"لیکن تم بچی تو نہیں ہو۔"

"کبھی کبھی میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ایسا ہو۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "اس طرح مجھے تمہارے اس طعنے سے تو نجات مل جائے گی کہ میں ہر وقت سوتی رہتی ہوں۔"

"آخر تمہیں اتنا سونے میں کیا ملتا ہے؟"

"مجھے نیند میں کسی قسم کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔" اس نے جواب دیا "اور میں یہی چاہتی ہوں کہ مجھے کسی کا احساس نہ رہے۔" ہیلن نے خوابناک لہجے میں کہا۔ اور پھر اپنی آنکھیں

بند کر لیں۔ وہ سو چکی تھی۔

اب ہیلن چودہ گھنٹوں کی بجائے پندرہ گھنٹے سونے لگی تھی۔ اس کی نیند ایسی تھی جیسے کوئی بے ہوش عورت مسہری پر لیٹی ہوئی ہو۔ میں جانتا تھا کہ اب اسے جگانے کی کوشش بے سود ہے۔ وہ کبھی نہیں جاگے گی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اسے جگانے کی کوشش کی تھی۔

"ہیلن۔ اٹھو۔ ہیلن۔" میں نے جھک کر اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کا جسم نرم لیکن فربہ مائل تھا۔ میں نے اکثر اس طرف مبذول کرائی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اس سلسلے میں کوئی حفاظتی تدبیر نہیں کرتی تھی۔ میں اسے بیدار کرنے کے لئے اس امید پر بار بار پکارتا رہا کہ وہ میری آواز سن کر اٹھ جائے گی، یا کم از کم میری باتوں کا کوئی جواب تو دے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ گہری نیند سوتی رہی۔ میں بستر سے اٹھا اور گرم پانی سے غسل کیا۔ باقی ماندہ رات میں نے جاگتے ہوئے گذاری تھی۔ نیند مجھ سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔

ساڑھے پندرہ گھنٹے۔ ایک بار پھر میں نے اسے جگانے کی کوشش کی۔ اس دفعہ میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ جاگ گئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم نے کم عمری ہی میں ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیا تھا ہیلن۔ ممکن ہے کہ تمہاری طویل نیند کی اصل وجہ یہی ہو۔" میں نے اسے ہوش میں آتے دیکھ کر کہا۔

"ہم نے اپنے آپ کو جوان ہونے کا بھی پورا موقع نہیں دیا اور صاحب اولاد بن گئے۔"

"نہیں فل یہ وجہ نہیں ہے۔"

"ممکن ہے کہ پھر بچوں کی پیدائش کا سلسلہ بند کر دینا اس کی وجہ ہو۔۔۔ پگی کی پیدائش کے بعد ہمیں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ ہمیں مزید بچوں کی کیا ضرورت ہے۔"

"اس طرح تمہیں زیادہ سے زیادہ مصروف رہنے کا موقع مل سکتا ہے۔"

"نہیں۔۔ ممکن ہے کہ ہونے والے بچے بھی پگی کی طرح ہوں۔ وہ ہمیں ملنے بھی تو نہیں آتی۔"

"اس کے بچہ ہوا ہے ہیلن۔ برمنگھم سے بروکلین تک خاصا سفر ہے اور کار کے بغیر تو۔۔۔"

"وہ فون تو کر سکتی تھی مگر شاید اس نے کبھی فون کرنے کی بھی زحمت نہیں کی ہے۔" ہیلن نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"فون تو وہ اکثر کرتی رہتی ہے۔ تم جاگتی رہو تو تمہیں پتہ بھی چلے۔ تمہارا سارا وقت تو سونے میں گزرتا ہے۔ تمہاری تمام دلچسپیاں سونے کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا تھا لیکن مجھے اپنے لہجے کی تلخی کا فوراً ہی احساس ہو گیا تھا۔

"میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"بات تو بہرحال کرنا ہی پڑے گی۔ ورنہ پھر کس طرح معلوم ہو گا کہ تمہیں کیا پریشانی ہے۔"

"پلیز فل....." اس کی آنکھوں سے ویرانی جھلکنے لگی اور چہرہ زرد پڑ گیا۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں ہیلن۔ مجھے کم از کم کوشش تو کر لینے دو۔"

"فل ــــ پلیز....."

"کیا بات ہے؟"

"میں اتنی تھک گئی ہوں کہ اب بات بھی نہیں کر سکتی۔" اس نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ سو گئی۔ میرا پورا جسم شدتِ جذبات میں کپکپا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جاگتی رہے لیکن وہ سو گئی تھی ــــ میں جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک شراب خانے میں چلا گیا جہاں میری ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ وہ زیادہ حسین تو نہیں تھی لیکن اس نے خوب خوشبو لگا رکھی تھی اور اس میں زندگی کی بھرپور حرارت موجود تھی۔ میں لڑکی کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا تھا۔ اس کے لئے مجھے پچیس ڈالر خرچ کرنا پڑے جو میرے آدھے دن کا معاوضہ تھے۔ تاہم لڑکی نے اس رقم کا حق ادا کر دیا تھا۔

ہیلن کے سونے کا وقت مزید بڑھ گیا تھا۔ اب وہ سولہ گھنٹے سونے لگی تھی۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور میں اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ جاگ گئی تھی۔

"ہیلن اٹھو اور کپڑے بدل لو۔ میں آج تمہیں ویسٹ ہائیڈ میڈیکل سنٹر لے جانا چاہتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک شاندار جگہ ہے۔ وہاں یقیناً تمہارے مرض کی صحیح تشخیص ہو جائے گی۔"

"لیکن میں جانا نہیں چاہتی۔ بہتر ہو گا کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "جلدی سے کپڑے بدل لو ہیلن ورنہ میں تمہیں زبردستی پہناؤں گا۔"

ہیلن نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ میرا لہجہ بہت سخت تھا۔ اس نے کپڑے بدلے اور میں اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر سیدھا کلینک کی طرف روانہ ہو گیا۔ کلینک پہنچ کر میں نے گاڑی روکی اور اندر چلا گیا۔ ہیلن کار میں بیٹھی میرا انتظار کرنے لگی۔

"میں اپنی بیوی کو دکھانا چاہتا ہوں۔" میں نے ڈیوٹی ڈیسک پر موجود نرس سے کہا۔

"کیا آپ نے وقت طے کر رکھا ہے؟"

"نہیں۔ لیکن یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر یقیناً اس کا معائنہ کرنے کے لئے فوراً ہی آمادہ ہو جائیں گے۔ آپ نام درج کر لیں۔ ہم اپنی باری کا دن بھر انتظار کر سکتے ہیں ــــ" میں نے کہا۔

"آج تو ناممکن ہے۔" نرس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "نام لکھنے کے باوجود تین ہفتے کم از کم لگ ہی جائیں گے۔"

"تین ہفتے!" میں نے حیرت سے چونک کر کہا اور نرس کی طرف دیکھنے لگا۔ نرس ہمدرد لگتی تھی۔ اس نے میرے چہرے پر پھیلتی ہوئی مایوسی کو دیکھا تو پسیج گئی اور رسیور اٹھا کر دبے دبے لہجے میں کسی سے باتیں کرنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے رسیور رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنی بیوی کو لا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اسے دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوتے ہی دیکھ لے گا۔"

"خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔" میں نے زیرِ لب کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر آتے ہی مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ کار اپنی جگہ کھڑی تھی لیکن ہیلن کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ میں جلدی سے کار میں بیٹھا اور اسے دیوانہ وار ڈرائیو کرتے ہوئے ہیلن کو سڑکوں پر تلاش کرنے لگا۔ جب وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی تو تھک ہار کر میں گھر واپس پہنچا۔ اور سیدھا فون کی طرف دوڑا تاکہ پولیس کو اطلاع دے دوں..... لیکن پھر مجھے ٹیلیفون کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہیلن کمرہ نشست میں موجود تھی۔ اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے اور گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے غصہ میں کانپتے ہوئے کلینک فون کیا اور ہیلن کے لئے طے شدہ وقت کو کینسل کروا دیا۔

سترہ گھنٹے۔ اس کی نیند کا ایک گھنٹہ مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی ننھی بچی کی طرح منہ میں انگوٹھا لئے ہمکتی سو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ سونے کا وقت بڑھا رہی تھی، میری اپنی نیند کم ہوتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ صرف تین چار گھنٹوں کے لئے ہی آنکھ لگتی تھی۔ میں ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔ معمولی سی مشقت کے بعد میری سانس اکھڑنے لگتی تھی اور میں بار بار ہانپنے لگ جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ صرف ہیلن کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ ہیلن کے ساتھ رہتے رہتے میری پریشانیوں میں دم بدم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ہیلن کے مسئلے کا جائزہ لینے کے لئے ان گنت کتابیں پڑھیں اور مختلف ماہرینِ علم الاعضاء سے اس بارے میں گفتگو کی لیکن مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ہیلن کے مسئلے کا حل کہیں نہیں تھا۔ کبھی کبھی ہیلن کو دیکھ کر اسی کی ماں یاد آ جاتی تھی۔ میں نے اس عورت کو کبھی پورے اور ڈھنگ کے کپڑوں میں ملبوس نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑی بڑی جماہیاں لیا کرتی تھی، یا پھر سگریٹ پیتی تھی۔ وہ اکثر سگریٹ پیتے پیتے سو جاتی تھی۔ اور پھر ایک روز اس کی یہی عادت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ جلتے ہوئے سگریٹ سے بستر میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گئی..... اب تک ہیلن بستر پر سگریٹ نوشی سے پرہیز کرتی ہے۔ ورنہ اس کا انجام بھی اپنی ماں سے مختلف نہ ہوتا۔

سوا ستر گھنٹے۔ اف۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہ صرف دو گھنٹے کے لئے بیدار ہوئی تھی اور اس کے لئے بھی مجھے بہت کچھ کرنا پڑا تھا۔ پہلے میں اس کے کان میں چیخا اور پھر اسے بستر سے گھسیٹ کر کافی کا ایک کپ اس کے حلق میں انڈیل دیتا۔ میں حیران تھا کہ اگر اس طرح اسے زبردستی نہ کھلایا پلایا جائے تو آخر وہ زندہ کس طرح رہ سکتی ہے۔ خدایا۔ میں کانپ گیا۔ کیا اس کے سونے کا وقت اسی طرح بڑھتا رہے گا..... کیا وہ چوبیس گھنٹے سوتی رہے گی..... آخر کب تک؟ میں ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر تھا اور میرے کالج کا دوست تھا، لیکن میں بہت عرصے سے اس سے نہیں ملا تھا۔ وہ مجھے گھورتا رہا اور میں اسے تفصیل سے سب کچھ بتاتا رہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی ماہر نفسیات کی ضرورت ہے۔ اسے پریشان نہ کرو۔ ممکن ہے کہ ایک دن وہ خود ٹھیک ہو جائے۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ میں اس کا معائنہ کروں تو میری سیکرٹری سے وقت طے کر لو۔"

"وہ یہاں نہیں آئے گی۔" میں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ "اب تو وہ سگریٹ کا پیکٹ خریدنے کے لئے بھی گھر سے نہیں نکلتی۔"

"تب تمہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ زیادہ پریشانی نہ اٹھاؤ۔ تمہارے اعصاب تباہ ہو چکے ہیں۔ ان پر قابو رکھو ورنہ اسپتال کی بجائے چھ فٹ زمین کے نیچے چلے جاؤ گے۔" ڈاکٹر نے مجھے مشفقانہ انداز میں سمجھایا۔ "آرام کرو۔ تمہیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔" میں شدید مایوسی کے عالم میں وہاں سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔

میں واقعی آرام کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے آرام کہاں تھا۔ ہیلن کے سونے کے وقفے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ دن رات میں اٹھارہ گھنٹوں کے لگ بھگ سوتی تھی۔ اس کے برعکس میں اب بمشکل دو گھنٹے سو پاتا تھا۔ پھر آنکھ کھل جاتی۔ میں ہیلن سے تنگ آ چکا تھا۔

مجھے کم از کم ایک ہفتہ فلوریڈا میں گزارنا چاہئے۔ تاکہ میں دھوپ اور دیگر مشاغل سے لطف اندوز ہو سکوں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا اور پھر فلوریڈا جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ میں نے گھر سے باہر نکلتے وقت ہیلن کو خدا حافظ کہنے کی غرض سے اسے اٹھایا تھا۔ لیکن وہ پڑی سوتی رہی۔

میں نے اس کے موٹے بازوؤں میں چٹکیاں بھرنے کی کوشش کی اور اس کے رخساروں پر طمانچے مارے۔ وہ نیند کی حالت میں جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور اس کے اوپر سے چادر پھینک کر ہیلن کو زبردستی مسہری پر بٹھا دیا۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا اور مجھ پر چیخنے لگی۔ میں اسے تنہا چھوڑ دوں۔

"میں ایک ہفتے کے لئے فلوریڈا جا رہا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

"کیا تم مجھے خدا حافظ نہیں کہو گی؟" اس نے نائٹ ٹیبل پر سگریٹ کا پیکٹ تلاش کیا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی سگریٹ ہے؟" اس نے میری سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ "اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک کہ تم مجھے الوداع نہیں کہتیں۔"

"الوداع..... خدا حافظ....." اس نے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور دوبارہ چادر اوڑھ لی۔ وہ جماہیاں لیتی ہوئی دھواں اڑا رہی تھی اور دھواں اگلتے ہوئے جماہیوں پر جماہیاں لے رہی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے ایک دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے وقت میں نے اسے اپنی آنکھیں موندتے دیکھا تھا۔

جہاز تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ میرے تصور میں ہیلن کی ماں کی تصویر ابھر آئی تھی اور میں سوچنے لگا کہ میں نے تو کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا پھر میں نے وہ پیکٹ کیوں خریدا تھا جو میں چلتے وقت ہیلن کو دے آیا تھا۔

کھوکھل

افروزہ اقبال

ایک شرابی کا قصہ جس نے اپنے علاج کیلئے ایک کلینک میں داخل ہونے کی غلطی کی تھی

میرے لئے سو کر اُٹھنا تو آسان تھا لیکن آنکھیں کھولنا بہت مُشکل۔ بہرصورت جیسے تیسے میں نے آنکھیں کھولیں اور اس بات کی کوشش کی کہ اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھوں۔ ساڑھے نو بج رہے تھے لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ وقت دن کا ہے یا رات کا، مجھے کروٹ بدل کر ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کی طرف نظر گھمانے کی زحمت کرنا پڑی۔ کھڑکی کے پردوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی نے بتایا کہ صبح ہو چکی ہے۔

میں نے کئی جماہیاں لیں۔ پھر بستر سے اس طرح قلابازی کھا کر کُودا جیسے مجھے کوئی سانپ نظر آ گیا ہو۔ نیچے اُتر کر میں نے گہری اور طویل سانس لی۔ میرا دماغ ابھی تک چکرا رہا تھا اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا، میں میز کی طرف لپکا اور جونی واکر کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیے تاکہ یہ گھونٹ مجھے کم از کم اس وقت تک زندہ رکھ سکیں جب تک میں شیو بنا لے اور لباس تبدیل کرنے سے فارغ نہ ہو جاؤں۔

مجھے وقت مقررہ تک ڈاکٹر کے پاس پہنچنا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میری بیماری کی اصل وجہ کیا ہے؟ حد سے زیادہ شراب نوشی نے میرے سارے جسمانی قویٰ کو بیکار کر کے رکھ دیا تھا لیکن لائف لونگ کلینک کے ڈاکٹر گینز سے تین دن قبل ٹیلیفون پر وقت لیتے وقت میں نسبتاً سنجیدہ تھا اور حقیقت میں چاہتا تھا کہ اپنی بیماری کے سلسلے میں اس سے مشورہ کروں۔

کرائے پر لی ہوئی ڈاج میں بیٹھ کر میں لائف لونگ کلینک میں پہنچا اور کار پارک کر کے سیدھا خیر مقدم کرنے والی لڑکی کے پاس گیا۔

"میرا نام ڈے بریک ہے۔" میں نے اسے بتایا "مجھے ڈاکٹر گینز نے ملنے کا وقت دیا ہے۔"

لڑکی نے شیڈول پر نظر دوڑائی اور "ہاں" کے انداز میں سر ہلاتی ہوئی بولی "سوا دس بجے!" اور یہ کہہ کر جیسا کہ میرے عجیب و غریب نام کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، اس نے مجھ پر دوسری نظر ڈالی تاکہ کوئی مزاحیہ جملہ کہہ سکے لیکن کچھ سوچ کر اس نے مذاق اڑانا مناسب نہ سمجھا۔

"بیٹھ جاؤ مسٹر ڈے بریک!" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا "چند منٹ بعد ڈاکٹر سے تمھاری ملاقات ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر کا لفظ اس کے خوبصورت منہ سے اتنے احترام سے ادا ہوا جیسے تبت کے باشندے دلائی لامہ کا ذکر کرتے ہیں اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ڈاکٹر گینز یقیناً قابلِ احترام شخصیت ہو گا۔

ٹھیک سوا دس بجے مجھے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا گیا۔ بظاہر وہ کوئی غیر معمولی شخص نہیں لگتا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ معمولی شخص نہیں ہے۔ مجھے اس کی آنکھیں بہت زیادہ پسند آئیں۔ اس نے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا: "تمھیں کیا شکایت ہے مسٹر ڈے بریک؟"

میں نے کہا "مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ شراب پیئے بغیر مجھے سکون نصیب نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی صورت سے میری یہ عادت چھوٹ جائے۔"

وہ مسکرایا: "شراب پینا بیماری تو نہیں ہے۔"

"ذرا میری حالت پر غور کرو۔" میں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اٹھا کر کہا "صبح کے سوا دس بجے ہیں اور اب تک میں پورے پانچ پیگ حلق سے نیچے اتار چکا ہوں۔"

"بہت سے ایسے ماہرینِ نفسیات موجود ہیں جو تمہاری اس عادت کو آسانی سے چھڑا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تمہیں ان کے پاس جانا چاہیئے۔"

"جا چکا ہوں ڈاکٹر۔ ان میں سے کئی کے پاس جا چکا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوا؟"

"فائدہ کیا ہوتا، میں کچھ زیادہ ہی پینے لگا۔" میں نے کہا "اسی لیے تمہارا نام اور شہرت سن کر میں نے سوچا کہ تم میری مسیحائی کر سکو گے۔"

ڈاکٹر چند لمحے میری بات پر غور کرتا رہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں تمہارا تسلی بخش علاج ہو سکتا ہے۔ میرے لیے کسی شرابی سے شراب چھڑوا دینا بہت ہی معمولی سی بات ہے لیکن میں تمھیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ کسی ایسی جگہ جاؤ جہاں تمھاری کم سے کم رقم خرچ ہو۔"

"منوخرچ کی بات مت کرو۔" میں نے کہا "میں تمھیں منہ مانگی رقم دینے کے لئے تیار ہوں۔"

اس نے پہلی بار میری طرف غور اور توجہ سے دیکھا: "کیا تمھاری خانگی زندگی خوشگوار نہیں ہے؟"

"ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔"

"جنس زدہ ہو؟"

"بالکل نہیں۔"

"کام کی زیادتی ہے؟"

میں نے سر ہلایا "نہیں ڈاکٹر، روزی کمانے کے لئے میں کوئی کام نہیں کرتا بلکہ اپنے کام کو ایک دلچسپ کھیل سمجھتا ہوں۔"

"کھیل سمجھتے ہو؟"

"دراصل میں جواری ہوں۔ ہر قسم کا جوا کھیلتا ہوں اور میری قسمت اتنی اچھی واقع ہوئی ہے کہ مجھے آج تک کسی کھیل میں کوئی ناکامی نہیں ہوئی۔" میں نے ہنس کر کہا "بہرحال مجھ پر کسی کام کی زیادتی کا کوئی اثر نہیں ہے۔"

"کوئی جسمانی وجہ ہو گی۔" ڈاکٹر گینز نے سوچتے ہوئے کہا "شاید تمہارے جسم کی مشینری میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے تم شراب پیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ میری مشینری میں کیا خرابی ہو گئی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شراب پیئے بغیر میرے لیئے ہلنا جلنا تک ناممکن ہے۔ اگر مشینری میں کوئی خرابی ہے تو کیا تم اسے ٹھیک نہیں کر سکو گے؟"

"کیوں نہیں ٹھیک کر سکوں گا؟" ڈاکٹر نے بڑے مشفقانہ انداز میں کہا "بشرطیکہ مجھے اس خرابی کا علم ہو جائے۔ اور خرابی کی وجہ معلوم کرنے سے قبل مجھے تمہیں بالکل خشک کرنا پڑے گا۔ تمھیں اس طرح نچوڑنا پڑے گا جیسے گیلے کپڑے کو نچوڑ کر خشک کیا جاتا ہے اور اس کام میں کئی دن لگ جائیں گے۔"

"کوئی پروا نہیں، تم جس طرح چاہو مجھے نچوڑ لو لیکن خدارا اس بلانوشی سے چھٹکارا دلا دو۔"

"دیکھو مسٹر ڈے بریک! تمہیں وقت اور رقم دونوں کی قربانی دینی ہو گی اور تمہیں اس وقت تک یہاں قیام کرنا پڑے گا جب تک ہم بار بار تمہارے خون کا جائزہ لے کر اس بات کا اطمینان نہیں کر لیں گے کہ شراب کے سارے اثرات زائل ہو گئے۔"

"میرے لئے وقت اور رقم دونوں بے قیمت ہیں۔ جتنا وقت چاہو لے لو اور جتنی چاہو، رقم لے لو۔"

"پھر تم فوراً میرے کلینک میں داخل ہو جاؤ۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "تم یہیں کے رہنے والے ہو یا باہر سے آئے ہو؟"

"شمالی علاقے سے گرمیاں گزارنے آیا ہوں۔" میں نے صحیح بات اُسے بتا دی۔ "اور اس وقت تک ایک ہوٹل میں مقیم ہوں۔ مجھے اجازت دو کہ ہوٹل کا حساب کتاب چکا دوں۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "مس ہلبرن، استقبالیہ لڑکی، تمہاری واپسی پر تمہیں کلینک میں مریض کی حیثیت سے داخل کر لے گی۔ میں اسے ضروری ہدایات ابھی دے دوں گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ، تم اس قابل ہو کہ بحفاظت کار چلا سکو۔

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ میرے نئے مریض کو بہت زیادہ شراب پی کر کار چلانے کے جرم میں پولیس پکڑ کر لے جائے۔"

"پروا مت کرو، ڈاکٹر۔" میں نے بتایا "مجھے ڈرائیونگ کی اتنی مشق ہو چکی ہے کہ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہو تب بھی میں بحفاظت فائر انجن تک ڈرائیو کر سکتا ہوں۔"

☆ ☆ ☆

دو گھنٹے بعد ہی میں دوبارہ بستر پر پہونچ گیا لیکن اس مرتبہ اسکیپ ہوٹل کے بجائے ڈاکٹر گیئر کے کلینک کا کمرہ تھا۔ میں نے دیر سے شراب نہیں پی تھی اور کلینک کے کمرے میں بھی میرا دکھ درد دور کرنے والی جونی واکر کی بوتل نہیں تھی۔ مس ہلبرن نے میرے داخلے کے وقت ہی بوتل کا پتہ چلا لیا تھا اور جس طرح کوئی ماں اپنے بچے کے کوٹ کی جیب سے خرگوش یا کتے کے پلے کو باہر نکال لیتی ہے، اسی طرح اس نے بھی میری جیب سے بوتل نکال لی تھی۔

بستر پر لیٹنے اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ میرے کمرے کو پردہ ڈال کر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور دوسری جانب کا مریض چونکہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہا، اس لئے سو رہا ہے یا بے ہوش پڑا ہے یا مر چکا ہے۔ میں نے حیرت انگیز جاسوسی کہانیوں کی ان کتابوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جو میں وقت گزاری کے لئے خرید کر لایا تھا۔

ابھی میں کتابوں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے کمرے میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی اور ایک خوبصورت سی لڑکی نرس کی یونیفارم پہنے ہوئے اندر آئی۔ اس کو دیکھتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ بہرحال کلینک میں میرا وقت ضائع نہیں ہوگا۔

"مجھے پیری کہتے ہیں۔" اس نے کہا "ڈاکٹر گیئر کے حکم کے مطابق مجھے تمہاری دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔"

"میرے قریب مت آنا نرس۔" میں نے اسے جلدی سے بتایا "میں سر سے پاؤں تک شراب کی نجاست میں ڈوبا ہوا ہوں اور یہ بات ہرگز پسند نہیں کرتا کہ ایک حسین کی دیوی میری دیکھ بھال کرے۔"

"بیوقوف مت بنو۔ خاموشی سے مجھے اپنا کام انجام دینے دو۔" وہ بولی "اور دیکھو، مجھے نرس کبھی مت کہنا۔ چاہو تو مس پیری کہہ سکتے ہو۔"

"شکر ہے خدا کا کہ اس نے اتنی اچھی خبر سنائی۔"

"اچھی خبر؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم مسز پیری نہیں ہو۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اس خبر نے مجھے کتنا مطمئن کر دیا ہے۔"

"میں تمہاری فضول باتوں میں آنے والی نہیں۔ منہ کھولو اور یہ تھرمامیٹر زبان کے نیچے دبا لو۔ اس سے نشہ نہیں ہوگا اس لیے اسے پینے کی کوشش مت کرنا۔"

"تم تو میری سانس ہی روکے دے رہی ہو۔"

"مطمئن رہو۔ تمہاری سانس آسانی سے نہیں رکے گی۔" اس نے میرے منہ میں تھرمامیٹر رکھ کر میری نبض کی رفتار دیکھنی شروع کر دی۔

ایک منٹ کے بعد جب اس نے تھرمامیٹر نکال کر میرا ٹمپریچر نوٹ کیا تو میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی سبز آنکھوں سے مجھے گھورا "تمہیں کیسے معلوم؟"

"تم یہ تو جانتی ہی نہیں ہو کہ مریضوں کے ساتھ کس طرح پیار و محبت کا برتاؤ کرنا چاہیئے بخصوص ایک ایسے مریض کے ساتھ جسے شراب نے تباہ کر دیا ہو۔"

"تمہیں شراب نے اتنا تباہ نہیں کیا، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم مجھے بہت کم اہمیت دے رہی ہو مس پیری۔ حالانکہ تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے جونی واکر کی بوتل میرے سامنے رکھ دی ہو۔"

وہ مسکرائی "ہاں۔ اکثر اوقات شرابی میرے بارے میں اسی قسم کے تاثرات رکھتے ہیں مگر یہ سمجھ لو، میں ایسی شراب ہوں جسے تم پی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "یہ درست ہے کہ تم میری دسترس سے باہر ہو لیکن اتنا احسان ضرور کر سکتی ہو کہ اسکاچ کی دو ایک چھوٹی بوتلیں اپنے گریبان میں چھپا کر مجھ تک پہنچا دو۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"الٹی سیدھی باتیں مت کرو، مسٹر ڈے بریک!"

"اسکاچ کی بوتلوں کے لئے التجا کرنے کو الٹی سیدھی باتیں کرنا کہتی ہو؟ آخر حرج ہی کیا ہے چند بوتلیں مہیا کر دینے میں؟"

"نہیں۔" اس نے کہا "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"تمہارا ہر جواب نفی میں ہے۔ کیا تم مثبت انداز میں کبھی نہیں سوچتیں؟"

"مثبت انداز میں بھی یہی جواب ہے کہ میں تمہارے لئے شراب کی بوتلیں ہرگز نہیں کروں گی۔ البتہ ایک ایسی چیز ضرور دوں گی جس سے تمہیں سکون ملے گا۔"

"میری زندگی میں سکون کہاں!" میں نے کہا "پھر بھی وہ کیا چیز ہے؟"

اس نے اپنی جیب سے متعدد پیپرمنٹ کے چوکلیٹ نکال کر میرے سرہانے ڈال دیئے۔ "ڈاکٹر گیئر کا کہنا ہے، جب تمہیں یہ یقین ہو جائے کہ تم اگلا منٹ شراب کے بغیر نہیں گزار سکتے، اس وقت ان میں سے ایک چوکلیٹ اپنے منہ میں ڈال کر چوسنے لگنا۔"

"یہ پیپرمنٹ کے ان چوکلیٹوں کے لئے مجھے سو ڈالر روزانہ کے کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے؟" میں نے احتجاجاً کہا۔

"سو نہیں، ایک سو پچاس ڈالر۔" وہ بولی "شکر کرو کہ تم سیمی پرائیویٹ کمرے میں ہو۔ پرائیویٹ کمرے میں ہوتے تو پورے ڈھائی سو ڈالر روزانہ دینے پڑتے اور وہاں بھی تمہیں یہی چوکلیٹ دیئے جاتے۔"

"چلو اگر تم یہی سمجھتی ہو کہ یہ چاکلیٹ کھانے سے میری شراب پینے کی عادت چھوٹ جائے گی تو تم پر یقین کیئے لیتا ہوں۔ کیا مجھے بستر سے اٹھنے کی اجازت ہے؟"

"ہاں ہاں، تم باتھ روم جا سکتے ہو، کاریڈور میں چہل قدمی کر سکتے ہو، اپنی کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔ شراب پینے اور دوسرے مریضوں کو پریشان کرنے کے سوا تم جو چاہو، بخوشی کر سکتے ہو۔"

"کیا مریضوں کو پریشان کرنے میں یہ بات شامل ہے کہ میں اپنے کمرے میں موجود مریض سے بھی گفتگو نہیں کر سکتا؟"

"بے شک!"

"پھر تو تم باہر جانے سے قبل اس پر ایک نظر ضرور ڈال لینا۔"

"کیوں؟"

"میرے خیال میں وہ مر چکا ہے۔"

"نہیں مسٹر ڈے بریک۔ وہ سو رہا ہے۔ آپریشن سے قبل نیند کا انجکشن لگایا گیا تھا۔"

"کیا شکایت ہے اسے؟" میں نے پوچھا "کیا وہ بھی شرابی ہے؟"

"جب وہ جاگ جائے تو اسی سے پوچھ لینا۔" اس نے کہا۔ پھر وہ نیری سے پلٹی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجھے اس کے پلٹنے اور جانے کے طریقے بہت بھلے معلوم ہوئے۔ بالکل ایسا لگا جیسے کوئی شیرنی اپنی کھال چمکاتی ہوئی میری نظروں کے سامنے سے گزر گئی ہو۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد، شراب نہ ملنے کے باعث مجھے اپنی نس نس میں ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اسی عالم میں مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ میری اس غنودگی کو برتنوں کی کھنکھناہٹ نے توڑ دیا۔ لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔

پردے کی دوسری جانب والے مریض نے پکار کر مجھ سے کہا "امید کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا یار۔"

میں نے کہا "تمہاری آواز سن کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم مر چکے ہو۔"

"نہیں یار، موت تو میرے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔" پردے کے پیچھے سے اس مریض کا سر نمودار ہوا۔ ٹیڑھا میڑھا سا سر تھا جس کے نیچے ٹوٹی ہوئی ناک، چمگادڑوں جیسے کان اور سور جیسی آنکھیں پائی جاتی تھیں۔ چہرہ کسی زخم کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا آدھا چہرہ ہنس رہا ہو اور آدھا بالکل سنجیدہ ہو۔ "میں نے نیند کا انجکشن لگوایا تھا یار۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"ڈے بریک!"

"اپنا اصلی نام بتاؤ۔"

"میرا اصلی نام یہی ہے۔" میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"اسمتھ!"

"تمہیں کیا شکایت ہے؟" میں نے پوچھا "دیکھنے میں تو تم اتنے تندرست معلوم ہوتے ہو جیسے کوئی باکسر یا پہلوان ہوتا ہے۔"

اچھا ڈاکٹر

ایک امریکی اور ایک جاپانی، بیماری اور تندرستی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد امریکی نے جاپانی سے سوال کیا۔ "مسٹر شانگ ہو! آپ کے ملک میں اچھے ڈاکٹر ہیں؟"

جاپانی کچھ دیر سوچتا رہا اور بولا "ہاں کئی ہیں۔ مگر ان سب سے بہتر ڈاکٹر ہانگ شانگ ہیں۔ اس نے میری زندگی بچائی ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ کیسے؟"

"میں بتاتا ہوں۔ میں بے حد بیمار تھا۔ ڈاکٹر ہانگ کین کے پاس گیا۔ اس نے دوا دی۔ میری طبیعت اور بگڑ گئی۔ ڈاکٹر سان سینگ کو بلوایا گیا۔ اس نے بھی دوا دی۔ وہ کھائی تو طبیعت اور بھی خراب ہو گئی۔ میں تو سمجھا کہ اب میں مر جاؤں گا۔ مجبور ہو کر لوگ مجھے ڈاکٹر ہانگ شانگ کے مطب لے گئے۔ وہ موجود نہیں تھا۔ مایوس ہو کر واپس آ گئے اور میری طبیعت سنبھلنے لگی۔ ڈاکٹر ہانگ شانگ نے میری زندگی بچائی ہے۔"

اسمتھ نے پورا پردہ کھینچ لیا اور اپنے بستر کے پاس بچھی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا "صرف اتنی شکایت ہے کہ مجھے لقوہ۔۔۔۔"

اس نے اپنا مرض بتانا شروع ہی کیا تھا کہ پیری اس کے لنچ کی ٹرے لئے ہوئے اندر آئی۔ اسمتھ کی سور جیسی آنکھیں اس کے جسم پر جم گئیں۔

میں بھی پیری ہی کو تک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے طے کر لیا کہ اگر وہ مجھے دودھ کا ایک گلاس لا دے تو میں ایک ہی گھونٹ میں پی جاؤں گا۔ ڈیڑھ دو سو ڈالر روزانہ خرچ کرنے کے بعد اگر مجھے جونی واکر نہ ملے تو کم سے کم دودھ تو ملنا ہی چاہیئے۔

جونہی پیری نے اسمتھ کی ٹرے رکھی، میں نے کہا "مس پیری اگر زحمت نہ ہو تو مجھے دودھ کا ایک گلاس لا دو۔"

اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور بجلیاں گراتی ہوئی بولی "معلوم ہوتا ہے تمہارا پیپرمنٹ کے چاکلیٹوں سے دل بھر گیا ہے۔"

میں نے بڑی مشکل سے اپنے منہ سے نکلنے والی آہ کا گلا اپنے حلق میں ہی گھونٹ دیا "بڑی مہربانی ہوگی نرس!"

"لے آؤں گی، لے آؤں گی۔" اس نے کہا "مگر یہ مت سمجھنا کہ میں اس

میں تھوڑی بہت برانڈی ملانے پر بھی راضی ہو جاؤں گی۔" پھر وہ اسمتھ سے مخاطب ہو کر بولی "مسٹر ڈے بریک شراب کی عادت چھوڑنے کے لئے یہاں بھرتی ہوتے ہیں۔ انھیں کچھ پلا مت دینا۔"

اسمتھ بولا "بھلا یہ بھی کوئی مرض ہے؟"

میں نے بگڑ کر کہا "تمہارے مرض سے بہرحال اچھا ہے۔"

پیری نے اپنا ہاتھ اٹھایا "خدا کے لئے ایک دوسرے کی بیماریوں پر لڑائی جھگڑا مت کرو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ میرے لئے دودھ لے آئی اور میری میز پر رکھ کر شیرنی والی مخصوص چال چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں سیٹی بجا کر ایک محبت بھری دھن گنگنانے لگا۔

"کیسی اچھی چیز ہے؟" اسمتھ بولا "اگرچہ ابھی اسے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا ہے۔ آج چوتھا دن ہے مگر کمرہ نمبر سات کا مریض دو مرتبہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر چکا ہے کہ وہ صحت یاب ہو چکا ہے حالانکہ ابھی اس کے ٹین ہی انجکشن لگے ہیں۔"

"اسے کیا مرض ہے؟"

"ایک پوشیدہ مرض بتا رہا ہے۔"

"تم سے کس نے کہا کہ وہ مس پیری پر دو مرتبہ اپنی صحت یابی ظاہر کرنے کی کوشش کر چکا ہے؟"

"خود مس پیری نے بتایا تھا جب اس نے یہ دیکھا کہ میرے ذہن میں بھی ویسے ہی خیالات آ رہے ہیں۔"

"کیا واقعی تمہارے ذہن میں ویسے ہی خیالات آ رہے تھے؟"

"کس کے ذہن میں نہیں آئیں گے؟" وہ آدھے دہانے سے ہنسا۔ "تمھیں لقوہ مار گیا ہے پھر بھی تم ایسی باتیں سوچتے ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی "لقوے کا علاج برانڈی سے کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری پانچوں انگلیاں برانڈی میں ہیں آج کل۔"

"برانڈی کے علاوہ ڈاکٹر گینر روزانہ میرا خون بھی ٹیسٹ کرتے ہیں اور نتائج بتاتے ہیں کہ میں تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہوں۔"

"لقوے کے لئے خون ٹیسٹ کیا جا رہا ہے؟"

"بے شک جدید طریقۂ علاج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ نتائج کو کمپیوٹر کے حوالے کر دیتے ہیں اور کمپیوٹر انہیں تفصیل بتا دیتا ہے۔"

"کتنے نتائج اخذ کئے جا چکے ہیں اور کتنے باقی ہیں؟"

"چار ہفتے میں آٹھ نتائج معلوم ہو چکے ہیں اور کم سے کم بیس نتائج معلوم کرنا ہیں۔"

"خرچ کیا آتا ہے؟"

"ہر ٹیسٹ پر ایک ہزار ڈالر۔ قیام و طعام کے ڈیڑھ سو ڈالر روز اس کے علاوہ ہیں۔"

میرے منہ سے سیٹی کی آواز نکل گئی "میں شرابی ہوں، تمھیں لقوہ ہے اور کمرہ نمبر سات کا مریض کسی پوشیدہ مرض میں مبتلا ہے۔ کیا ڈاکٹر گینر ہر مرض کا علاج جانتا ہے؟"

"ہاں ڈاکٹر گینر ہر مرض کا ماہر ہے۔ ہال کے برابر والے کمرے کا مریض اندرونی چیچک کا شکار ہے۔ پانچ نمبر والے کمرے میں دمے کا مریض ہے۔ کمرہ نمبر چھ میں جو لڑکی ہے، اسے معدے کی شکایت ہے اور ڈاکٹر ہر مریض کے خون کا ٹیسٹ لے کر کامیاب ترین علاج کر رہا ہے۔"

میں نے اپنے جسم کی چادر اتار پھینکی، بستر سے نیچے اترا اور سلیپر پہنتا ہوا بولا "میں تھوڑی سی چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں۔"

لائف لونگ کلینک باہر سے دیکھنے میں جتنی بڑی نظر آتی تھی، اندر سے اس کی آدھی بھی نہیں تھی۔ اس میں صرف پندرہ کمرے تھے اور ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ پچیس مریض وہاں رہ سکتے تھے۔ کئی کمرے خالی پڑے تھے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاکٹر گینر کا کاروبار عروج پر نہیں ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اوسط درجے کے لوگ وہاں کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مس پیری نرسوں کی گیلری میں بیٹھی ہوئی مریضوں کے چارٹ کی نقل تیار کر رہی تھی۔ مجھے کلینک میں گھومتے پھرتے دیکھ کر بولی "ادھر کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا "تھی نے تو اجازت دی تھی کہ میں باتھ روم تک جا سکتا ہوں۔"

"مگر میں نے تمہیں یہاں تک آنے کے لئے تو نہیں کہا تھا۔" اس نے کہا "اب طبیعت کیسی ہے؟"

"شاید تھوڑی دیر کے لئے صبر آ گیا ہے۔ یہ بتاؤ ڈاکٹر گینر میرے خون کو کب ٹیسٹ کریں گے؟"

"بہت جلدی۔" وہ بولی "یہاں کے علاج کے لئے خون کا ٹیسٹ ضروری ہے۔"

"یہی بات ہے مس پیری جو مجھے بہت پریشان کر رہی ہے۔ کیا خون کا ٹیسٹ لئے بغیر علاج نہیں ہو سکتا؟"

"تم ڈرتے ہو خون ٹیسٹ کراتے ہوئے؟"

"بات یہ ہے کہ میں سوئی لگتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میری شراب نوشی کی وجہ بھی یہی ہے۔ اب اگر میرا خون ٹیسٹ کرنے کے لئے سوئی لگائی گئی تو خدا جانے میرا کیا حشر ہو۔"

"تم اپنی مرضی سے علاج کرانے آئے ہو۔"

"لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہاں خون بھی نکالا جاتا ہے۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ میرا خون نکالنے سے پہلے مجھے دو چار پیگ پلا دیئے جائیں ورنہ میری موت کی ذمہ داری تم پر اور صرف تم پر عائد ہو گی۔"

"دیکھا جائے گا۔" اس کا لہجہ ایک دم ترش ہو گیا۔ "اب چلتے پھرتے نظر

آؤ ورنہ مجھے مجبوراً ڈاکٹر گینر سے تمہاری شکایت کرنی پڑے گی۔"

* * *

تین تباہ کن دن گزر گئے۔

روزانہ دن میں دو دفعہ ڈاکٹر گینر میرا معائنہ کرتا اور روزانہ تین دفعہ مس پیری میرے لئے مزیدار کھانوں کی ٹرے لے کر آتی۔ مجھے لکھنے پڑھنے اور تھوڑی سی چہل قدمی کی اجازت تھی اور میں ابھی تک مس پیری کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

چوتھے دن ڈاکٹر گینر دوپہر سے کچھ پہلے میرے کمرے میں آیا اور اس نے اسمتھ کے کہنے میں انجکشن لگا کر خون نکالا۔ اس کے فوراً بعد اس نے نیند کی ایک گولی اسمتھ کو کھلائی۔

اسمتھ کئی گھنٹے کی نیند سے جیرار ہوا تو میں نے اس سے پوچھا "کیا ڈاکٹر گینر ہمیشہ خود ہی انجکشن لگا کر خون نکالتا ہے؟"

"ہاں۔ اسے دوسروں پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"میری آرزو تو یہ تھی کہ مس پیری میرے انجکشن لگاتی۔"

"کہاں کی باتیں کر رہے ہو یار۔" اسمتھ نے دانت نکال کر کہا "یہ مالش گھر نہیں ہے، کلینک ہے کلینک!"

اگلے روز ڈاکٹر گینر نے ٹیسٹ کے لئے میرا خون لیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پیری سے پوچھا "نتائج کب تک معلوم ہو جائیں گے؟"

"اس وقت جب ڈاکٹر کی رپورٹ موصول ہو گی۔"

"اور وہ وقت کب آئے گا؟"

"چار یا پانچ دن بعد۔"

"چار یا پانچ دن بعد؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"لیبارٹری یہاں نہیں، کی ویسٹ میں ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ڈاک کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"بے شک!"

"کہیں رپورٹ آنے تک میں مر نہ جاؤں۔"

"اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔" اس نے کہا اور شیرنی جیسی چال چلتی ہوئی یہ جا، وہ جا۔

بستر سے اٹھ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور نرسوں والے کمرے کی طرف چل دیا۔ میرے خون کی ٹیوب مس پیری ایک پارسل میں رکھ کر پتہ تحریر کر رہی تھی "بلڈ کنسلٹنٹ۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۱۰، کی ویسٹ فلوریڈا۔" پتہ لکھ کر گھومی تو اس نے مجھے اپنے کندھے کے پاس کھڑا ہوا دیکھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو ڈے بریک؟" اس نے کہا "یہاں مریضوں کا آنا منع ہے۔"

میں نے کہا "مجھے علم نہیں تھا۔ دراصل میں ڈاکٹر گینر سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ڈاکٹر گینر کا آفس اوپر ہے۔"

ڈاکٹر خالی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا "کہو مسٹر ڈے بریک، کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "ایک گزارش کرنے آیا ہوں۔ اب میں ایک سوکھی ہوئی ہڈی کی طرح خشک ہو چکا ہوں اور میں اسی طرح اپنی زندگی گزار دینا چاہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ کچھ اس وجہ سے کہ تمہارے کمرے کا کرایہ زیادہ ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ مجھے ایک ضروری کام انجام دینا ہے۔ میں اس وقت تک کے لئے، جب تک کہ خون کے ٹیسٹ کا نتیجہ موصول نہ ہو جائے، میامی جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ میامی میں گھوڑوں کی ریس شروع ہونے والی ہے۔"

"ضرور جاؤ۔" اس نے کہا "البتہ دو باتوں کا خیال رکھنا۔ پہلی بات یہ کہ اب کبھی بھول کر بھی شراب کے پاس نہ جانا اور دوسری بات یہ کہ آج سے پانچویں دن یہاں ہو پہنچ جانا — اور ہاں، اب تک ہم نے تمہاری جو خدمت کی ہے، اس کی ادائیگی آج ہی کر دینا۔"

اگلے روز میں کرائے کی کار پر کی ویسٹ پہونچ گیا۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری میں کسی بلڈ کنسلٹنٹ کا پتہ نہیں ملا تو میں نے ڈاک خانے کا رُخ کیا اور بکس نمبر ۸۱۰ کے قریب ہی جا کھڑا ہوا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک شخص نے آ کر اپنی ڈاک نکالی۔ ڈاک میں وہ پارسل بھی موجود تھا جس میں میرے خون کی ٹیوب بھیجی گئی تھی۔ میں خاموشی سے اس آدمی کے پیچھے لگ گیا۔

سڑک پر بہت سے آدمی چل پھر رہے تھے اس لئے اس شخص کو یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ کئی گلیوں اور سڑکوں سے گزرنے کے بعد وہ دریا کے ساحل پر پہنچا اور لافنگ گرل نامی لانچ میں چلا گیا۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے میڈیکل لیبارٹریز کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ لانچ کسی قیمت پر لیبارٹری نہیں ہو سکتی۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد، میں بھی لانچ کے پاس پہنچا اور پکار کر کہا، "لافنگ گرل کے اندر کوئی ہے؟"

وہ شخص جو پوسٹ آفس سے ڈاک لے کر آیا تھا جھانکتے ہوئے بولا "کیا بات ہے؟"

میں نے صحیح صحیح بات بتا دی: "مجھے ایک میڈیکل لیبارٹری کی، جس کا نام بلڈ کنسلٹنٹ ہے، تلاش ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب ملا "ہمیں ایسی کسی لیبارٹری کا علم نہیں۔"

"لیکن مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔"

"کس نے کہا تھا؟"

"کی ویسٹ پوسٹ آفس کے ایک کلرک نے۔" میں نے کہا "میرے پاس پوسٹ بکس کا نمبر ۸۱۰ ہے اور پوسٹ آفس والوں کا کہنا ہے کہ وہ نمبر تمہیں دیا گیا ہے۔"

وہ ہنسا "لانچ میں آ جاؤ مسٹر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، پوسٹ آفس کا کوئی

شخص تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔"

میں لانچ پر چڑھ گیا۔

"کیا پوسٹ آفس کے مسخرے نے تمہیں میرا نام بھی بتایا تھا؟" اسی آدمی نے مجھے اندر لے جاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، مجھے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ تم لافنگ گرل کے مالک ہو اور لافنگ گرل دریا کے کنارے کھڑی ہے۔"

مجھے اچانک خیال آیا کہ میں نے لانچ میں آ کر بڑی زبردست غلطی کی ہے۔ لیکن اب کچھ سوچنا بے کار تھا۔ پیٹھ کے پیچھے سے کسی نے ایک بھاری چیز میرے سر پر رسید کی اور میں چکرا کر گر پڑا۔

جس وقت مجھے ہوش آیا، میرے منہ کو ایک رومال نے جکڑ رکھا تھا۔ اور دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ لانچ تیزی کے ساتھ دریا میں چل رہی تھی اور اندازہ یہ ہوتا تھا کہ ہم لوگ شہر کی حدود سے آگے نکل آئے ہیں۔

"میرے خیال میں۔" ایک مردانہ آواز میرے کان میں آئی "اب اسے دریا میں پھینک دینا چاہیئے پیٹر۔"

"نہیں جیری، جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے پہلے ہی اپنے آدمیوں کو بتا دیا ہو کہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔" پیٹر نے کہا، "ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"ڈاکٹر سے پوچھو، وہی کوئی عقل مندی کی بات بتا سکے گا۔"

"گولی مارو ڈاکٹر کو۔ ہمیں خود ہی نمٹ لینا چاہیئے۔"

"اور اگر یہ کوئی پولیس والا ہوا؟"

"ہوا کرے۔ پانی کے نیچے جا کر کوئی بھی سانس نہیں لے سکتا۔"

"تھوڑی دیر انتظار کرو۔ لانچ کو شہر کی طرف موڑ لو۔ ڈاکٹر کی رائے کے بغیر کوئی قدم اٹھانا انتہائی احمقانہ بات ہوگی۔"

تھوڑی دیر کے بعد لانچ دوبارہ اپنی پہلی جگہ پر پہونچ گئی۔ پیٹر نیچے اتر کر ڈاکٹر کو فون کرنے چلا گیا۔ میں بے ہوش بنا ہوا پڑا رہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد پیٹر کی واپسی ہوئی۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟" جیری نے پوچھا۔

"یہ!" پیٹر نے جواب دیا۔

میں نے کنکھیوں سے دیکھا، پیٹر کے ہاتھ میں ایک انجکشن تھا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ اس میں زہر نہیں ہے۔

دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں لائف لانگ ہسپتال کے ایک نرم بستر پر پڑا ہوا تھا۔ نہ میرے منہ میں کوئی رومال تھا اور نہ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ میرے سامنے ڈاکٹر گینز بیٹھا ہوا تھا اور سرہانے جیری اور پیٹر کھڑے تھے۔

ڈاکٹر گینز نے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر پوچھا: "مسٹر ڈے بریک! تم یہاں سے چلے کیوں گئے تھے؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو ڈاکٹر۔" میں نے اپنے چکراتے ہوئے دماغ کے باوجود اسے جواب دیا "تم جانتے ہو کہ میں ایک جواری ہوں۔"

"مگر تم تو میامی کی ریس میں حصہ لینے جا رہے تھے۔"

"میں نے سوچا، ایک داؤں کی ولیسٹ میں بھی لگاتا چلوں کیونکہ مجھے بلڈ کنسلٹنٹ کا پتہ تمہارے دفتر سے مل گیا تھا لیکن جب مجھے کسی لیبارٹری کے بجائے لافنگ گرل میں خون کا نمونہ پہنچتا نظر آیا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ سارا کھیل تم نے لوگوں کو لوٹنے کے لئے رچا رکھا ہے۔ تم ایک فرضی لیبارٹری کو خون کے نمونے بھیجتے تھے اور وہاں سے فرضی رپورٹ موصول ہو جاتی تھی اور اس طرح تمہیں اپنا کاروبار جمانے اور منہ مانگی فیس وصول کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی تھی۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مس پیری اندر داخل ہوئی، "دفتر میں دو آدمی آئے ہیں اور اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ فوری طور پر تم سے ملاقات کریں گے۔"

"ان سے کہو انتظار کریں۔ میں ابھی ایک ضروری کام سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔"

پیری نے جیری اور پیٹر پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ پھر بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھا اور گھوم کر ڈاکٹر سے بولی، "اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتی تو ان سے ملنے فوراً چلی جاتی۔ وہ لوگ اسٹیٹ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کے ہیں۔"

ڈاکٹر اچھل پڑا "کیا انہوں نے اپنے متعلق کچھ بتایا تھا؟"

"نہیں لیکن مجھے یقین ہے۔"

"تمہیں یقین ہے۔ مگر کیوں کر؟"

"وہ میرے ساتھی ہیں ڈاکٹر۔" پیری نے بتایا "وہ میرے ہی کہنے پر یہاں آئے ہیں۔ کیونکہ آج صبح میں نے لائف لانگ کلینک کی تفتیش مکمل کر لی ہے۔ میرا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ تم چاہو تو مجھے جاسوس کہہ سکتے ہو۔"

"کتیا!" ڈاکٹر نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

وہ ریستوران میں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ بیئر سے بھرے ہوئے گلاس ہم دونوں کے ہاتھوں میں تھے۔

"محکمے نے اس مرتبہ میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی "انہوں نے یہ بات مجھ پر ظاہر تک نہ ہونے دی کہ تم مریض نہیں ہو بلکہ محکمے کے آدمی ہو۔"

میں نے ہنس کر کہا "یہی شکایت مجھے بھی محکمے سے ہے۔ اب محکمے سے انتقام لینے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم دونوں انھیں بتا دیں کہ جنہیں انہوں نے ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ انھوں نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کا اعلان کر دیا ہے۔"

اس کا پورا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ اس کا سر آہستہ سے میرے سینے پر آ کر ٹک گیا۔

شہلا پاریکھ

گ

چند روز سے اس جزیرے میں شدید گرمی پڑ رہی تھی اور ہر شخص کپڑوں کو مختصر سے مختصر تر کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ دو مرد باقاعدہ سوٹ بوٹ میں ملبوس تھے۔ ایک شخص مشکی رنگ کا سوٹ پہنے تھا اور دوسرا آسمانی رنگ کا۔ دونوں دروازے پر رکے اور قدرے توقف کے بعد گھنٹی بجائی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک دراز قد سنہرے بالوں والی عورت نے دروازہ کھول دیا۔ مشکی رنگ کے سوٹ والے شخص نے تعظیماً سر جھکایا اور ہسپانوی زبان میں سلام کر کے بولا۔

"معاف کیجئے گا خاتون! ہم مخل ہوئے لیکن معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔ میرا نام میگوئیل ہے۔ میں وزارتِ سیاحت کا نمائندہ ہوں۔ ایک بار پھر آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں مگر معاملے کی نوعیت ایسی تھی کہ آپ کو مطلع کرنا ضروری تھا۔"

سنہرے بالوں والی عورت نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔ وہ سفید رنگ کا بے حد خوبصورت لانگ سا اسکرٹ پہنے ہوئے تھی اور چلنے سے اس کا ایک حصہ کھل جاتا تھا جس میں سے اس کی سفید اور سانچے میں ڈھلی ران دعوتِ نظارہ دیتی تھی اس نے سگریٹ سلگا کر منہ میں دبایا اور ان دونوں سے بولی۔

"مجھے علم نہیں کہ آپ لوگوں کو مجھ سے کیا کام ہے۔ بہرحال میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میرے شوہر کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے اور شاید آپ لوگوں کو اس

بارے میں علم ہو۔ خیر۔۔۔۔ پہلے تو آپ یہاں بیٹھیے۔" اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ آسمانی سوٹ والا شخص جو اب تک خاموش تھا اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔" اب ہم آپ کو جو کچھ بتانے والے ہیں، آپ۔ اس کو ذرا صبر و تحمل سے سنیئے گا۔"

عورت بے چینی سے اسے دیکھنے لگی مگر بولی کچھ نہیں۔

"پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں اس جزیرے میں ہسپانوی سفارت خانے کا کونسلیٹ ہوں اور یہ ناخوشگوار فرض میرے ذمے عاید ہوا ہے کہ۔۔۔۔"

سنہری بالوں والی عورت کا حوصلہ اب جواب دے چکا تھا۔ جلدی سے بولی۔

"آپ تو مجھے یونہی مارے ڈال رہے ہیں۔ آخر بات کیا ہے۔ کل صبح مجھ میں اور میرے شوہر میں کچھ اختلافِ رائے پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے شوہر کارٹ سے کہا تھا کہ وہ اپنے کارخانے پر لعنت بھیجے اور اسے فروخت کر کے اس خوبصورت جزیرے میں رہنے لگے۔ مگر وہ بھی عجیب آدمی ہے اسے کام سے عشق ہے۔ اس نے میرا مشورہ رد کر دیا۔"

مشکی سوٹ والے نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔" خاتون! ذرا یہ بتائیے کہ کل آپ کے شوہر یہاں سے کس وقت گئے تھے؟"

عورت نے بلا توقف جواب دیا۔" نو بجے سے ذرا پہلے۔ وہ تیراکی کے لباس میں ساحل کی طرف گیا تھا۔"

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہاں سے ساحل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

"چار پانچ منٹ۔ کیونکہ اس نے ایک کار کرایے پر لے رکھی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہو سکتا ہے اس کشتی میں چلا گیا ہو، جو سیاحوں کو کالا سانتا لے جاتی ہے۔"

سنہرے بالوں والی عورت نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور معنی خیز نگاہ سے کونسلیٹ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ہو سکتا ہے مگر اس سوال سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

ہسپانوی کونسل جنرل نے قدرے توقف کیا اور بولا۔" ایک اندوہناک واقعہ ہو گیا ہے۔ ایک کشتی جو نو بجے مسافروں کو لے کر روانہ ہوئی تھی غرق ہو گئی ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے شوہر بھی اسی میں تھے۔"

سنہرے بالوں والی عورت کو جیسے شاک لگا ہو۔ وہ خاموش ہی رہ گئی، پھر اٹھی اور وہسکی گلاس میں انڈیل کر اسے پینے لگی جب حالت کچھ بہتر ہوئی تو بولی۔

"آپ درست کہتے ہیں۔ میں اور کارٹ روزانہ ہی اس کشتی سے کالا سانتا جایا کرتے تھے۔ وہاں کا ساحل غسلِ آفتابی کے لئے بہت اچھا ہے۔ یہاں تو نوکیلے پتھر ہیں جو چبھتے ہیں۔"

کونسل جنرل نے اسکے خاموش ہوتے ہی کہا۔" یہ کشتی صبح سوا نو بجے ساحل سے تین میل آگے غرق ہو گئی تھی۔ کشتی کے آٹھ مسافر جن میں آپ کے شوہر بھی شامل تھے، اس میں غرق ہو گئے۔ ساحل پر موجود افراد نے اس کشتی کو غرق ہوتے دیکھا تھا۔ پھر غوطہ خوروں کی تلاشِ بسیار کے باوجود کسی کا پتا نہ چل سکا۔"

عورت بے حد پریشان معلوم ہوتی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"میں تو اب تک یہ سمجھ رہی تھی کہ میرے شوہر نے کچھ زیادہ پی لی ہو گی اور وہ رات کو اس لئے وہاں رک گیا ہو گا۔ کل رات میں نے پولیس کو فون کیا تو ایک افسر نے مجھے اطمینان دلایا کہ یہاں اکثر سیاح رات گھر سے باہر گزار دیتے ہیں۔ میں مطمئن ہو گئی۔"

وہ دونوں عورت سے اجازت لے کر واپس روانہ ہو گئے۔ عورت نے دروازہ بند کیا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

۲

دوپہر ہو چکی تھی۔ دھوپ میں بلا کی تیزی آ گئی تھی۔ وہی سنہرے بالوں والی عورت مارلن سیل اپنی جگہ سے اٹھی، باہر کا دروازہ کھولا اور برانڈی کا گلاس لے کر باہر پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئی۔ اسی لمحے ایک کوتاہ قد اور گنجا شخص پیچھے سے اس کے قریب آ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ عورت کے شانے پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ہاتھ کو دھیرے دھیرے نیچے کی طرف حرکت دینے لگا۔

"واہ واہ! تم نے پھر کمال کر دکھایا۔ تم واقعی زبردست عورت ہو۔" اور پھر وہ زور سے ہنس دیا۔ عورت کے سینے سے ہاتھ ہٹا کر اس نے برانڈی کا گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لے کر بولا۔" تمہارے ساتھ زندگی گزارنا کتنا لذت بخش کام ہے۔"

مارلن نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔" تم جھوٹے بھیڑیے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔ تم اس کشتی میں کیوں نہ غرق ہو گئے۔ مجھے کسی قدر سکون نصیب ہوتا۔"

کارٹ ہنس کر بولا۔" واہ ڈارلنگ! بات یہ ہے کہ میں تو اس کشتی میں بیٹھا ہی نہیں مگر تم نے کیوں جھوٹ بولا۔ تم کہہ دیتیں کہ میں اس کشتی میں گیا ہی نہیں۔ تم میرے بغیر بالکل بیکار جو ہو۔ جیسے ریت کا ایک ذرہ اس لئے تم جھوٹ بولنے پر مجبور تھیں۔"

"کیا خوش فہمی ہے۔ میں ان لوگوں سے کہہ دیتی کہ ہم لوگ قلاش ہو چکے ہیں۔ ان سے کہہ دیتی کہ کارٹ کا کارخانہ بک چکا ہے اور اب اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں ان سے یہ بھی کہہ دیتی کہ تم گھر سے نکلنے کے دو منٹ بعد ہی واپس آ گئے تھے کیونکہ تم کچھ بھول گئے تھے۔" پھر وہ معنی خیز نظروں سے شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔" اور یہ بھی کہہ دیتی کہ میں برآمدے میں برہنہ لیٹی دھوپ کھا رہی تھی کہ تم نے مجھے دیکھ کر بھیڑیے کی طرح مجھ پر حملہ کر دیا۔ تمہیں معلوم ہے بیوی کی مرضی کے خلاف اس سے اس طرح کی حرکت کرنا جرم ہے؟ اسی لمحے کشتی کا سائرن بجا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی غرقابی کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی اور اسے سنتے ہی تم کو ایک ترکیب سوجھ گئی اور تم نے مجھ سے کہا کہ میں یہی کہوں کہ تم اس کشتی میں سوار تھے۔"

مرد کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ بولا۔" بس کرو۔ تم نے خود اس منصوبے کو پسند کیا تھا اور اس سے تمہیں بھی تو فائدہ ہو گا۔ بیس لاکھ ڈالر کچھ کم نہیں ہوتے۔ بیمے کی اس رقم سے ہم عمر بھر عیش کر سکتے ہیں۔ تمہیں تو پیسے سے محبت ہے۔"

مارلن شوہر کی باتیں سن کر مطمئن ہو گئی۔ بولی۔

"تم سچ کہتے ہو کارٹ۔ مگر اب سب سے بڑا مسئلہ تیراکی کے لباس کو غائب کرنے کا ہے جس میں تم کل گھر سے نکلے تھے۔"

کارٹ ہنس کر بولا۔" ثابت ہوا کہ تم اتنی احمق نہیں ہو جتنا میں سمجھتا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے کار کی چابی جس سے وہ کھیل رہا تھا جیب میں ڈال لی اور بولا۔

"اس لباس کو کہاں چھپایا جائے۔؟"

مارلن نے فوراً جواب دیا۔" نیچے تہہ خانے کے اسٹور کی زمین نرم ہے۔ آسانی سے کھودی جا سکتی ہے۔"

کارٹ یہ سنتے ہی اٹھ کر چل دیا۔ اور نیچے پہنچ کر کھدائی کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد مارلن ہاتھ میں یخ بیئر کا گلاس لئے نیچے آئی۔ کارٹ کھدائی سے فارغ ہو چکا تھا۔ مارلن نے بیئر کا گلاس اسے تھما دیا۔ وہ شیطنت آمیز انداز میں ہنس کر بولا۔

"بالکل قبر معلوم ہوتی ہے۔"

پھر نیچے بیٹھ کر غٹاغٹ بیئر پینے لگا۔ کھدائی کے بعد اسے بڑی زور سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

جب کارٹ گلاس خالی کر چکا تو مارلن نے تمسخر سے کہا۔

"تم نے درست کہا کہ یہ بالکل قبر معلوم ہوتی ہے۔ معلوم ہے یہ کس کی قبر ہے؟ تمہاری۔"

کارٹ اسے مبہوت سا دیکھ رہا تھا۔ مارلن زور سے ہنس دی اور بولی۔

"معلوم ہے بیئر میں کیا تھا؟ چوہوں کو مارنے کی زہریلی دوا جو تم خود چند روز پہلے لائے تھے۔ تم نے اسے پی لیا ہے اب مجھے تم سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل جائے گا اور میں بیس لاکھ ڈالر کی بلا شرکت غیرے مالک ہو جاؤں گی۔ تمہیں تو لوگ پہلے ہی مردہ قرار دے چکے ہیں۔"

کارٹ نے ایک چیخ مار کر مارلن پر حملہ کرنا چاہا مگر اس وقت تک زہر اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ مارلن نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ فوراً اسے گھسیٹ کر قبر میں ڈالا اور کدال سے مٹی برابر کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں کارٹ جو ہنوز زندہ تھا، قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کام میں آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا۔

ابھی عورت نے کدال رکھ کر ایک گہری سانس کھینچی ہی تھی کہ اوپر سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ اور لباس صاف کرتی ہوئی اوپر پہنچی۔ دھیرے دھیرے دروازہ کھولا کہ دیکھے کون ہے۔؟

دروازے پر کونسل جنرل کا مشیر موجود تھا۔" میں آپ کو پھر زحمت دینے آیا ہوں۔" وہ اندر آ گیا۔ مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کے عملے کے چند افراد بھی تھے، مارلن حیران تھی کہ اب کیا ہو گیا۔ یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟

مشیر نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولا۔" میں اس بار آپ کے لئے ایک اچھی خبر لایا ہوں۔ آپ کے شوہر زندہ ہیں۔"

یہ خبر مارلن پر بجلی بن کر گری۔ اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس کی حالت پولیس افسر سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ بولا۔" کل آپ نے کہا تھا کہ آپ کے شوہر کار میں بیٹھ کر ساحل کی طرف گئے تھے مگر آج وہی کار آپ کے گھر کے سامنے کھڑی ہے۔ میں کافی دیر اس مسئلے پر سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ کے شوہر زندہ ہیں اور وہی کار کو واپس یہاں لائے ہیں کیونکہ کار کی چابی ایک ہی ہے اور وہ آپ کے شوہر کے پاس تھی۔"

مارلن سخت پریشان تھی۔ انہوں نے کار کو گھر کے سامنے کھڑا کر کے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا اور وہ پولیس افسر سے بولی۔

"آپ درست کہتے ہیں۔ میں دراصل یہ بتانا بھول گئی تھی کہ کل رات جب میں

ہوشمند شرابی

حضرت لڑکھڑاتے ہوئے بار سے نکلے اور ایک طرف کو چل پڑے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ سامنے سے اُن کے افسر کی کار آتی ہوئی نظر آئی۔ افسر نے انہیں پہچان کر کار روک لی اور بولے، "کیوں جناب! آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ اب آپ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ رات کو پیتے ہیں اور صبح دفتر میں آپ سے کام نہیں ہوتا۔"

"درست ہے جناب! مگر میں نے بہت تھوڑی سی پی ہے۔ اگر آپ سڑک پر ایک سیدھی لکیر کھینچ دیں تو میں سیدھا اس پر چل کر دکھاؤں۔"

افسر نے ہنس کر کار میں سے چاک نکالی اور سڑک پر ایک لکیر کھینچ دی۔ شرابی نے ایک نگاہ لکیر پر ڈالی اور ہنس کر بولا:

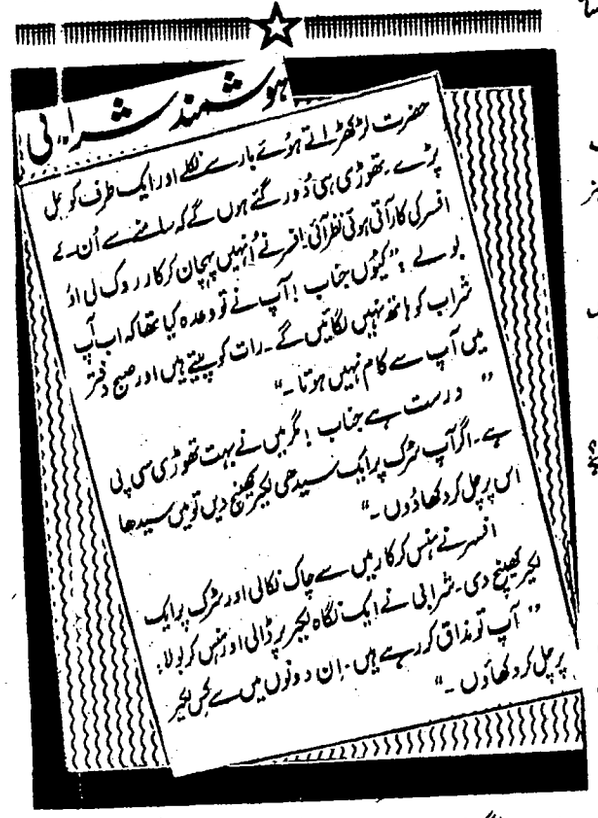

"آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔ ان دونوں میں سے کس لکیر پر چل کر دکھاؤں۔"

خود ساحل پر گئی تو میں نے وہاں یہ کار کھڑی دیکھی جو ہم نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ میں نے آگے جا کر دیکھا۔ چابی اس میں لگی تھی۔ میں سمجھی کہ شاید کارٹ جلدی میں تھا، اس لئے چابی اس میں لگی چھوڑ گیا۔ میں کار کو یہاں لے آئی۔ اس وقت تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ غرق ہو چکا ہے۔"

پولیس افسر بولا۔" یہ بات ہے! تو ذرا مجھے چابی تو دکھائیے۔ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

مارلن بولی۔" ابھی دکھاتی ہوں۔"

اس کے بعد وہ دیوانہ وار چابی تلاش کرتی رہی مگر وہ نہ ملی۔

مشیر کونسل جنرل نے مودبانہ کہا۔" اجازت ہو تو میں بھی آپ کی مدد کروں۔"

مارلن اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ پولیس افسر نے اشارہ کیا اور عملے کے افراد سارے گھر میں پھیل گئے۔

مارلن سوچ رہی تھی کہ اگر چابی مل جاتی تو وہ لوگ مطمئن ہو جاتے اور معاملہ خود بخود ختم ہو جاتا۔ کاش اب بھی چابی مل جائے اور وہ تہہ خانے تک نہ پہنچنے پائیں۔ اسی لمحہ اس کے ذہن میں یہ دہشت ناک خیال آیا کہ کہیں چابی اس کے شوہر نے ان کپڑوں کی جیب میں نہ رکھ لی ہو جو وہ پہنے ہوئے تھا اور جن میں وہ قبر میں زندہ دفن تھا۔

اسی لمحے تہہ خانے سے ایک پولیس کانسٹبل نے چلا کر کہا۔

"کارٹ سیل کی لاش یہاں دفن ہے۔"

مارلن چکرا کر گر پڑی اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

بہت زیادہ سوچ سمجھ کر کیے گئے اقدامات کا نتیجہ بھی کبھی کبھی توقع کے خلاف ہوتا ہے

دو اصناف کے درمیان ہونیوالی کشمکش کی خوبصورت کہانی

غلطی

ناہید اختر

ایمی کا شوہر ٹھیک چھ بجے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا ہیٹ دور ہی سے اسٹینڈ پر پھینکا اور ہمیشہ کی طرح وہ نشانے پر نہیں پہنچا۔ کوٹ دروازے کے ہینڈل پر ٹانگا اور جوتے رہائشی کمرے میں اتار کر کوچ پر لیٹ کر شام کا اخبار پڑھنے لگا۔ حسب عادت پانچ منٹ بعد ہی وہ خراٹے لینے لگا۔ ایمی دروازے میں کھڑی کمر پر ہاتھ رکھے اسے خوشی سے دیکھ رہی تھی۔ جلد ہی وہ بے خبر سو جائے گا ہمیشہ کے لئے۔ یہ سوچتی ہوئی وہ اس کے قریب گئی اور اس کے کندھے جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔ "فرینک! کھانا تیار ہے۔"

وہ اٹھا اور اس کے قریب سے گزرتا ہوا کمرۂ طعام میں پہنچا۔ میز پر نظر پڑتے ہی اس کا منہ بن گیا۔

"آج میں نے دوپہر کو بھی یہی کھانا کھایا تھا۔ کیا تم مختلف چیزیں نہیں پکا سکتیں۔؟ مجھے دو انڈوں کا آملیٹ بنا دو۔"

ایمی نے ایک گہری سانس کھینچی۔ کھانے کو اٹھا کر کوڑے کے ڈبے میں پھینکا اور آملیٹ بنانے لگی۔ ایمی چھوٹی سی جھینپو سی عورت تھی اسے خود بھی یقین تھا کہ وہ جس طرح ایک اچھی بیوی بننے میں ناکام رہی ہے۔ اسی طرح قتل کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ وہ ہنی مون کے دوران بھی ناکام رہی تھی۔ وہ دن کتنے تکلیف دہ تھے۔ فرینک کو وہ اس لمحے سے مایوس کن نظر آنے لگی تھی۔ جب سے اس کے پانی میں تیرنے والے آب موزے میں سوراخ ہو گیا تھا اور وہ پانی میں ڈبکیاں کھانے لگی تھی۔

ہنی مون کے بعد ایمی پر انکشاف ہوا کہ فرینک کو مچھلیوں کے شکار سے جنون کی حد تک دلچسپی ہے۔ اسے بیڈمنٹن، بطخوں کے شکار، اسکیٹنگ، فٹ بال، کشتی رانی، تیراکی اور گھڑسواری سے بھی لگاؤ تھا۔ الماریوں میں طرح طرح کے ملبوسات بھرے پڑے تھے۔ بک شیلفوں میں کھیلوں کے بے شمار رسالے نظر آتے تھے اور تہہ خانے میں مچھلی کے شکار کا سامان، ریکٹ، گالف کا سامان، اسکیٹس اور ایک بڑی سی کشتی موجود تھی۔

ایمی کے نزدیک وقت گزاری کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ دوپہر کو کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھا لیا جائے اور شام کو فلم دیکھ لی جائے۔ اس لئے فرینک اس کے لئے ایک معمے سے کم نہیں تھا اور فرینک کو ایمی بالکل ناکارہ لگتی تھی۔ ازدواجی زندگی کے اتنے طویل عرصے میں وہ باوجود کوشش کے مچھلی پکڑنا نہیں سیکھ سکی تھی۔ اس کا کانٹا یا تو جھاڑیوں میں پھنس جاتا یا فرینک کی پتلون میں اٹک جاتا۔ گالف کھیلتی تو گیندیں کبھی صحیح سمت پر نہ جاتیں۔ بیڈمنٹن کھیلتی تو شٹل کاک ہمیشہ نیٹ میں پھنس جاتا۔ بالآخر فرینک نے اسے چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ جانا شروع کر دیا مگر اس وقت تک اسے احساس ہو چکا تھا کہ وہ صرف کھیلوں یا مچھلی کے شکار میں ہی اناڑی نہیں ہے بلکہ وہ کھانا پکانا بھی نہیں جانتی۔ لانڈری پر کپڑے بھجواتی ہے تو واپس منگوانا بھول جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کس لانڈری پر کپڑے بھجوائے تھے۔ یہ ذہانت کی کمی نہیں تھی بلکہ وہ روزمرہ کی عام باتیں بھول جایا کرتی تھی۔ ممکن تھا کہ یہ انمل بے جوڑ شادی یونہی چلتی رہتی اگر فرینک کی ملاقات کلب میں کسی اور سے نہ ہو جاتی۔ یقری اسٹار کلب میں وہ ہر سنیچر کو ٹینس کھیلنے جایا کرتا تھا۔

یہاں اس کی ملاقات جین سے ہوئی تھی۔ وہ سفید شارٹس میں کتنی حسین لگتی تھی اور پھر بہت غضب کا کھیلتی تھی۔ اس نے ایمی کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اس کے بعد سے اس نے جین کے ساتھ کتنا ٹینس اور گالف کھیلا تھا لیکن ایمی کو ایک روز خود ہی معلوم ہو گیا جب فرینک نے نشے میں کلب میں سب کے سامنے جین سے بے تکلفی برتنی شروع کی۔ ایمی سامنے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

"میں طلاق چاہتا ہوں۔" اس رات اس نے ایمی سے کہا۔

"میں نہیں دوں گی۔" ایمی نے کہا اور اس نے پہلی بار ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ "مجھے تم سے محبت ہے فرینک۔"

"مگر مجھے تو تم سے محبت نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ کتنی بے کیف زندگی گزار رہے ہیں۔"

"مگر طلاق لینے کے لئے تمہارے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔" وہ نرمی سے بولی۔ "میں نے کبھی کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے۔"

"یوں کہو کہ تم نے کبھی کوئی صحیح حرکت ہی نہیں کی ہے۔" فرینک چیخا۔ "تم نہایت ناکارہ اور غیر ذمے دار ہو۔ میں تم سے تنگ آ چکا ہوں۔"

ایمی اسے سکتے کے عالم میں گھورتی رہی اور جب اسے پچھلی زندگی یاد آئی تو اس کا دل تلخ جذبات سے بھر گیا اسے وہ دن یاد آئے جب وہ فرینک کے ساتھ دلدلوں میں گھسٹتی پھرتی تھی۔ اس کا بھیگا بدن تھکن سے چور ہوتا تھا۔ وہ دن یاد آئے۔ جب وہ کئی کئی روز تک کشتی میں سفر کرتے تھے دھوپ کی شدت سے اس کا چہرہ جھلس جاتا تھا اور گیلا بادبان اس کے چہرے سے ٹکرا کر ناقابل بیان اذیت سے دوچار کرتا تھا۔ پھر اس نے وہ کوششیں شروع کر دیں جن کا خاتمہ اس کی توقع کے مطابق فرینک کی ہلاکت پر ہونا تھا۔

پہلے تو اس نے آلو کے بھرتے میں شیشہ پیس کر ملایا پھر ایک بار اس نے فرینک پر گاڑی دوڑانے کی کوشش کی جب وہ اتر کر گیراج کا دروازہ کھولنے گیا تھا۔

"کیا کر رہی ہو تم، مجھے مار ڈالنے کا ارادہ ہے کیا؟" فرینک چلا کر بولا تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا تھا۔

"سوری ڈیر!" اس نے کہا تھا۔ "میرا پیر ایکسلریٹر پر پڑ گیا تھا۔"

پھر وہ گھنٹوں پبلک لائبریری میں گزارنے لگی۔ وہ جاسوسی کہانیاں پڑھ کر کچھ منصوبے تیار کرتی اور پھر انہیں مسترد کر دیتی کیونکہ اس کے خیال میں واقعے کو حادثے کا رنگ دیا جانا چاہیئے تھا۔ زہر سے ہلاک کرنے کی کوشش تو بیکار تھی کیونکہ اس کے خیال میں فرینک جیسے آدمی کو قتل کر کے پھانسی پر چڑھ جانا حماقت تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی گفتگو میں جاسوسی ناولوں کا رنگ غالب آنے لگا۔ کبھی وہ سوچتی کہ اگر وہ لوگ لندن میں رہتے تو وہ اسے بڑی آسانی سے زمین دوز ریل کے نیچے دھکا دے دیتی۔ کوئی مکمل منصوبہ تیار کرنے میں مسلسل ناکامی سے اس کے اعصاب پر برا اثر پڑنے لگا۔ ایک بار تو اس نے سوچا کہ اس سارے منصوبے کو ہی بھلا دے مگر ابھی چند روز گزرے تھے ایک بار فرینک نے اپنی شاٹ گن اٹھائی اور اسے صاف کر رہا تھا کہ وہ چل گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی تو وہ دروازے پر کھڑا تھا۔

"تم میری بندوق کو ہاتھ لگاتی ہو؟"

ایمی معصومیت سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ مایوسی سے لرز رہے تھے۔ "میں تو تمہاری بندوق کو چھوتی بھی نہیں۔ تم نے خود ہی کئی بار بتایا ہے کہ یہ کتنی خطرناک ہوتی ہے۔"

فرینک نے فرش میں بنے سوراخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ابھی میرا پیر ہی اڑ جاتا۔ شاید میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں تو کبھی بھری ہوئی بندوق یوں نہیں رکھتا تھا۔"

اب ایمی نے سوچا کہ فی الحال وہ اپنی کوششوں کی رفتار دھیمی کر دے چنانچہ ایک ہفتے تک کچھ نہ ہوا۔

جمعرات کی شام کو فرینک نے حسب معمول کہا۔ "میں باہر جا رہا ہوں۔"

ایمی نے اس کی طرف دیکھا اور شانے اچکا کر بولی "تمہاری مرضی۔"

فرینک باتھ روم میں گرم پانی کے ٹب میں لیٹا ہوا جین کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ وہ اپنا چھوٹا سا ریڈیو لئے ہوئے آئی۔

"میں نے سوچا شاید تم کھیل کی خبریں سنو۔" اس نے ریڈیو ٹب کے اوپر ایک شیلف پر رکھ دیا۔ وہ باہر جانے لگی تو اس کی ایڑی تار میں پھنس گئی اور ریڈیو شیلف سے نیچے آ رہا۔ بدقسمتی سے تار کچھ زیادہ ہی کھنچ گیا تھا۔ لہٰذا وہ ریڈیو سے علیٰحدہ ہو گیا اور ریڈیو فرینک کے سر پر گر پڑا۔

"کیا مصیبت ہے۔ فرینک چیخا۔ "لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

وہ ٹب سے باہر نکل آیا اور کپڑے تبدیل کر کے جب وہ باہر کے دروازے کی طرف بڑھا تو وہ پورچ کی سب سے اوپری سیڑھی پر ایک لمحے کے لئے ہچکچایا۔

"تم دنیا کی ناکارہ ترین عورت ہو۔" وہ چیخا۔ "تمہارے ساتھ رہنا زندگی برباد کرنا ہے۔"

پھر نیچے جاتے ہوئے اس کا پنجہ ایک ہلتی ہوئی اینٹ پر پڑا اور وہ لڑھکتا ہوا سر کے بل نیچے جا گرا۔ ایمی دروازے پر کھڑی چیخنے لگی۔ ذرا دیر میں مجمع اکٹھا ہو گیا۔

مرنے سے پہلے اسے چند لمحے کے لئے ہوش آیا اور اس نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے ایمی کی آنکھوں میں جو کچھ دیکھا تھا۔ اطمینان یا حیرت یا سکون۔ اسے یقین تھا کہ وہ محبت ہرگز نہیں تھی چنانچہ اس نے اپنے قریب کھڑے پولیس سارجنٹ سے صاف اور واضح لہجے میں کہا۔

"یہ اس نے کیا ہے۔ میری بیوی ایمی نے مجھے دھکا دیا ہے۔"

اقلیم علیم

ایک کیمیاگر کی زندگی کے سنسنی خیز واقعات

حصولِ مقصد کے لیے ایک انسان کی جدوجہد کی عبرتناک داستان

میں آج ایک بدنام اسمگلر، پیشہ ور جواری، سفاک قاتل اور ماہر کیمیادان کے. بی کا پرتو ہوں۔ میں اپنے اس ہولناک اور لرزہ خیز ماضی سے یکسر فرار چاہتا ہوں، مگر زندگی کے ہر موڑ پر کسی نہ کسی لمحہ، ماضی کا کوئی شناسا سامنے آجاتا ہے اور مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں وہ رسوائے زمانہ صفدر علی ہوں جس کی سوانح مسلمہ سماجی، معاشی اور معاشرتی اقدار سے کھلی بغاوت کی کہانی ہے۔ میں ایک تجارت پیشہ گھرانے کا فرزند تھا۔ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا لہٰذا بے جا لاڈ پیار اور پیسے کے معاملے میں والدین کی فراخدلی نے میری ذات پر ایسے ستم ڈھائے کہ جب میں لڑکپن کی حدود میں داخل ہوا تو گھر بار کو خیرباد کہہ دیا۔ آوارگی کا ہر روپ میرا بہروپ تھا اور گھر چھوڑنے کی وجہ ایک فاحشہ کی چاہت تھی۔ لاہور کے گلی کوچوں کو خیرباد کہہ کر میں کراچی آیا۔ گزر اوقات کے جائز ذرائع مجھے دو وقت کی روٹی بھی نہ دے سکے اور یوں اس شہرِ غدار میں میں نے اسمگلنگ کا دھندا شروع کر دیا۔ اس کام نے بڑی مدت مجھ سے وفا کی مگر جب بدنصیبی کا سایہ پڑا، میں تن کے کپڑوں میں کسی خارش زدہ چوہے کی طرح پولیس سے چھپتا پھرا۔ میں نے ان دنوں کراچی کی زندگی کے وہ وہ پہلو دیکھے جن کا تصور تک محال ہے۔ مفلسی اور درماندگی کے اس دور میں میرا واسطہ لیاقت آباد کے ایک کیمیاگر سے پڑا۔ وہ سونا بنانے میں ماہر تھا مگر اس کی نرمی لانے کے لئے اسے ایک نایاب بوٹی بھاندرناس درکار تھی۔ اس کا تجربہ اور میرا حوصلہ یکجا ہوا تو ہم مشرقی پاکستان کے راستے عازمِ نیپال ہوئے۔ ان دنوں مشرقی صوبہ بُری طرح ہندو سازشوں کے چنگل میں تھا وہ کیمیاگر وہاں [illegible] گیا اور میں ملک دشمن عناصر کے ہتھے چڑھ گیا۔ طویل اور خونریز جدوجہد کے بعد میں ہندوستانی قید خانوں اور شہروں سے بھاگتا بھاگتا نیپال جا پہنچا۔ اور بے پناہ مصائب کے بعد انندرام نامی ایک رشی میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ کھٹمنڈو کے زبردست گروہ بند بدمعاشوں سے خون آشام قتال و جدال کے بعد میں کسی نہ کسی طرح سالانہ سفر کے موقع پر انندرام کا پیچھا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور شہروں سے گزر کر ویرانوں میں جا پہنچا۔ اس جدوجہد میں میرا بدنامی یک محسن بھی میرے ہاتھوں مارا گیا جس کا مجھے آج تک قلق ہے۔

انندرام کی بیٹی سندری تیس برس سے ہمالیہ کے آدم خوروں کے علاقہ میں رہتی تھی۔ اور وہ ہر سال میلوں کا جان لیوا سفر طے کر کے اپنی بیٹی سے ملنے وہاں جاتا تھا۔ مگر اس مہارشی کو یہ علم نہ تھا کہ اس کی کنواری بیٹی کچھ غیر ملکی سیاحوں کے ہاتھوں اپنی پاکیزگی لٹا دینے کے بعد بن بیاہی ماں بن چکی ہے۔ سندری کی بیٹی سیتا بہت جری اور خوبرو تھی۔ برفپوش وادیوں میں سفر اور برفانی انسان سے بھیانک معرکہ میں میں اس سے دل ہار گیا مگر اسی کے ساتھ آدم خوروں کا قیدی بھی بننا پڑا۔ سندری نے بڑی چالاکی سے مجھے ان کی قید سے نکالا اور اپنی بیٹی مجھے سونپ دی۔ جب میں اس سے رخصت ہوا تو اس نے بھونڈے پتھریلے نگ والی ایک انگوٹھی مجھے انعام میں دی جو کسی وقت انندرام نے اسے پہنائی تھی۔ آدم خوروں کی مقدس بوٹی بھاندرناس لے کر میں واپس روانہ ہوا تو انندرام سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے بھاندرناس ضائع کر دی اور خود میرے ہاتھوں مارا گیا۔ میرے لئے اب واپس اس علاقے کا رُخ کرنا ناممکن تھا پھر میری بیوی سیتا نے دھول گری کے خطرناک ہمالیائی علاقہ میں پارس پتھر کی تلاش [illegible] اور ہم دونوں پُرخطر راہوں پر چل نکلے۔

بھوپت کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں نے منشی کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اور میری بدقسمتی ایک بار پھر میرے آڑے آئی۔ ہوٹل کے کمرے میں رات گزار کر صبح کو میری آنکھ کھلی تو سیتا غائب تھی۔ بعد میں سارا دن سیتا کی تلاش کے بعد جب میں اپنی کار میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ٹرک نے اسے ٹکر ماری اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو ہسپتال میں تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں حراست میں ہوں۔ بعد میں پولیس نے مجھے سیکرٹ سروس والوں کے حوالے کر دیا۔ ہسپتال سے کار میں نامعلوم منزل کی طرف جاتے ہوئے میں نے سیکرٹ سروس کے گنجے افسر پر حملہ کر دیا لیکن کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ میرے کانوں نے آخری آواز جو سُنی وہ یہ تھی کہ واپس ہسپتال چلو۔

دوبارہ میری آنکھ جس عمارت میں کھلی، اُسے سیکرٹ سروس والے ڈان ہاؤس کہتے تھے۔ سیکرٹ سروس والوں کو میں نے یہ بتایا کہ پارس پتھر میرے پاس نہیں ہے اور سیتا اُسے لیکر نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ کچھ دن انہوں نے مجھے اس عمارت میں قید رکھا۔ اور پھر ایک دن میری آنکھ کھلی تو میں اس عمارت کے باہر تھا۔ دو راہگیروں کی گفتگو سے مجھے معلوم ہوا کہ سیتا کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان راہگیروں سے میں نے ڈان ہاؤس کا پتہ معلوم کیا تو انہوں نے اپنی گاڑی میں مجھے وہاں چھوڑنے کی پیشکش کر دی۔ میں ان کے ساتھ ڈان ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اچانک میرے سر کے عقبی حصے پر ضرب لگی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ڈان ہاؤس میں پایا۔ وہاں میں نے ایک بار پھر سونا بنانے کا چکر چلایا۔ بیدی کو اعتماد میں لے کر میں نے جب سونا بنانے کا دعویٰ کیا تو میرے دعوے کی تصدیق کے لیے تارا پور نیوکلیئر پراجیکٹ کا مشیر رامانند بھی آ گیا۔ نقلی سونے کی تیاری کے دوران میں نے دھوکے سے بیدی کو تیزاب پلا دیا۔ تیزاب پینے کے بعد اس کی شکل اتنی بھیانک ہو گئی تھی کہ میں اس کے منہ سے وہ چمٹی نکالنا بھول گیا جو اسے کھلا رکھنے کے لیے اٹکائی تھی اور پھر بیدی کی موت کے بعد جب ایک دن جسپال نے

چوٹی کے متعلق مجھے بتایا تو میں گڑگڑاتا ہوا اسی کی طرف لپکا، اس نے فوراً پستول تان لیا اور مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا۔

راما نند میرے بنائے ہوئے سونے کو آزما چکا تھا اور اسی لئے اس کے دل میں میرے لئے عقیدت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ان جذبات سے فائدہ اٹھا کر میں نے راما نند کو اپنی مظلومیت اور سائیکو مینشن والوں کے ظلم و زیادتی کا یقین دلا کر اس کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ راما نند، سیکرٹ سروس والوں کی مخالفت کے باوجود مجھے اپنے گھر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری رات کو جب راما نند ٹرالے سے گیا ہوا تھا اور میں اس کی لڑکی اوشا سے باتیں کر رہا تھا کہ باغ میں کسی کی موجودگی محسوس کر کے کھڑکی کے ذریعے باغ میں کودا تو حملہ آور مجھے زخمی کر کے فرار ہو گیا۔ میں کمرے میں واپس آیا تو تمام ملازم وہاں اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کا ساتھی راجو غائب ہے۔ اسی وقت باغ کی طرف سے ایک اور فائر کے ساتھ ہی انسانی چیخ سنائی دی۔

واقعات نے عجیب رُخ اختیار کر لیا تھا۔ اپنی تسکین کے لئے اوشا نے اور اس کے بعد اس کی سہیلی نینی نے مجھے آلۂ کار بنایا۔ اسی دوران کچھ ایسے واقعات ہوئے جن سے مجھے معلوم ہوا کہ کوئی روسی میری ذات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کی تلاش میں میں اس کے ہوٹل گیا تو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ میں کمرے کی تلاشی لے ہی رہا تھا کہ وہ بڑی خاموشی سے اندر داخل ہوا اور اپنا پستول نکال کر مجھے منہ دوسری طرف منہ کر کے دیوار کے قریب کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوا تو وہ دبے پاؤں میرے پاس آیا۔ موت کو اتنے قریب پا کر میری ہر حس بیدار ہو چکی تھی۔

اب آپ آگے ملاحظہ فرمائیے

نرم قالین پر بے آواز قدموں کی دھمک میرے عقب میں آکر رک گئی۔ اس کے ہموار سانسوں کی دھیمی دھیمی آواز کمرے کے سکوت میں سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ میری پشت اس کی جانب تھی، سامنے ٹھوس دیوار تھی اور میرے ہاتھ فضا میں اٹھے ہوئے تھے۔

اگر اس کے ہاتھ میں کوئی روایتی ہتھیار ہوتا تو میں اس موقع پر اس سے بھڑ جانے کا خطرہ مول بھی لیتا۔ ریوالور کی گولی بھی اچانک فائر کی صورت میں مجھے زخمی ہی کر پاتی۔ اس سے ہلاکت کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا مگر دنیا کے خطرناک زہر میں بجھی ہوئی سوئی کی نوک میرے جسم کے کسی بھی حصے میں پیوست ہوتی، موت یقینی تھی!

آخر کار اسے میری جیب سے ریوالور مل گیا اور اس کی آواز سنائی دی "اوہ! تو یہ تم نے اچھن سے حاصل کیا ہے۔"

شاید وہ ریوالور پوری الانوف ہی نے اچھن کو دیا تھا جو وہ پہلی نظر میں اسے پہچان گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس بدبخت روسی نے مجھے پھانسنے کے لئے بہت مضبوط جال بُنا تھا۔

مجھے غیر مسلح کرنے کے بعد اس نے مجھے ہاتھ گرا کر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اور خود مجھ سے محفوظ فاصلے پر صوفے پر دراز ہو گیا۔ زہریلی سوئی پھینکنے والا عجیب ساخت کا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور اس جنبش کے تیور بتا رہے تھے کہ ضرورت پیش آنے پر وہ اس کے استعمال میں ذرا بھی نہ جھجکے گا۔

"میں کل رات ڈیڑھ بجے تک بیلا پور کی لال حویلی میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔" چند ثانیوں بعد اسی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ گو وہ اپنے روسی لب و لہجے کو بدلنے پر قادر معلوم نہ ہوتا تھا مگر انگریزی الفاظ کے انتخاب میں خاصا محتاط تھا۔

"مجھے بلانے کے لئے تم نے بہت بھونڈا طریقہ اختیار کیا تھا۔" میں نے بے خوف لہجے میں کہا۔ میں اپنے اطوار سے اسے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ میں اس سے خائف نہیں ہوں۔

وہ ہونٹ بھینچ کر دھیمے سے ہنسا اور اس کی آواز مجھے کسی مکار بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنے سفاک ہو سکتے ہو ورنہ کوئی دوسری تدبیر اختیار کرتا۔ جب تم جانتے تھے کہ میں ڈاکٹر راما نند کے یہاں مقیم ہوں تو خود بھی فون کر سکتے تھے۔ اگر تمہاری شرائط معقول ہوتیں تو میں خود ہی سر کے بل دوڑا چلا آتا۔"

"میرے کام میں رازداری بنیادی شرط ہے۔" وہ یکایک سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "اگر میں براہِ راست تم سے رابطہ قائم کرتا تو اضطراری طور پر تم راما نند کو اعتماد میں لے سکتے تھے۔ وہ خنزیر کا تخم روسیوں سے نفرت کرتا ہے حالانکہ اس کی روزی ہماری جبری امداد سے وابستہ ہے۔ وہ بدک کر سارا معاملہ الجھا سکتا تھا اور میں غیر ضروری خطرات سے گریز کرتا ہوں!"

"اگر تم میرے مددگار ہی ہو تو مجھے راما نند سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "اعتماد میں لینے کا مسئلہ تو خطرے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر سفاکانہ مگر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ "یہاں آنے سے پہلے تمہارے بارے میں مجھے افسانوی قصے سنائے گئے تھے مگر مجھے یقین نہ تھا کہ تم اس قدر بے خوف ہو سکتے ہو۔"

"کس قدر؟"

"مجھے ذرا بھی امید نہ تھی کہ تم اچھن خاں سے الجھ پڑو گے اور تم نے اسے مار ہی ڈالا۔" آہستہ آہستہ اس کا لہجہ اعتدال پر آنے لگا تھا۔

"سنو مسٹر الانوف! میں ہند میں بدترین حالات کا شکار بنا ہوا ہوں۔ یہاں سے فرار میری سب سے بڑی آرزو ہے مگر میں ایک کنوئیں سے نکل کر کسی کھائی میں گرنا پسند نہیں کروں گا۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا "تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم صرف میری مدد کرنے کے لئے باہر سے یہاں بھیجے گئے ہو۔ تم کون ہو اور میری ذات میں کیوں دلچسپی لے رہے ہو؟"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ چند ثانیوں تک وہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا "کے جی بی میرے ذریعے تمہیں یہاں سے نکالنا چاہتی ہے۔"

"کے جی بی!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "روسی سیکرٹ سروس کی یہ ہمدردی بلا مقصد نہیں ہو سکتی۔"

"مقصد ضرور ہو گا مگر میں اس سے لاعلم ہوں۔" اس کے عجیب وضع کے پستول کی نال اس دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نیچے نہیں جھکی تھی نہ شہادت کی انگلی ٹریگر سے ہٹی تھی۔ "مقصد کے بارے میں میرے اوپر والے تم سے اسی وقت بات کریں گے جب تم اس قید سے رہائی پا لو گے!"

"ہند کے بجائے روس کی قید؟" میں سر ہلا کر بولا۔ یک بیک میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنی خواہشات کے برعکس زیرِ زمین تنظیموں میں خطرناک شہرت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ "نہیں مسٹر الانوف! یہ سودا بہت مہنگا ہے۔"

"اب تم زندہ رہو گے تو کریملن میں ورنہ موت تم پر سایہ فگن ہے۔ کے جی بی کے ہرکارے صرف احکام کی تعمیل جانتے ہیں۔ میں وہاں سے روانہ ہوا تو تم اگاٹی پر انڈین سیکرٹ سروس کے قیدی تھے اور میں تمہیں وہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ اب تم اگاٹی کے بجائے ممبئی میں ہو۔ تمہارے سامنے انتخاب کا معاملہ نہیں ہے۔ میری بات مانو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

مجھے اپنی ہتھیلیوں پر پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔ میں چند ثانیوں تک الانوف کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا "مجھے فیصلے کے لئے کچھ مہلت درکار ہے۔"

الانوف نے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور بولا "اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔"

میں خوفزدہ انداز میں ہنس دیا "میں دنوں کی بات کر رہا ہوں، مجھے سکون اور تنہائی چاہیے تاکہ میں آزادانہ فیصلہ کر سکوں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور سرد لہجے میں بولا "تم کسی تیسرے درجے کے اٹھائی گیرے کے سامنے نہیں ہو صفدر، اب تم واپس روز ہاؤس نہ جا سکو گے اور نہ میں طویل انتظار کا قائل ہوں۔ مجھے جلد از جلد واپس رپورٹ کرنا ہے۔"

میں نے بے چارگی سے سر جھکا دیا "میری نکاسی کی کیا صورت ہو گی؟"

"وہ میرا کام ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولا "تمہیں وہ جادوئی پتھر ساتھ لینا ہو گا جو لوہے کو سونے میں بدل سکتا ہے۔"

"پارس؟" میں نے دہشت زدہ لہجے میں دہرایا "مگر وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ بے یقینی کے عالم میں غرایا "وہ تمہارا ہے اور تمہارے ہی پاس رہے گا۔ مگر اسے تمہارے ساتھ ہونا چاہیے۔"

یہ جال بہت خوفناک تھا۔ الانوف کی اصل دلچسپی پارس ہی سے تھی۔ مجھے پارس سمیت ہند سے باہر لے جانے کی کوئی بھی کوشش خطرناک ہو سکتی تھی کیونکہ انڈین سیکرٹ سروس بھاری جانی نقصان اٹھانے کے بعد میری طرف سے بہت زیادہ محتاط ہو چکی تھی۔ الانوف مجھے رہائی کا لالچ دے کر پارس پتھر کی نمائش پر اکسا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جس لمحہ اس نے پارس کو آزمایا وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہو گا اور الانوف وہ نایاب پتھر لے کر خاموشی کے ساتھ ہند سے نکل جائے گا۔

"مگر وہ میرے پاس نہیں ہے۔" اس کا مقصد واضح ہو جانے سے میری خود اعتمادی بحال ہو گئی۔ جب تک مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے مجھے اس سے ہر لمحہ اپنی جان کا خطرہ تھا۔ مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ پارس پتھر کی کھوج میں تھا اور محض اسی مشن پر اسے روس سے بھارت بھیجا گیا تھا۔ اسے ہر قیمت پر پارس درکار تھا، پارس ملے بغیر وہ میری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ یہ بڑی احمقانہ سی حرکت ہوتی کہ سینکڑوں میل کا سفر کرنے کے بعد وہ محض ایک آدمی کو ہلاک کر کے بے نیل و مرام واپس لوٹ جاتا۔

"اگر تمہارے پاس ہوتا تو اب تک انڈین سیکرٹ سروس اسے حاصل کر چکی ہوتی۔" وہ سفاکانہ انداز میں مسکرایا "وہ تم نے جہاں کہیں بھی چھپایا ہے وہاں سے حاصل کرو ورنہ پارس کا نام تمہارے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔"

"سیتا کا سراغ لگانا میرے لئے بہت دشوار ہو چکا ہے۔ پارس اسی کے پاس ہے۔۔۔ وہ۔۔۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہنا شروع کیا لیکن اس نے روکھے لہجے میں میری بات کاٹ دی۔

"تمہاری اب تک کی ساری مکاریاں میرے علم میں ہیں۔ تمہاری داشتہ یقینی طور پر سرحد عبور کر چکی ہو گی، اور جلد ہی وہ بھی پکڑ لی جائے گی۔"

"الانوف ہوش میں رہ کر بات کرو۔" اس کے حقارت آمیز فقرے سن کر میں کھول اٹھا "سیتا میری بیوی ہے داشتہ نہیں۔"

"شٹ اپ!" وہ میرا مضحکہ اڑاتا ہوا بولا "ہرجائی مرد کے لئے ہر عورت داشتہ ہوتی ہے۔ تم راما نند کی لڑکی کے ساتھ عیاشی کر رہے ہو۔ تمہیں اپنی کسی بیوی کا تذکرہ زیب نہیں دیتا۔"

شاید اس نے اوشا کا حوالہ سرسری طور پر دیا تھا مگر یہ میری دکھتی رگ تھی، میں ایک دم بھڑک گیا "تمہیں شرم آنی چاہیے، اوشا میرے محسن کی بیٹی ہے۔"

وہ زور سے ہنسا "قریب بیٹھتے تو شاید وہ پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری گود میں آگری ہوتی۔ مردوں کے قرب کے ہوا آوارگی کا ہر انداز اس کا مزاج ہے۔"

یہ سن کر میں کانپ اٹھا۔ اوشا پہلی نظر میں کس قدر حسین اور معصوم نظر آئی تھی اور ڈاکٹر راما نند کس طرح والہانہ انداز میں اسے چاہتا تھا۔ بیٹی پر کیسا فخر کرتا تھا بڈھا! مگر چند ہی گھنٹوں میں میری نظروں میں اوشا کی پاکباز تصویر چکنا چور ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں انکشافات ہونے سے قبل میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ میری ذات اور ماحول سے متاثر ہو کر میری خوابگاہ میں چلی آئی تھی مگر نینی نے بتایا کہ اوشا اس کے گھر شرمناک فلموں کا شوق پورا کرنے آتی رہتی تھی اور اب الانوف پورے اعتماد سے اس کی ذات کے روپوش چہرے دکھا رہا تھا۔

اگر راما نند کو ان افسانوں کی بھنک بھی مل جاتی تو وہ ملک اور قوم کی خدمت کے جذبوں کو کہیں دفن کر کے اپنی کنپٹی میں گولی ہی مار لیتا۔

"اپنے گندے خیالات اپنے دماغ تک محدود رکھو۔ یہ بتاؤ کہ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں الانوف سے کہا۔

"میں پارس کے ساتھ تمہیں لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہاری ذات سے میری دلچسپی صرف اسی حد تک ہے۔" وہ ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ اس کا بریف کیس اس کے قدموں میں رکھا ہوا تھا اور زہریلے تیر پھینکنے والا پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

"میں پارس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"میں تشدد کے بہترین طریقوں سے واقف ہوں مسٹر صفدر!" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "اور بیلا پور کی ویران حویلی میرے لئے بہترین ٹھکانہ ثابت ہو گی۔"

"اگاٹی والے بھی تشدد کر کے عاجز آ گئے، تم بھی اپنے حربے آزما لو۔"

"میں جوڑ اتارنے میں خصوصی مہارت رکھتا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں اچانک وحشیانہ چمک کوندنے لگی "کہنی، بازو، ٹخنے اور گھٹنے کے جوڑ اتارنے کے بعد تم گوشت اور ہڈیوں کا ایک کراہتا ہوا انبار بن کر رہ جاؤ گے۔ تشدد ہی کامیاب رہتا ہے جو انسان کو پوری زندگی کے لئے معذور کردے۔"

اس کی وحشیانہ گفتگو سن کر میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور میں چند ثانیوں کے لئے ایک لفظ بھی نہ بول سکا، خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"تم پارس کس لئے چاہتے ہو؟" آخر میں نے بے چارگی کے ساتھ پوچھا۔

"مجھے اس کام پر مامور کیا گیا ہے۔"

"پارس میری رسائی سے باہر ہے۔"

"میں سچ اور صرف سچ سننے کا عادی ہوں۔" وہ خطرناک لہجے میں بولا۔

"اگر تم سونا چاہتے ہو تو میں پارس کے بغیر بھی سونا بنا سکتا ہوں۔" میں نے اسے پیش کش کی۔

"سونا!" وہ حقارت سے ہنسا "روس بھکاریوں کا دیس نہیں ہے۔ وہاں ہر شخص آسودہ اور مطمئن ہے۔ ہمارے قومی وسائل خوش حالی کا سرچشمہ ہیں۔ ننگے بھوکے ملکوں کے لئے سونا کشش انگیز ہوسکتا ہے۔ ہمارے لئے نہیں۔ کریملن میں روس کے بہترین دماغ پارس کی ماہیت پر غور کریں گے۔ ہمارا ملک وسیع تر مفادات کے لئے کام کرتا ہے، وقتی فائدوں کے لئے نہیں۔"

اس کی یہ گفتگو میرے لئے تعجب خیز تھی۔ یہ پروپیگنڈے کا دقیانوسی انداز تھا۔ اور کسی سیکرٹ ایجنٹ کی زبان سے ایسی فرسودہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔

"تو تمہارا ملک سائنسی تحقیق کے لئے پارس حاصل کرنا چاہتا ہے؟" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"یہ میرا قیاس تھا۔" وہ غصیلے انداز میں غرّایا "تمہیں مزید بکواس کی ضرورت نہیں۔ پارس کے بارے میں آخری بار سوچ سمجھ کر جواب دو۔"

"جو چیز میری پہنچ سے باہر ہے اس کے بارے میں سوچ بچار فضول ہے۔" میں نے آخری دم تک اسی بات پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"پھر دیوار سے چہرہ لگا کر کھڑے ہو جاؤ!" وہ پستول لہرا کر سرد لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ چند منٹ بعد اس نے مجھے گھومنے کی اجازت دے دی۔ اس دوران میں وہ ایک سیاہ اوورکوٹ پہن چکا تھا اور اس کے سر پر اسی رنگ کا فیلٹ ہیٹ نظر آ رہا تھا۔

"نیچے قالین پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ۔ اور داہنا ہاتھ آگے پھیلا دو۔" اس بار اس نے مجھے مضحکہ خیز قسم کی ہدایت دی "اور اپنا بازو کہنی تک ننگا کر دو۔"

"میں احمقانہ حرکتوں کے لئے تیار نہیں ہوں۔" میں بھنا کر بولا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔" الانوف سرد اور بے رحمانہ لہجے میں بولا۔

میں دل ہی دل میں اسے بے تحاشا گالیاں بکتا ہوا قالین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور داہنا ہاتھ پوری طرح آگے کی طرف پھیلا دیا۔ میری نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اور کلائی پر سے آستین اوپر سمٹی ہوئی تھی۔

"اب اپنا چہرہ بائیں طرف موڑ لو۔" اس کا اگلا حکم تھا۔

چند ثانیوں تک سناٹا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کسی ترکیب سے بے ہوش کرنے کی فکر میں ہے مگر اچانک ہی مجھے اپنی پوری کلائی کے اوپری حصے پر کسی دھات کا سرد لمس محسوس ہوا اور ایک کڑا میری کلائی کے گرد محیط ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنی کلائی پر الانوف کے دونوں ہاتھ تیزی سے حرکت کرتے محسوس ہوئے۔ میرے لئے یہ مہلت غنیمت تھی۔ اس وقت میرے مقابلے میں وہ خود بھی نہتا ہو چکا تھا۔ میں پوری قوت سے اچھل کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

اس کے حلق سے دبی دبی غراہٹ ابھری، مگر وہ خبیث ایسی کسی بھی کارروائی کے لئے تیار تھا۔ میرا ایک اچھا گھونسہ اس کی پسلیوں پر پڑا اور وہ پلک جھپکتے میں میری زد سے نکل گیا۔

میں نے اسے پھرتی کے ساتھ کوئی چابی نما چیز جیب میں ڈالتے دیکھا اور اسی کے ساتھ اس نے اپنا عجیب ساخت کا پستول اوورکوٹ کی جیب سے نکال لیا۔

میں جہاں تھا وہیں رک گیا اور میری نگاہیں اپنی داہنی کلائی پر جم گئیں۔ میری کلائی پر تقریباً ایک انچ موٹا اور ایک فٹ طویل خاصا وزنی ڈبہ موجود تھا۔ اس کی لمبائی میں دونوں سروں پر ہتھکڑی نما دو آہنی کڑے تھے۔ ہاتھ کے قریب والا کڑا الانوف مقفل کر چکا تھا جبکہ کہنی کے قریب والی ہتھکڑی کے دونوں سرے کھلے ہوئے تھے۔

"یہ لو، اور اوپر والی ہتھکڑی مقفل کر کے چابی واپس میری طرف اچھال دو۔"

الانوف نے ایک چابی میری طرف اچھالی۔ میں نے خاص طور سے یہ بات نوٹ کی کہ یہ چابی الانوف نے اس جیب سے نہیں نکالی تھی جس میں پہلی چابی ڈالی تھی۔ گویا دونوں ہتھکڑیوں کی چابیاں الگ الگ تھیں۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟" میں نے اس سیاہ صندوق کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے ساتھ زور آزمائی مت کرو۔" وہ بوکھلا کر جلدی سے بولا "دوسری ہتھکڑی مقفل کر دو تو میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

میں اس کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اگر ایک ہتھکڑی کے ذریعے وہ آہنی بلا میری کلائی سے چپکی نہ ہوتی تو میں ہرگز اسے گلے لگانے پر آمادہ نہ ہوتا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ میں نے ناچار دوسری ہتھکڑی بھی مقفل کی اور چابی اس کی طرف پھینک دی۔

"گڈ شو۔" چابی واپس مل جانے پر الانوف یک بیک مطمئن اور خوش نظر آنے لگا "اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ اسی سے تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ انڈین سیکرٹ سروس اور کے جی بی میں کتنا خوفناک فرق ہے۔"

"مگر پارس نہ وہ پا سکے نہ تم حاصل کر سکو گے۔" میں کوشش کے باوجود اس زہریلے طنز کو زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔

"وہ میں بعد میں دیکھوں گا۔" الانوف نے خلافِ توقع خوش دلی سے قہقہہ لگایا "فی الحال تمہاری حیثیت میرے کسی پالتو کتے سے زیادہ نہیں ہے۔ تمہاری داہنی کلائی پر ایک جدید قسم کا دھماکہ خیز اور آتش گیر بم بندھا ہوا ہے جو دس میل کے فاصلے سے بھی میرے ایک اشارے پر پھٹ کر تمہیں نیست و نابود کر سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے ایک قلم نکالا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا "یہ الیکٹرونکس کا کمال ہے۔ میں جونہی اس سوئچ کو دباؤں گا تمہاری کلائی پر بندھے ہوئے بم میں پوشیدہ

ریسیور سوئچ جنبش کرے گا اور یہ بم ایک شدید دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گا۔ یہ بم تمہارے جسم کے چیتھڑے ہی اڑانے پر بس نہ کرے گا بلکہ ہر کمرا آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔"

میں نے پہلی بار اپنے وجود میں دہشت کی لہر سرایت کرتی محسوس کی اور خوف زدہ نظروں سے اس چپٹے سیاہ بکس کو گھورنے لگا جو آستین کے نیچے چھپنے کے بعد شاید کسی کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔

"اگر تم نے ہتھکڑیاں توڑنے کی کوشش کی تو جھٹکوں کے باعث یہ بم خود بخود بھی پھٹ سکتا ہے۔ اب تم خاموشی کے ساتھ نیچے اتر کر بونانزا سے باہر نکلو اور قریبی ٹیکسی اسٹینڈ پر رک کر میرا انتظار کرو۔ اگر تم نے راستے میں کسی سے بات کرنے کی کوشش کی یا بھاگنا چاہا تو یہ یاد رکھنا کہ میں جانی نقصان کی پرواہ کئے بغیر سوئچ دبا دوں گا۔ میں ہر لمحہ پیچھے رہ کر تمہاری نگرانی کروں گا۔"

اس وقت میرے دل کی رفتار سست ہو چلی تھی مگر میں نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "ان شعبدوں سے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ الیکٹرونک ڈیٹونیٹر کیا ہوتا ہے۔"

"یہ اچھی بات ہے۔" مجھے اچھی طرح بے بس کرنے کے بعد اس کا موڈ بہت زیادہ خوش گوار ہو گیا تھا "عقلمندوں کو شکار کر کے مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔"

"شاید تم نے بونانزا کو اسی لئے ٹھکانا بنایا ہے کہ یہاں سے بیلا پور کا فاصلہ دس میل سے کم ہے۔" میں نے اسے کریدنے کی نیت سے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ الانوف سے الگ ہونے سے قبل اس مہیب خطرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لوں تاکہ ٹیکسی اسٹینڈ تک جاتے ہوتے میں اپنے لئے کوئی محفوظ لائحہ عمل مرتب کر سکوں۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے کور کئے ہوئے راہداری میں نکل آیا۔ کمرے کا خودکار دروازہ ہمارے پیچھے مقفل ہو گیا۔

میں اس کے ہمراہ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ الانوف میرے ہمراہ لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچ رہا تھا۔ پہلی منزل پر وہ دانستہ مجھ سے کافی پیچھے رہ گیا۔

رات کے دو بج رہے تھے مگر بونانزا میں زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ ہال مرکزی طور پر ایئر کنڈیشنڈ تھا مگر اس کے باوجود فضا شراب اور سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ دبی دبی آوازوں اور مترنم قہقہوں پر مغربی آرکسٹرا کی گونج حاوی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو الانوف مجھ سے تھوڑی دور اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لاپروایانہ انداز میں چلا آ رہا تھا۔

میں براہِ راست راہداری سے باہر نکلنے کے بجائے محض اس لئے ہال میں گھسا تھا کہ شاید ادشا نظر آ جائے یا اس کی کوئی سہیلی مجھے پہچان لے۔ اس طرح کم از کم راما نند کو یہ ضرور معلوم ہو سکتا تھا کہ گمشدگی سے پہلے میں آخری بار بونانزا میں موجود تھا مگر میری یہ امید بار آور ثابت نہ ہو سکی۔

بونانزا سے نکلتے ہی رات کی ویرانی اور سرد ہواؤں نے میرا استقبال کیا۔ گو آہنی خول والا بم زیادہ وزنی نہیں تھا مگر مجھے اپنا داہنا ہاتھ سن ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ الانوف کی دھمکیوں کے پیشِ نظر میں چلتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی فطری حرکات کو بھی سست رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں کسی جھٹکے کے باعث وہ بم خود بخود ہی نہ پھٹ جائے۔

ویران فٹ پاتھ پر مجھے عقب میں کوئی آہٹ نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو الانوف دس پندرہ گز پیچھے بے آواز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔ شاید اس کے پیروں میں کریپ سول جوتے تھے۔

چلتے چلتے مجھے ایک جگہ بجری اور پتھروں کا ڈھیر نظر آیا۔ فٹ پاتھ کے کنارے یہ چیزیں ایک زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے ڈھیر تھیں۔ میں اچانک کراہ کر لڑکھڑایا، جیسے مجھے ٹھوکر لگی ہو اور جب میں سنبھل کر سیدھا ہوا تو میری مٹھی میں چند پتھر موجود تھے۔ میں نے ٹٹول کر ایک چھوٹا سا گول مٹول پتھر اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھرتی سے مٹھی خالی کر دی۔

میرے تعاقب میں چند منٹ بعد الانوف بھی وہاں آ پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہاں موجود ٹیکسی ڈرائیوروں نے ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی مگر الانوف کو دیکھتے ہی تین چار آدمی ٹیکسیوں سے نکل کر اس کی طرف لپکے اور ٹوٹی پھوٹی مضحکہ خیز انگریزی میں اسے ان آبرو باختہ لڑکیوں کے بارے میں سمجھانے لگے جن کی وہ دلالی کرتے تھے۔ مگر الانوف نے خشک رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔

"پچاس روپے کمیشن دوں گا، اسے میری گاڑی میں لے چل بابو!" الانوف کو پگھلتے نہ دیکھ کر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے میرے قریب آ کر اردو میں کہا۔

اسی وقت الانوف نے میرا ہاتھ تھاما اور تیزی کے ساتھ ایک ٹیکسی میں جا گھسا۔ میں بھی عقبی نشست پر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انتہائی ادب کے ساتھ دروازہ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ دوسرے ڈرائیور موٹی مرغی ہاتھ سے نکلنے پر کفِ افسوس ملتے رہ گئے، اور ہماری ٹیکسی نیم تاریک اسٹینڈ سے نکل کر بمبئی کی جگمگاتی، لیکن ویران سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"اسے بتاؤ کہ ہمیں بیلا پور جانا ہے۔" الانوف نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔

آسان نسخہ

دماغی امراض کے اسپتال میں ایک مریض دوسرے مریض کے پاس گیا اور بولا۔

"کیوں اتنا غصّہ کر رہے ہو یار؟"

وہ بولا "میرے پاس صرف ایک شلوار تھی۔ وہ میں نے دھوئی تو سکڑ گئی اب اتنی چھوٹی اور تنگ ہو گئی ہے کہ پہنی نہیں جاتی۔"

پہلا مریض ہنسنے لگا اور بولا "تو یہ کون سی مشکل بات ہے۔ اب خود کو بھی دھو لو تو شلوار کے سائز کے برابر ہو جاؤ گے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک انوکھی تدبیر آگئی۔ الالوف نے مجھے اپنا مترجم بنا کر نجات کی ایک راہ سجھا دی تھی۔ میں ڈرائیور کو اپنے اعتماد میں لے سکتا تھا مگر الالوف بھی نرا احمق نہیں تھا۔ میرے فقرے میں بیلاپور کا نام آتے ہی وہ ہوشیار ہو سکتا تھا۔

"ڈرائیور! میری بات پر چونکنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اردو میں کہا۔ "یہ مجھے بیلاپور لے جا کر قید کرنا چاہتا ہے۔" میں نے انکھیوں سے دیکھا کہ الالوف پوری توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میری زبان سے بیلاپور کا نام سن کر مطمئن ہو گیا تھا۔

وہ ڈرائیور میری توقع سے زیادہ ہوشیار نکلا اور ذرا بھی حیرت کا اظہار کئے بغیر سکون سے بولا۔ "کیا چوری چکاری کا معاملہ ہے؟"

اب الالوف چونک سکتا تھا لہٰذا میں انگریزی میں اس سے مخاطب ہو گیا۔ "ڈرائیور کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس تین زبردست لڑکیاں ہیں!"

"اس کتے کے بچے سے کہو کہ لڑکیوں کو جہنم میں ڈالے۔" الالوف غصیلے لہجے میں بولا۔ "میں اسے میٹر سے دس روپے زائد ادا کروں گا۔"

"چوری نہیں چرس کا معاملہ ہے۔" میں اس بار ڈرائیور سے مخاطب تھا۔ "تم اسے ہوشیار ہونے کا موقع دیئے بغیر زیر کر سکو تو دو ہزار نقد دوں گا۔"

"اوہ!" ڈرائیور کے منہ سے تحیر آمیز آواز نکلی۔ "اس رقم کے لئے تو میں اس کا گلا بھی کاٹ سکتا ہوں!" یہ بمبئی کے ڈرائیور کا اصل روپ تھا۔

"یہ حیران کیوں ہوا تھا؟" چند ثانیوں کے بعد الالوف نے پوچھا۔

"میں نے اسے بتایا کہ ہم نے بیلاپور میں پہلے سے دو لڑکیوں کا انتظام کیا ہوا ہے۔" میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔

الالوف صورتحال سے مطمئن ہو گیا اور میں بے چینی سے کسی ہنگامے کے آغاز کا انتظار کرنے لگا۔ میرے اعصاب پر تناؤ طاری ہونے لگا تھا کیونکہ ڈرائیور کی ذرا سی کوتاہی میری ہلاکت کا سبب بن سکتی تھی۔ اگر الالوف کو شک ہو جاتا تو وہ لمحہ بھر میں میرے بدن کے چیتھڑے اڑا سکتا تھا۔ اس بھیانک موت کا تصور کرتے ہی ٹھنڈک کے باوجود میری پیشانی سے پسینے کی بوندیں پھوٹنے لگیں۔

چلتے چلتے گاڑی نے اچانک جھٹکے لینے شروع کر دیئے اور ڈرائیور قدرے بلند آواز میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے بے چینی کا اظہار کرنے لگا۔

"کیا ہوا؟" الالوف نے اس کی طرف جھک کر غصیلی انگریزی میں براہ راست پوچھا۔

یہ بات ڈرائیور کی سمجھ میں آگئی اور اس نے ہاتھ کا منفی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پٹرول ختم!" اسی کے ساتھ اس نے اگنیشن بند کر دیا اور گاڑی کا گیئر نیوٹرل کر دیا۔ گاڑی اپنے زور میں سڑک پر بے آواز دوڑتی رہی۔

اور جب رفتار کا زور ٹوٹا تو ڈرائیور نے ٹیکسی سڑک سے نیچے اتار کر بریک لگا دیئے اور پھرتی سے نیچے اتر گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ڈرائیور کارروائی کا آغاز کر چکا تھا اور اب چند ہی ثانیوں میں میری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

میں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا لہٰذا دروازہ کھول کر اسی کی سمت میں اترا۔

"ہینڈز اپ!" باہر نکلتے ہی میرے کانوں میں ڈرائیور کی کرخت آواز آئی۔

میں نے چونک کر سر اٹھایا تو چھوٹے بور کے ایک ریوالور کا دہانہ میری طرف اٹھا ہوا تھا۔

ڈرائیور کی پوری توجہ مجھ پر مرکوز تھی۔ الالوف کو وہ وقتی طور پر بھولا ہوا نظر آ رہا تھا کیونکہ الالوف نے گاڑی سے اترتے ہوئے جوں ہی ڈرائیور کی للکار سنی، وہ ٹیکسی کی اوٹ میں دبک گیا اور ڈرائیور نے بھی اسے نظر انداز کر دیا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" ڈرائیور کی اس حرکت پر میں چراغ پا ہو گیا۔

"جیبوں میں جتنی رقم ہے میرے حوالے کر دو۔" ڈرائیور کا لہجہ سخت اور حاکمانہ تھا۔ "ابھی میں گورے کو تمہاری سازشی پیشکش کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ بھی مجھے بھاری انعام دے گا۔ ایسا بڑا شکار تو مقدر والے ہی کو۔۔۔ چلتا ہے۔ خالی کرو اپنی جیبیں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے ریوالور والے ہاتھ کو۔۔۔ دھمکی کے انداز میں جنبش دی۔

"میرے پاس۔۔۔!" میں نے غصے میں چیخنا ہی چاہا تھا کہ ڈرائیور کے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکلی اور وہ کسی بے جان شہتیر کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اسے دبوچنے کے لئے آگے لپکا مگر اسی وقت ٹیکسی کے عقب سے الالوف کی سرد آواز آئی۔

"وہ مر چکا ہے!" یہ سن کر میں تیزی سے گھوما تو پوری الالوف میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ کھلونے نما پستول دبا ہوا تھا جو زہریلے تیر برساتا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا کہ میرا بھانڈا پھوٹنے سے قبل ہی الالوف نے اس لالچی کا کام تمام کر دیا تھا۔

"بمبئی ٹھگوں کا شہر ہے!" ڈرائیور کی لاش کو ٹیکسی کی ڈکی میں ٹھونستے ہوئے الالوف بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ پٹرول ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ بار بار کلچ دبا کر گاڑی کو جھٹکے دے رہا تھا۔ سڑک ویران دیکھ کر اس نے ہمیں لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہو گا۔"

میں نے لاش کے دونوں پیر تھامے ہوئے تھے۔ الالوف نے اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر ڈکی میں پڑے ہوئے جیک کے آہنی ہینڈل پر پڑی اور میں نے لاش کو پوری قوت سے الالوف کی طرف دھکیلا اور لپک کر آہنی سلاخ اٹھا لی۔

میری یہ حرکت نہایت غیر متوقع تھی۔ الالوف لاش کا وزن نہ سہار سکا اور بے تحاشا گالیاں بکتا ہوا لاش کے نیچے دبا، زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے پوری قوت سے آہنی سلاخ اس کے سر پر رسید کی اور وہ کریہہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں نے پھرتی سے الالوف کی جامہ تلاشی لی اور سارا سامان اپنی جیبوں میں منتقل کر لیا۔ اسی میں زہریلے تیر برسانے والا پستول بھی تھا، میرے داہنے ہاتھ پر بندھے ہوئے الکٹرونک ڈیٹونیٹر کی چابیاں بھی تھیں اور اس بم کا کنٹرول سوئچ بھی!

میں نے سب سے پہلے پوری احتیاط سے اپنی داہنی کلائی کی ہتھکڑیاں کھول کر وہ مہلک بلا اتاری اور اسے ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ تلے رکھ دیا پھر میں نے باری باری دونوں لاشیں ٹیکسی کی نشست پر ڈالیں اور الالوف کا بریف کیس لے کر واپس دوڑ پڑا۔

چلنے سے پہلے میں نے آہنی سلاخ ڈکی میں ڈال دی تھی مگر میں نے یہ نہیں دیکھا کہ الالوف زندہ ہے یا مر گیا۔ اس کے سر کے زخم سے بہنے والے خون کی وافر مقدار دیکھ کر میں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ ضرب لگتے ہی مر گیا ہو گا۔

میں سڑک سے اتر کر درختوں اور ٹیلوں کی اوٹ میں کئی سو گز دور واپس دوڑتا چلا گیا۔ پھر میں نے جیب سے قلم نما سوئچ نکالا جس کا اوپری حصہ بال پن کی طرح دبایا

جا سکتا تھا۔ میں نے جوں ہی وہ حصہ دبایا، سڑک کی جانب ایک ہولناک دھماکہ سنائی دیا اور رات کے اندھیرے میں شعلوں کی سرخی بھڑکنے لگی۔ دھماکے کا شور سن کر میرا رواں رواں لرز اٹھا۔ الالوف نے جو کچھ کہا تھا اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں تھا مگر یہ میرے نصیب ہی کی خوبی تھی کہ شکاری خود ہی جال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے رومال سے پسینوں میں بھیگا ہوا چہرہ خشک کیا اور پیدل شہر کی طرف چل پڑا۔

ویران سڑک سے شہر کی طرف لوٹتے ہوئے میری پوری کوشش یہ تھی کہ سڑک سے دور مگر اس کے متوازی چلتا رہوں جو تاروں کی چھاؤں میں کچے میدان سے تقریباً ایک ڈیڑھ فٹ اوپر چمکتی نظر آ رہی تھی۔ اگر میں راستہ بھٹک جاتا تو میرے لئے بے شمار دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

اس وقت صبح کے تین بجنے والے تھے اور میرا ذہن تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف تھا۔ پچھلی شام جب میں ڈاکٹر راماننڈ کی قیام گاہ سے روانہ ہوا تو میرا خیال تھا کہ اپنی ذات میں دلچسپی لینے والے پراسرار روسی کا سراغ لگانے کے بعد میں واپس سمندہ اوس جاؤں گا مگر بونانزا میں مجھے اپنے مشن میں خلاف توقع کامیابی حاصل ہوئی اور میں براہ راست الالوف کے کمرے میں جا پہنچا۔ اس کے بعد حالات میرے قابو سے باہر ہو گئے۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے الالوف کا داؤ اسی پر الٹ دیا تھا مگر مجھے اس ہنگامے سے اپنا دامن بچانا مشکل نظر آ رہا تھا۔

میں جب روز ہاؤس سے نکلا تو ڈاکٹر راماننڈ طویل محنت کے بعد تھک کر سو چکا تھا۔ یہ یقینی بات تھی کہ میری واپسی میں تاخیر ہونے کے ساتھ ساتھ اوشا کی بے چینی بڑھتی رہی ہو گی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ گزشتہ روز مجھے ایک ایسا فون موصول ہوا تھا جس میں میرا اصلی نام لیا گیا تھا۔ اس کے بعد بونانزا میں الجھن سے میرا معرکہ ہوا تو میں نے اپنی چوٹوں کا سرسری سا فرضی جواز پیش کر کے اوشا کو مطمئن کر دیا تھا مگر رات گئے تک میری واپسی نہ ہونے پر وہ پچھلے واقعات پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

مجھے یقین تھا کہ اوشا اور راماننڈ نے بوکھلا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہو گا اور سورج نکلنے سے پیشتر ہی بونانزا کی پارکنگ لاٹ میں اوشا کی ڈیسیٹر کار دریافت کر لی جائے گی یا شاید اسی وقت اس کا سراغ بھی لگا لیا گیا ہو۔ پھر الالوف کی جھلسی ہوئی لاش کے ٹکڑے بھی جلد ہی شناخت کر لئے جاتے کیونکہ بونانزا کی انتظامیہ کمرہ نمبر تین سو چار کے مکین کی غیر حاضری کی رپورٹ درج کرا دیتی۔ ٹیکسی کے نمبر کے سہارے پولیس یقیناً بونانزا کے قریبی ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچ جاتی اور وہاں متوفی ٹیکسی ڈرائیور کے کئی ساتھیوں نے مجھے دیکھا تھا، گو وہاں بھرپور روشنی نہیں تھی مگر اس کے باوجود خد و خال پہچانے جا سکتے تھے اور یوں الالوف کی موت میری ذات سے منسوب کی جا سکتی تھی۔ شاید بونانزا کا لفٹ بوائے بھی مجھے پہچان کر گواہی دیتا کہ میں نے اسی سے الالوف کے بارے میں دریافت کیا تھا!

ہندسرکار مجھے مقامیوں سے خون خرابے کے سلسلے میں تو رعایت دے سکتی تھی مگر غیر ملکی کے قتل کا معاملہ بالکل ہی مختلف تھا۔ الالوف کا سفارت خانہ تو اسے عام شہری ہی قرار دے کر سخت کارروائی کا مطالبہ کرتا مگر میں جانتا تھا کہ الالوف کے۔جی۔بی کا مہرہ تھا اور ہر طرح لیس ہو کر ایک خاص مشن پر بمبئی پہنچا تھا لہٰذا میرا حشر جو بھی ہوتا، نہایت عبرتناک ہوتا!

ادھر بمبئی میرے لئے اجنبی شہر تھا۔ وہاں میرے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ میں اس بارے میں جتنا سوچتا رہا، مایوسی بڑھتی ہی چلی گئی۔ پھر اچانک مجھے مسز دینی دھرما یاد آئی۔

بڑی بڑی آنکھوں والی وہ سوگوار خاتون ان کٹھن لمحات میں میرے قریب آ سکتی تھی۔ وہ محبت کو ترسی ہوئی تھی اور اس نے میری ذات کا سہارا لیا تھا۔ اس کے گھر میں بوڑھی ماما کے سوا کوئی نہ تھا۔ میں کچھ عرصے کے لئے اس کے گھر میں روپوش رہ سکتا تھا۔

وہاں جانے سے پہلے میں الالوف کے بریف کیس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی وہ خاصا وزنی تھا اور آزادانہ نقل و حرکت میں حارج ہو رہا تھا۔ جوں ہی مجھے ایک ویران مقام پر لیمپ پوسٹ کی بیمار زرد روشنی نظر آئی، میں اسی طرف ہو لیا۔

گرد و پیش سے غافل ہوئے بغیر میں نے الالوف کی جیبوں سے نکلنے والے چابیوں کے مختصر سے گچھے کا جائزہ لیا اور بریف کیس کی چابی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا بریف عجیب ساخت کا تھا۔ تالا ایک چکور آہنی پٹی پر لگا ہوا تھا اور چابی کے سوراخ کے نیچے ہی چند چھوٹے چھوٹے بٹن لگے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری ہر بٹن کو دبایا مگر کوئی کھٹکا نہ سنائی دیا۔ پھر میں نے جوں ہی تالے میں چابی گھمائی، ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور میرے چہرے کے سامنے دھوئیں کا ایک گرم اور کثیف بادل چھا گیا۔ ہاتھوں کی جلد جلتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

میرے دونوں ہاتھوں کی جلد جھلس چکی تھی اور زمین پر پڑا ہوا بریف کیس دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ شاید بریف کیس کے قفل کے ساتھ کوئی حفاظتی نظام وابستہ تھا تاکہ کوئی خاص ترکیب اختیار کئے بغیر قفل کھولے جانے کی صورت میں ہر چیز جل کر برباد ہو جائے۔۔۔ اور

کسی غیر متعلقہ شخص کے ہاتھوں میں نہ پہنچ سکے!

میں دہشت اور سکتے کے عالم میں چند ثانیوں تک جلتے ہوئے بریف کیس کو گھورتا رہا۔ جھلسے ہوئے ہاتھوں کی سوزش نے مجھے بے چین کر دیا اور میں بے چارگی کے عالم میں شہر کی طرف دوڑ پڑا۔ جلی ہوئی سیاہ کھال پر بڑے بڑے آبلے نمودار ہونے لگے تھے۔

پھر میری نظر ایک جوہڑ پر پڑی۔ میں نے زخم بگڑنے کی پروا کیے بغیر دونوں ہاتھ گندے پانی میں ڈال دیئے۔ یہ ترکیب کارگر رہی اور زخموں کی ناقابلِ برداشت اذیت میں خاصی کمی ہوگئی مگر چند منٹ کے بعد میں نے جوں ہی ہاتھ باہر نکالے، تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوہڑ کے کناروں پر پھیلی ہوئی دلدلی کیچڑ میں ڈال دیئے اور زخموں کو تازہ کیچڑ میں چھپا کر ہاتھ باہر نکال لئے۔ اس باسی کیچڑ کی نمی نے بہت سکون دیا اور میں ایک بار پھر آگے چل پڑا۔

رات کی ویرانی میں اکا دکا بے گھر راہ گیروں اور آوارہ کتوں کے غول سے بچتا بچاتا میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ مجھے شہر کے راستوں کا کچھ علم نہیں تھا نہ میں ایسی حالت میں تھا کہ اتنی رات گئے کسی لاابالی راہگیر کی مشتبہ نظروں کا سامنا کر سکوں۔

آخر میری نگاہ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے ایک بھکاری پر پڑی۔

وہ چیتھڑوں کا انبار اپنے جسم پر لپیٹے، سکڑا ہوا، بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر چھپا لئے اور آہستہ سے اسے پکارا تو اس نے چیتھڑوں سے سر باہر نکالے بغیر ہی مجھے پھٹکار دیا۔ کئی کوششوں کے بعد اس نے چیتھڑوں سے سر باہر نکال کر میری بات سننے پر آمادگی ظاہر کی تو میں اس کا چہرہ دیکھ کر لرز اٹھا۔ وہ جذام کا مریض تھا!

"بابا چوپاٹی کا راستہ کس طرف ہے؟" میں نے خوشامدانہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

وہ بھیانک اور غیر فطری انداز میں غرایا "میں اپاہج ہوں اور پچھلے سات برس سے یہیں پڑا ہوا ہوں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ اتنی معمولی سی بات کے لئے ٹھنڈ میں معذور کو ستا رہا ہے!"

وہ معذور اور مفلس تھا۔ انسانی نقطۂ نظر سے وہ ہر قسم کی ہمدردی کا مستحق تھا مگر اس کے لہجے میں اس قدر تکبر اور نفرت کی آمیزش تھی کہ میں نے بلند آواز میں اسے ایک نہایت فحش گالی دی اور ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کی غضبناک آوازیں اپنے طاغوتی آہنگ کے ساتھ دور تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔

میں شہر کے مختلف حصوں میں ٹھوکریں کھاتا پونے پانچ بجے کے قریب نینی کے مکان پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ پورٹیکو اور پھاٹک کے سوا پوری عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ادھر میرے جھلسے ہوئے ہاتھوں پر لتھڑی ہوئی کیچڑ خشک ہو چلی تھی اور میں شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

مسز نینی ورما کے مکان کے احاطے کی دیواریں تین چار فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھیں۔ انہیں حفاظت سے زیادہ آرائش کے انداز میں تعمیر کیا گیا تھا اور یہ بات میرے لئے سود مند تھی کیونکہ میں ہاتھوں کو مزید زخمی کئے بغیر آسانی سے اندر کود گیا۔ میری کوشش

- دُنیا میں سب سے زیادہ عذاب اماں حوا نے برداشت کیا ہے۔ ان کے دور میں چونکہ کوئی دوسری عورت موجود نہیں تھی لہذا انہیں غیبت اور لڑائی جھگڑے کا موقع ہی نہیں ملا۔
  (جارج برنارڈ شا)
- عاشق دُنیا کو دُوربین سے دیکھتا ہے اور حاسد خوردبین سے۔
  (آئن اسٹائن)
- پُرانے خطوط پڑھنے میں زیادہ مزا اس لیے آتا ہے کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہیں دینا پڑے گا۔
  (لارڈ بائرن)
- ہمارے آباؤ اجداد پیدائش سے ابدیت تک کی راہ سے خُوب واقف تھے۔ اور ہم بیسویں صدی کے انسان، تمام تر علمی ترقی کے باوجود اس باب میں مشکوک ہیں
  (والٹر لیمین)
- میں نے پڑھا ہے کہ ہاتھیوں کی عمر، انسان سے طویل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں ڈائٹنگ نہیں کرنا پڑتی اور وزن کم کرنے کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑتا
  (بوب ہوپ)

یہ تھی کہ بوڑھی ماما یا نینی کی اطلاعی بال کو میری وہاں آمد کا علم نہ ہونے پائے لہٰذا میں دستک دینے یا گھنٹی بجانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔

احاطے کی دیوار نیچی ہونے کے سبب مجھے اندر پہنچنے کے بعد رکوع کی حالت میں جھک کر آگے بڑھنا پڑا تاکہ باہر سے کوئی چوکیدار وغیرہ میری نقل و حرکت نہ دیکھ سکے۔

میں شام کے وقت اس مکان میں آ چکا تھا اور نینی کی خوابگاہ میں عیش و عشرت کے کچھ یادگار لمحات بھی گزار رہے تھے لہٰذا مجھے خوابگاہ کے محلِ وقوع کا بخوبی اندازہ تھا۔

مسز نینی ورما کے خوابیدہ مکان کے احاطے میں پھیلی ہوئی تاریکی میں کسی چوپائے کی طرح عمارت کے عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے مقدر کی ستم ظریفی پر مسکرا کر رہ گیا۔ صرف چند گھنٹوں میں میری حیثیت میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ پہلی بار دل میں آوارگی کا چور لئے میں اس مکان میں آیا تو آبرو کے ساتھ میرا استقبال کیا گیا تھا۔ وہاں کی رہنے والی نے اپنی قبائے عصمت میری نذر کر دی مگر اب رات کے سناٹے میں کسی مویشی کی طرح وہاں رینگنے پر مجبور تھا۔

عقبی رخ پر پہنچتے ہی میں چونک پڑا۔ فضا میں دبی دبی اور بہکی ہوئی کچھ سرگوشیاں سی تیر رہی تھیں۔ اچانک میری کنپٹیاں جلنے لگیں۔ شاید نینی وہاں تنہا نہیں تھی۔

میں مزید آگے بڑھا اور نینی کی خوابگاہ کی کھلی ہوئی عقبی کھڑکی میری نظروں کے سامنے آگئی۔ کھڑکی کے اندرونی حصے پر دبیز نیلے پردے لٹکے ہوئے تھے جن کے پیچھے ہلکی روشنی چمکتی نظر آ رہی تھی۔ پردوں کے درمیان ذرا جھری نہیں تھی جس سے میں اندر جھانک سکتا البتہ اندر سے نینی کی ہانپتی ہوئی والہانہ سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی آواز کے زیر و بم سے پتہ چل رہا تھا کہ اسکے حسین سراپا کو ایک جگہ قرار نہیں ہے، شاید وہ سیماب کی طرح کسی کی باہوں میں مچل رہی تھی کیونکہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کسی مرد کی لڑکھڑاتی ہوئی مخمور آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ جو بھی تھا نینی پر خاصا حاوی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے بے ربط بلکہ مہمل فقروں کا لہجہ تحکمانہ اور سخت گیر تھا۔

نینی کی ذات سے میری کوئی گہری وابستگی نہیں تھی۔ میری اور اس کی ملاقات ایسی تھی جیسے دو مختلف راستوں کے مسافر اتفاقاً چند لمحوں کے لئے کسی چوراہے پر مل جائیں مگر نینی کی خوابگاہ میں اپنے بجائے کسی اور جیتے جاگتے مرد کو موجود پا کر میرے وجود میں اچانک نفرت اور انتقام کا جوالا مکھی بھڑک اٹھا۔ میرا جی چاہنے لگا کہ میں اپنے ہاتھوں سے نینی کے ٹکڑے اڑا دوں۔

اس نے میری دوستی کی بناطر اپنے شوہر سے بے وفائی کی اور اب اپنے تپے کیف لمحوں کو نکھارنے کی خاطر کسی اور کو اپنے دام میں پھانسے بیٹھی تھی۔ وہ نہ میری بیوی تھی نہ محبوبہ۔ ہاں ایک اعتبار سے میری داشتہ کہی جا سکتی تھی جس سے میری دوسری ملاقات ہونی باقی تھی مگر مرد کی ذات عورت کے حق میں بدترین آمر ہوتی ہے۔ ہر مرد اس عورت کو اپنا پیدائشی غلام سمجھنے لگتا ہے جس سے اس کا ذرا بھی تعلق پیدا ہو جائے اور اگر وہ عورت کسی اور پر ملتفت ہو جائے تو وہی مرد حسد سے پاگل ہو جاتا ہے!

میں نے کسی چیتے کی سی مکاری کے ساتھ آہستگی سے ہاتھ بڑھایا اور ایک پردہ کو ذرا سی جنبش دی۔ پل بھر کے لئے دو پردوں کے سرے ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور میرا خون کھول اٹھا۔ ایک خوفناک غراہٹ میرے حلق میں ہی دم توڑ گئی اور آنکھیں جلنے لگیں۔

جب میں اس کا رفیق تھا تو تاریکی ہم پر سایہ فگن تھی مگر اس وقت ہلکی سبز روشنی میں نرم اور بیش قیمت مسہری پر دو بدن پیچ کھاتے ہوئے بے چین سانپوں کی طرح پھنکارتے، سسکارتے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی جیب سے وہ عجیب پستول نکالا جو میں نے الانوف سے چھینا تھا اور اگلے ہی لمحے ایک بے آواز زہریلا تیر نینی کے نیچے دبے ہوئے مدہوش شخص کی گردن میں پیوست ہو گیا۔

میں نے تیر نشانے پر لگتے دیکھ کر فوراً پردہ چھوڑ دیا مگر چند ہی سیکنڈ میں نینی کی ہذیانی چیخوں سے میری زخمی انا کو تسکین مل گئی۔ وہ دیوانہ وار مدد کے لئے چیخ رہی تھی۔

میرے لئے یہ صورتحال بہت خطرناک تھی۔ میں پناہ لینے کے لئے وہاں پہنچا تھا مگر حالات نے اچانک ہی ایک ڈرامائی موڑ اختیار کر لیا۔ نینی کے چیخنے سے پہلے تک مجھے اپنے اقدام کے نتائج کی پرواہ نہیں تھی مگر نینی کی سریلی چیخوں نے میرے حواس پر تازیانہ کا کام کیا۔ اگر اب میں ذرا بھی غفلت سے کام لیتا تو وہ مکان میرا مقبرہ بن سکتا تھا۔

اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں طویل چکر کاٹ کر عمارت کے سامنے والے حصے سے جانے پہچانے راستے پر فرار کی کوشش کرتا۔ چند ہی لمحوں میں نینی کی چیخوں کا ردِ عمل ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ بالائی منزل سے دو مختلف عورتوں کی چیخیں بھی سنائی دینے لگی تھیں اور قرب و جوار کے مکانات کی کھڑکیاں تیزی سے روشن ہوتی جا رہی تھیں۔

اس وقت صورتحال ایسی سنسنی خیز اور روح فرسا تھی کہ میں اپنے جھلسے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو بالکل ہی بھول گیا اور نینی کے مکان کے احاطے کی عقبی دیوار کسی بندر کی سی پھرتی سے کود گیا۔ وہ ایک پتلی اور ناہموار سی گلی تھی۔ میں پوری رفتار سے اس گلی میں ایک طرف دوڑنے لگا۔

فضا میں اب ملی جلی بلند انسانی آوازوں کے ساتھ ہی پہرے پر مامور سپاہیوں کی سیٹیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

میں اس گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر چند ثانیوں کے لئے ٹھٹکا پھر میدان صاف پاتے ہی پوری رفتار سے داہنی طرف کی ایک فٹ پاتھ پر دیواروں کے سائے میں دوڑ پڑا۔

رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی ہوئی خوفزدہ نسوانی چیخیں دم توڑ چکی تھیں مگر اب فضا کا سکوت بھی باقی نہیں رہا تھا۔ جائے واردات کے قرب و جوار سے ابھرنے والی دھیمی دھیمی آوازوں نے مل کر ایک گونج کی شکل اختیار کر لی تھی اسی کے ساتھ آوارہ کتوں کا تیز شور بھی سنائی دینے لگا۔ اس ماحول میں پولیس والوں کی تیز سیٹیاں آسیبی چیخوں کا سماں باندھ رہی تھیں۔

میں پوری قوت سے بھاگا جا رہا تھا کہ اچانک سامنے کے کسی موڑ سے ایک کار کے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی طلوع ہوئی اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس وقت میرے پاس سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ میں ہر قیمت پر اس علاقے سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

میں نے سڑک کے وسط میں آ کر آنے والی کار کو روکنے کے لئے دونوں ہاتھ لہرانے شروع کر دیئے۔ میرے کان پوری توجہ سے انجن کی آواز پر مرکوز تھے تاکہ بے خبری میں میں آنے والی کار کے پہیوں تلے روند نہ ڈالا جاؤں۔

مگر اس کار کا ڈرائیور خاصا نرم دل معلوم ہوتا تھا۔ بمبئی والوں کے روایتی لاتعلقانہ رویئے کے برعکس اس نے دور ہی سے بریک لگانے شروع کر دیئے اور میرے قریب لا کر کار روک دی۔

"مجھے لفٹ چاہیئے!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کہاں جائیں گے؟" کار کے اندر اندھیرے میں ایک شبہات آمیز آواز ابھری۔ اسے میری حالت، میرے لہجے اور پولیس کی سیٹیوں کے شور نے شبہ میں ڈال دیا تھا۔

میں نے غرا کر اسے ایک بھیانک سی گالی دی اور اس سے قبل کہ وہ جواب دے سکے، یوری الانوف کے پستول سے نکلے ہوئے زہریلے تیر نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھے بیٹھے ہی مٹی کے کسی بے جان پتلے کی طرح پائیدان میں ڈھلک گیا۔ گاڑی گیئر میں تھی لہٰذا اس نے آگے کی طرف ایک تیز جھٹکا لگایا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔

اس وقت صحیح معنوں میں مجھ پر خون سوار تھا۔ جنون اور دہشت کے باعث میں اپنی ہر تکلیف کو قطعی فراموش کر چکا تھا۔ میں نے جھلسے ہوئے ہاتھوں سے اسے

ایک طرف دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی ساتھ ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔

میں آندھی بن کر اس خطرناک علاقے سے روانہ ہوا۔ میں نے گلیوں کے پُرپیچ راستوں کے بجائے کھلی سڑک کی راہ اختیار کی اور چند ہی لمحوں میں سارے ہنگاموں کو پیچھے چھوڑ آیا۔

مگر اس وقت دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے جب میں نے اپنے پیچھے ایک پولیس کار کا تیز سائرن سنا۔ بے اختیار میری نگاہیں عقب نما آئینے پر گئیں اور مجھے ایک کار تیزی سے قریب آتی نظر آئی جس کی چھت پر سرخ روشنی تیزی سے جل بجھ رہی تھی۔

اس وقت میری کار کی رفتار پچپن میل فی گھنٹہ تھی میں نے ایکسلریٹر پہ پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور پیڈل پائیدان سے جا لگا۔ اب کار ستّر میل کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ شاید اس کا ایکسلریٹر دانستہ اس رفتار پر جامد کیا گیا تھا۔

رفتار بڑھانے کے بعد میرے اور پولیس کار کے درمیان مستقل فاصلہ قائم ہو گیا جو بظاہر خاصا محفوظ تھا مگر رائفل کے لئے بالکل بے حقیقت!

میں نے کار کے فیول میٹر پر نظر ڈالی تو سوئی کی پوزیشن سے پتہ چلا کہ ٹنکی پوری بھری ہوئی ہے۔ ——————— اور میں اس معرکے کو کئی گھنٹوں تک طول دے سکتا ہوں۔ اگر اس گاڑی میں میرے ساتھ ایک اکڑی ہوئی لاش نہ ہوتی تو شاید میں رُک کر پولیس پارٹی کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا مگر موجودہ حالات میں یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ فضا رائفل کے ہولناک دھماکے سے لرز اُٹھی مگر فائر خطا ہو گیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ گاڑی کو لہرانا شروع کر دیا۔ چند ثانیوں تک سکوت رہا۔ پھر ایک اور فائر ہوا اور کار کا عقبی شیشہ چُور چُور ہو گیا۔ گولی اسے توڑ کر ونڈ شیلڈ کے پار نکل گئی اور اب مجھے اس کی دوسری طرف دیکھنا مشکل ہو گیا۔ جس جگہ گولی لگی وہاں ایک سوراخ ہو گیا تھا اور پورا شیشہ اس بُری طرح چٹخ گیا تھا کہ ڈرائیونگ ناممکن ہو گئی۔

میں نے بریک لگانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک کار کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اُچھل کر چھت سے جا ٹکرایا۔ اسی وقت ایک پُرشور دھماکے اور اعصاب شکن جھٹکے سے کار رُک گئی۔ میں بدحواسی کے عالم میں دروازہ کھول کر باہر کود گیا۔ کار ایک چوراہے پر چڑھ کر الیکٹرک پول سے اس طرح ٹکرائی تھی کہ پول زمین پر آ گرا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ بجلی کے تار گاڑی پر نہیں گرے تھے مگر میں گاڑی سے کود کر اندھا دھند ایک طرف بھاگا تو سامنے ہی بجلی کے تار گرے نظر آئے۔ میں پوری احتیاط سے ان پر سے کود کر آگے دوڑ پڑا۔

پولیس کار اب بہت قریب آ چکی تھی۔ مجھے بھاگتے دیکھ کر ایک آوارہ کتا ہڑبڑا کر بھونکنے لگا اور پھر بے شمار آوارہ کتے بھونکتے ہوئے اپنے مسکنوں سے باہر نکل آئے اور جلوس کی صورت میں میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔

کتوں کے شور کے ساتھ ہی وہ علاقہ پولیس کار کے سائرن اور سیٹیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ میں اس وقت تنگ اور تاریک گلیوں میں دوڑ رہا تھا جہاں دو رویہ نیم پختہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وقت میرا ذہن تیزی کے ساتھ نجات کی کوئی راہ تلاش کر رہا تھا۔ پھر جوں ہی مجھے ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا میں مُڑ کر دیکھے بغیر اس میں گھس پڑا۔

شور و غل سن کر اس مکان کے ایک کمرے سے کوئی طویل قامت سایہ باہر آ رہا تھا۔ جس وقت مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا، مجھے تاخیر ہو چکی تھی، میں اپنے پورے زور میں اس سے جا ٹکرایا۔

اس سائے کے حلق سے ایک غضبناک غرّاہٹ اُبھری اور میرے چہرے پر ایک طاقتور گھونسا پڑا۔ میں لڑکھڑا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اس شخص نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے صحن کا کھلا ہوا دروازہ بند کیا۔ شاید اسے یقین تھا کہ میں اس کی واپسی سے قبل سنبھالا نہ لے سکوں گا۔ واپس آ کر اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر زمین سے اُٹھایا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے چلا۔

"تت.... تم کون ہو؟" میں نے ہانپتے ہوئے اس سے دریافت کیا مگر وہ کچھ بولا نہیں اور کمرے میں پہنچ کر اس نے بلب روشن کر دیا۔

اچانک روشنی ہونے کے باعث میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب بینائی قدرے بحال ہوئی تو میں نے اسے اپنی آنکھوں میں جھانکتے پایا۔

"مجھے پناہ چاہیئے۔" میں نے اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے اس

کتابوں کی دنیا میں ایک عظیم اور عہد ساز انقلاب

معلوماتِ عامہ پر مشتمل دنیا کی ضخیم ترین کتاب قسط وار

نئی معلومات

زیرِ ادارت

طاہر جیب

◎ ہر ماہ چیدہ چیدہ بہترین معلومات عامہ شائع کرنے کا انقلابی اقدام

◎ ۲۷ مختلف موضوعات پر ہر پندرہ تاریخ کو حیرت انگیز، دلچسپ و معلوماتی

۴۰۰

سوالات مع جوابات

◎ ہر سوال منفرد اہمیت کا حامل، اس دعوے کے ساتھ کہ وہ پہلے کبھی کسی کتاب میں شائع نہیں ہوا۔

سفید کاغذ ◎ فوٹو آفسٹ طباعت ◎ بہترین کتابت ◎

تاریخ اشاعت ◎ ۱۵ مئی ◎ قیمت — ۲ روپے پچاس پیسے

خط و کتابت و تفصیلات کے لئے

نئی معلومات [illegible] کراچی [illegible] پاکستان

سے کہا۔ "پولیس تمہارا پیچھا کر رہی ہے؟" اس نے فضا میں سیٹیوں کا شور سنتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا۔ وہ پختہ عمر کا قوی الجثہ شخص تھا اور اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔

"ہاں، میرے ہاتھ سے ایک آدمی مارا گیا ہے۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"تم بے فکر رہو، تمہارا مقدر عروج پر ہے۔ تم صحیح ٹھکانے پر پہنچے ہو۔" اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ "مگر یہ یاد رکھنا کہ مجھ سے چالبازی کی کوشش تمہیں لے ڈوبے گی۔"

"میری شامت آ ہی گئی تو تم سے اُلجھنے کی حماقت کروں گا۔" میں نے خوفزدہ انداز میں ہنسنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے اسی کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر دراز ہو جانے کا مشورہ دیا اور خود باہر جانے لگا۔

"میرے دونوں ہاتھ جھلسے ہوئے ہیں۔" میں نے اسے روک لیا۔ موت اور گرفتاری کی دہشت کم ہو جانے کے سبب زخموں کی تکلیف پوری شدت سے اُبھر آئی تھی۔ "تمہارے پاس مرہم پٹی کا بندوبست ہو گا؟"

اس نے روشنی میں میرے زخموں کا جائزہ لیا۔ پھر ٹین کے ایک صندوق میں سے مرہم کی ڈبیہ نکال کر جھلسی ہوئی جلد پر مرہم کا ہلکا ہلکا لیپ چڑھا دیا اس کے بعد روشنی گُل کر کے وہ کمرے سے نکل گیا اور باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد فضا پر سکوت چھا گیا۔ پولیس والے شاید میری تلاش میں بھٹکتے ہوئے کہیں دور نکل گئے تھے، ادھر مرہم کے اثر سے میری تکلیف میں اتنی کمی ہو چکی تھی کہ میں اپنا ذہن دوسرے مسائل پر مرکوز کر سکوں مگر مجھے سوچ بچار کی مہلت نہ مل سکی اور وہ دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ میں نے دروازے پر اس کی آواز سنتے ہی اندر روشنی کر دی تھی۔

دروازہ کھلا تو باہر صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلتا نظر آیا۔ فضا پرندوں کے شور سے گونج رہی تھی۔

"ہاں۔ اب تم اپنی کہانی سناؤ۔" اندر آ کر وہ نہایت سکون سے میرے قریب بیٹھ گیا۔

"میں نیپال سے چرس باہر بھیجتا تھا۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کہنا شروع کیا۔ "مگر کچھ عرصے سے انٹرپول کی نشاندہی پر مقامی پولیس میرے پیچھے لگ گئی اور مجھے مجبوراً ہندوستان کی طرف فرار ہونا پڑا۔ یہاں کی پولیس پہلے سے ہوشیار تھی۔ اس آنکھ مچولی میں میری ساری پونجی ختم ہو گئی۔ آج رات میں ایک مکان میں چوری کی نیت سے گھسا مگر وہاں کے مکین بیدار ہو گئے اور انہوں نے شور مچا دیا، میں بمشکل وہاں سے جان بچا کر نکل سکا، مگر پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ راستے میں میں نے ایک کار روکی اور جب وہ مجھے لفٹ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو میں نے اسے مار دیا اور اس کی کار لے بھاگا یہاں سے تھوڑی دور کار ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ پولیس میرے تعاقب میں تھی۔ میں اندھا دھند اس بستی میں گھس آیا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"امیر خان!" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے اپنے ایک پرانے دشمن کا نام نکل گیا۔

"یہ بہت خطرناک علاقہ ہے۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔ "رات تو بڑی بات ہے، دن کے اُجالے میں بھی یہاں نئے آدمی کا گھسنا اور صحیح سلامت بچ نکلنا محال ہے، تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ جب تک میں اجازت نہ دوں، تم یہیں چھپے رہو، میں استاد دلگیر سنگھ سے تمہارا ذکر کروں گا۔ شاید وہ تمہیں بھی کسی دھندے سے لگا دے۔"

"دلگیر سنگھ!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "عجیب نام ہے، کون ہے یہ؟"

"اس کے نام سے لوگوں کے دل دہل جاتے ہیں۔" اس شخص نے کہا۔ "بمبئی میں ہر بدمعاش استاد کا باجگزار ہے۔"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"ٹھاکر!" اس نے جواب دیا۔ "یہ یاد رکھنا کہ دلگیر سنگھ کے ہاتھ بہت دراز ہیں، بمبئی میں تم پولیس سے بچ سکتے ہو مگر استاد تمہیں چوہے کے بل سے کھینچ نکالے گا۔ اس سے دغا کرنے والے کتے کی موت مار دیئے جاتے ہیں۔"

"میں تو صرف پناہ کی اُمید میں تمہارے دروازے میں گھسا تھا، اگر اسی بہانے مجھے دھندا بھی مل جاتا ہے تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا، مجھے بھاگنے یا دغا بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے!"

ٹھاکر میری مچھے دار گفتگو سے مطمئن ہو گیا۔ سورج طلوع ہونے پر وہ مجھے اسی کمرے میں بند کر کے کہیں چلا گیا اور میں بستر پر دراز ہو گیا۔

اس وقت دونوں ہاتھ ناکارہ ہو جانے کے باعث میں مفلوج ہو کر رہ گیا تھا اور فی الحال خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

دوپہر کے قریب ٹھاکر واپس آیا تو میں گہری نیند سو رہا تھا، اس نے مجھے جگایا اور خوشخبری سنائی کہ دلگیر سنگھ شام کے سات بجے اپنے ایک اڈے پر مجھ سے ملے گا۔ وہ میرے لئے تندوری نان اور کباب وغیرہ ساتھ لایا تھا۔

شام کو روانگی سے قبل میں نے اپنا لباس اتار کر ٹھاکر کا ایک جوڑا پہنا سر پر پگڑی جمائی اور ہم دونوں دھندلکے میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

شہر میں روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ زندگی ہر طرف پورے جوش و خروش سے رواں دواں تھی اور ہماری ٹیکسی ساحلی علاقے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

بندرگاہ کے نواحی علاقے میں ایک شراب خانے کے سامنے ٹیکسی رک گئی۔ سامنے ہی بڑے بڑے روشن حروف میں سیلرز کلب کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ علاقہ بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سستے شراب خانے اور ہوٹل بکھرے ہوئے تھے اور غیر ملکی جہازوں سے اترنے والے ملاح طویل سمندری سفر کے بعد یوں ان تفریح گاہوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے جیسے چند گھنٹوں بعد قیامت آنے والی ہو۔

ٹھاکر نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور مجھے ساتھ لے کر سیلرز کلب میں داخل ہوا اندر قدم رکھتے ہی تیز موسیقی اور تیز آوازوں کے ملے جلے شور نے ہمارا خیر مقدم کیا

سیلرز کلب کے نیچے چھت والے ہال میں صرف رنگین قمقموں کی آرائشی جھالریں روشن تھیں اور رنگ برنگی روشنیوں کے متحرک ہالے میں ایک نیم عریاں اینگلو انڈین رقاصہ میزوں کے درمیان ناچتی پھر رہی تھی، ہال کے ایک سرے پر بنے ہوئے دو فٹ اونچے اسٹیج پر سازندے تیز آوازوں میں ساز بجا رہے تھے اور رقاصہ ہر بدلتے ہوئے سُر کے ساتھ اپنے جسم کو نت نئے زاویوں سے واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھی، میزوں پر ہر رنگ اور نسل کے لوگ موجود تھے۔ فضا شراب اور تمباکو کے دھوئیں کی ملی جلی بو سے بوجھل تھی۔ رقاصہ جدھر جاتی لوگ کرسیوں سے اٹھ کر رقص میں اس کا ساتھ دینے لگتے پھر جیسے ہی کوئی ہاتھ اسے گرفت میں لینے کے لئے آگے بڑھتا، رقاصہ کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر دور نکل جاتی۔

ٹھاکر مجھے سیدھا کاؤنٹر کی طرف لیتا چلا گیا جہاں ایک پستہ قامت خونخوار چینی موجود تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں شناسائی کے انداز میں ٹھاکر کی طرف اٹھ گئیں

"اندر جانا ہے" ٹھاکر نے قریب جاکر سرگوشی کی۔

"یہ بھی ساتھ جاتا ہے؟" چینی نے بمبئی والوں کے لہجے میں اردو میں پوچھا اور اس کی سخت ناقدانہ نظریں مجھ پر جم گئیں۔

"ہاں، استاد سے ملنا ہے" تیز شور میں اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ میں بھی بمشکل ہی اسے سن سکا۔

چینی نے دراز کھول کر پیتل کے دو ڈھلے ہوئے گول سکے نکالے اور ٹھاکر کی مٹھی میں تھما دیئے اور بولا:

"ماسٹر او۔ فور میں ہے"

ٹھاکر مجھے ساتھ لے کر ہال سے گذرتا ہوا چلا گیا۔ ہم عقبی راہداری میں نکلے تو اس کے آخری سرے پر ایک شخص نے راستہ روک لیا۔ ٹھاکر نے چینی سے ملے ہوئے مخصوص سکے اس کے حوالے کئے اور اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

آگے راہداری نیم تاریک تھی، اس کے اختتام پر نیچے جانے والے زینے تھے، ٹھاکر بے دھڑک نیچے اترتا چلا گیا۔ زینوں کے اختتام پر ایک بند دروازہ تھا۔ ٹھاکر نے دروازے پر دو بار دستک دی اور دروازے کے پیچھے موجود مسلح دربان نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی تہہ خانے سے گرم ہوا کے تیز بھبکے باہر آئے اور ٹھاکر مجھے لیکر اندر گھس گیا۔ سیلرز کلب کا وہ تہہ خانہ جوئے کی کئی مشینوں سے آراستہ تھا جہاں مضحکہ خیز لباس والے بے فکرے ملاح قسمت آزمائی کر رہے تھے، میزوں پر بھی جوا ہو رہا تھا لیکن رقم کہیں نظر نہیں آرہی تھی، سارا کام ٹوکنوں کے ذریعے طے ہو رہا تھا۔ ٹھاکر نے بتایا کہ تہہ خانے میں آنے والے مختلف مالیت کے ٹوکن خریدتے ہیں اور واپسی کے وقت دو فیصد کا معمولی سروس چارج منہا کر کے ہر شخص کو ٹوکنوں کے بدلے رقم ادا کر دی جاتی ہے، میری دانست میں یہ بندوبست کچھ عجیب سا تھا۔ اگر پولیس کے چھاپے سے بچاؤ کے لئے رقم کے بجائے ٹوکن جاری کئے جاتے تھے تو یہ ایک احمقانہ اقدام تھا۔ کیونکہ اس طرح سارا الزام انتظامیہ ہی کے سر آتا تھا۔

علم

جو شخص اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے وہ اپنے دکھ میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ حافظے اور پیش بینی کی قوت سے بھی انسانی کلفت میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ ہمارے الم کا ماخذ یا تو گزشتہ واقعات کا استحضار ہے یا آنے والے واقعات کے متعلق بصیرت۔ خود الم کی کیفیت بہت کم عرصے کے لیے قائم رہتی ہے، موت اتنی تکلیف نہیں دیتی جتنا موت کا خیال یا خوفِ مرگ۔

—— شوپن ہار

تہہ خانے کے ایک کمرے میں میری ملاقات دلگیر سنگھ سے ہوئی۔ وہ ایک نہایت کڑیل اور خوش شکل نوجوان تھا، اگر اس کے داہنے رخسار پر چاقو کے زخم کا ایک لمبا سا پرانا نشان نہ ہوتا تو یہ کہنا دشوار تھا کہ دلگیر سنگھ بدمعاش ہے۔

"تو یہ ہے مارتے خاں" مجھے دیکھتے ہی دلگیر قہقہہ مار کر بولا "تم جاؤ ٹھاکر میں اس سے خود بات کروں گا"

ٹھاکر نے ادب سے سر کو خم دیا اور واپس چلا گیا۔

"بیٹھ جاؤ امیر خان" دلگیر سنگھ نے صوفے پر دراز ہو کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "اور یہ بتاؤ کہ تمہاری کہانی میں سچ کتنا ہے؟"

"اس میں جھوٹ بالکل نہیں ہے"

"شام کے اخبار پڑھے ہیں تم نے؟" اس بار دلگیر سنگھ کا لہجہ سخت تھا۔

میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"صبح طلوع ہونے سے قبل بمبئی میں پانچ قتل ہوئے ہیں" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اطمینان سے بولا "ایک طوائف کے کوٹھے پر گولی چلنے سے اس کا ایک گاہک ہلاک ہوا، بیلا پور جانے والی سڑک پر ایک ٹیکسی بم کے دھماکے سے اڑا دی گئی جس میں ٹیکسی ڈرائیور اور ایک روسی مسافر ہلاک ہوا۔ چوپاٹی کے علاقہ میں ایر انڈیا کا کیپٹن ورما اپنی خواب گاہ میں ایک زہریلے تیر کا نشانہ بنا اور ایک کھمبے سے ٹکرائی ہوئی کار میں کار والے کی لاش ملی ہے، وہ بھی زہریلے تیر کا نشانہ بنا ہے"

وہ خاموش ہو گیا اور میرا دل کھوپڑی میں دھمکنے لگا۔ دلگیر سنگھ کی گفتگو بالکل واضح تھی وہ مجھے بتا رہا تھا کہ طریقۂ قتل کی یکسانیت سے ظاہر تھا کہ میں نے کم از کم دو قتل کئے ہیں۔ مجھے شدید صدمہ اس بات کا تھا کہ میرے ہاتھوں نینی بیوہ ہو گئی تھی۔ طویل مدت کے بعد جب کیپٹن ورما کو بیوی کی یاد آئی، اور اس نے گھر کا رخ کیا تو میں نے اسے نینی کا آشنا سمجھ کر حسد کے جذبے سے مغلوب ہو کر قتل کر دیا اور یوں میرے حساب میں ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا۔

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ چوپاٹی والے مکان میں میرا نشانہ کاری رہا تھا" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خوب" وہ زور سے ہنسا "بہت سمجھ دار معلوم ہوتے ہو" وہ چند ثانیوں تک خاموش رہا پھر بولا "زہریلے تیر تم کیسے پھینکتے ہو؟"

"سرکنڈے کی نالی میں پھونک مار کر میں شکار کھیلتا ہوں" میں نے سفید جھوٹ بولا "مگر بھاگتے ہوئے وہ نالی کہیں گر گئی۔ کار والے کو میں نے ہاتھ سے تیر چبھا کر ختم کیا تھا"

"کیا کیا کام جانتے ہو؟"

"جیب تراشی کے علاوہ ہر کام کر سکتا ہوں"

"تاش کے کھیلوں میں شارپنگ کر لیتے ہو؟" اس کا لہجہ تجسس آمیز تھا۔

"یہ تو میرا خاص شعبہ ہے" میں نے انکساری سے کہا۔

"آؤ ذرا دیکھوں تمہارا کھیل" وہ یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔

"ابھی میرے ہاتھ زخمی ہیں"

"ہاں۔ تمہارے ہاتھ کیسے زخمی ہوئے؟"

"سگریٹ سلگاتے ہوئے، میرے ہاتھ پیٹرول سے نم تھے، بس کھال جھلس گئی ہے"

"تم یہیں رہو گے، دو چار روز میں تمہارے ہاتھوں کے زخم بھر جائیں تو میں تمہارا کھیل دیکھوں گا، اس کے بعد ہی تم کو کام پر لگایا جائے گا"

یہاں تک تو میں نے بات نبھالی، تہہ خانے میں تین رہائشی کمرے بھی تھے جو لمبا کھیل کھیلنے والے جواریوں کو کرائے پر دیئے جاتے تھے مگر دن میں خالی پڑے رہتے تھے، ان ہی میں سے ایک کمرہ میرے حوالے کر دیا گیا اور زخموں پر لگانے کے لئے چند مرہم بھی فراہم کر دیئے گئے۔

اگلے دنوں میں مجھے عجیب و غریب معلومات حاصل ہوئیں۔ سیلرز کلب کا جوا خانہ باقاعدہ سرکاری لائسنس کے تحت چلایا جاتا تھا، مگر وہاں آوارہ عورتوں کو بھی خاصا دخل تھا۔ وہ عام طور پر جیتنے والوں کے گرد منڈلاتی ہوئی پائی جاتی تھیں۔ دلگیر سنگھ ان سے ماہانہ ایک خطیر رقم وصول کرتا تھا، ٹوکن سسٹم رائج کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ انتظامیہ کو علم ہو سکے کہ تہہ خانے سے نکلنے والے کی جیب میں کتنی رقم موجود ہے، کئی بار ایسا ہوا کہ بھاری رقمیں جیت کر نکلنے والے سیلرز کلب کے نواحی علاقے سے باہر جانے سے قبل لوٹ لئے گئے اور لٹیروں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ تہہ خانے میں کچھ تنخواہ دار ملازم بھی جوا کھیلتے تھے اور عملے کی مدد سے بے ایمانی کرتے تھے۔ ان کا نشانہ عام طور پر وہ ملاح بنتے جن کے جہاز چند روز کے لئے بمبئی کی بندرگاہ پر ٹھہرتے تھے۔ ان پیشہ ور جواریوں کو ٹوکن مفت فراہم کئے جاتے تھے اور جیتی ہوئی رقم میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ مقررہ ماہانہ معاوضہ کے علاوہ کسی بڑی جیت پر دلگیر انہیں انعام وغیرہ بھی دے دیا کرتا تھا۔

دلگیر سنگھ کا عجیب نام سن کر میں پہلے ہی دن چونکا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تضادات کا مجموعہ ہے، اس کا باپ مسلمان تھا اور ماں کا تعلق سکھ گھرانے سے تھا۔ دونوں کا عشق سچا تھا مگر شادی کی کوئی صورت نہ تھی۔ لہٰذا وہ دونوں گھروں سے فرار ہو گئے۔ اس کی ماں نے دہلی پہنچ کر اسلام قبول کیا اور اپنے محبوب سے شادی رچا لی۔ فرار کا چرچا ہوتے ہی شہر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ دونوں طرف کے بے شمار آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اسی دوران میں لوگوں کو پتہ چل گیا کہ مفرور جوڑا دہلی کے ایک ہوٹل میں ہنی مون منا رہا ہے۔ فوراً ہی ایک بارہ نفری مسلح جماعت دہلی روانہ ہوئی اور دلگیر سنگھ کے باپ کو بے رحمی سے ہلاک کر دیا گیا، اس کی ماں کو گھر لایا گیا تو وہ حاملہ تھی۔ اس کی کوکھ اجاڑنے کے سارے جتن کئے گئے مگر دلگیر سنگھ تو ماں کی کوکھ سے جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا لہٰذا جب وہ پیدا ہوا تو اسے ایک گوردوارے کے دروازے کے قریب پھینکوا دیا گیا۔ مفت کی روٹیوں پر پلنے والے اس لڑکے کا نام تو کچھ اور رکھا گیا تھا مگر ہوش سنبھالنے پر جب اس کو اپنی اصلیت کا علم ہوا تو وہ باغی ہو گیا۔ اس نے

ایک رات گوردوارے میں سوتے ہوئے تین سکھ یاتریوں کی داڑھیاں اور سر مونڈ دیئے اور خود بمبئی بھاگ آیا۔ لوگوں نے بتایا کہ بمبئی آکر وہ خوب رویا اور اس نے عہد کیا کہ وہ بدی سے اچھائیوں کا کام لے گا۔ اسے ان جنونیوں سے نفرت تھی جو مذہب کے مقدس نام پر درندگی کے ساتھ انسانی لہو کی ہولی کھیلتے ہیں، اس نے اپنا نام دلگیر سنگھ رکھا مگر وہ نہ سکھ تھا نہ مسلمان، اس نے اپنے ہوش میں مسجد، مندر یا گوردوارے میں قدم تک نہ رکھا البتہ اس کے قریبی ساتھی بتاتے تھے کہ دلگیر سنگھ کی ناجائز آمدنی کا بیشتر حصہ یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کے کام آتا تھا۔

سیلرز کلب کے جوئے خانے میں ملازم بشن ملہوترہ نامی ایک پیشہ ور جواری مجھے ان دنوں کینہ توز نظروں سے دیکھتا تھا، اسے اپنی شارپنگ پر بڑا ناز تھا اور عام طور پر وہی زیادہ تر جیتا کرتا تھا، جب اسے میری آمد کے مقاصد کا علم ہوا تو اس نے میرا کھیل دیکھے بغیر ہی مجھ کو اپنا رقیب سمجھ لیا، وہ جب بھی مجھ سے بات کرتا اس کا لہجہ طنز آمیز ہوتا۔

کلب کے بار روم میں کاؤنٹر پر بیٹھنے والا خونخوار چینی دلگیر سنگھ کا ملازم تھا مگر یہ بات گروہ سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہیں تھی۔ کلب کا لائسنس بھی اسی چینی کے نام پر تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ گیارہ خون کر چکا ہے، کئی بار اس پر مقدمہ بھی چلا مگر ہر بار ثبوت نہ ہونے کی بناء پر اسے رہا کر دیا گیا۔ ایک مرتبہ تو اس نے ایک بھرے بازار میں اپنے ایک حریف کو زمین پر گرا کر ذبح کیا اور موقع سے فرار ہو گیا۔ پورا شہر جانتا تھا کہ قاتل کون ہے مگر جب وہ گرفتار ہوا تو پولیس کی سر توڑ کوششوں کے باوجود استغاثہ کو کوئی گواہ نہ مل سکا۔ لوگ جانتے تھے کہ چنگ ہوا کے خلاف زبان کھولنے والے کے پورے خاندان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اپنی مجرمانہ سرگرمیوں سے قطع نظر چنگ ہوا بمبئی میں

رہنے والے چینیوں کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے ذرا سے اشارے پر شہر میں ہنگامے پھوٹ سکتے تھے۔ اس کے ملنے والوں میں ہاتھی دانت کے دستے والے اعشاریہ دو دو کے پستول کو بڑی شہرت تھی۔ کوئی بھی شخص چنگ ہوا کا وہ پستول دکھا کر بمبئی کے چینیوں سے ہر کام لے سکتا تھا۔

میں تین دن تک بے کاری کے عالم میں وہاں مقیم رہا۔ اس دوران میں میرے ہاتھوں کے زخم حیرتناک تیزی سے بھرتے جا رہے تھے مگر پہلی ملاقات کے بعد وہاں دلگیر سنگھ کا سایہ تک نظر نہیں آیا، وہ شاذ و نادر ہی کلب کا رخ کرتا تھا تاکہ چنگ ہوا کا نام اس کے ساتھ ملوث نہ ہونے پائے اور وہ چینی سارے معاملات بڑی مہارت سے نمٹا لیتا تھا۔

تیسری شام میری طلبی ہوئی۔

سیلرز کلب کی عمارت دو منزلہ تھی۔ تہہ خانے کے اوپر بار روم تھا، اور اس کی اوپری منزل پر چنگ ہوا کی رہائش تھی۔ مجھے عمارت کے اسی حصے میں طلب کیا گیا تھا، جہاں چنگ ہوا اپنے ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔

اس کے ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہاں شیشے کی نازک الماریوں میں تاریخی اہمیت کے بے شمار تاریخی نوادرات سجے ہوئے تھے دیواروں پر صدیوں پرانے نفیس قالین، تلواریں اور زرہ لٹکی ہوئی تھیں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" چنگ ہوا کی چبھتی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"امیر خان۔" میں نے جواب دیتے ہوئے محسوس کیا کہ میرے ساتھ کچھ گڑبڑ ہو چکی ہے اور چنگ ہوا کا سوال خالی از علت نہیں ہے۔

وہ چند ثانیوں تک مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتا رہا، پھر بجلی کی سی سرعت سے میری طرف لپکا اور اس سے پیشتر کہ میں اس کے عزائم کا اندازہ لگاتا۔ اس نے مجھے کسی ننھے سے بچے کی طرح فضا میں اچھال دیا۔ میرے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور میں پشت کے بل قالین پر آ رہا۔ چنگ ہوا پھرتی سے میرے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے میرے شانے کی کچھ رگیں، اس طرح دبانی شروع کیں کہ میرا پورا جسم بے جان ہونے لگا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، چھوڑو مجھے۔" میں بوکھلا کر چیخا۔

جواب میں اس نے رکے بغیر مجھے چند گالیاں دیں اور بولا۔ "اگر تم نے دو منٹ میں اپنا اصل نام نہ بتایا تو میں تمہیں ساری عمر کے لیے معذور کر دوں گا۔"

اس مردود کو اپنی قوت اور مہارت پر اتنا ناز تھا کہ اس نے اپنے آراستہ ڈرائنگ روم ہی میں مجھ پر حملہ کر دیا۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ میں اس کے داؤ سے بچ کر ہنگامہ آرائی کروں گا تو وہ یقیناً کسی اور جگہ کا انتخاب کرتا۔

میں نے اس کی خوفناک گرفت سے بچنے کی کوشش کی مگر اسی لمحے چنگ ہوا نے میرے پٹھوں پر اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھا دیا اور میں درد سے تڑپ اٹھا۔

"نام... نام بتاؤ۔"

"صفدر علی۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور وہ اچھل کر میرے سینے سے اتر گیا۔

رہائی پاتے ہی میں غصے اور جنون کے عالم میں اس کی طرف لپکا مگر اس نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر مجھے وارننگ دی۔ "اگر میرے ڈرائنگ روم کو ذرا بھی نقصان پہنچا تو میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ میں جہاں تھا، وہیں رک گیا۔

ڈرائنگ روم میں دکٹوریَن ساخت کی ایک آبنوسی کرسی موجود تھی، چنگ ہوا اس پر بیٹھ گیا اسی وقت مکان کے کسی دور افتادہ حصے میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور فوراً ہی ایک زرد رو مگر دراز قامت چینی سینے پر ہاتھ باندھے وہاں آ موجود ہوا۔

چنگ ہوا نے چینی زبان میں اسے کچھ ہدایت دی اور وہ سر جھکائے وہاں سے لوٹ گیا۔

"میرے ساتھ اس بدتمیزی کی کیا ضرورت تھی۔" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد میں نے تلخ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"اس لیے کہ تم جھوٹ بول رہے تھے۔"

"مگر نام کی کیا اہمیت ہے، میرا نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"بڑا فرق ہے۔" وہ طنز آمیز انداز میں مسکرایا۔ "آج کے اخبارات میں تمہاری تصاویر شائع ہوئی ہیں۔ صفدر علی کو گرفتار کرانے والے کے لیے دس ہزار روپے کا انعام مقرر کیا ہے مگر امیر خان کی پورے شہر میں کسی کو پروا نہیں ہے۔"

"اخبارات میں میرا جرم کیا بتایا گیا ہے؟"

"عجیب بات یہی ہے کہ تمہارے جرم یا جرائم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے بس اشتہارات میں تمہاری تصاویر ایک خطرناک مجرم کے طور پر چھپی ہیں۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ پولیس کیوں اتنی شدت سے تمہاری متلاشی ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ انٹرپول میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ آج کل ہر ملک کی پولیس منشیات کی دشمن ہو رہی ہے۔"

اسی اثنا میں چنگ ہوا کا دراز قد چینی ملازم سبز چائے لے آیا۔ اور چنگ ہوا نے ایک پیالی اور قہوہ دان میرے پاس بھیج دیا۔

"بے عزتی کے بعد یہ عزت افزائی میری سمجھ سے باہر ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ پہلا سبق تھا اور مجھے امید ہے کہ وہی آخری بھی ثابت ہو گا۔ میں اپنے آدمیوں کے منہ سے جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"مگر میں تمہارا آدمی کب سے ہو گیا؟"

"جس وقت تم ٹھاکر کے مکان میں گھسے تھے۔ پولیس سے بچتے پھرنے والے میرے لیے بہترین آدمی ثابت ہوتے آئے ہیں۔"

"دلگیر سنگھ کہاں ہے؟"

اچانک چنگ ہوا کا چہرہ غضبناک ہو گیا۔ وہ کسی زخمی بھیڑیے کی طرح خوشیانہ انداز میں غرّایا۔

"خبردار، اگر اس عمارت میں کبھی اس کا نام لیا، بھول جاؤ کہ تم نے کبھی اسے سیلرز کلب میں دیکھا بھی تھا ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے، وہ ایک سائے کی طرح یہاں آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔"

"باہر پولیس میری متلاشی ہے، کلب میں آنے والوں میں سے بیشتر نے اخباروں میں میری تصاویر بھی دیکھی ہوں گی، اب یہاں میرا کیا مصرف ہے؟"

"تمہارے ہاتھوں کے زخم کیسے ہیں؟" جواب کے بجائے اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔ وہ میرے بارے میں پوری طرح باخبر معلوم ہوتا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ میری کیمیاگری وغیرہ کے قصے انڈین سیکرٹ سروس نے دانستہ راز میں رکھے تھے ورنہ یہ باتیں بھی چنگ ہوا کے علم میں ہوتیں۔

"زخم تیزی سے بھر رہے ہیں۔"

"ان زخموں کے بارے میں تمہاری کہانی بے جان ہے۔" وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ دھماکے سے اڑائی جانے والی ٹیکسی سے تمہارا بھی تعلق رہا ہے۔"

"ٹیکسی؟" میں مضحکہ خیز انداز میں ہنسا۔ "بمبئی میں قدم رکھنے کے بعد میں نے ٹرام کے سوا کسی سواری میں قدم نہیں رکھا۔"

"آج میرے آدمیوں نے تحقیقات کی ہیں۔" وہ بولا۔ "ٹیکسی بونانزا ہوٹل کے قریب سے کرائے پر لی گئی تھی۔ سواریوں میں ایک روسی اور دوسرا مقامی تھا۔ اندھیرے کے باعث وہاں موجود ڈرائیور رنگوں کے نمایاں فرق کے علاوہ کچھ نہ دیکھ سکے مگر ٹیکسی سے روسی کے علاوہ صرف ڈرائیور کی لاش کے جلے ہوئے ٹکڑے ملے ہیں، جب میں تمہارے جلے ہوئے ہاتھوں پر غور کرتا ہوں تو تم ہی ٹیکسی کے روپوش مسافر معلوم ہوتے ہو۔"

"اگر ایسا ہے تو میں یقیناً غیر انسانی قوتوں کا مالک ہوں۔" میں نے بظاہر ہنس کر کہا مگر چنگ ہوا کے ٹھوس استدلال نے مجھے سہما دیا۔ "میں نے سنا تھا، ٹیکسی کا حادثہ شہر سے میلوں دور سیلا پور جانے والی سڑک پر ہوا تھا۔ ٹیکسی کو بم کے دھماکے سے اڑا کر چوپاٹی آنا اور پھر ٹھاکر کے مکان تک پہنچنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور پھر ان حرکات کا کچھ نہ کچھ مقصد بھی تو ہونا چاہیے تھا۔"

"خیر، میرے لیے صرف یہی جاننا کافی ہے کہ تم پولیس کو مطلوب ہو اور پناہ کے متلاشی ہو، فی الحال تم اسی مکان میں میرے پاس رہو گے جتنے دن میں ہاتھوں کے زخم ٹھیک ہوں۔ تم داڑھی بھی بڑھا لو، پھر میں تمہیں ایسی جگہ بھیج دوں گا جہاں پولیس کا سایہ بھی نہ پڑ سکے گا۔"

"بمبئی سے باہر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس کا جواب بے حد مختصر تھا۔

"مگر مجھے تو بتایا گیا تھا کہ مجھے کلب میں آنے والوں کی جیبیں خالی کرانے پر مامور کیا جائے گا۔"

"اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی شدت سے پولیس کو مطلوب ہو سکتے ہو، محض دو قتل کرنے والے کے لیے بمبئی پولیس دس ہزار کے انعام کا اعلان نہیں کر سکتی، اور شارپنگ تو بچے بھی آسانی سے کر لیتے ہیں تمہیں بڑا کام سونپا جائے گا۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میری چھٹی حس جاگ اٹھی اور میں نے کہا۔ "میری شارپنگ کو پکڑنا ناممکنات میں سے ہے۔"

"میرے سامنے ایسا مضحکہ خیز دعویٰ نہ کرو، تمہارے لیے جو کام چنا گیا ہے تم اسی کے لیے موزوں ہو اور وہاں تم خود کو محفوظ بھی پاؤ گے۔"

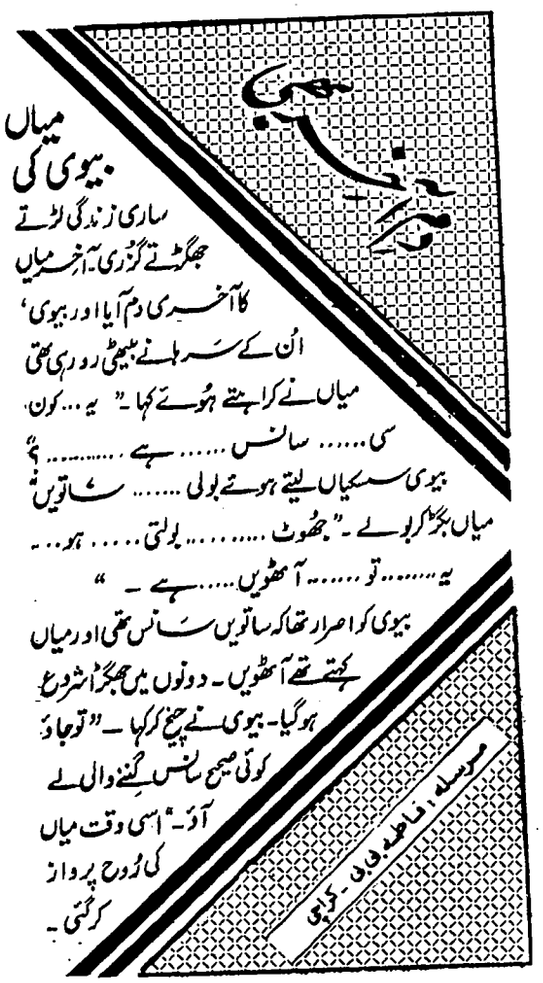

بے اختیار میرے سینے میں کسک سی اٹھی، چنگ ہوا انسان کی صورت میں کوئی بدروح تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے جہاں بھی بھیجنے والا ہے، وہ جگہ قید خانے سے ہرگز کم نہ ہو گی، میں ایک جال سے نکل کر دوسرے جال میں پھنسا جا رہا تھا، قید پولیس کی ہو، سیکرٹ سروس کی یا چنگ ہوا کی، میرے لیے ان میں کوئی فرق نہیں تھا بلکہ میں دن بدن اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ قانون کے نگہبان اداروں کے علاوہ اب قانون شکن افراد بھی میری راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ پارس پتھر انبالہ کے ایک ہوٹل میں پوشیدہ تھا۔ میری محبوب بیوی سیتا میری زبان کے کاری زخم کھا کر سرحدوں کے قریب مجھ سے بچھڑ چکی تھی، میں ان دونوں کی طرف ایک قدم آگے بڑھاتا

مزاح بھی

میاں بیوی کی

ساری زندگی لڑتے جھگڑتے گزری۔ آخر میاں کا آخری دم آیا اور بیوی، اُن کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی

میاں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "یہ... کون... سی... سانس... ہے...؟"

بیوی سسکیاں لیتے ہوئے بولی... "ساتویں۔"

میاں بگڑ کر بولے۔ "جھوٹ... بولتی... ہو... یہ... تو... آٹھویں... ہے۔"

بیوی کو اصرار تھا کہ ساتویں سانس تھی اور میاں کہتے تھے آٹھویں۔ دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ بیوی نے چیخ کر کہا۔ "تو جاؤ کوئی صحیح سانس گننے والی لے آؤ۔" اسی وقت میاں کی رُوح پرواز کر گئی۔

مرسلہ: فاطمہ فی بی۔ کراچی

تھا مگر مقدر مجھے سو قدم پیچھے دھکیل دیتا تھا۔

" اگر میں اپنے طور پر کوئی راہ اختیار کرنی چاہوں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چنگ ہوا سے ایک خطرناک سوال کیا۔

" تمہارے سامنے انتخاب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" یکتے ہوئے وہ منقش آبنوسی کرسی سے اٹھ گیا۔ " اگر میری تجویز ناقابل قبول ہو تو پولیس کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہو، یہ دس ہزار مفت ہاتھ آئیں گے اور میری ساکھ بھی بنے گی۔"

" مجھے کام کی نوعیت بھی تو معلوم ہونی چاہیئے۔"

" یہ میرے کاروباری اصولوں کے منافی ہے۔" وہ مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ " مناسب وقت آنے پر ہر بات خود بخود تمہیں معلوم ہو جائے گی۔"

اس گفتگو کے بعد وہ نیچے بار روم میں چلا گیا اور اس کے جاتے ہی اس کا زرد رُو ملازم کسی آسیب کی طرح اچانک میرے سر پر مستعد ہو گیا۔

" آیئے آقا، میں آپ کو کمرے میں پہنچا دوں۔" اس نے ادب سے سر جھکا کر اپنے استخوانی ہاتھوں سے اشارہ کیا۔

بظاہر اس کا لہجہ احترام آمیز تھا مگر اس کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ میں نے ذرا بھی تامل سے کام لیا تو وہ مجھے کندھے پر لاد کر وہاں سے لے جائے گا۔ ناچار میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

وہ مجھے ملحقہ باتھ روم سے مزین ایک آراستہ کمرے میں لے گیا جہاں ضروریات کا مختصر سامان موجود تھا اور بولا۔

" آپ یہاں آرام فرمائیں گے، اگر اس کمرے سے باہر نکلنے کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا کر مجھے طلب فرما لیجیے گا۔ تنہا باہر نکلنے کی صورت میں آپ مشکلات سے دوچار ہو جائیں گے۔"

میں اس مردود کو تہہ بار نظروں سے گھورنے لگا مگر وہ میری نگاہوں کی پرواہ کئے بغیر کسی مسکین کی طرح مسکراتا رہا۔

اور یوں میں اس کمرے میں نظر بند کر دیا گیا۔

چنگ ہوا کے مکان میں آسیبی سکوت طاری تھا۔ سڑک اور شراب خانے سے آنے والے شور کے سوا وہاں کوئی آہٹ نہ سنائی دیتی تھی۔ شاید اس مکان میں چنگ ہوا اور اس کے ملازم کے سوا کوئی نہ رہتا تھا اور وہ ملازم تو مجھے کمرے میں پہنچانے کے بعد ایسا غائب ہوا کہ کھانے کے وقت تک اس کا سایہ بھی کہیں نظر نہ آیا۔

وقت گذاری کے لئے میں بستر پر دراز ہو کر گذرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ مجھے رہ رہ کر خلش ستا رہی تھی کہ میں نے نادانستگی میں نیلی کے شوہر کیپٹن ورما کو اپنی سفاکی کا نشانہ بنایا تھا۔ شوہر کی توجہ کو ترسی ہوئی وہ عورت میرے ہاتھوں بیوگی کے جہنم میں جھونک دی گئی تھی مگر اب اس زیادتی کے ازالے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

میں اسی سوچ بچار میں غلطاں تھا کہ چنگ ہوا کا ملازم کھانے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں آیا۔ جب تک میں کھانے میں مصروف رہا وہ کمرے میں موجود رہا اور میرے فارغ ہوتے ہی ٹرالی لے کر واپس چلا گیا۔

گیارہ بجے میں نے کمرے کی روشنی گل کر دی۔ اس وقت پورے مکان میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی مگر نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ مکان میں چھایا ہوا گہرا سکوت بار بار مجھے کچھ کر گذرنے پر اکسا رہا تھا۔

جب بڑھتی ہوئی بے چینی کے باعث میرا بستر پر پڑے رہنا محال ہو گیا تو میں آہستگی سے بستر سے اترا اور ننگے پیروں کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ میں دیوار سے چپک کر سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا مگر باہر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید چنگ ہوا کا ملازم بھی سو چکا تھا۔

میں پوری احتیاط سے پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کی اوٹ سے نکلا اور جو نہی میں کھلے ہوئے دروازے کے درمیان پہنچا، سامنے سے ایک چمکدار خنجر زناٹے سے اڑتا ہوا آیا اور داہنی جانب کی چوکھٹ میں پیوست ہو گیا، میں ہلکی سی چیخ مار کر پیچھے اچھل گیا، اسی کے ساتھ خواب گاہ کے باہر تیز روشنی پھیل گئی۔

چند سیکنڈ بعد چنگ ہوا کا دبلا پتلا دراز قامت چینی ملازم چہرے پر ندامت کے آثار لئے پلکیں جھپکاتا میری طرف آیا۔

" ارے آقا، آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" اس کا لہجہ سراسر انکسار آمیز تھا۔ " دراصل مجھے دن میں کام سے فرصت نہیں ہوتی اور میں بے خوابی کا بھی مریض ہوں اس لئے رات کو اندھیرے میں خنجر سے نشانہ بازی کی مشق کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے بے ہودہ مشغلے سے آپ کو زحمت ہوئی۔" دروازے کی چوکھٹ سے تیز دھار خنجر نکالتے ہوئے وہ خواب گاہ میں گھس آیا۔

اس کی بکواس پر میرا خون کھول اٹھا۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ باہر بیٹھا میری نگرانی کر رہا تھا اور جوں ہی اس نے اندھیرے میں مجھے باہر نکلتے دیکھا۔ چوکھٹ پر خنجر پھینک کر مجھے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا اور اب مجھے یوں بہلا رہا تھا جیسے میں کوئی شیر خوار بچہ ہوں۔

میں غراتا ہوا اس پر جھپٹ پڑا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں اس نحیف و نزار ڈھانچے کو پل بھر میں مسل کر رکھ دوں گا لیکن اس نے میرے حملے سے قبل ہی لپک کر میرے بڑھے ہوئے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لئے اور ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار کئے بغیر پرسکون لہجے میں بولا:

" میں اپنی غلطی پر معافی کا خواستگار ہوں جناب، آپ کے دونوں ہاتھ زخمی ہیں۔ اگر میرے ہاتھوں سے آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو مالک میری چمڑی گرا دیں گے، میں پھر التجا کرتا ہوں کہ مجھے معاف فرما دیں۔"

اس کی گفتگو سے میرا پارہ اور چڑھ گیا، میں نے زور آزمائی کر کے اپنی کلائیاں چھڑانی چاہیں مگر اس کی ہڈیوں میں بلا کی طاقت تھی۔ اس کی انگلیاں مجھے اپنی زخمی جلد میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

زخموں کی تکلیف اچانک بڑھ جانے کے باعث میں نے زور آزمائی

ترک کر دی اور وہ میرے ہاتھ چھوڑ کر پھرتی سے کئی قدم پیچھے سرک گیا۔ خنجر وہ پہلے ہی نیفے میں اڑس چکا تھا۔

" دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

" مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ " یہاں آنے والے کسی مہمان کو آج تک میری صورت پسند نہیں آئی، مگر میں آپ کا بدخواہ نہیں ہوں۔ میں پھر التجا کروں گا کہ جب مکان میں اندھیرا یا سناٹا ہو تو مجھ نابکار کو خبر دیئے بغیر باہر نہ نکلیں۔ اگر میری نشانہ بازی سے آپ کو کوئی زخم آگیا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا، میں اپنے مالک کے مہمانوں کا پورا احترام کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نابکار واپس چلا گیا اور وہاں ایک بار پھر گہرا اندھیرا چھا گیا۔

چنگ ہوا کے آسیبی مکان میں میں پورے دس دن مقیم رہا۔ اس دوران میں نہ صرف میرے ہاتھوں کے زخم بھر گئے بلکہ جھلسی ہوئی کھال کی جگہ نئی کھال بھی آنے لگی۔ اس پوری مدت میں چنگ ہوا ہمیشہ میرے ساتھ فراخدلی سے پیش آتا رہا۔ اس نے پہلی شب کے قصے کا بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ادھر اس کے ملازم کا رویہ اس حد تک احترام آمیز تھا کہ میں اس کے سامنے خود کو بالکل بے بس سمجھنے لگا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہر وقت پوشیدہ رہ کر میری نگرانی کرتا رہتا ہے۔ اگر اس میں یہ خوبی نہ ہوتی تو چنگ ہوا مجھے اپنے کھلے گھر میں ٹھہرانے کی پیش کش ہرگز نہ کرتا۔

گیارہویں رات چنگ ہوا دس بجے کے قریب تاش کی گڈی لئے میرے کمرے میں آموجود ہوا۔ اس کی بے وقت آمد پر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

" پریشانی کی ضرورت نہیں، آج رات تمہیں اپنے کام پر روانہ ہونا ہے، میں نے سوچا جانے سے پہلے تم اپنے دل کی خلش بھی نکال لو۔" وہ تاش پھینٹتے ہوئے بولا۔

" دل کی خلش؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

" ہاں۔" اس نے تاش میرے سامنے بستر پر بکھیر دیئے۔ " تم بانٹو۔ میں تمہیں پکڑوں گا۔"

" اگر نہ پکڑ سکے؟" میں نے گڈی سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

" تو تمہیں نیچے قمارخانے ہی میں جگہ دے دوں گا۔"

میں نے حسب عادت حکم کی بیگم تلاش کر کے سب سے اوپر لگائی اور اسی دوران میں چاروں یکوں کے کناروں پر ناخن سے نشان لگا دیئے۔ اس مقام پر کناروں کی موٹائی میں خفیف سا اضافہ ہو گیا جسے صرف میری ہی انگلیاں محسوس کر سکتی تھیں۔

میں نے تاش پھینٹنے شروع کئے۔ ایک اکا میرے داہنے ہاتھ والے کو جا رہا تھا۔ کارڈ ز ایک دوسرے پر سے پھسلے اور اکے کے نیچے والا کارڈ سرک کر میرے ہاتھ میں آگیا۔

" فاؤل!" چنگ ہوا فوراً بول پڑا اور میں نے ایک مرتبہ پھر سارے تاش

شرمندگی

ہزاروں تماشائی جمع تھے کہ دونوں باکسر رنگ میں داخل ہوئے۔ ایک نے فوراً تولیہ اتارا اور ہاتھ اٹھا کر سب کو سلام کیا لیکن دوسرا اسی طرح تولیہ اوڑھے ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ اس کا معاون فوراً اس کے قریب پہنچا۔

" تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ اگر خوف بھی محسوس ہو تو اسے ظاہر نہ کرو۔ تولیہ اتارو اور کھڑے ہو کر سب کو سلام کرو۔"

باکسر نے بے بسی سے سر ہلا کر کہا۔ " میں یہ نہیں کر سکتا۔"

" مگر کیوں؟"

" کیونکہ اس لیے کہ میں انڈرویئر پہننا بھول گیا ہوں۔"

سمیٹ لئے۔

میں نے سات مرتبہ تاش بانٹے اور ہر بار چنگ ہوا کی عقابی نگاہوں نے میری چالاکی پکڑ لی۔ آخر میں نے شرمندہ ہو کر گڈی اسے لوٹا دی۔ " تمہاری نگاہوں کی داد نہ دینا زیادتی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار اس طرح چیک ہوا ہوں۔"

" جوئے خانے کو نفع میں چلانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔" وہ بولا۔ " سیلز کلب سے بمبئی پولیس کو ہر ماہ اسی ہزار روپیہ دیا جاتا ہے جب کہ ہمارے پاس جوئے خانے کا لائسنس بھی ہے۔ ایکسائز والوں کو بھی بھاری رقم دی جاتی ہے اور یہ مال میرے آدمی عارضی گاہکوں کی جیبوں سے نکلواتے ہیں ——!"

" مجھے کہاں روانہ ہونا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

" ایک چھوٹا سا بحری سفر ہے۔" اس نے کہا۔

" کھلے سمندر سے ڈلیوری لینی ہے؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

" کام کی نوعیت منزل پر پہنچ کر ہی معلوم ہو گی۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ " کام بے حد دلچسپ اور حوصلہ طلب ہے۔"

میرے ذہن میں ان دنوں کی یاد تازہ ہو گئی جو میں نے بحر ہند کے ایک جزیرے پر سائیکو فورٹ میں گزارے تھے۔ ایک بار میں ڈاکٹر رامانند کی مہربانیوں کے طفیل اگاتی سے رہا ہو کر بمبئی پہنچا تھا اور اب ایک بار پھر کسی گمنام مشن پر سمندر کے سفر پر جا رہا تھا۔

شراب خانہ بند ہونے کے بعد رات کے تین بجے چنگ ہوا نے مجھے روانگی کا پیغام دیا۔ میرے پاس چنگ ہوا کے لاتے ہوئے چند جوڑوں

اور ایک سوٹ کیس کے سوا کچھ بھی نہ تھا جو مجھے دیر لگتی۔ لیڈی الانوف سے چھینا ہوا زہریلے تیر پھینکنے والا ننھا سا پستول میں نے پہلے ہی کوٹ کی اندرونی جیب میں چھپایا ہوا تھا۔ اس میں اب بھی گیارہ ہلکے پھلکے مگر مہلک تیر موجود تھے۔

سیلرز کلب کے باہر ایک بند گاڑی میں تین افراد میرے منتظر تھے چنگ ہو نے مجھے ان کے حوالے کیا اور گاڑی تیزی کے ساتھ سڑک پر دوڑنے لگی۔

سیلرز کلب بمبئی کے ایک ساحلی علاقے میں واقع تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ اس سفر کا اختتام جلد ہی ہوگا مگر خلاف توقع سفر کافی دیر جاری رہا۔ عقبی حصّے کے شیشوں پر سفید رنگ ہونے کی بنا پر مجھے راستوں کا اندازہ نہ ہو سکا مگر جب گاڑی رُکی اور مجھے نیچے اترنے کو کہا گیا تو مجھے قریب ہی سمندر کی سرکش موجوں کا شور سنائی دیا۔

اس وقت ہم ساحل سے بمشکل پندرہ بیس گز دور ناہموار پہاڑیوں میں موجود تھے۔ تاروں بھرے آسمان کی چھاؤں میں سیاہ سمندر کے سینے پر دیوہیکل موجیں ابھر رہی تھیں اور کنارے پر ایک چھوٹی سی کشتی کا ہیولا لرزتا نظر آرہا تھا۔

میرے ہمراہ گاڑی سے دلیت نامی ایک شخص اور اترا جس کے بعد گاڑی تیزی سے واپسی کے راستے پر چلی گئی۔

دلیت مجھے ساتھ لے کر چٹان سے بندھی ہوئی لانچ بوٹ کی طرف ہو لیا۔ چٹان سے رسّی کھول کر ہم دونوں اتھلے پانی میں دوڑتے ہوئے کشتی کو ریت سے پانی میں لے گئے اور جب ہمارے گھٹنوں سے اونچا پانی آگیا تو ہم دونوں اُچھل کر کشتی میں سوار ہو گئے۔

پلاسٹک کے چپوؤں کے سہارے ہم کشتی کو گہرے پانی کی طرف دھکیلتے رہے۔ اس علاقے میں تا حدِ نظر ساحل ویران پڑا ہوا تھا اور بے ترتیب پہاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

دلیت کی ہدایت پر کشتی کا رُخ درست کیا جانے لگا پھر دلیت نے حلق سے بحری چمگادڑ کی کریہہ آواز یکساں وقفوں کے تین بار بلند کی۔ تیسری آواز ابھرتے ہی گہرے سمندر میں کافی دور سبز رنگ کی محدود روشنی چمکی اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

”ہمیں اسی طرف جانا ہے۔“ دلیت نے معدوم ہونے والی روشنی کی سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم ایک بار پھر پلاسٹک کے چپوؤں سے رُخ کاٹنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے گہرے سمندر میں لنگر انداز ایک تاریک بوٹ کا ہیولا نظر آنے لگا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر وہاں کچھ ہیولے نقل و حرکت میں بھی مصروف نظر آئے۔

”کون ہے ادھر؟“ اچانک موجوں کے شور پر حاوی ایک انسانی آواز گونجی جو تاریک بوٹ کی جانب سے سنائی دی۔

”دو مچھیرے۔“ دلیت منہ پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے چیخا کیونکہ ہم ہوا کی مخالف سمت میں جا رہے تھے اور ابھی بوٹ ہم سے کافی دور تھی۔

”چلے آؤ۔“ بوٹ سے کہا گیا۔

پُرسکون سمندر کی موجوں سے لڑتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں ہم اس بوٹ کے قریب پہنچ گئے۔ عرشے سے رسّے کی سیڑھی لٹکائی گئی اور ہم دونوں باری باری اوپر چڑھ گئے۔ لانچ بوٹ بھی اوپر کھینچ لی گئی اسی کے ساتھ بوٹ کا ڈیزل انجن بیدار ہو گیا۔

اندھیری رات میں سمندری ہوا کے خنک تھپیڑے اگر ناگوار نہیں لگ رہے تھے تو کچھ ایسے خوشگوار بھی نہیں تھے۔ بوٹ پر مچھلیوں کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ عرشے پر پہنچنے کے بعد میں اندھیرے میں آگے بڑھا تو پیر نیچے پڑے ہوئے جال میں اُلجھ گئے۔

اسی وقت بوٹ کا لنگر اٹھا دیا گیا اور وہ ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ رُخ بدلنے لگی۔

عرشے پر میرے ساتھ دلیت کے علاوہ دو آدمی اور موجود تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں محدود روشنی والی سگنل ٹارچ تھی جس کے شیشے پر سبز فلٹر لگا ہوا تھا۔ گو موٹر بوٹ حرکت میں آچکی تھی مگر اس کی تمام روشنیاں ابھی تک گل تھیں۔ ہمیں اسی سگنل ٹارچ کی محدود سبز روشنی میں کیبن تک پہنچایا گیا جہاں وہیل پر ایک داڑھی والا خوفناک شخص نیلی جین اور جیکٹ پہنے مصروف تھا۔ کنٹرول پینل پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی رنگین روشنیوں کے انعکاس میں اس کا چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ کیبن میں اس کے علاوہ تین افراد اور موجود تھے۔

ان سب کے لباس ماہی گیروں جیسے تھے اور وہ بوٹ میں ساخت کے اعتبار سے چھوٹا فشنگ ٹرالر معلوم ہو رہی تھی۔ بوٹ کا انجن بہت طاقتور تھا کیونکہ رُخ درست کرنے کے بعد اس کی رفتار تیزی کے ساتھ بڑھی تھی اور اب وہ سیدھی جا رہی تھی۔

”اسے بتا دیا ہے نا؟“ وہیل پر موجود شخص نے مُڑے یا کسی کو مخاطب کیے بغیر سوال کیا۔

”سنو!“ اچانک دلیت نے میرا شانہ جھنجوڑ کر کہا۔ ”ہم کھلے سمندر میں ماہی گیری کے لیے جا رہے ہیں۔ تمھارا نام ودیارائے ہے، عمر ۳۲ سال باپ کا نام اُسنہارائے، سمجھ گئے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ اس وقت میرا ذہن ماضی کے دریچوں میں جھانک رہا تھا۔ کراچی میں میرا بھی یہی کام تھا مگر میں نے کبھی یوں چوروں کی طرح بحری سفر نہیں کیا تھا۔ میں شان و شوکت سے اپنی فرم کے دفتر میں بیٹھتا تھا اور میرے کارندے کھلے سمندر میں لنگر انداز جہازوں سے مال لا کر بازار میں پہنچاتے تھے پھر جس رفتار سے میں عروج پر پہنچا تھا اسی راہ سے میرا زوال شروع ہوا۔ میری ساحل نامی لانچ پر چھاپہ پڑنے کی خبر جس وقت مجھ تک پہنچی میں تاش کی بازی پر بازی ہار رہا تھا اور ساحل کی اطلاع ملنے

پر ہاتھ کی بازی میں اپنا سجا سجایا گھر بھی ہار کر میں تن کے کپڑوں سے سڑک پر نکل آیا تھا۔ اس کے بعد سے میں در بدر بھٹک رہا تھا اور اب مقدر نے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ ملاحوں کی ایک فوج کی کفالت کرنے والا اصغر علی ایک بدبودار لانچ میں معمولی ملاح کی طرح سمندر میں چوری چھپے سفر کر رہا تھا۔

اور یہ میری بدنصیبی کی انتہا تھی کہ اس وقت میرا نام بھی اپنا نہ تھا۔ میری ولدیت بدل دی گئی تھی، میری عمر پر ڈاکہ ڈالا گیا تھا مگر میں یہ سب ستم جھیلنے پر مجبور تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں بندرگاہ کی روشنیاں نظر آنے لگیں، اسی کے ساتھ موٹر بوٹ کی بھی ساری روشنیاں جل اٹھیں، رفتار میں بھی بتدریج اعتدال آگیا۔

موٹر بوٹ بندرگاہ کے بیرونی علاقے سے گزر رہی تھی تو کسٹم پولیس کی ایک گشتی لانچ سے رُکنے کا سگنل موصول ہوا۔ موٹر بوٹ کے کپتان نے دانت پیس کر چند مہمل اور غیر عملی گالیاں دیں اور چند منٹ میں بوٹ کی رفتار دم توڑ گئی۔

اس کے ساتھ ہی کسٹم والوں کی بوٹ ساتھ آ لگی۔ چند سوال جواب ہوتے۔ ہماری بوٹ سے ایک شخص کاغذات لے کر کسٹم والوں کی بوٹ پر گیا، اور ماہی گیری کا پرمٹ دیکھنے کے بعد انھوں نے سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

وقت گزرتا رہا۔ بندرگاہ کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ سمندر کے مشرقی کناروں سے سفیدی چمکنے لگی۔ ستارے دُھندلانے لگے، پھر نسیم سحری کے لطیف جھونکے سرسرائے۔ فضا میں بحری پرندے معصوم آوازیں نکالتے قطار در قطار خوراک کی تلاش میں پرواز کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سورج طلوع ہو گیا۔

میرے ساتھ کیبن میں بیٹھے ہوئے سب لوگ اُونگھ رہے تھے مگر بوٹ کا ناخدا پوری بشاشت سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

معاً میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ میرے پستول میں اب بھی گیارہ مہلک تیر موجود تھے اور وہ تعداد میں کل سات تھے۔ ان میں سے چھ اُونگھ رہے تھے ساتواں بوٹ چلانے میں منہمک تھا میں بآسانی ان سب کو زیر کر سکتا تھا۔

میں نے آہستگی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اُونگھنے والوں میں سے کوئی نہ چونکا اور میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

”ہینڈز اپ!“ میری للکار ان سب کے اعصاب پر کسی بم کے دھماکے کی طرح گری اور وہ ہڑبڑا کر عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگے ناخدا نے اپنے مقدر کو ایک وزنی گالی دے کر پوری قوت سے آہنی پہیے پر گھونسہ مارا، اور دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

”میرے ہاتھ میں مہلک تیر برسانے والا پستول موجود ہے۔“ میں نے باری باری ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اور اس میں گیارہ تیر ہیں۔ یہ تمھاری جلد کے کسی بھی حصّے میں پیوست ہو جائیں تو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں موت واقع ہو جاتی ہے گی لہٰذا اب وہی کرو جو میں کہتا ہوں۔“

”کام ایسا بتانا جو ہم کر بھی سکیں۔“ ناخدا تلخ لہجے میں بولا۔ وہ صورتِ حال سے ذرا بھی خائف نظر نہ آتا تھا اور خوفناک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

”تم بوٹ کی رفتار کم کرو۔“ میں نے اسے حکم دیا۔

”ہاتھ اٹھا کر یہ کرنا مشکل ہے۔“ وہ مضحکانہ لہجے میں بولا۔

”بکواس مت کرو سور کے بچّے، میں تمھیں جہنم واصل کر دونگا۔“

میں اس وقت ایسی خطرناک صورتِ حال سے دوچار تھا کہ اس کے اعتماد نے مجھے ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ اگر مجھ سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو ساتوں آناً فاناً میں میری بوٹیاں اُڑا دیتے۔

ناخدا مُڑ کر بوٹ کی رفتار کم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

”اور دلیت! تم باقی لوگوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دو۔ اس کے بعد سب کے پیر جکڑ دو۔“ میں نے اگلا حکم دیا۔

دلیت نائیلون کی رسّیاں اُٹھانے آگے بڑھا تو اس کی نگاہیں مسلسل مجھ پر مرکوز تھیں مگر میں ہر طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ اسی وقت ناخدا نے اچانک بوٹ کی رفتار بڑھا دی اور پھرتی سے میری طرف پلٹا مگر میں ایسی حرکت کے لئے تیار تھا۔ میں ایک کھڑکی تھام کر گرنے سے بچ گیا اور پستول کی نال ناخدا کی طرف اُٹھالی۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور رفتار کم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

نیچے گرنے والوں میں سے کسی کو ہتھیار نکالنے کی مہلت نہ ملی۔ دلیت نے فرش پر ایک کونے میں پڑا ہوا جال میری طرف اُچھالا اور ٹریگر پر میری انگلی چل گئی۔ وہ حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ہی ختم ہو گیا۔

اس کا عبرتناک حشر دیکھ کر بقیہ پانچوں کے چہرے دہشت سے سفید پڑ گئے۔

میں نے ان میں سے ایک کو دلیت کا چھوڑا ہوا کام پورا کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو میں نے خود ہر ایک کی بندشیں دیکھیں۔ ان سے مطمئن ہو کر میں نے چھٹے کو خود جکڑ دیا۔ وہ میرے پستول سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔

”مائیکل!“ میدان صاف کرنے کے بعد میں نے ناخدا کو پکارا۔

وہ بشرے پر ناگواری کے اثرات لئے میری طرف گھوم گیا۔

”دلیت نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو اس کا حشر تمہارے سامنے ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اسے مار دیا؟“ وہ حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔

”ہاں ـــ ان زہریلے تیروں کی صفت یہی ہے کہ ان کے شکار کو چیخنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

مائیکل نے باری باری اپنے تمام ساتھیوں کا جائزہ لیا پھر تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

"یہ موٹر بوٹ کہاں جا رہی تھی؟"

"بوٹ کی منزل کا علم دلیپ کو تھا، اُسے تم نے مار دیا۔" اُس نے بلاتامّل جواب دیا۔ "اب یہ وہیں جائے گی جہاں تم چاہو گے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کھُلے سمندر میں کسی جہاز سے اسمگلنگ کا مال لینے جا رہے تھے۔" یہ کہہ کر میں اس کے تبصرے کا منتظر رہا مگر وہ ایک لفظ نہ بولا تو قدرے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "مگر اب یہ بوٹ واپس بمبئی کے کسی ویران ساحل پر لگے گی۔"

"جیسا تمہارا حکم۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مگر یہ کوشش تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ کسٹم والے کھُلے سمندر سے واپس آنے والی ہر بوٹ کو اچھی طرح چیک کرتے ہیں۔ پھر ہم اتنی جلدی واپس لوٹیں گے تو انہیں لازماً شُبہ ہو گا۔"

"کیا مقصد ہے تمہارا؟" اس کی گفتگو نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔

"میں خود اس زندگی سے تنگ آیا ہوا ہوں۔" وہ بیحد سنجیدہ تھا۔

"یہ خیال رکھنا کہ تم نے کوئی چالبازی کی تو میں کوئی رعایت نہ کروں گا خواہ سمندر میں بھٹک کر مجھے جان دینی پڑے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے سر جھُکا کر کہا۔

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"بمبئی واپس چلیں گے۔" اس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

"مگر ابھی تو تم اس میں خطرات بتا رہے تھے۔"

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔"

"نہیں۔ میں تمہاری تجویز سُننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ چند ثانیوں تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "کھُلے سمندر میں بحری جہازوں کی گزرگاہ پر کئی ویران اور آباد جزائر موجود ہیں، ہم وہاں پناہ لے سکتے ہیں۔ جوں ہی ہمیں کوئی جہاز نظر آیا ہم اس سے مدد مانگ کر نکل سکتے ہیں۔"

میں خاصی دیر اس کی تجویز پر غور کرتا رہا۔ بمبئی جانے کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک بار پھر ان ہی خطرات میں گھر جاؤں جن سے نجات کے لئے میں مہینوں سے کوشاں تھا۔ پولیس، انڈین سیکرٹ سروس، کے۔ جی۔ بی، دلگیر سنگھ اور چینگ ہوا ـــ ان میں سے کوئی بھی کم خطرناک نہیں تھا۔ آخر میں نے مائیکل کو کوئی جزیرہ تلاش کرنے کی اجازت دے دی

مائیکل نقشے اور کمپاس کی مدد سے سمتوں کا تعین کرنے لگا۔ میں پستول سنبھال کر کوچ پر دراز ہو گیا۔ میرے لئے کھُلے سمندر میں سمت کا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ ہر طرف ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا نیلگوں پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ مائیکل اتنی آسانی سے میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گیا ورنہ میں شدید مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا۔

وہ سارا دن سفر میں گزرا۔ میں نے خشک غذا کا ایک ڈبہ کاٹ کر اپنا پیٹ بھرا کیونکہ خالی پیٹ کے سبب مجھے متلی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک ڈبہ مائیکل کے حوالے کیا اور جب سورج مغربی اُفق کے اُس پار ڈوب رہا تھا تو مائیکل بے اختیار خوشی سے چلا اُٹھا۔

"ہم ایک جزیرے کے قریب ہیں۔ سامنے خشکی نظر آ رہی ہے۔"

میں نے اس سے محفوظ فاصلے پر رہتے ہوئے ونڈ شیلڈ سے دیکھا اور کچھ دُور سمندر کے سینے پر سرسبز درختوں کی قطار ایک لکیر کی صورت میں اُبھری ہوئی نظر آئی۔ گو مائیکل کا رویّہ میرے ساتھ بہت ہی مصالحانہ تھا مگر میں آخر تک کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا۔ بوٹ کی روشنیاں ایک بار پھر جل اُٹھیں مگر وہ جزیرہ قریب نہ آیا۔ مجھے جاگتے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور میرے اعصاب بوجھل ہونے لگے تھے، سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے نصف شب کے قریب بوٹ ساحل کے قریب پہنچی۔ میں مائیکل کے پیچھے کھڑا ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین مرتبہ بوٹ کا سائرن بجایا اور یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ ساحل پر تین بار سبز روشنی بالکل اسی طرح جلائی اور بجھائی گئی جس طرح لائف بوٹ کے لئے موٹر بوٹ پر جلائی اور بجھائی گئی تھی۔

مگر مجھے خطرے کا اندازہ قدرے تاخیر سے ہوا۔ میری محویت سے فائدہ اُٹھا کر مائیکل کسی بھوکے درندے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ تکان سے ویسے ہی میرے اعصاب شکستہ ہو رہے تھے۔ مائیکل کی پہلی ہی ٹکّر نے مجھے بوٹ کے چوبی فرش پر ڈھیر کر دیا اور پستول میری گرفت سے نکل گیا۔ اس کے بعد میرے سر پر ایک بھرپور ٹھوکر پڑی اور میرا ذہن اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں مٹی اور پھوس کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں پیال پر پڑا ہوا تھا جس کی چھت پر سیمنٹ کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پیال سے اُٹھنا چاہا لیکن چکروں کے باعث دوبارہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میرا پورا سر کسی پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔

میں نے سر گھُما کر پورے جھونپڑے کا جائزہ لیا مگر وہاں میرے سوا کوئی ذی رُوح موجود نہیں تھا۔ میں نے چند ثانیوں تک اپنی بکھری ہوئی قوّت کو مجتمع کیا اور بلند آواز سے مائیکل کو پکارا۔

میری آواز کے جواب میں جھونپڑے کے دروازے پر قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ پھر گنجے سر والا ایک خبیث اور سیاہ چہرہ دروازے میں نظر آیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے میرا جائزہ لیا اور اس کے قدموں کی آہٹیں کہیں دُور معدوم ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر فضا میں قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اس بار آنے والے تعداد میں کئی تھے۔ جب وہ اندر آئے تو دلگیر سنگھ ان میں پیش پیش تھا۔ اس کے چہرے پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا حال ہے تیرا؟" اُس نے پیال پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"مائیکل نے میرا سر توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" میں کراہتے ہوئے بولا۔

"یہاں آتے ہوئے راستے میں تو نے جو کچھ کیا وہ جگر والوں کا کام ہے۔" دلگیر سنگھ خلافِ توقع مصالحانہ انداز میں پیش آرہا تھا۔ "مگر اب یہ چکر ختم ہو جانا چاہیئے۔ میں نے دلیپ کا خون تجھے صرف اس لئے معاف کیا ہے کہ وہ عقل کا کام بھی طاقت سے لینے لگا تھا اور اس جزیرے پر مجھے عقل والے کی ضرورت ہے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"سرکاری ریکارڈ پر یہ ویران جزیرہ ہے مگر یہ ملکیت ہے۔ میرے آدمی یہاں افیم اور حشیش کی بڑے پیمانے پر کاشت کرتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک سو انیس ہے۔ تجھے یہاں رہ کر ان سے کام لینا ہے۔ آج سے اس جزیرے پر تیرا حکم چلے گا۔"

"ابھی تو میں بستر سے بھی اُٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے، جب تک تو سنبھل نہیں جاتا میں یہیں رہوں گا۔ ویسے میری واپسی جلد از جلد ہونی ہے۔"

دو دن میں میری طبیعت سُدھر گئی۔ اس دوران یہ سوچ کر مجھے کوفت ہوتی رہی کہ مائیکل نے نہایت مکاری سے مجھے بیوقوف بنایا تھا۔ اس کا شروع سے جو پروگرام تھا اس نے مجھے دھوکے میں رکھ کر اسی پر عمل کیا اور مجھے آخر تک اس پر شُبہ نہ ہو سکا۔

طبیعت سُدھرنے کے بعد میں نے دلگیر سنگھ کے ہمراہ جزیرے کا چکر لگایا۔ وہاں کسی زمانے میں گھنا جنگل رہا ہو گا مگر دلگیر نے جنگل کی ساحلی پٹی چھوڑ کر جزیرے کے وسطی حصّے سے سارا جنگل صاف کرا دیا تھا اور وہاں دُور دُور تک افیم اور حشیش کے پودے لہلہا رہے تھے جن کی دیکھ بھال کے لئے جزیرے پر وہ مجرم جمع کئے گئے تھے جو سنگین جرائم کے تحت پولیس کو مطلوب تھے۔ دلگیر سنگھ یہاں ان کی تمام بنیادی ضروریات پوری کرتا تھا۔ اور ان سے سختی کے ساتھ پورا کام لیتا تھا۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں جن سے کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ مقرّرہ باریوں کے مطابق جزیرے کے باسیوں کے ساتھ وقت گزاریں۔

جزیرے کے ساحل پر جنگل باقی چھوڑ دینے کا مقصد یہ تھا کہ اس علاقے سے گزرنے والے بحری جہاز جزیرے کے وسطی حصّے میں ہوتے والی کارروائیوں سے باخبر نہ ہو سکیں۔ بمبئی سے رابطے کے لئے سمندر سے ایک گہری نہر جزیرے میں لائی گئی تھی جس نے ایک گھاٹ کی صورت اختیار کر لی تھی منشیات کی کاشتکاری کے لئے ساری آبی ضروریات تین کنوؤں سے پوری ہوتی تھیں جن پر کثیر صرفے سے ڈیزل سے چلنے والے پمپ نصب کئے گئے تھے۔ اس وسیع و عریض جزیرے پر زیرِ زمین میٹھے پانی کے ذخائر طویل عرصے کے لئے کافی تھے۔

"ان میں ایک لڑکی بہت طرّار ہے۔" جزیرے پر مقیم عورتوں کے بارے میں بتلاتے ہوئے دلگیر سنگھ نے کہا۔ "اس پر دو آدمیوں کے خون کا الزام ہے اور میرے آدمی اسے اندور سے لائے تھے۔ یہاں آئے دو مہینے ہونے کو ہیں مگر کسی مرد کو قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔ ایک دو کو تو زخمی کر چکی ہے ذرا اس سے ہوشیار رہنا۔"

"دو روز میں اس کا سارا کَس بل نکال دوں گا۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ جزیرے کا نظام چلانے کے لئے میرے پاس کیا چیز ہے۔ میں نہتّا نہیں کیسے سنبھال سکوں گا؟"

"تیرے جھونپڑے میں ریوالور سے ٹامی گن تک ہر چیز موجود ہے، اس کی چابیاں میں وہیں چل کر تیرے حوالے کر دوں گا۔"

دلگیر سنگھ نے جس طرح دلیپ کا خون معاف کیا تھا اس کے پیشِ نظر میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ کچھ عرصہ اس جزیرے پر گزار دیا جائے تاکہ لوگ صفدر علی اور اس کی کہانیوں کو بھول جائیں۔ بھرے پُرے شہروں میں رہتے ہوئے نکاسی کی راہ تلاش کرنا میرے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا تھا۔

جس وقت دلگیر سنگھ جھونپڑے میں موجود فولادی صندوق کھول کر مجھے اسلحے کا ذخیرہ اور شراب کی بوتلیں دکھا رہا تھا، جزیرے پر ایک طرف سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں کچھ نسوانی آوازیں بھی نمایاں تھیں۔

"پھر ہو گیا بلوہ۔" دلگیر سنگھ غصّے میں بولا۔

"عورتیں بھی جھگڑے میں شریک ہیں۔" میں ہوا کے دوش پر آنے والی آوازوں پر کان جما کر آہستہ سے بولا۔

"عورتیں کیا، وہی حرامزادی ہو گی۔" دلگیر سنگھ ایک رائفل میرے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ دوسری اس نے خود سنبھال لی تھی اور صندوق کو تالا لگا رہا تھا تاکہ جائے واردات پر پہنچ کر معاملہ جلد ہی ختم کرایا جا سکے۔

"کون حرامزادی؟" میں نے سرسری طور پر سوال کیا۔

"وہی پارسا کی بچّی، سیتا ــــ اور کون ہو گی۔" دلگیر سنگھ بیزاری سے بولا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایسی شہ زور تو رُوئے زمین پر ایک ہی سیتا تھی جس کی تلاش میں، میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا ہوں اور وہ بدنصیب بحرِ ہند کے اس گناہ پرور جزیرے پر درندوں کے غول میں گھری اپنی آبرو کی پیکار میں مصروف تھی۔

میرا سینہ غرور سے تن گیا۔ وجود میں عزم اور ہمّت کی ایک نئی لہر سرایت کر گئی۔ دلگیر سنگھ کے ہتک آمیز الفاظ اس انکشاف کے بعد تیر بن کر میرے سینے میں چبھنے لگے اور بے اختیار میں نے اس پر رائفل تان لی۔ رائفل کی اُٹھتی ہوئی نال دیکھ کر دلگیر سنگھ بوکھلا گیا۔ "یہ کیا کر رہا ہے، دماغ چل گیا ہے تیرا؟" وہ بے اختیار چیخ اُٹھا۔

"دماغ نہیں چلا، اب تو ہوش آیا ہے دلگیر سنگھ!" میں نے تلخ لہجے میں کہا اور اسی وقت باہر سُنائی دینے والا شور یک بیک تیز ہو گیا۔ نہ جانے اس شور میں کیا مقناطیسی اثر تھا کہ میں ایک لحظہ کے لئے وہاں نہیں ٹھہر سکا اور رائفل اُٹھائے بے اختیار اُدھر دوڑ پڑا جدھر سے شور سُنائی دے رہا تھا۔ دلگیر سنگھ میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

باقی آئندہ ماہ

صفدر صدیقی

ایک سرد اور ٹھٹھرے ہوئے موسم میں پیش آنے والا گرما گرم واقعہ

اس کہانی کو مِی بی گلفورڈ نے لکھا ہے

گشتی پولیس کے کانسٹبل پٹی کریب کو اس جیسے دن میں کوئی خاص ڈیوٹی نہیں دینا ہوتی تھی وہ کاؤنٹی پارک میں اکیلا تھا۔ یوں تو وہ عام طور پر اکیلا ہی ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ اس اعتبار سے بھی تنہا تھا کہ پارک میں کوئی ایک فرد بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ایسے خراب موسم میں کون اپنے گھر سے نکلنا چاہتا ہے آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کسی بھی لمحے بارش ہو سکتی تھی۔ ہوا بے حد خنک اور برفیلی تھی۔ اور پٹی کریب اس سرد موسم میں اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا۔ وہ پارک کے ریسٹ ہاؤس کو چیک کرتا اور پھر اپنی گشتی کار میں گھس جاتا جہاں انجن کی وجہ سے ایک خوشگوار حرارت موجود تھی۔

دوپہر کو اس نے لنچ کھایا اور اب تک کی رپورٹ پیش کی۔ اس نے بتایا کہ پارک بالکل خالی ہے۔ لیکن پارک خالی ہو یا نہ ہو اسے بہرحال اپنی ڈیوٹی پہ ٹھہرنا تھا۔ پارک کے دونوں گیٹ شام کا اندھیرا ہونے تک کھلے رہتے تھے اور اس کاؤنٹی کے ٹیکس دہندگان چاہتے تھے کہ موسم خواہ کیسا بھی کیوں نہ ہو اُن کا پارک اُن کے استعمال کے لئے کھلا رہے۔ چنانچہ ایک بجے سے کچھ پہلے پارک میں ایک کار داخل بھی ہوئی۔ پیٹی اس وقت ایک چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر تھا۔ اس نے دُوربین کی مدد سے اس کار کو دیکھا۔ وہ پارک میں تقریباً سو گز اندر آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک مرد اور ایک عورت اترے اور ہاتھوں میں ہاتھ دیئے آگے بڑھ گئے۔ پٹی نے سوچا کہ اگر وہ اس مرد کی جگہ ہوتا تو عورت کو اس خراب

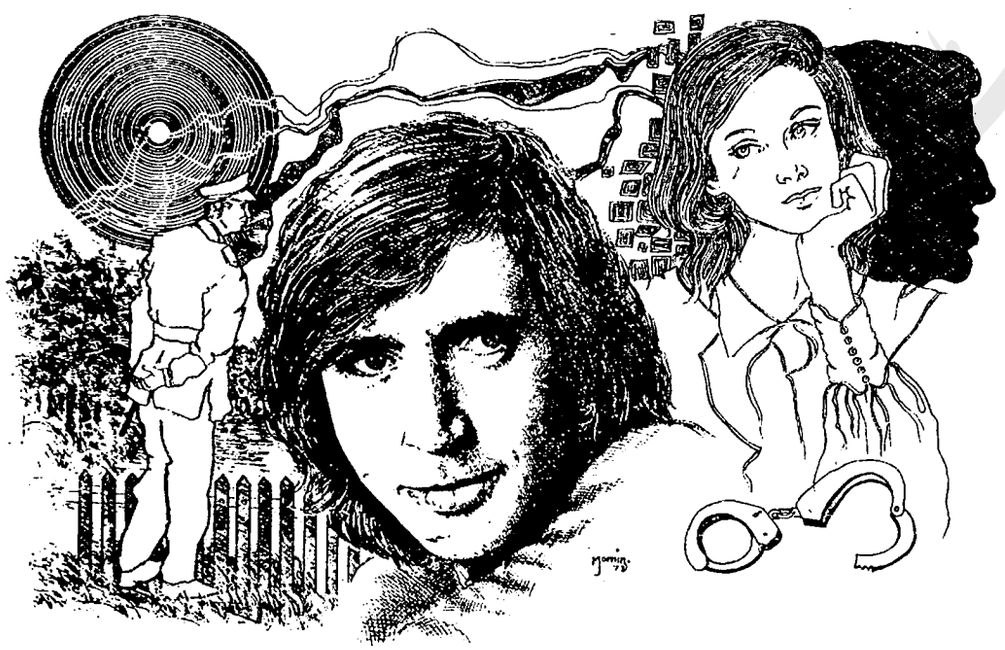

موسم میں پارک میں لانے کے بجائے کسی گرم بار میں لے جاتا۔

اس کے بعد وہ حسبِ معمول اپنی کار میں پارک کے گشت پر چل دیا۔ پارک سات ایکڑ کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے اسے کافی دُور تک گشت کرنا پڑتا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں ہفتہ کے آخری ایام میں پارک میں کافی ہجوم ہوا کرتا تھا اور اس بنا پر ایک کے بجائے تین چار کانسٹبل ڈیوٹی دیتے تھے مگر آج کے دن وہ اکیلا تھا اور اس کا کام صرف اتنا تھا کہ پارک کی مختلف سڑکوں پر اپنی کار لئے گھومتا رہے۔ اپنی وردی اور کار جس پر محکمہ پولیس ــــ کا نشان بنا ہوا تھا۔ لوگوں کو دیکھنے کا موقع دے تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ اُن کی باقاعدہ حفاظت ہو رہی ہے اگرچہ ایک کانسٹبل ایک وقت میں صرف ایک جگہ موجود ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دُوسری کار کو پارک میں آتے نہیں دیکھ سکا۔ اس نے اسے اس سڑک کے کنارے خالی کھڑا پایا جو واکنگ ٹریل کے ایک کنارے پر واقع تھی۔

پیٹی نے ایک بار پھر ناپسندیدگی کے انداز میں سر ہلایا۔ شاید اس کار میں کوئی اور رُومانی جوڑا آیا ہو گا۔ لیکن یہ جوڑا پارک کے کسی حصّہ میں گھومنے کے بجائے اس پگڈنڈی پر چل پڑا تھا جو گھنے درختوں کے جنگل میں لے جاتی تھی۔ پگڈنڈی تقریباً تین میل لمبی تھی اور ایسے خراب موسم میں یقیناً بالکل تنہا اور سنسان ہو گی۔ پیٹی نے کار کو غور سے دیکھا یہ ایسی حرکت تھی جو اس سے غیر ارادی طور پر سرزد ہو جاتی تھی۔ اس نے کار کا نمبر ذہن نشین کر لیا۔ یوں کار بڑی خستہ حالت میں تھی۔ ایک پرانی شیورلٹ ــــ اس قسم کی کار جس میں شریر اور ہنگامہ پسند نوجوان لڑکے لڑکیاں سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں لیکن آج شاید صرف ایک ہی جوڑا آیا تھا اور جنگل میں جانے والی پگڈنڈی کا انتخاب کرنے سے ظاہر تھا کہ ان کی آمد کا مقصد بھی کچھ اچھا نہیں ہے لیکن اس قسم کی حرکتوں کی روک تھام پیٹی کے فرائض میں شامل نہیں تھی۔ اس نے کار کا نمبر ذہن میں محفوظ کر لیا اور آگے بڑھ گیا۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ جب دوبارہ اس جگہ واپس آیا تو پہلے اُس کی ملاقات اس جوڑے سے ہوئی جسے اس نے دُوربین سے دیکھا تھا۔ وہ دونوں اُدھیڑ عمر کے اور شادی شدہ تھے دونوں میاں بیوی کو باہر گھومنا بہت پسند تھا۔ اسلئے وہ خراب موسم کے باوجود پارک میں آئے تھے لیکن پارک کی برفیلی ہوا نے کچھ ہی دیر میں ان کا سکون ختم کر دیا اور اب وہ واپس جا رہے تھے۔ پیٹی نے دیکھا کہ وہ سُرخ رنگ کی پرانی شیورلٹ کار بدستور اپنی جگہ کھڑی ہوئی ہے لیکن اب وہ اکیلی نہیں تھی اس کے قریب ہی ایک نئی چمکیلی چھوٹی سی زرد رنگ کی مستونگ کار بھی موجود تھی۔ اگرچہ دونوں کاروں کے ڈرائیوروں یا مسافروں میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پیٹی کسی قدر فکرمند تھا لیکن اس کے ساتھ اسے اس اتفاق پر تعجب بھی تھا کہ وہاں صرف دو کاریں کھڑی تھیں۔ یہ ممکن تھا کہ دونوں کاروں میں صرف ایک ہی ایک فرد آیا ہو اور انہوں نے پہلے سے اس پگڈنڈی پر کسی جگہ ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا ہو لیکن اس کا امکان بہت کم تھا۔ کیونکہ دونوں کاروں میں کوئی مماثلت نہیں تھی بلکہ زیادہ ممکن بات یہ تھی کہ مستونگ کار میں آنے والے افراد شیورلٹ کار کے لوگوں کے لئے اجنبی ہوں لیکن سوال یہ تھا کہ کیا مستونگ کار میں آنے والے شیورلٹ میں آنے والوں کی تنہائی میں مداخلت بے جا کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں دونوں کے درمیان گرما گرم بحث کا منظر کافی دلچسپ ہو سکتا ہے لیکن ظاہر تھا کہ اس قسم کا کوئی منظر بھی پیٹی کے فرائض میں داخل نہیں تھا۔

بریل تنہائی چاہتی تھی۔ وہ کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے جنگل میں جانے والی پگڈنڈی کے قریب پرانی شیورلٹ کار کو کھڑے دیکھا تو وہ کچھ ہچکچائی۔ دوسری کار کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ کوئی اور شخص یا کچھ اور لوگ بھی اس راستہ پر گئے ہیں پھر کیا اسے پارک کے کسی حصّہ میں چلا جانا چاہیئے۔ مگر اسے یہ پگڈنڈی بہت پسند تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اسے کچھ اور لوگ ملے بھی تو وہ جلدی سے اُن کے قریب سے گذر کر آگے بڑھ جائے گی۔

شروع میں وہ دوسرے افراد کی موجودگی کے خیال سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی لیکن جب کئی سو گز آگے بڑھنے کے بعد بھی اسے کوئی نظر نہیں آیا تو وہ یہ بات بھول گئی کہ وہ پارک کے اس حصّہ میں اکیلی نہیں ہے۔ جنگل اور جنگل کی خاموشی نے اسے اس دوران اپنے اندر جذب کر لیا جیسے کوئی کسی کے زخم پر مرہم رکھ دے۔ اس نے کچھ مطمئن ہو کر اپنی رفتار آہستہ کر دی اور کسی فرد کو تلاش کرنے کے بجائے کوئی ایسا آرام دہ گوشہ دیکھنے لگی جہاں وہ سکون کے ساتھ بیٹھ سکے۔ درختوں پر لگے ہوئے پتوں کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ درخت موسم کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر رہے تھے اور یہ دیکھ کر بریل نے سوچا کہ جب یہ درخت نئے حالات کے تحت اپنے آپکو تبدیل کر لیتے ہیں تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔

انسان کی زندگی میں بھی مختلف موسم آتے رہتے ہیں کبھی خزاں ہے تو کبھی بہار کبھی گرمی ہے تو کبھی جاڑا۔ اس صبح وہ خودکشی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس پر ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہوا تھا جس سے وہ پہلے دانستہ اغماض برتتی تھی۔ لیکن اب وہ مزید آنکھیں بند نہیں کر سکتی تھی۔ یہ یقینی بات تھی کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا، ورنہ شاید کبھی کرتا تھا۔ اس کے بجائے وہ کسی دوسری لڑکی کو چاہتا تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کو اور بریل خوبصورت نہیں تھی۔ بات کتنی سیدھی اور واضح تھی مگر ساتھ ہی کتنی تکلیف دہ۔ اور وہ اس تکلیف سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی جو اس کے خیال میں صرف موت ہی کی آغوش میں مل سکتا تھا لیکن وہ خودکشی کرنے کی بجائے یہاں پارک میں چلی آئی۔ ایک ایسی جگہ جس سے اسے محبت تھی اور شاید وہ جگہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ یقیناً کرتی تھی۔ یہ تنہائی۔ یہ پُرسکون خاموشی اس کے اعصاب کو تسکین پہنچا رہی تھی۔

وہ اپنے آپ میں اور اپنے خیالات میں اتنی محو تھی کہ اس غیر مانوس اجنبی حرکت اور آواز کو بالکل نہیں سن سکی جو پگڈنڈی پر آگے جا کر کئی پیچ پیچ موڑوں کے بعد ــــ وقوع پذیر ہوئی تھی۔ اس لئے جب ایک موڑ کے بعد وہ دفعتاً ان کے سامنے پہنچی تو بُری طرح چونک گئی۔ وہ دو نوجوان لڑکے تھے۔ ایک نے سرخ رنگ کی اُونی قمیص پہن رکھی تھی اور دُوسرا نیلے رنگ کی جیکٹ پہنے تھا۔ وہ اس طرح اچانک اس کے سامنے آ گئے تھے کہ بریل کا پہلا ردِعمل خوفزدگی کا تھا۔ کسی ایسے جانور کی طرح جو دفعتاً کسی خونخوار درندے کے سامنے آ گیا ہو۔

پگڈنڈی پتلی ہونے کے باوجود اتنی کشادہ تھی کہ وہ اُن سے ٹکرائے بغیر آگے بڑھ سکتی تھی اس کے باوجود وہ خوفزدہ ہو کر پگڈنڈی سے نیچے اتر گئی اور جس حد تک بھی اُن سے دور رہتے ہوئے گذر سکتی تھی، تیز تیز قدموں سے تقریباً بھاگتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اس کا عجیب طرزِ عمل بلاشبہ خوف کا نتیجہ تھا۔ مگر یہ خوف صرف ان دو اجنبی لڑکوں سے نہیں تھا۔ اس وقت تو وہ پوری انسانیت سے خوفزدہ تھی۔ کیونکہ انسانیت نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ اسے محبت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اور اب کوئی اور بھی اس سے محبت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ وہ بڑے احمقانہ انداز میں ان دو اجنبی لڑکوں سے بھی دُور بھاگ گئی جن کے نام بھی اسے معلوم نہیں تھے۔

وہ جتنا تیز چل سکتی تھی چل رہی تھی۔ گاہے گاہے رک کر وہ پیچھے بھی دیکھ لیتی تھی۔ اس توقع میں کہ شاید اب اسے تنہائی میسر آ گئی ہو گی مگر اس نے دیکھا کہ وہ سُرخ قمیص اور نیلی جیکٹ والے دونوں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ اُن کے شیو بڑھے ہوئے چہرے اور بکھرے ہوئے لمبے بال اب اسے کچھ اور زیادہ خوفناک محسوس ہونے لگے تھے۔ ان کا درمیانی فاصلہ پچاس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ مگر بریل آگے بڑھتی گئی۔ اب وہ بھاگنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ پہلے وہ دونوں لڑکے اپنی کار کی طرف واپس جا رہے تھے لیکن اسے دیکھ کر واپس پلٹ پڑے اور اب اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس سرد دن جبکہ پارک میں کوئی اور نہیں تھا۔ وہ جنگل کی گہرائی میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر ایک کی نظروں اور ہر ایک کی حدودِ سماعت سے بہت دُور۔

اب اسے کیا کرنا چاہیئے؟ کیا واپس ہو جائے اور اس طرح ایک مرتبہ پھر ان کے پاس سے گزرنے کا خطرہ مول لے۔ کیا وہ اس مرتبہ اسے گزرنے دیں گے؟ یا پھر وہ جنگل میں اور آگے بھاگ کھڑی ہو؟ یا خود کو پرسکون ظاہر کرتے ہوئے انہیں بالکل نظرانداز کر کے اپنی راہ چلتی رہے؟ وہ جانتی تھی کہ وہ محض اسے پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھ چکے ہیں کہ بریل اُن سے ڈر گئی ہے اور اب اس کے خوف سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ وہ چاہتے تو اب تک اسے پکڑ سکتے تھے مگر وہ ایک مقررہ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ اسے پریشان اور خوفزدہ کر کے لطف اٹھانے کے لئے۔

اور بریل آگے چلتی رہی۔ اب اسے پیچھے گھوم کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آہٹ پر لگے ہوئے اس کے کان اسے بتا رہے تھے کہ تعاقب مسلسل جاری ہے۔ ابھی اس کھیل سے اُن کا جی نہیں بھرا تھا۔ پگڈنڈی کا دوسرا کنارہ بہت دُور تھا۔ دو میل سے بھی زیادہ دُور۔ ممکن ہے وہ تھک جائیں یا پھر آخر تک اس کا پیچھا کریں۔ بس وہ ایک مرتبہ اس جنگل سے نکل جائے پھر ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہے گی۔ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ اسے چھیڑنا، پریشان کرنا۔ دو شریر لڑکوں کو اگر ایک تنہا لڑکی مل جائے تو وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر بعد میں وہ انکی شکایت پارک کی ڈیوٹی پر متعین کانسٹبل سے کرے تو وہ بالکل بجا طور پر قسم کھا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ ایک بات بھی نہیں کی ہے۔

بریل نے بڑی کوشش اور قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے خود کو بھاگنے سے باز رکھا۔ وہ اُن کی نظروں کا لمس اپنے جسم کے ہر حصّہ پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اس وقت بڑے پائینچوں کی پتلون اور جیکٹ پہن رکھا تھا۔ اچانک بریل کو خیال آیا کہ لڑکے کہیں اس کا پرس اڑانے کے لالچ میں تو اس کا تعاقب نہیں کر رہے ہیں جو کہ اس نے بائیں بازو میں لٹکا رکھا تھا۔ اگر وہ اس کا تعاقب کرنے سے باز آ جائیں تو وہ بڑی خوشی سے اپنا پرس دینے پر آمادہ تھی اس نے سوچا کہ وہ پرس کو پگڈنڈی پر پھینک کر بھاگ کھڑی ہو۔ اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ پھر کچھ آگے جا کر پیچھے گھوم کر دیکھا۔ پیچھے دیکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑی۔ اس کے گرتے ہی تعاقب کرنے والے بھی رک گئے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ کئی سیکنڈ گزر گئے مگر وہ اپنی نظریں ان کی طرف سے نہیں ہٹا سکی۔ اُس کا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ دونوں لڑکے پہلے کے مقابلے میں کچھ قریب آ

عادی

ایک خاتون اپنے بچّوں کو کھانا کھاتے وقت پلیٹ میں کھانا چھوڑ کر اٹھ جانے پر بہت ٹوکتی تھیں۔ چنانچہ جب ان بچّوں کے اسکول میں بھی یہ سختی کی جانے لگی کہ دوپہر کو لنچ کے وقت جب تک بچّے پلیٹ خالی نہ کر دیں، انہیں میٹھا یا کوئی اور چیز نہیں دی جاتی تھی۔ تو انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس کے عادی تھے ــــ

چند روز بعد ان کے سب سے چھوٹے بیٹے نے اپنی سالگرہ پر باپ سے سائیکل لینے کی فرمائش کی اور باپ نے یہ کہہ کر ٹالا کہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں تو وہ جلدی سے بولا۔ "ڈیڈی آدھے پیسے میں دے دوں گا۔" یہ کہہ وہ اپنا غلّہ اٹھا لایا اور اسے کھول کر سکّے ڈیڈی کے سامنے گرا دیے۔ انہیں یہ شُبہ ہوا کہ کہیں بچّے نے یہ رقم کہیں سے چرائی تو نہیں ہے۔ انہوں نے بیٹے سے پوچھا کہ اتنے پیسے تمہیں کہاں سے ملے؟

"یہ میں نے اسکول میں کمائے ہیں" وہ بولا۔ "بچّوں کو جو سبزی یا سالن پسند نہیں ہوتا وہ مجھے کھانے کے لیے دے دیتے ہیں اور میں اس کے بدلے ان سے پیسے لے لیتا ہوں۔ چنانچہ میں آلو کے بھرتے کے لیے ۲۰ پیسے، بینگن کی ترکاری کے لیے ۲۵ پیسے، بھنڈی کے لیے ۵۰ پیسے اور چقندر کے لیے ۷۵ پیسے وصول کرتا ہوں۔"

گئے تھے۔ اگر وہ بھاگے تب بھی ان سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتی وہ چیخنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اگر وہ چیختی تب بھی یہاں اس کی آواز سننے والا کون تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی چیخ سن کر فوراً کسی عملی شرارت پر اتر آئیں۔ نہیں اسے پر سکون رہتے ہوئے دلیری کا مظاہرہ کرنا چاہیئے وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور دونوں لڑکوں سے مخاطب ہوئی۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

لڑکوں نے نہ مسکرانا بند کیا اور نہ کوئی جواب دیا۔ بس ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر رہ گئے۔

"تم لوگ میرا تعاقب کیوں کر رہے ہو؟" بریل نے کچھ اور ہمت کرکے پوچھا۔ انہوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ بریل اب انہیں واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اُن کی عمریں اٹھارہ انیس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھیں وہ نہ تو طالب علم نظر آرہے تھے اور نہ ملازمت پیشہ۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں وہ یہاں پارک میں موجود نہ ہوتے۔ وہ یہاں کیوں آئے تھے۔ کیا اسی جیسی کسی مجبور و بےبس لڑکی کی تلاش میں؟ وہ ان سے خوفزدہ ہونے میں حق بجانب تھی۔ وہ آوارہ گرد تھے۔ غنڈے، خطرناک اور جرائم پیشہ۔

"مہربانی کرکے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" اس نے مضبوط لہجہ میں کہا۔

نیلی جیکٹ والا پھر ہنسنے لگا۔ سرخ قمیص والے نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔

"یہ ایک پبلک پارک ہے محترمہ۔"

اور اس طرح وہ بدستور اس کے تعاقب میں چلتے رہے۔ بریل نے ایک مرتبہ پھر بھاگنے کے بارے میں سوچا۔ پگڈنڈی پر نہیں۔ اس طرح تو وہ اسے آسانی سے پکڑ سکتے تھے۔ بلکہ جنگل میں۔ گھنے درختوں کے درمیان۔ اپنا پرس یہاں پھینکو اور جنگل میں بھاگ کر جان بچاؤ۔ ممکن ہے وہ جنگلی پودوں اور جھاڑیوں میں اپنے کپڑے پھاڑنے کا خطرہ مول نہ لیں اور اس کے تعاقب سے باز آجائیں۔ سرخ قمیص والا اس کی طرف بڑھا اور بریل نے جلدی سے اپنا پرس وہیں ڈالتے ہوئے پگڈنڈی سے نیچے جنگلی گھاس میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک لمحہ میں وہی جنگل جو اسے اپنا دوست اور خیر خواہ محسوس ہو رہا تھا، خطرناک دشمن میں تبدیل ہو گیا۔ جھاڑیوں میں اسکے کپڑے اور درختوں کی پھیلی ہوئی شاخوں میں اس کے لمبے بال الجھنے لگے۔ بالوں کو شاخوں سے چھڑانا تکلیف دہ تھا مگر اس سے بھی زیادہ بڑھ کر یہ کہ اس میں نہایت قیمتی وقت صرف ہو رہا تھا۔ درختوں کی شاخیں اس کے چہرے پر بھی لگ رہی تھیں۔ اس کی جیکٹ اور پتلون جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ جھاڑیوں کے کانٹے جیسے ان غنڈوں کے ساتھی بن کر اسے ہر ہر قدم پر روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ بریل ٹھوکریں کھاتی لڑکھڑاتی آگے بڑھتی رہی۔ اگرچہ اس کی رفتار بے حد سست تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے خواب ہی کے عالم میں وہ جانتی ہے کہ اسے اپنی جان بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ تیز بھاگنا چاہیئے۔ مگر نہیں بھاگ پاتی۔ کوئی نادیدہ قوت اسکے قدموں کو روک رہی ہے۔ یا پھر جیسے اس کی ٹانگیں اور اس کے پیر سیسے یا پتھر کے بن گئے ہیں۔

خود اپنی سسکیوں کی آواز کے درمیان اس نے اپنے پیچھے ان دونوں کے آنے کی آوازیں سنیں۔ وہ بھاگتی رہی، ڈری سہمی ہوئی سی۔ اس کی ہمت اور اس کی طاقت دونوں جیسے ہر قدم پر کچھ اور کم ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن اسے ہر صورت میں خود کو بچانے کے لئے بھاگنا تھا اور یہی جذبہ تھا جو اسے کشاں کشاں آگے لئے جا رہا تھا۔ وہ پہاڑی سے نیچے اترنے لگی تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ درختوں کا سلسلہ نیچے جا کر ختم ہو گیا ہے اور اس سے بھی آگے ایک ہموار سی سطح ہے جس پر آسمان کے بادلوں کا دھندلا دھندلا سا عکس پڑ رہا ہے۔ یہ تالاب تھا۔ وہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ یہاں ایک تالاب بھی تھا۔ گرمیوں میں جبکہ درخت اور ان کی شاخیں پتوں سے لدی ہوئی تھیں اسے اوپر پگڈنڈی سے دیکھنا بھی ناممکن تھا۔ لیکن جاڑوں میں جبکہ خزاں کی وجہ سے شاخوں کے بیشتر پتے جھڑ چکے تھے کبھی کبھی پگڈنڈی سے گزرنے والا کوئی فرد تالاب کو دیکھ کر اس طرف آجایا کرتا تھا۔ یہ تالاب اسے بہت پسند تھا۔ وہ جب پارک میں آتی تو کبھی کبھی تالاب تک بھی آجاتی تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی تالاب کے سرد پانی میں ہاتھ ڈالنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ پارک کے ضابطوں کے مطابق تالاب میں اترنا یا تیرنا منع تھا۔ یوں بھی کوئی اس طرح کے جنگلی تالاب میں نہانے یا تیرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس جنگلی تالاب میں کتنے اور کیسے کیسے خطرناک جانور موجود تھے۔ سانپوں کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت بریل کے سامنے تالاب میں اُترنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

بریل بہت اچھی تیراک تھی۔ اس لئے اسے پانی سے کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن اسے تیرنا نہ بھی آتا ہوتا تب بھی۔ سو فٹ چوڑا اور نہ معلوم گہرائی کا یہ تالاب اسے ان دونوں غنڈوں کے مقابلے میں کم خطرناک معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تالاب میں کود گئی اور تیرتے ہوئے اس کے درمیان میں پہونچ گئی۔ اس کے سامنے کوئی واضح پلان نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ سرخ قمیص اور نیلی جیکٹ والے اچھے تیرنے والے ہوں۔ وہ تو اس وقت ایک اضطراری حرکت کے طور پر تالاب میں اتر گئی تھی۔ کچھ سوچے بغیر۔ لیکن تالاب کے درمیان میں پہونچ کر پلٹ کر دیکھا۔

وہ دونوں تالاب کے کنارے آکر رک گئے تھے۔ اور دلچسپی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ بریل نے اپنے چہرے سے پانی صاف کیا۔ اور آہستہ آہستہ ہاتھ پیر مارتے ہوئے ان کی جانب سے کسی ردِ عمل کا انتظار کرنے لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے آہستہ لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے آہستہ کہ بریل ان کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ مزید احتیاط کے خیال سے وہ ان سے کچھ اور دور ہو گئی۔ اسے توقع تھی کہ وہ واپس لوٹ جائیں گے اور ان کے جانے کے بعد وہ تالاب کے دوسرے کنارے پر پانی سے باہر آئے گی اور جنگل سے گزرتے ہوئے کسی قریبی سڑک تک پہونچنے کی کوشش کرے گی۔ یا پھر اس وقت تک جنگل میں چھپی رہے گی جب تک اندھیرا نہ ہو جائے۔ وہ یہ خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ دونوں اسے سڑک پر ایک مرتبہ پھر گھیر لیں۔ پانی کے مانوس لمس نے اسے تحفظ کا ایک نیا احساس دے دیا تھا۔ آہستہ رفتار سے تیرتی ہوئی وہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھی۔

مگر یہ کیا۔ سرخ قمیص والا اپنے ساتھی سے جدا ہو کر تالاب کے کنارے کنارے چلتے ہوئے دوسرے کنارے کی طرف آرہا تھا۔ اور اچانک بریل کو احساس ہوا کہ وہ تالاب میں اتر کر اُن کے ہاتھوں سے بچی نہیں ہے بلکہ اور گھر گئی ہے۔ اور اس وقت وہ پہلی مرتبہ زور سے چیخی۔ لیکن ان گھنے درختوں کے درمیان اس کی چیخ بیرونی دنیا تک پہونچنے کے بجائے گونج کی شکل میں لوٹ کر اسی کے پاس آگئی۔ وہ اس وقت تک چیختی رہی جب تک تھک نہیں گئی۔ اس تھکاوٹ نے اس کے تیرنے میں مشکل پیدا کر دی۔ پانی اسکے مُنہ تک آگیا۔ وہ ہاتھ پیر مار کر دوبارہ سطح سے اوپر ابھر آئی مگر اب اس نے چیخنے میں مزید طاقت خرچ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ پانی کے اوپر سیدھی تیرتی رہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں غنڈوں کا کوئی ارادہ پانی میں اترنے کا نہیں تھا۔ موسم سرد تھا اور پانی بھی جیسے برف ہو رہا تھا۔ چونکہ وہ دو تھے اس لئے بڑی آسانی سے نامعلوم مدت تک کے لئے اسے تالاب میں گھیرے رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر شل ہو جائے اور خود کو ان کے حوالے کر دے۔ ایسی صورت میں انہیں پانی میں بھیگنے کی کیا ضرورت تھی

سوال یہ تھا کہ وہ کتنی دیر تک پانی میں تیر سکتی ہے۔ اگر حالات موافق ہوتے، پانی گرم ہوتا یا کم سے کم اس قدر ٹھنڈا نہ ہوتا تو وہ ایک لامحدود مدت تک تیر سکتی تھی۔ لیکن اس تالاب کا برفیلا پانی ابھی سے اس کے خون کو منجمد اور قوتِ برداشت کو ختم کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ کیا وہ تالاب میں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرے جہاں اس کے پاؤں تہہ سے چھو سکیں اور وہ کھڑی ہو سکے۔ لیکن اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ وہ بہرحال ٹھنڈے پانی میں رہے گی۔

اس وقت وہ دونوں تالاب کے مخالف کناروں پر ایک دوسرے کے بالکل مقابل جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ وہ اب بھی مسکرا رہے تھے۔ ان کے لئے اسے اس تالاب میں قید رکھنا کس قدر آسان تھا۔ وہ صرف کھڑے رہ کر اس کے تھکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک نہ اسے ہاتھ لگایا تھا اور نہ کوئی دھمکی دی تھی۔ وہ صرف مسکراتے ہوئے اس کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ جیسے مکمل طور پر ان کے قبضہ میں آگئی تھی۔

ایک طویل وقفہ تک کچھ نہ ہوا۔ وہ بس اسے مسکراتی نظروں سے گھورتے رہے۔ آسمان پر بادل بدستور چھائے ہوئے تھے۔ ان کی سیاہی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر لمحہ بارش ہونے کا امکان تھا۔ کیا بارش ہو جائے تو یہ دونوں اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے؟ ممکن تو تھا۔ لیکن آسمان بھی یوں لگتا تھا جیسے بارش کی صرف دھمکی ہی دے رہا ہے اور بریل اس برفیلے پانی میں سردی سے ٹھٹھرتی جا رہی تھی۔ وہ کانپنے لگی تھی اور جسم کی حرارت کو برقرار رکھنے کے لئے اسے مسلسل ہاتھ پاؤں ہلانا پڑ رہے تھے۔

"اے!" سرخ قمیص نے اسے آواز دی۔ "باہر نکل آؤ۔"

بریل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمہیں کبھی نہ کبھی تو باہر آنا ہی پڑے گا۔" سرخ قمیص نے پھر کہا۔ لیکن

تھیلا

اصغر اسکول سے روتا ہوا آیا اور ماں سے بولا "امی! مجھے اسکول میں سب بچے چڑاتے ہیں کہ اصغر کی ٹوپی گندی۔ اصغر کی ٹوپی گندی۔"

ماں نے اسے تسلّی دی اور کہا "تم دل چھوٹا نہ کرو۔ بچے غلط کہتے ہیں۔ تمہاری ٹوپی بالکل صاف ہے۔"

اصغر چپ ہو گیا۔ اگلے روز وہ پھر اسکول سے روتا ہوا آیا اور وہی شکایت دہرائی۔ ماں نے پھر اُسے تسلّی دی۔ "بچوں کو کہنے دو۔ تمہاری ٹوپی بالکل صاف ہے۔ اچھا ذرا بھاگ کر سبزی والے کے ہاں سے ایک سیر پیاز لے آؤ۔"

اصغر رونا دھونا بھول گیا اور بولا "تھیلا تو دیجیے امی!"

"تھیلا کیا کرو گے۔ ٹوپی میں ڈال کر لے آنا۔"

بریل کے ذہن نے اس دلیل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

سرخ قمیص نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔

"یہ تو بہت ٹھنڈا ہے۔" اس نے کہا۔ لیکن بریل اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

"اب ہم کیا کریں؟" سرخ قمیص نے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے اپنے ساتھی کو پکارا۔

"انتظار۔" نیلی جیکٹ نے جواب دیا۔

انتظار۔ ہاں انتظار۔ اگر انہیں کوئی اور دلچسپ مصروفیت نہیں ہے تو وہ اندھیرا ہونے تک انتظار کر سکتے ہیں۔ پارک شام کو بند ہو جاتا تھا اور پارک پر متعین پولیس کانسٹبل کاروں کا جائزہ لے گا۔ اگر وہ پگڈنڈی کے پاس دو کاروں کو کھڑا دیکھے گا تو تحقیقات کرے گا۔ لیکن ابھی اندھیرا ہونے میں تو کئی گھنٹے ہیں۔ اس وقت تک تو بریل یا سردی سے مر جائے گی یا ڈوب جائے گی سرخ قمیص والا جو کچھ زیادہ بیقراری کا اظہار کر رہا تھا، ایڑیوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اسے گھورنے لگا۔ پھر اس نے یونہی شغل بیکاری کے طور پر سیاہ گیلی مٹی میں اپنی انگلیاں گاڑ دیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے اسے کوئی نیا خیال سوجھ گیا ہو اس نے ہاتھ میں تھوڑی سی مٹی لی پھر اسے گیند کی طرح گول بنا لیا اور پھر وہ گولا اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ کر بریل کی طرف کھینچ مارا۔

بریلی اس حرکت سے اس قدر متعجب ہوئی کہ اس نے بچنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ یہ اتفاق تھا کہ مٹی کا ڈھیلا اس سے ایک گز پہلے ہی پانی میں گر گیا۔ بریلی نے پلکیں جھپکائیں۔ سرخ قمیص نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ اور پھر دوسرے کنارے پر اپنے ساتھی کو آواز دے کر اسے بھی اس نشانہ بازی کی طرف متوجہ کیا اور دونوں نے بالکل اس طرح جیسے دو بچوں کو ایک نیا کھیل مل گیا ہو، گیلی مٹی کے ڈھیلے بنا بنا کر چاند ماری شروع کر دی۔ ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کو چیخ چیخ کر بہترین نشانہ لگانے پر اکسا بھی رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی اچھا نشانہ باز نہیں تھا۔ ان کے ڈھیلے عموماً بریلی تک پہنچ ہی نہیں رہے تھے۔ کچھ اس کے اوپر سے نکل جاتے تھے۔ وہ پانی میں اس طرح تیر رہی تھی کہ دونوں پر بیک وقت نظر رکھ سکے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ کیا کہ باری باری مارنے کے بجائے دونوں نے ایک ساتھ مارنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ڈھیلے سے بچنے کے لئے اسے پانی میں غوطہ مارنا پڑا۔ دوبارہ سر نکالا تو لڑکے ہنس ہنس کر پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

اب کھیل کچھ زیادہ سنجیدگی اور سرگرمی اختیار کر گیا تھا۔ مٹی کے ڈھیلے بھی بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ اتنی دیر کی مشق کے بعد نشانہ بھی بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک ایک ڈھیلا ٹھیک بریلی کے منہ پر آ کر لگا اور نرم کالی مٹی اس کے پورے چہرے پر پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں اور منہ میں بھر گئی۔ وقتی طور پر وہ دیکھنے سے عاری ہو گئی۔ بریلی نے جلدی سے غوطہ لگایا اور پانی مل مل کر اپنا چہرہ اور آنکھیں صاف کیں۔ وہ پھر سطح پر آئی تو دونوں بے تحاشہ قہقہے لگا رہے تھے۔ اسے چیخنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بریلی نے سوچا۔ وہ دونوں مل کر اسکے چیخنے سے کہیں زیادہ شور مچا رہے تھے۔ لیکن اسے امید نہیں تھی کہ ان کی آواز اس گھنے جنگل سے باہر بھی سنائی دے رہی ہو گی۔

بریلی اب بہت زیادہ تھک چکی تھی۔ اس کا جسم سردی سے سن ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں اب بھی حرکت میں تھے۔ اس کے ہاتھ اب بھی اسے تیرنے میں مدد دے رہے تھے، مگر یہ حرکات غیر ارادی طور پر ہو رہی تھیں۔ پھر جب اس کے جسم سے قوت کی آخری رمق بھی ختم ہو جائے گی تو یہ حرکات بھی آپ ہی آپ رک جائیں گی۔ پہلی مرتبہ اس کے ذہن کو بہ مجبوری یہ سوچنا پڑا کہ ایسا لمحہ آنے سے پہلے وہ کیا کرے۔ کیا وہ باقی ماندہ قوت کو کنارے تک پہنچنے میں صرف کرے اور خود کو ان غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے یا مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ وہ اس ناانصافی کے خلاف چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ دونوں ہی صورتیں اسکے لئے ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تصور تھیں۔

نشانہ بازی کا کھیل بدستور جاری تھا۔ پھر شاید وہ مٹی سے ڈھیلے بناتے بناتے بور ہو گئے کہ نیلی جیکٹ والا چیخ کر بولا۔

"ارے یہاں پتھر بھی تو پڑے ہیں انہیں کیوں نہ استعمال کیا جائے۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے پہاڑی مٹی میں دبے ہوئے کئی پتھر نکال لئے پھر اس نے ان میں سے ایک پتھر کا انتخاب کیا اور نشانہ لے کر بریلی کی طرف کھینچ مارا۔ پتھر بریلی تک نہیں پہنچا لیکن اس سے وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس کے پاس اور اور بھی بے شمار پتھر پڑے ہوئے تھے۔ اور اس نے یکے بعد دیگرے پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے شروع کر دیئے۔ بریلی کا سن ہوتا ہوا جسم دیوانہ وار اپنے بچاؤ میں مصروف ہو گیا۔ یہ نیا کھیل خطرناک تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ان پتھروں سے خود کو محفوظ رکھ سکے گی۔ کچھ پتھر اس کے اوپر سے گزر گئے، کچھ اس تک نہیں پہنچے، لیکن جلد ہی نشانے بہتر ہونے لگے۔ اور بریلی کو پتھروں سے بچنے کے لئے ہر بار پانی کے نیچے پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ نیلی جیکٹ نے یہ دیکھا تو اس نے بھی حملہ کرنے کی ترکیب بدل دی۔ اس نے ایک ساتھ دو پتھر اٹھا لئے۔ جب بریلی ایک پتھر سے بچنے کے لئے پانی میں گئی تو وہ دوسرا پتھر لئے تاک میں کھڑا رہا جیسے ہی بریلی نے سر اوپر نکالا اس نے دوسرا پتھر کھینچ مارا۔

اور اس مرتبہ بریلی اپنا بچاؤ نہ کر سکی۔ پتھر اس کی داہنی کنپٹی پر لگا۔ اسے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس پر کلہاڑی سے حملہ کر دیا ہو۔ اس کا سر بھنا گیا دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ چوٹ کی جگہ پر پہنچا اور پھر واپس ہٹا تو اس کی انگلیاں خون سے تر تھیں نیلی جیکٹ نے اپنی کامیابی پر ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔

"میں چیمپین ہوں۔" وہ بار بار چیخ کر کہہ رہا تھا۔ اس نے بھی خون بہتے دیکھ لیا تھا اور بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔

اور بریلی کو یقین ہو گیا کہ اگر اس نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی تو اسے مرنا پڑے گا۔ اس نے واپس اس کنارے کی طرف تیرنا شروع کیا جس طرف نیلی جیکٹ والا کھڑا تھا۔ اس کے بڑھنے کی رفتار بے حد سست تھی۔ اسے اپنا منہ اور ناک پانی سے اوپر رکھنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسی چھاتے ہوئے اندھیرے میں اس نے دیکھا کہ سرخ قمیص والا بھی بھاگ کر اس کنارے کی طرف آ رہا ہے۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ کنارے پر کھڑے ہو کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

بریلی نے محسوس کیا کہ اس کے پیر تالاب کی تہہ سے لگ گئے ہیں۔ وہ کھڑی ہو گئی اور تیرنے کے بجائے چلنا شروع کر دیا مگر اس کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ سست تھی۔ اگر پانی اسے سہارا نہ دیئے ہوئے ہوتا تو وہ ضرور گر جاتی۔ آخر کار پانی صرف کمر تک رہ گیا تو وہ گر پڑی۔ اٹھی۔ سنبھلی اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل آگے بڑھنے لگی۔ اس کی کنپٹی سے بہنے والا خون اس کی سیدھی آنکھ میں بھرنے لگا تھا۔ اس نے کیچڑ آلودہ ہاتھ سے اسے صاف کرنے کی کوشش کی۔ پھر جب وہ کنارے سے قریب آ گئی تو سرخ قمیص اور نیلی جیکٹ نے اسے سہارا دے کر پانی سے نکال لیا۔

"یہ کچھ خوبصورت تو نہیں ہے"۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

پولیس کانسٹبل پیٹی کریب ایک مرتبہ پھر واکنگ ٹریل کے قریب سے گزرا اور دیکھا کہ سرخ شیورلٹ اور زرد مستونگ بدستور وہاں کھڑی ہوئی ہیں۔ اس وقت اس کی گھڑی میں ساڑھے چار بج رہے تھے۔ دونوں کاریں وہاں کافی دیر سے کھڑی تھیں لیکن جنگل میں جانے والی پگڈنڈی تین میل لمبی تھی! اگر کار والوں

نے پوری پگڈنڈی کی سیر کا پروگرام بنایا ہے تو تین میل جانے اور پھر تین میل واپس آنے میں انہیں کم سے کم دو گھنٹے ضرور لگ جائیں گے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے دونوں پارٹیاں ایک دوسرے سے مل گئی ہوں۔ پھر بھی وہ کچھ اضطراب سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی کار روکی۔ باہر نکلا اور دونوں کاروں کے پاس آیا ان دونوں میں کوئی نہیں تھا۔ اور نہ کوئی غیر معمولی بات نظر آ رہی تھی۔ پھر آخر اسے کس بات کی پریشانی ہے۔ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر دونوں کاروں کی نمبر پلیٹوں کو دیکھا۔ دونوں مقامی کاریں تھیں پیٹی نے ایک سگریٹ سلگایا اور مستونگ کار کے سہارے کھڑا ہو کر کش لگانے لگا اس کے چاروں طرف پارک میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ جنگل بھی جس میں پگڈنڈی جاتی تھی خاموش محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے درختوں اور پتوں سے ٹکرانے کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ جو لوگ بھی ان کاروں میں آئے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ پارک شام ہونے پر بند ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں باہر بلانے کے لئے اسے چیخنا پڑے۔ یا ان کے پیچھے جنگل میں جانا پڑے۔ اس نے دو تین لمبے کش لگا کر اپنا سگریٹ پھینک دیا۔ پھر اسے جوتے سے مسلتے ہوئے اپنی کار میں آ بیٹھا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

٭ ٭ ٭

"اے ڈیوک اسے کیا ہو گیا ہے۔"

ڈیوک نے جواب دینے میں وقت لیا۔ اب وہ مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔

"میرے خیال سے یہ مر گئی ہے۔" آخر اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"مر گئی ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔"

"وہی جو مرنے کا ہوا کرتا ہے۔ وہ سانس نہیں لے رہی ہے۔"

وہ دونوں زمین پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے جسم کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ وہ خود بھی کسی حد تک کیچڑ میں بھیگ گئے تھے۔

"یہ مر کیسے گئی ڈیوک۔"

"کیونکہ اس کی سانس کی آمد و رفت رک گئی ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ کیوں۔ آخر اس کی سانس کیوں رک گئی ہے"۔

"کیونکہ اسے مار دیا گیا ہے"۔

"لیکن اسے کس چیز نے مارا؟"

جواب میں خاموشی چھا گئی۔ ان دونوں نے لاش کی طرف دیکھا۔ اس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اور نہ سانس کی آمد و رفت سے سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ کسی قدر کھلے ہوئے تھے۔ کنپٹی پر زخم سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔

"تمہارے خیال میں اس کی موت اس پتھر سے تو نہ ہوئی ہو گی"۔ نیلی جیکٹ نے سرگوشی میں پوچھا۔

ایک مرتبہ پھر خاموشی طاری ہو گئی۔

"وہ چھوٹا سا پتھر اسے نہیں مار سکتا"۔ نیلی جیکٹ گھٹنوں کے بل لاش کے پاس بیٹھ گیا اور کندھے سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑنے لگا۔ "اے اٹھو۔ اٹھو۔ آنکھیں کھولو۔ تم بن رہی ہو۔ تم سچ مچ نہیں مری ہو۔"

"بکواس بند کرو رولو۔ وہ مر چکی ہے"۔ ڈیوک نے کہا۔

مگر رولو اسی طرح بیٹھا رہا۔

"اس کے علاوہ آخر اور کس چیز نے اسے مارا ہے"۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ اور کیا کیا ہے جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔"

"کچھ نہیں۔ یہ ایک حادثہ تھا"۔ ڈیوک نے جواب دیا اور خود بھی لاش کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"کون جانتا ہے"۔ اس نے کہا۔ "ممکن ہے اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی ہو"۔

"یا پھر سرد پانی سے اس کا خون جم گیا ہو"۔ رولو نے کہا۔ "وہ کافی دیر تک پانی میں رہی تھی نا۔"

"ہاں کیوں نہیں"۔ ڈیوک مسکرایا۔ "اسے نمونیا ہو گیا تھا۔"

"مذاق مت کرو۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ

شکر ہے

ایک شخص حیران و پریشان، دوست کے گھر پہنچا۔ دستک دی۔ دوست نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟"

وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "آج عجیب واقعہ ہوا۔ میں جنگل سے گزر رہا تھا کہ ایک گڑھے میں ایک لاش پڑی دیکھی۔ میں نے سوچا کہیں یہ تم تو نہیں ہو۔"

"اچھا! شکل و صورت کیسی تھی؟"

"بالکل تمہاری طرح۔ شکل و صورت، جسم، ہیکل غرض کہ ہر چیز۔"

"کپڑے بھی میری طرح تھے؟"

"ہاں! ہاں۔"

"سفید اور سرخ دھاریوں والے۔"

"نہیں، کتھئی دھاریوں والے۔"

دوست نے اطمینان کی سانس لی اور بولا۔ "اوہ! شکر ہے۔ وہ میں نہیں تھا۔ میرے پاس کتھئی دھاریوں والا کوئی لباس نہیں ہے۔"

کیوں مری اور کیسے مری۔ بس وہ مر گئی۔"
"یہاں آنے کی تجویز تمہاری تھی ـــ"
"تو پھر کیا ہوا۔ مجھے تازہ ہوا پسند ہے۔ میں ٹہلنا بھی چاہتا تھا۔ تو اس میں کیا خرابی تھی۔ پھر میں نے یہ بھی کہا تھا کہ شاید یہاں ہمیں دلچسپی کی کوئی چیز مل جائے۔ تو ہمیں کچھ نہ کچھ تفریح تو میسر آ ہی گئی۔"
"مگر زیادہ نہیں۔"
"تمہیں شکایت کرنے کے علاوہ اور کیا آتا ہے۔"
رولو کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر گھبرائی نظروں سے دیکھا۔
"ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہیئے"۔ وہ بولا۔
"پھر اس کا کیا ہوگا۔" ڈیوک نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔
"کیا مطلب؟"
"کیا ہم اسے یہاں اسی طرح چھوڑ جائیں"۔
"پھر ہم اور کیا کر سکتے ہیں"۔
"احمق۔ کوئی نہ کوئی اس لاش کو یہاں ضرور دیکھ لے گا۔"
"تو کیا ہوا"۔
"تمہیں پتہ ہے کہ جب پولیس کو کوئی لاش ملتی ہے تو وہ کیا کرتے ہیں

وہ تلاش شروع کر دیتے ہیں کہ یہ کس کا فعل ہے"۔
"تو کیا ہوا۔ اوّل تو اس موسم میں کوئی یہاں آنے سے رہا۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے موسم بہار تک لاش یہاں پڑی رہے۔ اس وقت تک ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔ پھر کوئی ہمیں کیسے پکڑ سکے گا۔"
یہ ایک خاصی مؤثر دلیل تھی۔ ڈیوک بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ساتھی کی دلیل سے اتفاق کرتے ہوئے واپس جانے کا ارادہ کر رہا ہے لیکن پھر وہ رک گیا۔
"فرض کرو کسی نے لاش دیکھ ہی لی تب"۔ وہ بولا۔
"ہم اس کی کار لے جا کر کہیں چھوڑ دیں گے۔" رولو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر اگر ہفتہ دو ہفتے کے بعد کسی نے اسے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوگا۔ ہم تو بہر حال جا چکے ہوں گے۔"
"اس پارک میں کسی نہ کسی پولیس کانسٹبل کی ڈیوٹی ہوتی ہے"۔
"تو پھر کیا ہوا"۔
"ممکن ہے کسی کانسٹبل نے پگڈنڈی کے پاس ہماری کار کھڑی دیکھ لی ہو۔ اور اس کی کار بھی دیکھ لی ہو۔ پولیس والوں کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ کاروں پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے رجسٹریشن نمبر یاد کر لیتے ہیں"۔
رولو نے لاش کو پیر سے ٹھوکر ماری، شاید اس توقع میں کہ وہ اٹھ کھڑی ہوگی، مگر ایسا نہیں ہوا۔
"اچھا تو پھر تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں"۔ اس نے پوچھا۔

"ہمیں یہ لاش کہیں چھپا دینا چاہیئے"۔
"کہاں۔ کیا تالاب میں؟"
"ہاں" ڈیوک نے اثبات میں سر ہلایا۔
پھر انہوں نے تفصیلات پر غور کیا۔ پولیس والوں کی یادداشت ہو سکتا ہے کہ کار کے نمبر یاد رکھنے کے بارے میں اچھی ہو۔ لیکن یہ نمبر انہیں زیادہ دنوں تک یاد نہیں رہ سکتے۔ انہیں ہمیشہ کچھ اور نمبر کچھ اور حلیئے یاد کرنے کے لئے ملتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ پرانے نمبروں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لہٰذا انہیں لاش چھپا دینا چاہیئے تاکہ اسے کافی دنوں تک برآمد نہ کیا جا سکے۔ اس وقت تک پارک کے کانسٹبل نے اگر ان کی کار کا نمبر نوٹ کر بھی لیا ہوگا تو بھول جائے گا۔ خاص طور سے اگر لاش تالاب میں پھینک دی جائے تو اس کا امکان ہے کہ پھر وہ کبھی برآمد نہ کی جا سکے۔ چنانچہ اس کا اہتمام کرنا پڑے گا کہ لاش تالاب کی تہہ میں بیٹھ جائے اور پھر وہیں رہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تالاب کے جانور اسے کھا جائیں۔ اور جب لاش ہی موجود نہ ہو تو قتل کا جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا خواہ کانسٹبل کو کار کا نمبر یاد ہی کیوں نہ رہے۔
"قتل"، رولو نے آہستہ سے دہرایا۔
"ہاں پولیس اس واقعہ کو قتل ہی خیال کرے گی"۔
تالاب کے اردگرد پتھروں کی کمی نہیں تھی۔ مگر انہیں بڑے پتھروں کی ضرورت تھی۔ یا پھر بہت سارے چھوٹے پتھر۔ تاکہ اتنا وزن ہو جائے جو لاش کو پانی کی سطح پر ابھرنے نہ دے۔ انہوں نے جلدی جلدی پتھر جمع کرنا شروع کر دیئے کیونکہ شام ہوتی جا رہی تھی اور پارک شام کو بند ہو جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ بھی خراب ہوئے اور کپڑے بھی مگر انہوں نے ضرورت کے مطابق پتھر جمع کر لئے۔ پھر انہوں نے یہ پتھر لاش کے کپڑوں میں بھرنا شروع کر دیئے۔ پہلے جیبیں، پھر جیکٹ اور پتلون کے اندر، یہاں تک کہ لاش پتھروں کی وجہ سے پھولی پھولی سی نظر آنے لگی۔ اس محنت نے دونوں کو پسینہ میں شرابور کر دیا تھا۔
"اب اس سے زیادہ پتھر نہیں سما سکتے۔" ڈیوک نے کہا۔
اب لاش کو تالاب میں پھینکنے کا مرحلہ درپیش تھا۔
"اسے زیادہ سے زیادہ گہرائی میں ڈالنا ہے۔" ڈیوک نے پھر کہا۔
"کتنی گہرائی میں"۔
"کم سے کم پانچ چھ فٹ"۔
دونوں میں سے کوئی بھی تیرنا نہیں جانتا تھا اور دونوں تالاب میں اترنے سے ڈر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر کنارے پر کھڑے ہو کر لاش پانی میں پھینکی تو وہ زیادہ گہرائی میں نہیں جائے گی۔ چنانچہ انہیں مجبوراً تالاب میں اتر کر کچھ دور تک جانا تھا۔ انہوں نے اپنے کپڑے اتار دیئے۔ ٹھنڈی ہوا جسم پر لگی تو سردی سے کانپنے لگے۔ اور پھر جب تالاب کے برفیلے پانی میں گھسے تو دانت بھی بجنے لگے۔ رولو نے لاش کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا رکھا تھا اور ڈیوک اس کے پیر پکڑے ہوئے تھا۔ ان کے پیروں کے نیچے تالاب کی زمین نرم اور مجید پھسلن والی تھی۔ ان کے پیر۔ خاص طور سے لاش کے وزن کی وجہ سے نرم زمین

میں دھنسے جا رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے تھوڑا تھوڑا رک کے آگے بڑھ رہے تھے۔
"کہیں یہ ہم دونوں کو نہ ڈبو دے۔" رولو نے کہا۔
"بس کچھ دور اور"۔ ڈیوک نے تسلی دی۔
وہ تالاب کے کنارے سے دس فٹ سے زیادہ دور نہیں تھے مگر پانی ان کے سینے تک آ گیا تھا۔ لاش پہلے ہی پانی میں ڈوبنے لگی تھی اور پانی نے اس کا وزن بہت کچھ ہلکا کر دیا تھا۔ وزنی پتھر اسے نیچے لئے جا رہے تھے۔ اب ان میں مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے لاش کو چھوڑ دیا اور خوف و سردی سے کانپتے ہوئے تالاب سے باہر آ گئے۔ انہوں نے جسم کو خشک کرنے کی کوشش کی۔ مگر سرد ہوا جسم خشک کرنے سے کہیں زیادہ ان کے خون کو جمائے دے رہی تھی۔ انہیں گیلے جسم پر ہی کپڑے پہننے پڑے، جس کی وجہ سے کپڑے بھی کچھ بھیگ گئے اور ان کی سردی کچھ زیادہ کم نہیں ہوئی۔
لاش کو ٹھکانے لگانے کے علاوہ کچھ دوسری باتیں بھی توجہ طلب تھیں مثلاً قدموں کے نشانات۔ وہ کچھ دیر تک بحث کرتے رہے کہ آیا انہیں مٹا دیا جائے یا یونہی چھوڑ دیا جائے۔
"لعنت ہو"۔ ڈیوک نے آخر کہا۔ "قدموں کے نشانات سے کیا ہوتا ہے ان میں سے کئی تو ہمارے ہوں گے بھی نہیں۔ پھر کسی بھی لمحہ بارش ہو سکتی ہے جو تمام نشانات کو ختم کر دے گی۔"
اس کے بعد بریل کے پرس کا مسئلہ تھا۔ وہ انہیں اسی جگہ پڑا ہوا مل گیا جہاں بریل نے انہیں تعاقب سے باز رکھنے کے لئے پھینکا تھا۔ انہوں نے اسے کھول کر دیکھا، اس میں کار کی چابیاں تھیں جس کی انہیں ضرورت تھی۔ پھر سولہ ڈالر نقد تھے، یہ بھی انہوں نے رکھ لئے۔ باقی چیزیں مثلاً کنگھا، لپ اسٹک، آئی برو پنسل وغیرہ ان کے لئے بیکار تھیں۔ یہ سب چیزیں انہوں نے پرس میں رکھ دیں۔ واپس تالاب کے پاس آئے اور جتنی طاقت سے پھینک سکتے تھے اسے تالاب میں پھینک دیا۔ وہ تقریباً وسط میں جا کر گرا۔ گرتے وقت پرس کھل گیا۔ اور اس کی کچھ چیزیں باہر نکل آئیں۔ کئی تو فوراً ڈوب گئیں مگر ایک آئی برو پنسل جو کہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی، پانی میں تیرتی رہی۔ ڈیوک اور رولو چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر تیزی سے واپس مڑے اور پگڈنڈی پر آ کر کاروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت تقریباً چھ بجنے والے تھے۔ موسم سرما میں پارک بند ہونے کا وقت ٹھیک چھ بجے تھا۔ میٹی کریب ایک مرتبہ پھر پرانی شیورلٹ اور نئی چمکیلی مستونگ کار کے قریب کھڑا انہیں فکرمند نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اسے جنگل میں جا کر ان لوگوں کو باہر لانا پڑے گا۔ چنانچہ جس وقت اس نے پگڈنڈی پر قدموں کی آہٹ سنی تو کچھ مطمئن ہو کر اس طرف گھوما اور جیسا کہ اس نے اندازہ لگایا تھا، اس نے دو آوارہ گرد نوجوان لڑکوں کو جنگل سے باہر آتے دیکھا یہ بالکل اسی طرح کے لڑکے تھے جو اس پرانی شیورلٹ کار کے مالک ہو سکتے تھے بہر حال اس کی نصف الجھن تو دور ہو گئی تھی۔
وہ دونوں بہت جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ خاص طور پر اسے دیکھنے کے

ایک خاتون نے مشہور فلسفی والتیر سے کہا۔
"عشق ایک چور کی مانند ہے جو آدھی رات کو نقب لگاتا ہے۔"
والتیر نے جواب دیا۔ "درست ہے اور بدقسمتی سے جب واپس جاتا ہے تو انسان کے پاس کوئی چیز باقی نہیں بچتی۔"

بعد۔ مگر یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ آوارہ گرد اور جرائم پیشہ افراد ہمیشہ سے پولیس کو دیکھ کر اسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا کرتے تھے لیکن میٹی کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ سرخ قمیص والا شیورلٹ کار کی طرف بڑھا تو نیلی جیکٹ والا نئی مستونگ کی جانب چل دیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف والا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جب نہیں کھلا تو ایک چابی اس کے قفل میں ڈال کر گھمائی۔
میٹی کریب کے ذہن میں کوئی چیز چبھنے لگی۔ اسے اس کی توقع نہیں تھی شیورلٹ کار تو ان کی ہو سکتی تھی مگر مستونگ؟ پھر یہ بات بھی ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی کہ ان جیسے لڑکے دو الگ الگ کاروں میں پارک آئے ہوں گے خاص طور سے یہ نیلی جیکٹ تو اس نئی کار کا مالک ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے دروازے کا قفل کھولنے میں بھی دقت پیش آتی معلوم ہوتی تھی۔
"کہو چہل قدمی سے لطف اٹھایا۔" میٹی نے کہا۔
"کیا"۔ نیلی جیکٹ نے پلٹ کر دیکھا۔
"میں نے پوچھا تھا کہ چہل قدمی میں کچھ لطف آیا یا نہیں"۔
"ہاں۔ کیوں نہیں"۔
وہ کانپ رہا تھا۔ خوفزدہ تھا۔ شاید اس لئے کہ ایک کانسٹبل اس سے سوالات کر رہا تھا یا پھر اس لئے کہ اس کا ضمیر مجرم تھا۔ شاید۔ لیکن کوئی بات تھی ضرور۔ میٹی نے اس ہاتھ کی طرف دیکھا جس میں اس نے چابی پکڑ رکھی تھی ہاتھ سردی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بھیگا ہوا بھی تھا۔ شاید پانی سے۔ تالاب کے پانی سے۔ مگر اس موسم میں اسے تالاب میں ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر ہاتھ ہی نہیں اس کے کپڑے بھی بھیگے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میٹی ہچکچایا۔ اسے فوراً گرفتار کر لو۔ جیسے اس کے دل نے کہا۔ تالاب میں نہانا خلاف قانون تھا اور یہ لڑکا یقیناً تالاب میں نہا کر آ رہا تھا۔
مگر میٹی نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ پھر اس کے علاوہ اچھی خاصی زحمت بھی ہوتی۔ اسے پکڑ کر پولیس اسٹیشن لے جانا پڑتا ضابطہ کی کارروائی کرنی ہوتی۔ اور ممکن تھا کہ یہ سب کچھ آخرکار بے سود ثابت ہوتا لیکن اس کے باوجود میٹی کے دل میں اسے گرفتار کرنے کی خواہش برقرار رہی۔ اس وقت تک لڑکے نے کار کا دروازہ کھول لیا تھا اور ڈرائیونگ وہیل کے سامنے بیٹھ رہا تھا۔ اس کے الٹے ہاتھ نے سیٹ کے نیچے، سیٹ کو آگے پیچھے کرنے کا لیور تلاش کرنے کی کوشش کی اور آخر اسے پا کر سیٹ کو کچھ پیچھے کر لیا۔ تاکہ اسے کار چلانے

کے لئے کچھ زیادہ جگہ مل جائے۔ پھر اس نے کچھ مسکراتے ہوئے میٹی کی طرف دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ میٹی کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ کوئی بات بھی اپنی جگہ درست معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ یہ آوارہ گرد تالاب میں کیا کر رہے تھے؟ اور یہ نیلی جیکٹ والا۔ آخر کیا کام کرتا ہے کہ وہ مستونگ جیسی نئی کار خریدنے کے قابل ہو سکا اور اگر یہ کچھ کام کرتا تھا تو اس وقت اپنے کام پر موجود ہونے کے بجائے یہاں کیا کر رہا ہے اس درمیان میں شیورلیٹ کار اسٹارٹ ہو چکی تھی اور پیچھے ہٹ کر واپس جانے کے لئے گھوم رہی تھی۔ مستونگ کا موٹر بھی جاگ اٹھا۔ شیورلیٹ کار چلنے لگی تھی۔ نہ بہت زیادہ سست نہ بہت زیادہ تیز۔ پھر دوسرے لمحہ مستونگ کار بھی اس کے پیچھے چل دی۔

جلد ہی دونوں کاریں نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور تب پہلی مرتبہ میٹی کو احساس ہوا کہ اس لڑکے نے کار چلانے سے پہلے اپنی سیٹ کو پیچھے کیا تھا آخر اس نے یہ حرکت کیوں کی۔ کیا مستونگ کار اس کی نہیں تھی۔ کیا وہ اس میں بیٹھ کر پارک میں نہیں آیا تھا۔ پھر کون آیا تھا؟ کیا کوئی شخص ابھی تک جنگل میں موجود ہے۔ کوئی ایسا فرد جس کی ٹانگیں اس لڑکے کی طرح لمبی نہیں تھیں، جو سیٹ کو پیچھے ہٹائے بغیر کار چلا سکتا تھا۔ شاید کوئی لڑکی؟

میٹی اپنی کار کی طرف چلا۔ مگر پھر رک گیا۔ کار کی سیٹ کو آگے پیچھے کرنا کسی بات کا حتمی ثبوت نہیں تھا۔ جس طرح اس کے بھیگے ہوئے کپڑے اس کے تالاب میں نہانے کا یقینی ثبوت نہیں تھا۔ لیکن اگر کوئی فرد۔ کوئی لڑکی ۔ وہاں جنگل میں ہوئی تو کیا ہوگا؟ ممکن ہے یہ لڑکے اسے باندھ کر چھوڑ گئے ہوں۔ یا وہ بیہوش ہو۔ یا زخمی ہو۔ ۔ اسے جب تک اس بارے میں اطمینان نہ ہو جائے وہ پارک بند کر کے نہیں جا سکتا تھا۔ میٹی پگڈنڈی پر بھاگنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر وہ رک گیا۔

"یہاں کوئی ہے"۔ اس نے پکارا۔

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ جنگل میں خاموشی طاری تھی۔ وہ اور آگے بڑھا۔ کئی جگہ رک کر اس نے پکارا۔ مگر کسی بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ آگے دوڑتا گیا۔ میٹی جوان نہیں تھا۔ اس طرح کی بھاگ دوڑ اس کے لئے مشکل تھی۔ مگر وہ پھر بھی آگے بڑھتا رہا۔ اچانک اسے تالاب کا خیال آگیا۔ اور ساتھ ہی لڑکوں کے بھیگے ہوئے کپڑے بھی۔ وہ پگڈنڈی سے اتر کر تالاب کے کنارے پہونچ گیا۔ یہاں گیلی مٹی میں قدموں کے بیشمار نشانات بنے ہوئے تھے۔ وہ بدمعاش لڑکے یہاں ضرور آئے تھے۔ اس نے نشانات کو غور سے دیکھا۔ وہ سب تقریباً مردانہ جوتوں کے نشانات تھے۔ یا پھر بڑے بڑے پیروں کے نشانات۔ یقیناً وہ دونوں تالاب میں اترے تھے۔ کیا نہانے کے لئے۔ اس برفیلے موسم میں۔ بڑی عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔

میٹی خود بھی اتنی دور تک بھاگنے سے ہانپنے لگا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ذہن کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ یہاں کسی لڑکی کی موجودگی کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ لیکن پھر اس کار کی سیٹ کو پیچھے ہٹانے کے بارے میں کیا سمجھا جائے۔ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے میٹی نے تالاب کی طرف دیکھا۔ غور سے دیکھنے پر اسے کوئی چیز تیرتی ہوئی نظر آئی۔ میٹی اگرچہ تھک گیا تھا مگر اس کا دل ابھی تک مطمئن نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ پانی میں پھینک دیا اور ادھر ادھر جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد اسے وہ چیز مل گئی۔ یہ ایک درخت کی شاخ تھی۔ تقریباً پندرہ فٹ لمبی۔ اس شاخ کی مدد سے اس نے وہ تیرنے والی چیز نکالنے کی کوشش کی مگر شاخ وہاں تک نہیں پہونچ سکی۔

لیکن میٹی اس چیز کو نکالنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے جوتے اتارے، موزے اتارے، پتلون کے پائنچے چڑھائے اور پانی میں اتر گیا۔ لیکن اسے اس چیز تک پہونچنے کے لئے کمر کمر پانی تک بڑھنا پڑا۔ پھر آخر کار اس نے شاخ کی مدد سے اس چیز کو تالاب سے باہر نکال ہی لیا۔ اور اس وقت اس نے دیکھا کہ وہ ایک آئی برو پنسل تھی (وہ پنسل جس سے خواتین اپنی بھنویں بناتی ہیں، یا انہیں مزید سیاہ کرتی ہیں)

وہ تالاب میں دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ ایک آئی برو پنسل جو کہ تالاب کے درمیان تیر رہی تھی اور تالاب بھی وہ جو جنگل میں الگ تھلگ واقع ہوا تھا یوں تو آج کل لڑکے بھی آئی برو پنسل استعمال کرنے لگے ہیں مگر وہ دونوں لڑکے ایسے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ پنسل کسی لڑکی کی تھی۔ چونکہ وہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی اس لئے پانی میں تیرتی رہی اور پھر لکڑی کی حالت سے ظاہر تھا کہ اسے تالاب میں تیرتے ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں گذری۔

وہ اپنی کار میں واپس آگیا۔ اور کار میں لگے ہوئے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر شیرف کے ڈپٹی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہا تھا وہ ڈپٹی شیرف کو کس طرح اور کن الفاظ میں سمجھاتے۔ بہرحال اس نے اپنی پوری کوشش کی۔ اگرچہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اپنی بات سمجھانے میں ناکام نہ ہو جائے۔

"بہتر ہو گا کہ آپ ایک مستونگ کار کو چیک کریں۔ اس نے مشورہ دیا "اس کا لائسنس نمبر جے او ۱۵۷۸۸ ہے۔ میں یہ معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں کہ وہ کس کی ملکیت ہے۔ اس کے علاوہ ایک پرانی سی سرخ رنگ کی شیورلٹ کار ہے جس کا لائسنس نمبر ڈبلیو وائی ۲۰۳۳۵۴ ہے۔ میں اسکے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس کے نام پر رجسٹر ہے اور اس وقت کہاں ہے۔ پھر ۔۔۔۔"

"میٹی"، ڈپٹی شیرف نے اس کی بات کاٹ دی "آخر یہ تفتیش تم کس جرم کے سلسلے میں کر رہے ہو"۔

"پارک کے تالاب میں تیرنے کے جرم میں"، میٹی کا جواب تھا۔

"تالاب میں تیرنا"، ڈپٹی شیرف کے لہجے سے حیرت صاف نمایاں تھی۔

"سردست اسی جرم کو بنیاد بنا کر ان دونوں آوارہ گرد لڑکوں کو گرفتار کر لو جن کے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ میں تالاب میں غوطہ خور اتار رہا ہوں۔ سو فیصدی یقین ہے کہ اس کے بعد ہم اس سے کہیں زیادہ سنگین جرم ان پر عائد کر سکیں گے"!

انجم نوید

"مِس"

تھامپسن! میں ایک تعارفی نوٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔ پھر تم اسے اس طرح ٹائپ کرنا کہ درمیان میں ترمیم و اصلاح کی گنجائش باقی رہے۔ ہم آج سہ پہر اس پر غور کر کے فائنل کاپی تیار کر لیں گے۔ تو پھر تیار ہو مس تھامپسن! ذرا مجھے سوچنے دو ۔۔۔۔۔۔"

"ہاں، تو مس تھامپسن! ہوشیار ۔۔۔ ادارہ کے پبلشر مایۂ ناز ادیب گریچ ریجر کے زرخیز قلم سے ایک اور شاہکار ناول پیش کرتے ہیں۔ اسے بڑے حروف میں ٹائپ کرنا ۔۔۔ میرا مطلب ہے نام ۔۔۔ ہاں تو گریچ ریجر کے زرخیز قلم سے ایک اور شاہکار ناول پیش کرتے ہیں ۔۔۔ یہ ایک ایسا سنسنی خیز ناول ہے جس کی سنسنی خیز تحریر قابل مصنف کے گزشتہ کامیاب ناولوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

پبلشر بڑے فخر اور احترام کے ساتھ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اسے کاٹ دو۔ احترام نہیں ہونا چاہیئے۔ اگرچہ یہ درست ہے ۔۔۔ لیکن کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔۔۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ۔۔۔ پبلشر بڑے فخر کے ساتھ قابل مصنف کی تازہ ترین کتاب پیش کرتے ہیں جو اس مایۂ ناز مصنف کی ہمہ گیر شہرت ہو کہ بحر اوقیانوس کے اس ساحل سے اُس ساحل تک پھیلی ہوئی ہے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ ذرا ٹھہرو ۔۔۔ میں پہلے ہی مایۂ ناز کا لفظ استعمال کر چکا ہوں۔ مایۂ ناز کے لئے دوسرا لفظ کیا ہے ۔۔۔ ڈکشنری کہاں ہے؟ ذرا اس میں دیکھو ۔۔۔ مایۂ ناز ۔۔۔ مایۂ فخر ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی ۔۔۔ قابلِ فخر ۔۔۔ ہاں یہ چل جائے گا۔ قابلِ فخر مصنف کی ہمہ گیر شہرت وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔۔

ہم آپ کو چیلنج کرتے ہیں کہ آپ یہ ناول آدھی رات کے بعد تنہائی اور تاریکی میں جبکہ لندن گہری دُھند میں گھرا ہوا ہو ۔۔۔ نہیں۔ یہ نہیں چلے گا ۔۔۔ لعنت ہو ۔۔۔ آجکل صفائی ستھرائی کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے اور بغیر دھوئیں کے حرارت پیدا کرنے کے ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ ہم لندن کے باشندے ایک مدت سے قابلِ ذکر دُھند سے محروم ہیں ۔۔۔ ہاں تو آدھی رات کے بعد، تنہائی اور تاریکی میں ۔۔۔ جبکہ ہوا سائیں سائیں کر رہی ہو ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ جبکہ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی صدیوں سے کھڑے ہوئے قبر کے کتبوں کے درمیان سے گزر رہی ہو۔

یہ فقرہ کیسا ہے؟ میرے خیال سے بہتر ہو گا کہ اسے یوں کر لو۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی مدتِ دراز سے ایستادہ، قبر کے کتبوں کے درمیان سے گزر رہی ہو ۔۔۔ حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن یہ ذرا کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

گریچ ریجر ۔۔۔ بڑے حروف میں ۔۔۔ کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ نہیں ۔۔۔ ۱۹۳۵ء میں ہوئی ۔۔۔ نہیں ۱۹۳۹ء میں ہوئی ۔۔۔ یہ بھی نہیں صرف اتنا لکھ دو کہ گریچ ریجر کی پیدائش مانچسٹر میں ہوئی ۔۔۔ اوہ ۔۔۔ خدایا ۔۔۔ میرے نوٹس کہاں ہیں؟ ہاں، مانچسٹر میں ہوئی۔ اس نے لیورپول یونیورسٹی سے ڈگری لی ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اس نے مانچسٹر گرامر اسکول میں تعلیم پائی ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اسے یوں کر دو ۔۔۔ اسکول چھوڑنے کے بعد اس نے لکڑہارے کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ پھر پلمبر بنا۔ وکیل بنا۔ گھوڑوں کے ٹرینر کے طور کام کیا کچھ دن تک دندان سازی کا تجربہ بھی کیا۔ پھر اس کے بعد مچھلیاں پکڑنے والے جہاز کے ساتھ دنیا کے گرد چکر لگایا ۔۔۔ ایک منٹ ٹھہرو ۔۔۔ لعنت ہو ۔۔۔ لندن میں لکڑہارے کہاں ہوتے ہیں ۔۔۔ یا ہوتے ہیں؟ ۔۔۔ یہ تو سب کچھ غلط ہو گیا۔ پھر ہمارے یہاں کیا ہوتا ہے؟ خدا کے لئے کیا کوئی اتنا نہیں کر سکتا کہ کچھ درختوں کو کاٹ کر ڈال دے؟ آخر یہ اتنے بہت سے شاہ بلوط کے درخت کس مصرف کے ہیں؟ کیا کوئی انہیں کاٹ کر شہتیر نہیں بنا سکتا؟ جنگل میں کام کرنے والا کیسا رہے گا؟ نہیں، یہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی جگہ ڈانس ہال میں اُچھل کود کرنے والا تحریر کر دو ۔۔۔ ہمارے یہاں یہ لوگ تو ہوتے ہیں؟ میں نے خود ٹی۔ وی پر دیکھا ہے ۔۔۔ یا وہ امریکن ٹی وی تھا؟ ۔۔۔ ممکن ہے اُنہوں نے برطانوی ٹی۔ وی سے لیا ہو؟ ۔۔۔ یا ہم نے امریکن ٹی وی سے لیا ہو؟ ۔۔۔ ختم کرو ۔۔۔ اس سب کو کاٹ دو۔

ہاں تو ایک مچھلیاں پکڑنے والے جہاز کے ساتھ دنیا کے گرد چکر لگایا۔ تب کچھ ایسے دوستوں نے جو اس کے خطوط پڑھتے رہتے تھے۔ خطوط کی تحریر اور عبارت آرائی سے متاثر ہو کر اس پر زور دیا بلکہ شدید اصرار کیا کہ وہ اپنی تحریری صلاحیتوں کو ناول کے میدان میں استعمال کرے ۔۔۔ اور اس کا جو کچھ نتیجہ برآمد ہوا، وہ ہم سب کے سامنے ہے ۔۔۔ شاہکار، مایۂ ناز ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ ذرا ٹھہرو ۔۔۔ ہاں جگمگاتی تحریریں، مؤثر اندازِ بیاں۔ اور یہ سب کچھ ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے ہے۔

ہم ایک مرتبہ پھر آپ کو سنسنی خیز تحریر ۔۔۔ ہیجان انگیز عبارت ۔۔۔ دہشتناک مناظر ۔۔۔ گریچ ریجر ۔۔۔ بڑے حروف میں ۔۔۔ کے تازہ ترین ناول میں ایک ساتھ پیش کرتے ہیں ۔۔۔ میرے خیال سے یہ بس کافی ہے؟ کیا خیال ہے مس تھامپسن؟ مگر ہاں، ذرا مایۂ ناز ۔۔۔ اور شاہکار جیسے الفاظ کے دوسرے مترادف الفاظ ڈکشنری میں ضرور تلاش کرنا ۔۔۔ کرو گی نا ۔۔۔؟"

"بہت اچھا مسٹر ریجر ۔۔۔!" اسٹینو گرافر مس تھامپسن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

ہیرو کا بیٹا

ایم۔ اے۔ راحت

انسان کی ترقی اور تنزلی کے حیرت افروز واقعات

نیویارک ایرپورٹ سے پرواز کرنے والا طیارہ طوفان میں گھر گیا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو نوجوان پائلٹ راڈرک نے ایک خوفناک سفر کے بعد اسے برف پر اُتار لیا۔ طیارہ برف کے ایک پہاڑ میں داخل ہو گیا تھا اور بہت سے مسافر دہشت سے مر گئے۔ نوجوان راڈرک نے باقی بچے ہوئے لوگوں کے ساتھ ایک سُرنگ کھودی اور اس کے ذریعے باہر نکل کر بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کیا لیکن ناکام رہا۔ پروفیسر خاور نے نوجوانوں کو تیار کر لیا کہ وہ برف کھود کر جہاز کا ڈھانچہ نکال لیں تاکہ اس میں بیٹھ کر ڈھلان کے دوسری طرف موجود دنیا میں جا سکیں۔ ڈھانچہ نکالنے کے بعد سب لوگ اس میں بیٹھے اور ڈھلان کا سفر شروع کر دیا۔ اور پھر جب بوڑھے خاور کو ہوش آیا تو جہاز پھر تباہ ہو چکا تھا اور زندہ بچنے والوں میں وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں فرزانہ اور فروزاں تھیں۔ پروفیسر نے وہاں ایک غار دیکھا جس میں زندگی کے وجود کا پتہ چلتا تھا۔ جب وہ غار میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک عظیم الشان لیبارٹری موجود تھی۔ وہاں ایک تابوت رکھا ہوا تھا جس میں ایک نوجوان کا جسم رکھا ہوا تھا۔ پروفیسر کی تھوڑی سی کوشش سے یہ نوجوان جاگ اُٹھا۔ نوجوان نے بتایا کہ اس کا کوئی نام نہیں ہے اور اس کی عمر نامعلوم ہے۔ وہ ہر دَور میں زندہ رہا ہے۔ اُس نے تہذیب کا ارتقاء دیکھا ہے۔ پھر اس نے اپنی کہانی شروع کی۔ کہانی کی ابتدا پتھر کے دَور سے ہوتی ہے جب نوجوان کو ایک لڑکی مل گئی تھی پھر اُسے دوسری لڑکی ملی جس نے پہلی لڑکی کو ہلاک کر دیا۔ اس لڑکی نے اُسے توسا کے نام سے پکارا۔ لڑکی نے اپنا نام للکا بتایا تھا۔ ایک دن زلزلہ آیا تو للکا زلزلے کی نذر ہو گئی اور نوجوان نے اپنے آپ کو ایک وادی میں پایا جہاں اس جیسے بہت سے لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ حالات نے اسے اس علاقے کا سردار بنا دیا۔ وہاں اس نے ایک طویل زندگی گزاری اور پھر ایک دن اُکتا کر وہ اس علاقے سے نکل آیا۔ سمندر کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا وہ درختوں کی بستی میں جا نکلا جو تہذیب کی طرف گامزن تھی لیکن رقابت کا دَور شروع ہو گیا تھا اور میدانوں میں رہنے والے گوبے ان درختوں والوں کی تاک میں تھے۔ ایک دن انہوں نے حملہ کر کے درختوں والوں کو تباہ کر دیا لیکن نوجوان کو انہوں نے بحیثیت دوست قبول کر لیا۔ وہیں اس کی ملاقات بوڑھے ارساس سے ہوئی اور ارساس نے جو سردار آکے کا باپ تھا اُسے بڑی عزت بخشی۔ وہ اسے ان غاروں میں لے گیا جہاں وہ لوہا دریافت کرنے کے بعد اس کے ہتھیار تیار کر رہا تھا۔ اس کی بیٹی سامی اس کی مددگار تھی۔ بوڑھے نے اسے تہذیب سکھائی۔ لیکن جب سامی کے ساتھ اس کے جذباتی تعلقات قائم ہو گئے تو بوڑھا اس کا دشمن بن گیا۔ اس نے اسے اور سامی کو گرفتار کر کے آگ میں جھونک دیا۔ سامی جل کر راکھ ہو گئی لیکن وہ زندہ رہا۔ بستی والے یہ دیکھ کر فرار ہو گئے۔ پھر اُس نے سمندری سفر شروع کیا اور ایک لہر نے اُسے ایک سفید زمین پر لا پھینکا۔ وہ یہاں سو گیا۔ جب نیند سے جاگا تو دنیا کئی قدم آگے بڑھ چکی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات آرسانہ کی ملکہ سے ہوئی۔ ملکہ نے اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دیا اور اسے لیکر آرسانہ آگئی۔ شہنشاہ کو ان کے تعلقات کا علم ہوا تو اُس نے نوجوان کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیا۔ نوجوان نے شیروں کو ٹھکانے لگا دیا تو سب خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ وہیں اس کے تعلقات شہنشاہ کی لڑکی بائیسہ سے استوار ہو گئے۔ شہنشاہ نے سازش کر کے اسے اور بائیسہ کو پتنگ میں باندھ کر آتش فشاں کے دہانے میں اتار دیا۔ بائیسہ جل کر راکھ ہو گئی لیکن نوجوان کو آگ نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ انتقام کے طور پر وہ شہنشاہ کی دوسری لڑکی آکاشا کو لیکر فرار ہو گیا۔ پھر آکاشا بوڑھی ہو کر مر گئی تو وہ ایک بستی میں پہنچا۔ وہاں ظالم طاآس حکمران تھا۔ بعض حیرت انگیز واقعات کے بعد طاآس اُس کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا اور اس کی تمام بیویاں نوجوان کے حصے میں آگئیں۔ وہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر وہ ایک جزیرے میں جا نکلا جہاں لاکھوں سیاہ فام آگ سے دیوتا کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے دیوتا کہہ کر پکارا اور اسے بوڑھے آشوشا کے پاس لے گئے جو ایک پُراسرار انسان اور غیر معمولی قوتوں کا مالک تھا۔ بوڑھا عظیم سائنسدان تھا جس نے جڑی بوٹیوں سے طویل عمری کا راز پا لیا تھا لیکن وہ جوان ہونا چاہتا تھا۔ جوان ہونے کے شوق میں جب اس نے آگ کا غسل کیا تو مارا گیا۔ آشوشا کی موت سے بددل ہو کر وہ بستی سے اس غار میں آگیا اور وہ نظام قائم کیا جو پروفیسر خاور اور اس کی لڑکیوں نے دیکھا تھا۔ اپنے انتظامات کر کے وہ اس وقت تک کے لئے سو گیا جب دنیا تہذیب کے دَور میں داخل ہو گی۔ جب وہ جاگا تو تہذیب کا دَور شروع ہو چکا تھا۔ وہ تہذیب کے گہوارے مصر میں داخل ہو گیا۔ وہاں بعض عجیب و غریب اور حیرتناک واقعات سے گزر کر اس کی ملاقات غلاموں کے سوداگر سی سارا سے ہوئی۔ سی سارا کے جہاز پر موجود غلاموں سے اسے ہمدردی تھی اور وہ ان کی آزادی کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ جہاز پر موجود نوجوان کے دشمن سیاہ فام کیشے نے ایک قیدی کو اس کے قتل پر تیار کر لیا لیکن جو ہونا تھا وہی ہوا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ نوجوان نے کیشے کو طلب کر لیا لیکن اُس نے وہاں بھی چالاکی سے کام لیکر بات بدل دی اور موقع پا کر لوگاس پر خنجر کھینچ لیا۔ نوجوان نے اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے کیشے کو کامیاب نہ ہونے دیا اور اپنے قول کے مطابق اسے سزا دی۔ بعد میں یوجنا کے جہازوں سے مقابلے میں سی سارا مارا گیا اور یوجنا والے بھی مارے گئے تو قیدیوں کو آزادی مل گئی۔ انہوں نے مجھے اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ قیدیوں میں موجود عورتوں کو آپس میں بانٹ لیا گیا پھر بھی کچھ عورتیں بچ گئیں تو میں نے اپنے آپ کو ان کے لئے وقف کر دیا۔ اب ہر عورت مجھ سے فیضیاب ہو سکتی تھی۔ انہی عورتوں میں لوگاس کی بہن ابانیہ بھی تھی۔ آخرکار ہمارا جہاز ایک سرسبز زمین پر پہنچا۔ وہاں جانوروں کا وجود نہیں تھا جس کی وجہ ایک پُراسرار وجود تھا۔ ہم نے اس زمین کو اپنا لیا۔ لوگاس اور دوسرے لوگوں نے یہ بات مان لی۔ لباس نہ ہونے کی وجہ سے برہنگی اپنانی پڑی تھی۔ وہاں رہتے ہوئے ہمیں خاصا عرصہ گزر گیا تھا۔ عورتیں بچے جن رہی تھیں لوگ کھیتی باڑی میں لگے تھے کہ ایک رات جب ابانیہ میری آغوش میں تھی ہم لوگوں نے عجیب آوازیں سُنیں ہم دونوں چونک پڑے۔ یہ ڈھولوں کی آوازیں تھیں۔ ابانیہ کو لیکر میں ان آوازوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کافی دُور چلنے کے بعد ایک وادی میں وحشی انسانوں کو دیکھا۔ وہ لوگ ڈھول بجا رہے تھے اور کسی دیوتا کو پانچ انسانوں کی بھینٹ دینے آئے تھے۔ ان وحشی لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے ان پانچوں کو کھولا۔ ان لوگوں نے دیوتا نیمون کی کہانی سنائی۔ میں ان لوگوں کو لیکر بستی میں آیا اور انہیں اپنے لوگوں میں شامل کر لیا۔ انہوں نے پہاڑوں کی ملکہ شیمونا اور ہیگوں کی کہانی سُنائی جو میرے لئے دلچسپ تھی۔ میں ہافو اور اس کی عورت پوشیانہ کو لیکر نیمون کے غار کی طرف چل پڑا۔ نیمون کے غار کا معائنہ کرنے سے پتہ چلا کہ اس کے قدموں کے نشانات ایک بستی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ سو میں نے کہا کہ ہم بستی والوں کی مدد کریں گے۔ ہم دوسری بستی کی طرف چل پڑے۔ اور وہی ہوا... جس کا اندیشہ تھا۔ خونخوار نیمون بستی کے بے شمار لوگوں کو ہلاک کر کے پہاڑوں کی طرف نکل گیا تھا۔ میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو سوگوار لوگوں کے درمیان چھوڑا اور خود نیمون کی تلاش میں نکل گیا لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ یہاں جب میں واپس آیا تو انکشاف ہوا کہ شیمونا کے سپاہی ہافو کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں، البتہ دونوں عورتیں محفوظ تھیں۔ میں نے بستی والوں کو اپنی طاقت سے مرعوب کر کے ان کے گھوڑے حاصل کئے اور رسان بارے کا راستہ معلوم کر کے چل پڑا لیکن راستے میں رقابت کی ماری پوشیانہ نے ابانیہ کو قتل کر دیا۔ وہ میرا قرب چاہتی تھی۔ تب میں نے طیش میں آکر دونوں گھوڑوں کو ہلاک کر دیا اور پوشیانہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اور بالآخر ناقابل عبور راستوں کو عبور کر کے میں رسان بارے میں داخل ہو گیا جہاں ہیگوں کا راج تھا۔ کالوس اعظم ان کا سردار تھا۔ مجھے گرفتار کر کے قیدخانے میں ڈال دیا گیا۔ ہیگے مجھے دیوتا تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

رام داس اچھوت کے بارے میں، میں نے کہا کہ وہ دراصل برہمن ہے اور اس کا ثبوت میں نے دیا تھا کون اس کی تردید کر سکتا تھا چنانچہ شکنتلا کے باپ لکشمی کانت کو بُلا کر میں نے اسے حکم دیا کہ شکنتلا کی شادی رام داس کے ساتھ کر دی جائے۔ چند دھمکیوں اور راگ کے شعبدوں نے کام بنا دیا اور لکشمی کانت کو اپنی آدھی دولت بھی رام داس کو دینی پڑی۔ پھر میں وہاں سے چل پڑا۔ میرا رخ درشن پور کی طرف تھا اور درشن پور کے پہلے مندر کے پاس میں نے لچھی کی جان بچائی جسے ستی کیا جا رہا تھا۔ یہ جے راج کی بستی تھی، بہرحال دھرم کے دیوانے لڑکی کو میرے پاس چھوڑ گئے اور ایک جادوگر کو لے کر آئے جس نے بہت سے جادو مجھ پر آزمائے لیکن وہ میرے ہاتھوں مارا گیا اور میں لچھی کو یہاں سے لیکر ہردے مان چل پڑا جو راجہ امی چند کی بستی تھی۔ راستے میں ہم دونوں ایک دھرم شالہ میں ٹھہرے لیکن دوسری صبح دھرم شالہ کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ بہت سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

آنے والا جے راج تھا جو اپنی فوج کے ساتھ آیا تھا اور لچھی کو طلب کر رہا تھا۔ بہرحال جنگ کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ جے راج میرے ہاتھوں مارا گیا اور پھر ہم وہاں سے ہردے مان چل پڑے، جہاں بلدیوا مندر کے گرد یاتری جمع تھے جو طرح طرح کے کرتب دکھاتے تھے۔ بڑے بڑے سادھو موجود تھے لیکن آگ کا کھیل کسی کو نہ آتا تھا اور جب میں نے یہ کھیل پیش کیا تو مجھے مہان مان لیا گیا اور بلدیوا مندر کا پجاری مجھے اندر لے گیا۔

منورما اپنی شکتی سے لچھی کو پتھر کا بنا چکی تھی۔ میرے غم و غصے کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جواباً منورما نے مجھے جس شکتی سے ڈرایا میں نے اس ولیشو کو ختم کر دیا۔ وہ جس طرح مجھے مارنے کی دھمکی دے رہا تھا، میں نے اسے اسی طرح مارا۔ جب میں منورما کے کالے علم کے سامنے بے بس ہو گیا تب میں نے منورما سے کہا کہ اگر وہ لچھی کو اس کی اصلی شکل دے دے تب میں اسے اپنا قرب دے دوں گا لیکن وہ نہ مانی۔ اس نے مجھے قید کر لیا۔ قید کے دوران میں نے ایک کھوپڑی دیکھی جو دیوار سے نصب تھی۔ بعد میں، میں نے دوسروں کی مدد سے سریندر کی کھوپڑی کو اس کے جسم سے ملا دیا۔ تب ہم دونوں باہر نکل آئے۔ تب میں نے اپنے پرانے دوستوں کو یاد کیا، وہ دوست جو ہر ماحول میں، ہر دور میں میرے رہے تھے۔ میں نے ان ستاروں سے دوبارہ دوستی کر لی اور تب ہم دروازے کی تلاش میں چل پڑے جس کے بارے میں منورما نے بتایا تھا۔

جادو نگری کی ملکہ منورما، بالآخر میرے جال میں پھنس گئی اور اپنے دوست ستاروں کی مدد سے میں نے اسے اس کی کہانی سُنائی اور وہ حیران رہ گئی۔ پھر اس نے اپنے رازداں کو ختم کرنے کے لیے آگ کا سہارا لیا اور خود آگ کا شکار بن گئی لیکن حیرت انگیز علم کی مالک عورت سیاہ مجسّمے کی شکل میں نکل بھاگی اور اس کا طلسم ختم ہو گیا۔ تب میں واپس بلدیوا پہنچ گیا۔ وہاں سریندر موجود تھا۔ ہم نے سفر کیا اور ٹھاکر نامی ایک ڈاکو کے جال میں پھنس گئے لیکن میں بھلا اسے کیا خاطر میں لاتا۔

بالآخر میں نے ٹھاکر کا غرور توڑ دیا اور پھر سریندر کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔ اس کے بعد ہم سیدھے سادے لوگوں کی ایک بستی میں پہنچے، جنھوں نے ہماری خوب خاطر مدارات کی اور لاکھی نام کی ایک لڑکی کو مجھ سے محبت ہو گئی لیکن جس رات لاکھی میری آغوش کی زینت بننے آئی، اسی وقت کسی چڑیل نے اس کی گردن دبا دی اور سریندر کے خیال میں وہ چڑیل منورما تھی۔ سریندر اس واقعے سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ راتوں رات مجھے چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ بہرحال مجھے کسی کی کیا پروا ہو سکتی تھی، میں وہاں سے چلا آیا۔ پھر مجھے پربھو دیال نامی ایک شخص ملا جو دولت نگر کے دولت رام کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چالاکی سے اس کی شادی کرا دی تھی۔ اسی بستی والوں کی ایک روایت نے مجھے دھن راج سبھا کی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک عظیم خزانہ جو بُتوں کے ساتھ ایک غار میں پوشیدہ تھا لیکن وہیں مجھے پتھر کی وِدّیا ملی جسے میرے بوسوں نے زندگی بخش دی۔ وہ لالچی دھن راج کی بیٹی تھی اور یوں یہ انوکھی عورت مجھے مل گئی۔

دھن راج کی بیٹی مجھ سے بہت زیادہ محبت کرنے لگی تھی۔ میں نے اسے جادوگرنی منورما کے بارے میں بتایا اور خواہش ظاہر کی کہ میں جادو سیکھنا چاہتا ہوں۔ وِدّیا نے مجھے مہاراج ستیانند کے بارے میں بتایا جو جادو ٹونے کا ماہر تھا۔ ستیانند ایک رنگا سیار نکلا اور وِدّیا دراصل منورما ـــ اس نے چالاکی سے چار معصوم لڑکیوں کو ستیانند کی بھینٹ چڑھا دیا، صرف اس لئے کہ مجھے قابو میں رکھنے کا گُر سیکھ لے۔ تب مجھے ایک اور سادھو ملا جس کا نام کرنامی تھا۔

اور سادھو کرنامی کی مدد سے میں نے ستیانند کو ہلاک اور منورما کو ایک بار پھر سے چڑیل بنا دیا۔ وہاں سے چلا تو ایک ایسی بستی میں پہنچا جہاں سوئمبر ہو رہا تھا۔ ترکھانی کے راجہ کی بیٹی کا سوئمبر جس میں حیرت انگیز طور پر میں بھی شریک ہو گیا تھا۔

اب آپ آگے ملاحظہ فرمایئے

روپ کمار

تھوڑی ہی دیر میں مجھ سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ سوئمبر کے بارے میں اس نے جو کچھ بتایا تھا، میرے لیے خاصی دلچسپ حیثیت رکھتا تھا۔ یہ لوگ مجھے بھی کہیں کا راجکمار ہی سمجھتے تھے اور بہرحال یہ بات تو خود بھی سوچی جا سکتی تھی کہ سوئمبر میں شرکت کرنے والوں کے لیے خود راجہ نے یہ بندوبست کیا ہو گا۔ اس سے قبل میں نے ہندوؤں کی اس رسم کے بارے میں کچھ نہیں سُنا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ رسم کیسی ہوتی ہے۔ تب میں نے روپ کمار سے پوچھا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا روپ کمار کہ پتی کا انتخاب کرنے کے لیے صرف لڑکی کی رائے کافی ہوتی ہے؟"

"ہاں مہاراج! یہی بات ہے لیکن سوئمبر میں شریک ہونے والوں کو پہلے پرکھ لیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہیں بھی کہ نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ مہاراج کہ آج تک جتنے راجکمار آ گئے، کل صبح سے ان میں سپہ گری کے مقابلے ہوں گے اور ان کو حیثیت دے دی جائے گی۔ جو بالکل ہی بے حیثیت ثابت ہو گا، اسے سوئمبر میں شریک ہی نہیں کیا جائیگا۔"

"بے حیثیت سے تمھاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے مہاراج، اس مقابلے میں جو بالکل ہی نکمے ثابت ہوں گے، انھیں سوئمبر میں شریک ہی نہیں کیا جائے گا۔"

"اوہ۔ تمھاری مراد مقابلوں میں ہار جانے والوں سے ہے؟"

"ہاں!" روپ کمار نے جواب دیا۔

"ابھی تک ان میں مقابلے نہیں ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مہاراج! آج تک آنے والوں کا آخری دن تھا۔ کل آنے والوں کو سویکار نہیں کیا جائے گا اور کل کا دن صرف مقابلوں کے لیے ہے۔"

"تم بھی مقابلے میں حصہ لو گے؟" میں نے پوچھا۔

"لڑنا تو پڑے گا مہاراج ـــ مگر مجھے لڑائی بھڑائی سے کبھی شوق نہیں رہا۔ سیدھی سی بات ہے یہاں بھیجنا پتاجی کا شوق تھا، یہاں سے ناکام واپس جانا میرا اپنا کام ہو گا۔"

"اوہو۔ تم کامیاب نہیں ہونا چاہتے؟" میں نے پوچھا۔

"چاہوں بھی تو کیا ہو گا مہاراج۔ اب تم خود ہی دیکھ لو، اگر میرا مقابلہ تم سے ہو جائے تو مجھ میں اور تم میں کتنا فرق ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ اتنے سارے جو یہاں آئے ہیں، سب کے سب پاگل نہ ہوں گے۔ لڑائی بھڑائی سے ضرور واقف ہوں گے جبکہ مجھے تلوار ہاتھ میں پکڑنا بھی بُری لگتی ہے۔"

"لیکن روپ کمار، تمھاری ناکامی سے تمھارے پتاجی کو تو بڑا دُکھ ہو گا؟"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دُکھ تو ہونا ہی ہے۔"

"کیوں؟"

"ارے میں چاہوں بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا نا۔" روپ کمار نے کہا۔

"آخر کیوں؟"

"مجھے لڑنا ہی نہیں آتا اور یہ بات پتاجی کو بھی معلوم تھی انھیں سوچ لینا چاہیے تھا کہ ان کا سپوت یوں بھی سوئمبر جیت کر نہ آئے گا، اس نے آج تک کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہے۔" روپ کمار نے اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ بڑا دلچسپ نوجوان تھا۔ اچھی گفتگو کرتا تھا۔ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"بہرحال تم اچھے انسان ہو روپ! دوست بنانے کے قابل تھے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"سچ کہتے ہو سروپ جی؟" روپ کمار نے غور سے میری شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں، تمھیں اس میں کوئی جھوٹ محسوس ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے سروپ جی!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"اگر تم من سے میرے میت بن گئے ہو تو میری بات سُنو۔ میں تو سوئمبر میں جیت ہی نہیں سکتا۔ یہاں میں نے جیسے جیسے لوگوں کو دیکھا ہے انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تم بھی نہ جیت سکو گے۔ ہمیں چاہیے کہ اول وقت میں ایک آدھ سے لڑ بھڑ کر یہاں سے نکل چلیں۔ تمھاری کوئی راجدھانی تو ہے نہیں کہ واپس وہاں جاؤ۔ سادھو قسم کے آدمی ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ دونوں تلنگانہ چلتے ہیں۔ وہاں رہیں گے عیش کریں گے۔"

"ارے ارے، تم تو بہت ہی چالاک آدمی ہو۔ اگر ایسے ہی چلنے کا ارادہ ہے تو پھر لڑنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ راتوں رات یہاں سے نکل چلتے ہیں، ہمیں پوچھنے والا کون ہے؟"

"ہے نا یار۔" روپ کمار نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کون ہے؟"

"اف اوہ۔ تم نہیں جانتے بھائی، پتاجی مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک ہرکارہ میرے ساتھ کر دیا ہے۔" روپ کمار نے جواب دیا۔

"اچھا۔ تو تمھارے خیمے میں تمھارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ہاں۔ بوڑھا سکھ داس۔ وہ یہاں میرے اس کی حیثیت سے آیا ہے لیکن اصل میں وہ میرا نگران ہے اور جب تک لڑوں بھڑوں گا نہیں بھائی، میری جان کہاں چھوٹے گی ورنہ جا کر کہہ دے گا ہتھیارا کہ مہاراج تو ان میں جانے سے پہلے ہی بھاگ آئے۔" روپ کمار نے کہا۔

"اوہ، کہاں ہے اس وقت وہ؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بس یونہی تماشہ دیکھنے چلا گیا ہے کہیں۔ آ دھمکے گا تھوڑی دیر کے بعد۔"

اب میں سمجھا کہ ان دونوں خادموں نے مجھ سے میرے کسی خادم کے بارے میں کیوں پوچھا تھا۔ گویا یہاں لوگوں کے ساتھ ان کے ملازم بھی آئے تھے بہرحال روپ کمار کی بات میں نے سُن لی تھی اور اب میں اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ روپ کمار کی یہ تجویز مجھے پسند نہیں تھی کہ سوئمبر میں حصہ نہ لیا جائے۔ رہی لڑنے بھڑنے کی بات تو بہرحال میں اس سے بھی باز نہیں رہ سکتا تھا۔

اور یہ تو مجھے یقین ہی تھا پروفیسر کہ جیت میری ہی ہو گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں خود بھی راجکماری پدمنی کا شوہر نہیں بننا چاہتا تھا، ویسے بھی شوہر بننے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ میں ان کے دھرم سے تعلق رکھتا تھا لیکن لڑائی تو میرا دلچسپ مشغلہ تھا اور میں اس سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد روپ کمار کا خادم واپس آ گیا۔ روپ کمار نے اسے خیمے میں جانے کے لیے کہا اور بولا۔

"تو پھر آپ نے کیا سوچا مہاراج؟"

"کس بارے میں روپ کمار؟"

"میری تجویز ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں یار۔ تھوڑی بہت تو دلچسپی ضرور لیں گے۔ دیکھیں گے تو سہی کہ تمھاری پدمنی کسے پسند کرتی ہے۔"

"جیسی تمھاری مرضی، مگر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ خود راجکماری پدمنی کیسی ہیں۔"

"اوہو۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "تو کیا تم لوگوں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے؟"

"نہیں سروپ جی! وہ ابھی تک کسی کے سامنے نہیں آئی۔"

"کمال ہے یار ـــ لیکن اس کے اتنے سارے عاشق جمع کیسے ہو گئے؟"

"یہ اس کے پریمی نہیں ہیں مہاراج۔ ان کا تعلق تو پریمی راجدھانی سے ہے۔ پدمنی کے پتی بننے کے بعد انھیں راج گدی جو مل جائے گی۔" روپ کمار نے کہا۔

"ہونہہ، تو یہ معاملہ ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن ایک بات تو بتاؤ روپ کمار، اگر پدمنی واقعی خوبصورت ہے تو کیا پھر بھی تم اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرو گے؟"

"خوبصورت لڑکیاں کسے پسند نہیں ہوتیں مہاراج لیکن اگر ان کے لیے جیون کی بازی بھی لگانی پڑے تب وہ واقعی خطرناک ہوتی ہیں۔" روپ کمار نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ "تو گویا تم بیوی کا حصول بھی اسی آسانی سے چاہتے ہو؟"

"ارے سروپ جی۔ اس جیون میں کیا رکھا ہے۔ تھوڑی سی سانسیں لیکر آئے ہیں۔ جس وقت سانسوں کے تار ختم ہو جائیں گے تو واپس آکاش پر چلے جائیں گے۔ ان چند سانسوں کے لیے مٹی پر ہنگامے کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔" روپ کمار نے جواب دیا۔

"واہ! انوکھی سوچ ہے تمھاری۔ تمھیں تو فنکار ہونا چاہیے تھا۔"

"جو کچھ ہونا چاہیے تھا، وہ ہوں مہاراج۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ پتاجی کی نگاہوں میں کچھ نہیں ہوں۔"

”میری مانو تو روپ کمار چلو ایک نگاہ اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”کسے سروپ جی؟“ روپ کمار حیرت سے بولا۔

”راجکماری پدمنی کو۔“

”ارے رام رام رام۔ کیسے دیکھیں گے اسے؟ اور کہاں دیکھیں گے؟“

”ارے وہ کہیں نہ کہیں تو رہتی ہوگی۔“

”راج محل میں رہتی ہے۔“ روپ کمار نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر — اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”راج محل میں جانا آسان تو نہ ہوگا؟“ روپ کمار دانت نکال کر بولا۔

”ہاں۔ تم تو یہاں بھی آسانیاں تلاش کرتے پھروگے۔ بہرحال ہم راج محل ضرور جائیں گے۔ ضرور جائیں گے روپ کمار جی!“

”ارے ارے کیسی باتیں کرتے ہو سروپ جی؟“ روپ کمار ہنستے ہوئے بولا اور میں نے اس کی پیٹھ پر دھول جمائی۔

”میرا تو ہردے کانپنے لگا ہے۔“ روپ کمار لرزتے ہوئے بولا اور مجھے ہنسی آگئی۔

ذرا سی دیر میں اس نوجوان سے کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ دلچسپ تھا، ہنستا ہنساتا تھا اور ایسے لوگ کبھی ذہن پر بار نہیں بنتے۔ بہرحال میں نے اسے تیار کرلیا کہ وہ میرے ساتھ راج محل جائے گا۔

”پر میں اس بوڑھے کا کیا کروں گا؟“ روپ کمار نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”کس بوڑھے کا؟“

”ارے وہی میرے باپ کا داس۔“ روپ کمار جلے کٹے لہجے میں بولا۔

”کیوں؟ کیا وہ تم پر آنے جانے کی نگاہ بھی رکھے گا؟“

”رکھے گا کیا، رکھ رہا ہے۔“ روپ کمار جلے کٹے لہجے میں بولا۔

”لیکن آخر کیوں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”سروپ بھیّا! اصل بات یہ ہے کہ میرے پتاجی کا خیال ہے کہ میں کبھی کوئی کام کی بات نہیں کرسکتا۔ انھیں خطرہ ہے کہ میں راتوں رات یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ یا کوئی اور ایسی حرکت کروں گا کہ سوئمبر میں حصّہ لینے میں ناکام رہوں۔ بس اسی لیے انھوں نے بوڑھے داس کو میرے بارے میں سب کچھ سمجھا دیا ہے اور یہ نوکر ایسی نگرانی کرتے ہیں کہ اچھی خاصی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔“ روپ نے کہا۔

”اوہو۔ پھر تو کچھ سوچنا پڑے گا۔“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

”سوچو — سوچو — سوچ لو۔“ روپ کمار گردن ہلاکر بولا۔

”تم ایسا کرو روپ کمار، تم اس سے ایسا کہہ دو کہ رات کو تم میرے خیمے میں رہو گے۔“

”وہ پوچھے گا کیوں؟“

”کہہ دینا میں تمھارا متر ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے کچھ نہ کچھ تو کہہ ہی دوں گا۔“

”بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ آج ہی تمھیں متر بنایا اور آج ہی تم سولی پر لیے جارہے ہو۔“ روپ کمار بے چارگی سے بولا اور میں ہنسنے لگا۔

میں جانتا تھا کہ وہ دل سے میرے ساتھ چلنے کو تیار ہے لیکن اپنے مسخرے پن کی وجہ سے فضول باتیں کررہا ہے۔ ہم رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ رات کا کھانا آگیا تھا۔ خاصا اچھا تھا۔ میں نے اور روپ کمار نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ پھر ہم چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔ روپ کمار اور میں قلعے کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں مجھے خیال آیا اور میں نے روپ کمار سے پوچھا۔

”ایک بات تو بتاؤ روپ کمار!“

”پوچھو بھگونت!“ روپ کمار گہری سانس لے کر بولا۔

”قلعے میں داخل ہونے کے لیے کیا کروگے؟“

”کیوں؟“ اس نے میری شکل دیکھی۔

”قلعے میں داخل ہونے پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا جاتا؟“

”نہیں — خیر — اب اتنے بُرے تو نہیں ہیں۔ مہمانوں پر پابندیاں نہیں لگائی ہیں انھوں نے۔“

”گویا ہم آسانی سے قلعے میں داخل ہوسکتے ہیں؟“

”ہاں — عام حالات میں شاید قلعے کا بڑا دروازہ بند رہتا ہو لیکن اب چھوٹا دروازہ دن رات کھُلا رہتا ہے۔ مہمانوں کو کسی بھی سمے آنے جانے کی اجازت ہے۔“

”بس پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

ہم لوگوں کو قلعے کے دروازے تک پہنچنے کے لیے سارے خیموں کے آگے سے گزرنا پڑا تھا۔ چونکہ رات زیادہ ہوگئی تھی اس لیے دوسرے لوگ اپنے اپنے خیموں میں داخل ہوچکے تھے۔ راستے میں ہمیں کوئی نہ ملا اور ہم قلعے کے دروازے تک پہنچ گئے۔

مسلح سنتری دروازے پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنے نیزے مختلف سمتوں میں جھکا دیے، گویا ہمیں اندر جانے کی اجازت تھی اور ہم چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔

میں نے اس کشادہ قلعے کو اندر سے دیکھا۔ رات کی تاریکی میں وہ سنسان پڑا تھا۔ صرف پہرہ دینے والے سنتری جاگ رہے تھے، سڑکوں اور گلیوں میں گشت کررہے تھے۔ ہمیں کسی نے نہ روکا اور ہم گلیوں میں سے آگے بڑھتے رہے۔ پورا شہر آباد تھا۔ طرزِ تعمیر بھی خوبصورت تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔

”تمھیں اندازہ ہے روپ کمار کہ راج محل کس طرف ہوگا؟“

”اوہو۔ میں دن میں یہاں کی سیر کرچکا ہوں سروپ جی!“

”تو گویا تمھیں معلوم ہے کہ راج محل کس طرف ہے؟“

”ہاں — ہاں — کیوں نہیں۔“

”تب پھر ادھر ہی چلو۔“ میں نے کہا۔

”ہم ادھر ہی چل رہے ہیں مہاراج!“

تھوڑی دیر کے بعد ہم راج محل کے نزدیک پہنچ گئے۔ راج محل پر بھی مسلح سنتریوں کا پہرہ تھا۔ بھاری بھاری قدموں سے چل رہے تھے۔ میں نے راج محل کے چاروں طرف چکر لگایا اور پھر ایک جگہ منتخب کرلی۔

”میرا خیال ہے یہاں سے ہم اندر داخل ہوسکتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”میرے تو ہاتھ پیر ٹھنڈے ہورہے ہیں مہاراج!“ روپ کمار لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”اوہ، روپ کمار بزدلی کی باتیں مت کرو۔“ میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

”مگر دیوار اتنی اونچی ہے ہم اندر داخل کیسے ہوسکیں گے؟“

”میں اوپر چڑھ جاتا ہوں! اس کے بعد تم میرا ہاتھ پکڑ لینا۔ میرا خیال ہے مشکل نہ ہوگا۔“

”تم کیسے اوپر چڑھوگے مہاراج؟“ روپ کمار نے پوچھا۔

”ایسے۔“ میں اچانک اپنی جگہ سے اچھلا اور دیوار پر جا کھڑا ہوا — روپ کمار حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے دیوار پر بیٹھ کر دونوں طرف پیر لٹکا دیے اور پھر ایک سمت جھک گیا۔ روپ کمار کو میرا ہاتھ پکڑنے کے لیے کسی قدر اچھلنا پڑا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں نے روپ کمار کو اوپر کھینچ لیا تھا اور پھر ہم دیوار کے دوسری طرف کود گئے۔

”رادھے شیام۔ رادھے کرشن۔ ہے بھگوان۔ یہاں تو جو درگت بنے گی سو بنے گی، پتاجی بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔“ روپ کمار آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا اور مجھے اس کے مسخرے پن پر ہنسی آرہی تھی۔

بہرحال میں اس شخص کو پسند کرنے لگا تھا۔ ہم نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر آگے بڑھ گئے۔

”سروپ جی!“ روپ کمار آہستہ سے بولا۔

”ہوں۔ بولو۔“ میں نے کہا۔

”راج محل اب اتنا چھوٹا تو نہیں ہے کہ ہم یہاں سے سیدھے کماری پدمنی تک پہنچ جائیں گے۔ اسے تلاش کرنا آسان تو نہ ہوگا۔“

”رات بھر تلاش کریں گے یار۔ کہیں نہ کہیں تو مل ہی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے بھگونت۔ رات بھر جاگیں گے اور صبح آرام کریں گے۔“ روپ کمار نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں ہنس پڑا۔

”ارے رات بھر جاگنے کے بعد کس میں اتنی ہمت رہے گی کہ صبح کے وقت اتنی وزنی تلوار اٹھائے۔“

”یار تم تو لڑکیوں سے بھی کم ہمت ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہے بھگوان، کاش تو لڑکی ہی بنا دیتا۔ سوئمبر ہوتا بس اتنا کرنا پڑتا کہ مالا کسی کے گلے میں ڈال دیتے اس کے بعد رام رام۔“ اور میں اسے دھکیلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

ہم راج محل کے مختلف حصّوں میں پھرتے رہے! اس کی خوبصورتی کا اندازہ لگاتے رہے۔ اب ہم راج محل کے پچھلے حصّے میں تھے۔ یہاں پر بھی دوسری طرف کی طرح ماحول سنسان اور خاموش تھا۔ اب اسے اتفاق کہا جائے یا خوش بختی کہ راج محل کے پچھلے باغ میں ہمیں کچھ چہل پہل نظر آئی۔ ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے کچھ روشنی بھی ہورہی تھی اور اس روشنی میں کچھ سائے بھی نظر آرہے تھے۔ چاند بادلوں میں ڈھکا ہوا تھا اور سیاہ بادل اس سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہم روشنی سے منہ چھپائے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ روپ کمار بدستور خوفزدہ تھا اور آگے بڑھنے سے ڈر رہا تھا۔ تھوڑی

دیر کے بعد ہم اس تالاب کے پچھلے حصے میں درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم تالاب کے گرد لرزاں سائے بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

تالاب کے کنارے سے رنگین قہقہے اُبھر رہے تھے اور نسوانی قہقہوں کی کھنک دُور تک گونج رہی تھی "روپ کمار!" میں نے روپ کمار کے کان میں سرگوشی کی۔

"جی سروپ کمار!" وہ کانپتے لہجے میں بولا۔

"لڑکیاں ہیں!"

"مجھے تو چڑیلیں معلوم ہوتی ہیں بھگوت!" وہ آہستہ سے بولا۔

"اگر چڑیلیں بھی اس قدر خوبصورت ہوتی ہیں تو چلو ان میں سے دو چار چڑیلوں کو پکڑ کے چلتے ہیں۔ نہ سہی رانی پدمنی، یہ ہی سہی۔ کام تو آجائیں گی۔"

"ہرے رام۔ ہرے رام۔ چڑیلوں کو پکڑ کر کیا مصیبت مول لینی ہے۔"

"اوہو۔ روپ اُدھر دیکھو وہ کون ہے؟" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ شمعوں کی روشنی میں ایک حسین چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا تھا جسے دیکھ کر آنکھیں پلک جھپکانا بھُول جاتی تھیں۔ سلونا سا حسن، ہندوستان کی سرزمین کا عکاس، لانبی لانبی پلکیں آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بلا کی حلاوت اور بدن میں قیامت کا لوچ۔ وہ بڑے ناز سے آرہی تھی اور شاید چاند اسی کے انتظار میں تھا۔ چاند نے بادلوں کی چادر دونوں طرف سے سمیٹی اور اس میں سے منہ نکال کر جھانکا۔ تب اس کا چہرہ مکمل طور پر روشن ہوگیا۔

روپ کمار شاید بولنا بھُول گیا تھا وہ ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھ رہا تھا۔ خوبصورت لڑکی داسیوں کے جھرمٹ میں تالاب کے کنارے پڑے ہوئے خوبصورت تخت تک پہنچ گئی۔ تخت ہیرے جواہرات سے مزین تھا اور شاید اسی مورت کے لیے بنایا گیا تھا۔

اور میرے ذہن میں ایک شبہے نے سر اُبھارا۔ کیا یہی کماری پدمنی ہے؟ عین ممکن تھا اور میرا یہ خیال غلط ثابت نہ ہوا۔ تالاب کے کنارے موجود داسیوں نے اس کا بڑا احترام کیا تھا اور پھر وہ ناز سے تخت پر بیٹھ گئی۔

"چمپا!" اس نے مترنم آواز سے کسی کو پکارا۔

"کماری جی!" ایک حسین خادمہ آگے بڑھ آئی۔

"کیا خبر ہے؟" کماری پدمنی نے پوچھا۔

"بس کماری جی، کم سے کم چالیس آدمی آئے ہیں۔"

"تو نے انھیں دیکھا ہے؟" کماری پدمنی نے پوچھا۔

"نہیں۔ کماری جی! میں بھلا کیسے دیکھتی۔ بس بانکے مجھے بتا رہا تھا۔"

"کیا بتا رہا تھا؟" پدمنی نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ بڑے بڑے راجکمار ہیں۔"

"بس؟" پدمنی ہنس پڑی۔

"ہاں کماری جی، راجکمار، راجکمار ہی ہوتے ہیں۔"

"ہوں۔ مگر یہ بڑی بُری بات ہے۔ پتاجی نے انھیں قلعے کے باہر ٹھہرایا ہے۔ اگر وہ قلعے کے اندر ہوتے تو کسی نہ کسی طرح ہم انھیں چوری چھپے دیکھنے کی کوشش کرتے۔"

"چلیے کماری جی اب سمے ہی کتنا رہ گیا ہے۔ آپ انھیں آرام سے دیکھ لیں گی، کل شام کو سوئمبر رچے گا اور آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"یہی تو مشکل ہے چمپا۔ ہمیں بس انھیں ایک نظر دیکھنے کی مہلت ملے گی اور اس ایک نظر ہی میں ہمیں فیصلہ کر لینا پڑے گا۔ ہم تو چاہتے تھے کہ انھیں من بھر کر دیکھیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں۔"

"مجبوری ہے کماری جی۔ برسوں سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ اب تو آپ ایسا ہی کریں کہ کسی کو پسند کریں اور پھر اسے من بھر کر دیکھیں۔"

"ہمارا تو من کانپ رہا ہے چمپا!"

"اسے ٹھہرائیں کماری جی۔ کل تک تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔"

"ہاں۔ چھوڑو ان باتوں کو گیت سناؤ۔" کماری پدمنی نے کہا۔

"من جو نہیں لگ رہا مہارانی کا۔" ایک اور داسی بولی۔

"ہائے من میں تو نہ جانے کون کون ہوگا۔"

"ارے بھئی نہیں۔ ہماری کماری ایسی نہیں ہیں۔ کسی منش کو نظر بھر کر بھی نہ دیکھا ہوگا انھوں نے۔"

"تو اور کیا۔" دوسری داسی بولی۔

خیر جتنے منہ تھے اتنی زبانیں۔ سب کماری پدمنی کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور میں دلچسپی سے ان لڑکیوں کی چہلیں دیکھ رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر وقتی طور پر میری توجہ روپ کمار سے ہٹ گئی تھی لیکن چند لمحات کے بعد ہی مجھے احساس ہوگیا۔ روپ کمار بے حد خاموش تھا۔

اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔ تب میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ روپ کمار کی نگاہیں کماری پدمنی پر گڑھی ہوئی ہیں اور میری صدیوں کی تجربہ کار نگاہوں نے اس مدّھم سی روشنی میں بھی اندازہ لگا لیا کہ روپ کمار کی شکنیں سکڑ اور پھیل رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر کافی حد تک تبدیلی آچکی تھی۔ شاید کماری پدمنی کا حسن آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا ہے۔

بہرحال پروفیسر میرے بارے میں تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دنیا کا کتنا ہی حسین چہرہ میری نگاہوں میں آجائے وہ میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے تو صدیوں کا منتخب حسن دیکھا تھا۔ میں نے تو ایسے ایسے حلیم چہرے دیکھے تھے جن کو دیکھ کر مر جانے کو جی چاہے اور اس کے بعد زندگی بے کار ہو۔

کماری پدمنی کمسن تھی، بے حد حسین تھی۔ عام حالات میں اگر مجھے اس کے حصول کا کوئی ذریعہ نظر آتا تو میں اس کے لیے پوری پوری کوشش کرتا لیکن اگر میرا دوست اور یہ دلچسپ نوجوان اس پر فریفتہ ہوگیا تو میں اس کا رقیب نہ تھا، بلکہ خلوص دل سے اسے راجکماری پدمنی سے عشق کرنے کی اجازت دے دیتا۔

"روپ جی!" میں نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور وہ چونک پڑا۔

"مم۔ مہاراج۔ مہاراج۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

"ہاں۔ ہاں کہیے، کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ۔ وہ پدمنی ہے؟"

"جی ہاں۔ وہی ہے۔"

"وہ کماری پدمنی ہے سروپ مہاراج!" روپ کمار کی حالت ایکدم بدل گئی تھی۔ وہ عجیب سے انداز میں یہ الفاظ ادا کر رہا تھا۔ مجھے اس کی کیفیت پر ترس آگیا اور میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیسی ہے روپ؟" میں نے پوچھا اور جواب میں روپ کمار نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جن سے حسرت اور بے چارگی ٹپک رہی تھی۔ پھر بولا۔

"بہت اچھی ہے مہاراج، بہت سُندر ہے مہاراج!"

"اب بولو۔ اب کیا کہتے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کہوں گا سروپ جی؟" وہ بے چارگی سے بولا۔

"اتفاق ہے روپ کمار کہ ہمارا کام بڑی ہی جلدی ہوگیا۔" یوں لگتا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے ہمیں اس طرف بھیجا ہو اور شاید وہی قوت راجکماری کو بھی اسی طرف کھینچ لائی تھی۔

"ہاں مہاراج ـــــ مگر یہ اچھا نہ ہوا۔" روپ بے چارگی سے بولا۔

"کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"چلیں یہاں سے؟" میں نے پوچھا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" وہ حسرت سے بولا۔

"افوہ۔ پاگل آدمی، اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"یہ اچھا نہیں ہوا مہاراج۔ یہ اچھا نہیں ہوا۔" اس نے اسی انداز میں کہا اور پھر سامنے نگاہیں جھکا دیں۔ اچانک سامنے سے سنگیت کی آوازیں اُبھریں اور ایک داسی رقص کرنے لگی۔ دوسری داسیاں گیت گانے لگی تھیں اور راج محل کے پچھلے حصے میں تالاب کے کنارے یہ محفل کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی طاری تھی اور اسی خاموشی میں گیت کی آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔

رقاصہ کا خوبصورت بدن لچک رہا تھا اور میرے ذہن میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات آرہے تھے۔ میں نے روپ کمار کی طرف ۔۔۔ سے توجہ ہٹا لی تھی اور وہ خاموشی سے رقص دیکھ رہا تھا اور گیت سُن رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی نگاہیں پدمنی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں پدمنی کی آنکھوں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وقت اتنی تیزی سے گزر گیا کہ پتہ بھی نہ چلا۔ رقص ختم ہوگیا اور راجکماری اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ میرے خیال میں یہ بہتر ہی ہوا تھا، ورنہ روپ کمار کا دل رات بھر اُٹھنے کو نہ چاہتا۔ راجکماری واپس جا رہی تھی اور داسیاں اس کے پیچھے تھیں۔ پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

روپ کمار دل پکڑ کر بیٹھ گیا تھا اور میں اس کی یہ کیفیت بغور دیکھ رہا تھا۔

"چلیں ـــ روپ کمار ـــ؟" میں نے پوچھا۔

"چلیے مہاراج!" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا اور میں اسے لے کر واپس چل پڑا۔ واپسی کا سفر نہایت خاموشی سے طے ہوا تھا۔ بالآخر یہ طویل فاصلہ طے کر کے ہم قلعے کے چوبی دروازے سے باہر نکل آئے اور پھر خیموں کا شہر عبور کر کے اپنے خیمے میں پہنچ گئے۔ روپ کمار نے مجھ سے جانے کی اجازت مانگی تھی۔

"کیوں روپ کمار، میرے خیمے میں نہ رہو گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مہاراج۔ آگیا دیں، مجھے نیند آرہی ہے۔" روپ کمار نے جواب دیا۔

اس کے بدلے ہوئے لہجے سے میں نے اس کی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔ بہرحال میں نے اسے نہ روکا اور وہ اپنے خیمے میں چلا گیا۔ میں بھی مسکراتا ہوا اپنے خیمے میں واپس آگیا تھا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں پروفیسر کہ راجکماری پدمنی مجھے خوبصورت ضرور لگی تھی لیکن میرے ذہن نے ایسا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا کہ میں اس کے حصول کے لیے بے چین ہو جاتا۔ ہاں میں نے تو ہر دور میں انسانوں کی مدد کی تھی اور اب میں سوچ رہا تھا کہ روپ کمار کے لیے کیا کروں؟

بظاہر کوئی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن یہ فیصلہ تو میں نے کر لیا تھا کہ اگر میرا دوست پدمنی کو پسند کرتا ہے تو پدمنی اس کے علاوہ کسی اور کی پتنی نہیں بن سکے گی۔ میرا کیا ہے۔ یوں بھی کم بخت منورما نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ اگر میں کسی لڑکی کو اپنانے کی کوشش بھی کرتا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی اور راجکماری پدمنی، ارمان بھری جوانی کی ایسی منزل میں تھی جہاں اسے محبت کی ضرورت تھی۔ اگر اسے محبت کے بجائے موت ملتی تو مجھے کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں تھا۔

گو مہاراج کرنامی نے مجھے منورما کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا لیکن اس کے باوجود میں مطمئن نہیں تھا۔ منورما خود کسی روپ میں میرے سامنے آتی تو میں اسے پہچان سکتا تھا لیکن اگر وہ رقابت کی آگ میں جل کر کسی ایسی لڑکی پر وار کرتی جس کا میرے قریب ہونے کا امکان ہو تو میں اس کی کیا مدد کر سکتا تھا، سوائے اس کے کہ اس کی موت پر افسوس کرتا۔

نہیں نہیں۔ دو زندگیوں کو مصیبت میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟ روپ کمار کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پدمنی پر مر مٹا ہے اور اب پدمنی اس کی ضرورت بن گئی ہے۔ اگر پدمنی اسے نہ ملی تو اسے زبردست صدمہ ہوگا اور پدمنی بھی خوبصورت اور جوان تھی۔ میں اس کی زندگی سے نہیں کھیل سکتا تھا۔ مجھے روپ کمار پر ہنسی آنے لگی۔ انسان کتنا کمزور ہوتا ہے۔ معصوم راجکمار تھوڑی دیر قبل یہاں سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے پتاجی کو کوس رہا تھا کہ انھوں نے بلاوجہ اسے اس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔

لیکن اب ـــ اب شاید اس کے دل کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوگی کہ وہ کسی طرح دوسروں کو شکست دے دے اور مالا اس کے گلے میں

آپڑے۔ ویسے میں نے ایک نگاہ ان دوسرے راجکماروں کو دیکھا تھا۔ ان میں بہت سے بانکے سجیلے جوان تھے لیکن اگر صورت دیکھی جاتی تو روپ کمار درحقیقت روپ میں سب سے اچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی نرمی اور ملائمت تھی کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتا تھا۔ بہرحال میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ہر قیمت پر اس کی مدد کروں گا۔

اور پروفیسر میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، اس بات کا اندازہ تمھیں بھی بخوبی ہے۔ رات کو میں حالات پر غور کرتا رہا لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ تب میں نے اطمینان سے آنکھیں بند کرلیں اور پھر میرا دماغ غنودہ ہو گیا۔ جب میں کسی بات کا فیصلہ نہیں کر پاتا تھا تو پھر ذہن کو آزاد چھوڑ دیتا تھا اور پھر حالات مجھے جہاں سے بھی آواز دیتے۔ میں عام حالات کو تو قابو میں کرنے کی ہمت رکھتا تھا اور بہرحال اپنے اس دوست کی مدد کا میں نے فیصلہ کرلیا تھا۔

صبح ہوگئی اور صبح ہونے کی اطلاع بھی مجھے روپ کمار نے دی تھی۔ شاید وہ ساری رات نہیں سویا تھا اور روشنی کی پہلی کرن پھوٹتے ہی وہ میرے خیمے میں آگیا تھا۔ میں نے اس کی شکل دیکھی۔ آنکھیں سرخ، بال بکھرے ہوئے۔ عجیب حالت تھی اس کی۔

"ارے۔ روپ! کیا بات ہے؟" میں نے پُرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا۔

"صبح ہوگئی سروپ جی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو ہونے دو۔ تم اتنی صبح کیسے جاگ گئے؟"

"بس۔ میں سو نہیں سکا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"یونہی۔ بس نیند نہیں آئی۔"

"بھاگ جانے کی سوچ رہے ہوگے؟" میں نے شرارت سے کہا۔

"نہیں۔ ایسے تو نہیں بھاگیں گے۔" روپ کمار آہستہ سے بولا۔

"جنگ کروگے؟"

"ہاں۔ کرنا ہی ہوگی۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا اور پھر بولا۔ "تمھیں کماری پدمنی کیسی لگی سروپ کمار؟"

"اوہ۔ رات بھر اسے سپنوں میں دیکھتا رہا ہوں بس سوتا جاگتا رہا۔ وہ تو بڑی ہی من موہنی ہے۔" میں نے جواب دیا اور روپ کمار کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔ اس کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ میرے ذہن میں شرارت ناچ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے دل کی بات نہیں بتائی اور خاموشی سے اس کی صورت کا جائزہ لیتا رہا۔

"بھوجن تو ساتھ ہی کروگے سروپ جی؟" اس نے مُردہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہم دونوں تو ایک دوسرے کے متر ہیں۔ ابھی ہماری دشمنی تو نہیں ہوئی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ روپ کمار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اب تو اس کی کچھ کہنے کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کافی دیر گذر گئی۔ پھر ہم دونوں اٹھے اور باہر نکل آئے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ میرے پاس تو پہننے کے لیے دوسرا لباس بھی نہیں تھا لیکن اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ہاں روپ کمار کو میں نے نیا لباس پہننے پر مجبور کردیا تھا۔

"تم نہیں پہنوگے سروپ جی؟" وہ میری محبت سے متاثر ہو کر بولا۔

"کیا پہنیں یار۔ ہم سادھوؤں کے پاس لباس ہوتے ہی کہاں ہیں۔ ہاں اگر پدمنی دیوی مالا ہمارے گلے میں ڈال دے اور ترکھانی کی راج گدی مل جائے تو بہت سے کپڑے بنالیں گے اپنے لیے۔"

"میرے کپڑے تو تمھارے آ نہیں سکتے۔" وہ بولا۔

"ہاں نہیں آئیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر ہمارے لیے صبح کا بھوجن آگیا۔ اس وقت بھی ہم دونوں نے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا۔ روپ کمار کی ذہنی کیفیت کا میں نے بخوبی اندازہ لگالیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ کافی حد تک سے کام لے رہا تھا۔ ایک طرف اس کا دل پدمنی کے لیے تڑپ رہا تھا تو دوسری طرف دوستی کی بھی اس کی نگاہ میں کافی اہمیت تھی۔ وہ میری دوستی کو بھی نہیں ترک کرنا چاہتا تھا اور اب تو وہ مجھ سے دل کی بات بھی نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ میرے منہ سے پدمنی کے بارے میں سُن چکا تھا۔

بھوجن ختم ہوگیا اور پھر ہم سیر کے لیے نکل پڑے۔ دوسرے سارے راجکمار بھی سیر کے لیے نکل آئے تھے۔ ہم نے ان کی تیاریاں دیکھیں۔ سب کے سب اکڑتے پھر رہے تھے۔ ہر ایک اپنے آپ کو سب سے بڑا سورما سمجھ رہا تھا اور مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ ہم دونوں ان کے درمیان سے گذرتے رہے۔ بہت سے راجکماروں نے ہمارے اوپر فقرے بھی کسے تھے اور ایک جگہ روپ کمار کی دلی کیفیت پھر میرے سامنے آئی۔ ہم ایک خیمے کے سامنے سے گذر رہے تھے کہ ایک قوی ہیکل راجکمار خیمے سے نکل آیا۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے۔

"اوہو۔ دیکھو کل والے سادھو مہاراج۔" قوی ہیکل راجکمار نے کہا۔

"یہ شاید ہمیں آشیرواد دینے آئے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔

"اوہ۔ ٹھیک کہا تم نے۔ مہاراج کا دم ہمارے لیے غنیمت ہے۔ آؤ مہاراج سے آشیرواد لے لیں۔" اور وہ سب ہمارے سامنے آگئے۔ ان کی تعداد پانچ چھ تھی۔

"جے رام جی کی مہاراج!" قوی ہیکل راجکمار نے شرارت سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور میں رُک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ روپ کمار کی آنکھوں میں غصّے کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔

"کیا بات ہے راجکمار؟" میں نے حلیمی سے پوچھا۔

"کچھ پوچھنا ہے سوامی؟" وہ بولا۔

"پوچھو!"

"آپ اس جوانی میں ہی اتنے بڑے گیانی کیسے بن گئے؟"

"اور تم اس جوانی میں کیوں مرنا چاہتے ہو؟" میری بجائے روپ کمار آگے بڑھ کر بولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

"اوہو۔ یہ تھارا نیا چیلا بن گیا ہے مہاراج۔ بڑے ہی مہان ہیں، آتے ہی چیلے بھی بنالیے مگر آپ نے اپنے اس چیلے کو یہ نہیں بتایا کہ راجکمار آپس میں کس طرح ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں اور غلط طور سے گفتگو کرنے پر بعض اوقات دانتوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔" قوی ہیکل شخص نے غصیلے انداز میں کہا۔

"ہمیں ایک دوسرے سے اس طرح گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے اسی بردباری سے کہا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں مہاراج۔ آپ اسے سمجھا دیں ویسے آپ دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

"ہم تم سے بات نہیں کرنا چاہتے۔" میں نے کہا۔

"کرنا پڑے گی مہاراج۔ ہمیں بھی آشیرواد کی ضرورت ہے۔ ہم بھی تمھیں اتنی ہی اچھنا دیں گے جتنی ریڑے گا۔ ویسے تم ادھر آکس طرح گئے۔ ویسے تو تم سادھو معلوم ہوتے ہو۔"

"میں جو کوئی بھی ہوں، تمھیں بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔ راستے سے ہٹ جاؤ!" میں نے کہا۔

"ہٹ جاؤ بھئی ورنہ مہاراج کو غصّہ آگیا تو ہمیں شراپ دے دیں گے۔" قوی ہیکل نے کہا اور پھر وہ لوگ سامنے سے ہٹ گئے۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا تھا سروپ جی؟" روپ کمار بولا۔

"کیا؟"

"یہی کہ یہ چھچھورے ہیں۔"

"اونہہ۔ ہوں گے۔ ہمیں کون سا ان سے دوستی کرنا ہے۔ دل کی بھڑاس نکال رہے تھے بے چارے۔ تم ان باتوں کی پرواہ مت کرو۔" میں نے کہا اور روپ کمار کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ پھر ہم نے گھوم پھر کر یہ سارا علاقہ دیکھا۔ ایک طویل و عریض میدان تھا جس میں نہ جانے کب سے لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ یہ سب سوئمبر کی ابتدائی رسموں کا تماشہ دیکھنے آئے تھے۔ بڑے پُرجوش تھے سب کے سب۔ گردنیں اٹھا اٹھا کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جنگ کا میدان دیکھا اور پھر اس جگہ آگئے جہاں چند گھوڑ سوار آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ قلعے کے اندر سے آئے تھے اور شاید کوئی سندیس لائے تھے۔ چند لوگ ہماری طرف بھی آئے اور انھوں نے ہمیں مخاطب کیا۔

"مہاراج! سندیسی آئے ہیں۔ سب کے نام پوچھ رہے ہیں۔ آپ بھی چلیں۔" انھوں نے کہا اور ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔ سب کے نام پوچھے جا رہے تھے۔ پھر میری باری آئی اور سندیسیوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔

"آپ بھی راجکمار ہیں مہاراج؟"

"تھارا کیا خیال ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کا شبھ نام؟"

"سروپ کمار!" میں نے کہا اور انھوں نے میرا نام لکھ لیا۔ پھر ان میں سے ایک بوڑھے آدمی نے زور زور سے کہا۔

"متروا راجکمار پدمنی کے سوئمبر میں شریک ہونے پر مہاراج ترکھان تھارا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ سوئمبر میں شریک ہونے کی کچھ شرطیں تمھیں پوری کرنی ہیں۔ جیسا کہ تم سب کو معلوم ہے کہ مہاراج ترکھان کے کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے جو راجکمار کماری پدمنی کا پتی بنے گا وہی ترکھانی کا مہاراجہ بھی ہوگا اور مہاراج ترکھان کے دیہانت کے بعد وہی راج گدی پر بیٹھے گا اور راج گدی کا مالک بننے کے لیے کسی مضبوط اور بہادر سورما کی تلاش بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے تمھیں آپس میں مقابلہ کرنا ہوگا۔ سوئمبر میں وہی شریک ہوگا جو بہادری کے کارنامے دکھائے گا۔ کسی بزدل یا سپہ گری میں نکمّے راجکمار کو سوئمبر میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ جن راجکماروں کے ساتھ ان کے متر یا ایسے سورما آئے ہیں جو ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے ساتھی کی مدد کرسکتے ہیں۔ ان کا کام صرف اپنے راجکمار کے لیے ہوگا۔ یہ مقابلے کی شرائط ہیں۔"

"اس بات کو دوبارہ بتاؤ سندیسی۔" ایک راجکمار نے کہا۔

"سیدھی سی بات ہے مہاراج۔ تم اگر کسی راجکمار سے لڑ رہے ہو اور اس سے کمزور پڑ رہے ہو تو تھارا متر تھاری سہائتا کرسکے گا لیکن جس راجکمار سے تم کمزور پڑ رہے ہو اس کا متر اگر چاہے تو تھارے اوپر تلوار نکال سکتا ہے۔ گویا اس طرح جوڑی جوڑی لڑے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ خوشی سے بولا۔ شاید اس کا ساتھی کوئی بڑا سورما تھا۔

"اس کے علاوہ متروا اگر لڑائی میں کوئی راجکمار کسی کے ہاتھوں مارا جائے تو راجہ ترکھان اس کے ذمّہ دار نہ ہوں گے۔ تم سب اپنی اپنی مرضی سے جنگ کر رہے ہو۔ اس بات کی منظوری دو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں منظور ہے۔" سب نے کہا لیکن پروفیسر اس بات پر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی تھی۔ میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ واہ خود بخود ہموار ہوگئی تھی۔ اس طرح میں اپنے دوست کی مدد بہ آسانی کرسکتا تھا جس کے لیے میں دل سے بے چین تھا۔ اب میرا دل خوشی سے سرشار تھا۔ میری سب سے بڑی مشکل خود بخود آسان ہوگئی تھی۔

میں نے مسکرا کر روپ کمار کی طرف دیکھا لیکن روپ کمار کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ اس کے دل میں اُمّید کی کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ بدستور اُداس تھا۔

پھر جب سندیسی قواعد کا اعلان کرکے چلے گئے تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "پتاجی نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"کیا مطلب؟"

"کاش وہ میرے ساتھ بھی کسی سورما کو بھیج دیتے۔"

"اوہ۔ ہاں۔ میرے ساتھ بھی ایسا نہیں ہے۔" میں نے کہا اور روپ کمار ایک ٹھنڈی سانس لیکر خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرے ہنگامے شروع ہوگئے۔ بڑے بڑے لوگ آنے لگے تھے۔ ان کے لیے باقاعدہ نشستوں کا بندوبست تھا۔ سورج چڑھے نقارے پر چوٹ پڑی۔ یہ

راجہ ترکھان کی آمد کی اطلاع تھی اور اس کے آنے کے بعد مقابلے شروع ہونے والے تھے۔

راجہ ترکھان کی سواری بڑی شان سے آئی۔ پینتالیس سال کی عمر کا شاندار آدمی تھا۔ چہرے سے بارعب نظر آرہا تھا۔ خوبصورت انسان تھا۔ اس کے چہرے میں پدمنی کی شباہت تھی۔ بے شمار لوگوں کی معیت میں وہ مقابلے کے میدان میں پہنچ گیا۔ سارے لوگ اس کے نام کی جے جے کار کر رہے تھے۔

پھر راجہ بیٹھ گیا اور اس کے بعد جنگ کا نقارہ بجنے لگا اور بانکے سجیلے راجکمار ہتھیاروں سے لیس میدان میں آنے لگے۔ کاش میرے پاس میرا کھانڈا ہوتا۔ اسے دیکھ کر بہت سوں کے پتے پانی ہو جاتے تھے لیکن میرے پاس تو کوئی ہتھیار ہی نہیں تھا۔ روپ کمار بھی اب مجھ سے جدا ہو گیا تھا ورنہ اس سے ہی کوئی تلوار مانگ لیتا۔

مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اسی راجکمار نے مجھ پر طنز کیا۔ "ارے مہاراج! آپ خالی ہاتھ ہی میدانِ جنگ میں جا رہے ہیں۔" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"ہاں راجکمار جی! دراصل یہاں کوئی میرے مقابلے کا ہے ہی نہیں۔ ان معمولی انسانوں کے لیے ہتھیاروں کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں آپ تو گیان سے جنگ لڑیں گے۔"

"اس کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم جیسوں کے لیے میرے ہاتھ ہی کافی ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے مقابلے پر نہ آیئے گا مہاراج۔ میں گیانیوں کا سخت دشمن ہوں۔ پھر نہ کہیں کہ آپ خالی ہاتھ تھے۔"

"کیا تم مجھے للکار رہے ہو راجکمار؟"

"ارے کیا للکاروں گا آپ کو۔ میرے مقابلے پر تو یہاں کوئی ہے بھی نہیں۔" اس نے حقارت سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میں بھی مسکراتا ہوا میدان کی طرف چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد سب میدان میں پہنچ گئے — سارے راجکمار ایک لائن میں کھڑے ہو گئے تھے۔ تب راجہ ترکھان اپنی جگہ سے اٹھا اور راجکماروں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے سارے راجکماروں کو آشیرواد دی۔ میرے قریب رُک کر اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور پھر کئی سیکنڈ وہاں کھڑا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"تم کون سی راجدھانی سے آئے ہو راجکمار؟"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ روپ کمار مجھ سے کافی دُور تھا اس لیے مجھے پرواہ نہیں ہوئی۔ میں نے راجہ ترکھان کی طرف دیکھا اور پھر گردن جھکا کر بولا۔ "میں مہاراج روپ کمار کا داس ہوں۔"

"کیا مطلب؟" راجہ ترکھان حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ میں ان کی طرف سے لڑوں گا۔ میں ان کی سہائتا کروں گا۔"

"اوہ۔ لیکن تمہارا لباس سادھوؤں کا سا ہے؟"

"مجھے یہی لباس پہننے کی عادت ہے۔" میں نے جواب دیا اور راجہ ترکھان نے گردن ہلائی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہیں آیا ہو۔ یا پھر اسے افسوس ہو کہ میں خود کسی ریاست کا حکمران کیوں نہیں ہوں۔ لیکن میرے قریب کھڑے دوسرے راجکمار مجھے بُری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں حقارت جھلک رہی تھی لیکن میں نے کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور دوسری طرف رُخ کر لیا۔

پھر سارے راجکمار منتشر ہو گئے اور اس کے بعد وہ اپنے اپنے ہتھیار چلا کر دیکھنے لگے۔ اس کے بعد مقابلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے دو راجکمار تلواریں لیکر میدان میں آئے اور راجہ ترکھان کے اجازت دینے پر ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگے۔ پھر فوراً ہی دوسری جوڑی بھی میدان میں اُتر آئی اور چاروں شمشیر زن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ ایک راجکمار ہلکا پڑنے لگا تو اس کا مددگار جو کالے رنگ کا ایک دیوہیکل آدمی تھا، تلوار لیکر میدان میں اتر آیا۔ وہ اپنے راجکمار سے اچھا لڑا اور جلد ہی اپنے مقابل کو تھکانے میں کامیاب ہو گیا۔ تب اس کے مالک نے دوبارہ تلوار سنبھال لی لیکن دوسرے راجکمار کا بھی ساتھی موجود تھا، وہ اپنے مالک کی مدد کو آ گیا۔ اس طرح یہ مقابلہ کافی دلچسپ ہو گیا تھا۔ میں دلچسپی سے مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے کافی فاصلے پر روپ کمار بھی کھڑا خاموشی سے مقابلہ دیکھ رہا تھا اور پھر مقابلے کا پہلا حریف شکست کھا کر میدان سے پلٹا اور اس کی جگہ روپ کمار میدان میں آ گیا۔ میرے بدن میں پھریریاں اٹھنے لگیں۔ میں روپ کمار کا مددگار تھا۔

روپ کمار نے شروع میں جس بددلی کا مظاہرہ کیا تھا اور جنگ و جدل سے جس طرح بیزاری کا اظہار کیا تھا، اس وقت وہ کیفیت اس میں نہیں تھی۔ وہ کافی چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی اپنے مقابل پر تابڑ توڑ وار کیے اور اس کا مقابل بوکھلا گیا۔ اس کی پیشانی پر ایک چرکا بھی لگ گیا تھا جس سے خون کی لکیر نیچے رینگ آئی تھی۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر اس کا مددگار اس کی مدد کو آ گیا۔ یہ وہی قوی ہیکل سیاہ فام تھا جو مجھے خاص لڑاکا نظر آتا تھا۔ اس نے روپ کمار پر وار کرنے شروع کر دیے۔ دو تین ہاتھوں میں ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ روپ کمار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت میں نے روپ کمار کے انداز میں بدحواسی سی محسوس کی۔

روپ کمار اس کے وار روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن سیاہ فام کے قوی ہیکل بازوؤں کے سامنے اس کی ایک نہیں چل رہی تھی چنانچہ اب وقت نہ رہا تھا۔ تب میں اپنے دوست کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور سیاہ فام کے مقابل پہنچ گیا۔ ایک لمحے کے لیے سب حیران رہ گئے کیونکہ میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔

سیاہ فام ٹھٹھکا اور پھر اس نے دانت پیس کر میرے اوپر تلوار کا وار دیا۔ میں نے اسے جھکائی دی اور دوسرے لمحے میرا ایک زوردار مکہ سیاہ فام کے چہرے پر پڑا۔ سیاہ فام کی گردن ٹیڑھی ہو گئی تھی اور دوسرے لمحے وہ

چاروں شانے چت تھا۔ میرا کام بس اتنا ہی تھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ روپ کمار نے حیرت سے مجھے دیکھا لیکن پھر سنبھل کر دوبارہ اپنے مقابل کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی لیکن آنکھوں سے حیرانی بھی جھلک رہی تھی۔

شاید اسے تعجب تھا کہ میں اپنے طور پر لڑنے کی بجائے اس کی طرف سے کیوں لڑ رہا ہوں۔ میرا مقابل سیاہ فام ایک گھونسے سے زیادہ مار کھانے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے قدموں سے اٹھ کر نہ جا سکا۔ لوگ گردن اٹھا اٹھا کر اسے دیکھ رہے تھے مجھے دیکھ رہے تھے۔ یہ کیسی جنگ تھی، جس میں ایک خطرناک آدمی نے اس طرح شکست کھائی تھی۔

تب میں نے سیاہ فام کی تلوار اپنے قبضے میں کر لی اور اطمینان سے پیچھے ہٹ آیا۔ روپ کمار اب زیادہ دلجمعی سے لڑ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے مقابل کو شکست دے دی۔

چوتھا آدمی وہی راجکمار تھا جس نے میرا مذاق اُڑانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تلوار ہلاتا ہوا آیا اور روپ کمار پر پل پڑا۔ مجھے روپ کمار کی پھرتی پر حیرت تھی۔ اس نے جنگ سے جس بیزاری کا اظہار کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کبھی تلوار اٹھائی نہ ہو گی لیکن اس وقت وہ جس بے جگری سے مقابلہ کر رہا تھا اس پر میں حیران تھا۔ نہایت برق رفتاری سے وہ لڑ رہا تھا۔ ابتدا میں تو اس نے اپنے دوسرے مقابل کو بھی بدحواس کر دیا لیکن بعد میں اس کے ہاتھ کی رفتار ہلکی پڑ گئی۔ تب میں نے اپنے ذہن میں ایک بات سرچی۔ اگر روپ کمار کو زیادہ محنت کرنا پڑی تو شاید وہ زیادہ دیر تک میدان میں نہ رہ سکے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے کم سے کم تلوار چلانے کا موقع دیا جائے اور اس طرح اس کے مقابل آنے والوں کو شکست دی جا سکے۔

تب میں آگے بڑھا اور اس خطرناک آدمی کا وار میں نے اپنی تلوار پر روکا۔

"اوہ۔ آ گئے میرے ددست۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن تعجب ہے کہ تم اپنے لیے لڑنے کی بجائے دوسروں کے لیے لڑ رہے ہو۔" وہ پیچھے ہٹا اور پھر تلوار کے کئی تابڑ توڑ وار اس نے میرے اوپر کیے۔ میں نے اطمینان سے اس کے کئی وار اپنے اوپر روکے اور پھر کہا۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا راجکمار کہ میں تمہارے مقابل آؤں گا تو خالی ہاتھ۔"

"ہاں۔ ہاں مہاراج تم نے وعدہ تو کیا تھا مگر یہ وعدہ خلافی کیوں؟"

"نہیں وعدہ خلافی نہیں۔" میں نے تلوار ایک طرف پھینک دی اور میرے مقابل نے ایک قہقہہ لگایا۔ بلاشبہ وہ پھرتیلا تھا اور کافی جنگ جُو بھی لیکن اس کی بدقسمتی اسے میرے سامنے لے آئی تھی۔

مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اس نے موقعے سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت سمجھا اور پھر اس نے پینترے بدل کر میرے اوپر بھرپور وار کیے۔ میں نے اچھل اچھل کر اس کے کئی وار خالی جانے دیے اور پھر میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ اب بھلا تلوار اس کے ہاتھ میں کیسے رہ جاتی۔ اس کی تلوار گر گئی اور میں نے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی۔

"کیا خیال ہے راجکمار؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرے مقابل کے چہرے کی کیفیت اب کسی قدر بدل گئی تھی اور اب وہ بدحواس نظر آ رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے اس کی گردن چھوڑ دی اور پھر اسے للکارا لیکن وہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے تلوار اٹھا لی اور شاید اپنی زندگی کی شدید ترین کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ تلوار میرے بازو پر پڑی تھی لیکن جس طرح وہ بازو سے اچھل اس نے میرے مقابل کو حیران کر دیا۔

لیکن اب میں فیصلہ کر لینا چاہتا تھا۔ روپ کمار اطمینان سے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور دلچسپی تھی۔ تب میں نے اپنے مقابل کو اٹھایا اور اٹھا کر اسے زوردار جھٹکے سے زمین پر گرا دیا۔ اس کی چیخ پورے میدان میں گونج اٹھی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اب وہ اس قابل نہیں رہا ہے کہ روپ کمار کے مقابل آ سکے۔

چاروں طرف سے داد و تحسین کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں بڑی سعادت مندی سے پیچھے ہٹ گیا اور روپ کمار دوبارہ اپنی تلوار لے کر میدان میں آ گیا۔

اور پھر تو جنگ کا فیصلہ سامنے آنے لگا۔ روپ کمار کو لڑنے کا بہت کم موقع مل رہا تھا۔ اس کا جو بھی مقابل آتا، میں اس کو اس قابل نہ چھوڑتا کہ وہ روپ سے مقابلہ کر سکتا اور روپ کے کرنے کے لیے کچھ نہ رہ جاتا۔ اب چاروں طرف سے لوگ روپ کمار کی جے روپ کمار کی جے کر رہے تھے۔ روپ کے نام کے نعرے پورے میدان میں گونج رہے تھے۔

دوسرے لڑنے والوں میں سے بھی بہت کے فیصلے ہوئے، کچھ جیتے کچھ ہارے اور شاید راجہ ترکھان کی توقع سے بہت پہلے یہ مقابلے ختم ہو گئے۔ روپ کمار کے علاوہ دوسرے شاندار طور پر فتح حاصل کرنے والوں میں دلاور سنگھ کا نام سب سے آگے تھا۔ میں نے بھی دلاور سنگھ کو دیکھا۔ بلاشبہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ شاندار آدمی تھا لیکن پھر دلاور سنگھ کی قسمت نے اسے دھکا دیا، اگر وہ نہ بھی چاہتا تو مجھ سے جنگ کرنے کی اسے کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن طاقت کے زعم میں وہ مجھے بھی شکست دینے پر تُل گیا اور پھر وہ تلوار لے کر خاص طور پر میرے مقابل آیا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ دوسرے چند لوگ بھی دیکھ رہے تھے کہ دلاور سنگھ کس طرح اکڑ رہا ہے۔ چند لوگوں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا بھی کہ دلاور سنگھ تم اس طرح کیوں لڑ رہے ہو بازو آؤ لیکن دلاور نہ مانا۔ اس نے میرے اوپر حملہ کر دیا۔ میں نے اب تک جس انداز میں جنگ کی تھی دوسرے لوگوں کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ انھوں نے اپنے طور پر دلاور سنگھ کی شکست کا یقین کر لیا تھا اور اس یقین کو میں نے ٹھیس نہ پہنچنے دی۔

دلاور سنگھ نے تین تلواریں طلب کیں اور میں نے ایک ایک کر کے تینوں تلواریں توڑ دیں اور تلوار کا ٹوٹنا بدترین شکست میں شمار ہوتا تھا — دلاور سنگھ کو اس کا کوئی اندازہ نہ تھا اور یہی بات اس کی بدقسمتی کا باعث بن گئی۔

میدانِ جنگ کا کھیل ختم ہو چکا تھا اور جن لوگوں کو اس میں کامیاب قرار دیا گیا ان میں دلاور سنگھ نہیں تھا۔ راجہ ترکھان نے سوئمبر میں حصّہ لینے والوں کے ناموں کا اعلان کیا ـــــ اور یہ خوشی کی بات تھی کہ روپ کمار کا نام اس فہرست میں ٹاپ پر تھا۔

میری خوشی کی انتہا نہ تھی لیکن دلاور سنگھ آگے بڑھا اور اس نے جھلّائے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہ انیائے ہے ترکھان مہاراج!“

”کیا مطلب؟“ راجہ ترکھان نے ٹیڑھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”میں نے صرف ایک آدمی سے شکست کھائی ہے اور دس آدمیوں کو شکست دی ہے۔“

”لیکن دلاور سنگھ، تم نے جس انداز میں شکست کھائی ہے کیا تمھیں اس کا کوئی احساس ہے؟“ راجہ ترکھان کا لہجہ سخت تھا۔

”ٹھیک ہے لیکن میں سوئمبر میں حصّہ لوں گا۔“

”میری مرضی کے بغیر؟“ راجہ ترکھان نے پوچھا۔

”میں فاتح ہوں۔“

”اگر تم فاتح ہو دلاور سنگھ تو اس جوان سے پھر مقابلہ کرو۔“ راجہ ترکھان نے میری طرف اشارہ کر کے کہا اور دلاور سنگھ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”وہ راجکمار نہیں ہے۔“ دلاور سنگھ چیخ کر بولا۔

”لیکن وہ روپ کمار کا ساتھی ہے۔“ راجہ نے کہا۔

”اوہ ـــ روپ کمار ـــ مجھے روپ کمار سے مقابلہ کرنے کی اجازت دی جائے مہاراج؟“ دلاور سنگھ خونخوار لہجے میں بولا۔

”نہیں۔ مقابلے ختم ہو چکے ہیں۔ جن شرائط کا اعلان کیا گیا تھا، سارا کام انہی شرائط کے مطابق کیا گیا ہے چنانچہ مقابلہ ختم کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو سوئمبر میں حصّہ لینے کی دعوت دی گئی ہے، وہی اس میں حصّہ لے سکتے ہیں۔“ چاروں طرف سے راجہ ترکھان کی بات کی تائید کی گئی اور راجہ ترکھان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے اپنے کسی آدمی کو اشارہ کیا اور وہ میری طرف آ گیا۔

”مہاراج ترکھان نے رات کو آپ کو بلایا ہے۔“

”صرف مجھے؟“ میں نے پوچھا۔ معاً میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ راجہ ترکھان مجھ سے متاثر نہ ہو گیا ہو اور مجھ سے تنہائی میں کوئی ایسی بات نہ کرنا چاہتا ہو جو میرے دوست روپ کمار کے مفاد کے خلاف ہو لیکن بہرحال میں اتنے کچے ذہن کا مالک تو نہیں تھا اور پھر جب دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا تو اسے بدلنے کا کیا سوال۔

راجہ ترکھان کے ملازم نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے میری شکل دیکھ رہا تھا۔ ”کیا راجہ ترکھان نے خاص طور سے مجھے بلایا ہے؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”ہاں مہاراج!“ اس نے جواب دیا۔

”تمھیں یقین ہے کہ اس نے میرے مالک کو میرے ساتھ نہیں بلایا؟“

”ہاں، مہاراج ترکھان نے یہی کہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے اپنے مالک سے آگیا لینا ہو گی۔ اس کی آگیا کے بنا میں کیسے آ سکتا ہوں مہاراج۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں راجہ سے کہہ دیتا ہوں۔“ وہ بولا اور واپس چلا گیا۔ راجہ ترکھان نے اس کی سنی اور پھر اسے دوبارہ میرے پاس بھیجا۔ ”مہاراج کہتے ہیں وہ تمھیں مہمان کی حیثیت سے بلا رہے ہیں۔ تمھیں آنا چاہیے۔ تم کہو تو تمھارے مالک سے اجازت لے لی جائے۔“

میں چند لمحات سوچتا رہا اور پھر میں نے کہا۔

”میں آ جاؤں گا مہاراج!“

”ہم تمھیں لینے آئیں گے۔“ اس نے کہا اور میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ راجہ ترکھان کیا کہنا چاہتا تھا، سُن لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ظاہر ہے میں سچ مچ تو روپ کمار کا ملازم نہیں تھا۔ سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ جو ہار گئے تھے، ان کے لیے یہاں رُکنا اب بے کار تھا۔ وہ واپسی کی تیاریاں کرنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں کینہ توزی تھی اور چہروں پر افسردگی۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر روپ کمار کو تلاش کیا۔ وہ ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ بہت سے لوگ اس کے گرد جمع تھے لیکن اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”مہاراج ـــ بدھائی ہو مہاراج!“ میں نے اس سے کہا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ رو پڑے گا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”آیئے روپ جی۔ اپنے استھان پر چلیں۔“ میں نے کہا اور وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں بھی بہت سے لوگوں نے ہم سے ملاقات کی کوشش کی لیکن میں روپ کمار کو ان سے بچاتا ہوا آگے لے گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے خیمے پر پہنچ گئے۔ خیمے پر پہنچ کر روپ کمار نے مجھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ میں مسکراتا ہوا اس کے خیمے میں چلا گیا اور پھر وہ احمق میرے پیروں پر جھک گیا۔ اس نے میرے بازو پکڑے اور سسکنا شروع کر دیا۔

”ارے ـ ارے روپ کمار ـــ روپ کمار کیا ہوا؟“ میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے اٹھایا اور اپنے مقابل کھڑا کر لیا۔

”سروپ بھیّا ـ سروپ بھیّا ـ یہ تم نے کیا کیا ـ سروپ بھیّا۔ میں، میں تمھارے اس احسان کو کیسے اتار سکتا ہوں۔ تم نے ایسا کیوں کیا بھیّا ـــ تم نے ایسا کیوں کیا میرے دوست؟“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”چپ ہو کر میری بات سُن سکتے ہو تو سُن لو ورنہ میں کچھ نہیں بولوں گا۔“

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا بھیّا ـــ یہ تم نے ـــــ“

”کیوں؟ آخر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم ـــ تم ـــ میں ـــ میں تمھارا کون ہوں۔ تم نے میرے لیے یہ۔“

”پگلے ہو روپ۔ کیا میں نے تمھیں نہیں بتایا کہ میں سوئمبر میں حصّہ لینے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں تو یہ قلعہ دیکھ کر اس طرف چل پڑا تھا۔ یہاں آ کر ہی مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”پھر بھی، تم یہی کام اپنے لیے کر سکتے تھے۔“

”ہم سادھو سنت لوگ، آوارہ گرد، ہم ان چکّروں میں کہاں پڑتے ہیں روپ کمار۔“

”مہاراج ـ سروپ مہاراج! تمھیں بھگوان کی سوگند۔ تمھیں بھگوان کی سوگند مہاراج، مجھے بتاؤ، کیا تمھارے من میں سچ مچ سوئمبر میں حصّہ لینے کی بھاونا نہیں تھی؟“

”ہرگز نہیں روپ کمار۔ تمھیں معلوم ہے یہاں آتے ہی میری تم سے دوستی ہو گئی تھی۔ اسی سمے میرے دوست ـ اسی سمے میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر میں نے اس جھنجھٹ میں حصّہ لیا تو صرف تمھارے لیے۔“

”اوہ ـ میرے بھیّا ـ میرے من میں تمھاری اس سہانتا کا خیال بھی نہیں تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے بھاگ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔“

”دو باتیں ہیں روپ کمار ـــ اوّل تو تم نے مجھے اپنا دوست بنایا تھا، دوسرے میرا نام تمھارے بھائی کے نام پر تھا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، اپنے بھائی کے لیے کیا ہے۔“

”میں تمھیں بھائی بن کر دکھاؤں گا سروپ۔“ روپ کمار نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”سب ٹھیک ہے میرے یار۔ تم چنتا کیوں کرتے ہو۔ بس کل سوئمبر اور جیت لو، مجھے اسی وقت خوشی ہو گی اور ذرا مجھے ایک بات بتاؤ۔“

”پوچھو سروپ!“

”تمھارے من میں سوئمبر سے اس وقت تک کوئی دلچسپی نہیں تھی جب تک تم نے پدمنی کو دیکھا نہیں تھا لیکن اسے دیکھنے کے بعد تمھاری حالت بدل گئی تھی۔ مجھے بتاؤ روپ کمار، کیا تم اس کے تیرِ نظر کے گھائل نہیں ہو گئے تھے؟“

روپ کمار نے گردن جھکا لی۔ چند منٹ وہ اسی طرح گردن جھکائے بیٹھا رہا اور ایک بار پھر وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ”سروپ بھیّا! بھگوان میں تو مر گیا تھا ـ میں تو مر ہی گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا بھیّا کہ اگر میں مقابلے میں جیت نہ سکا تو اپنے مقابل سے اس طرح لڑوں گا کہ وہ مجھے ہلاک کر دے۔ بس میں مر کر ہی میدان سے ہٹنا چاہتا تھا۔“

”کیوں روپ کمار؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے اس سے پریم ہو گیا ہے مہاراج! میں پدمنی پر مرمٹا ہوں ـــ بھگوان کی سوگند، اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے راج گدی نہیں چاہیے بھیّا۔ مجھے اس کی کوئی چنتا نہیں ہے مگر پدمنی ـــ“

”تم اچھے انسان ہو روپ کمار! تم نے اعتراف کر لیا۔“

”تم بھی ایک بات بتاؤ گے بھیّا؟“

”ہاں۔ ضرور۔“

”کیا تمھیں پدمنی پسند نہیں آئی تھی؟“

”بہت پسند آئی تھی روپ کمار! مگر اس پسند کی حیثیت بدلی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے بھائی کی پتنی اور اپنی بھاوج کی حیثیت سے پسند کیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم مہان ہو بھیّا! مگر ـــ“ روپ کمار اُداس ہو گیا۔ ”مگر کیا ضروری ہے کہ سوئمبر میں، پدمنی مجھے ہی پسند کرے؟“

”پدمنی اگر پاگل نہیں ہے تو تمھارا انتخاب ہی کرے گی۔ تم سب سے زیادہ من موہن ہو اور پھر چاروں طرف تمھاری دھوم مچی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے روپ کمار، وہ تمھارا ہی انتخاب کرے گی۔ وہ مالا تمھارے ہی گلے میں ڈالے گی۔“ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور روپ کمار خاموش ہو گیا۔

”راجہ ترکھان نے مجھے اپنے محل میں طلب کیا ہے۔“

”اوہ۔ ہاں میں نے اس کے آدمی کو تمھارے پاس آتے دیکھا تھا۔ ضرور جاؤ بھیّا۔ دیکھو وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔“

”میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے۔ میرے اوپر بھروسہ رکھنا روپ کمار۔“

”مجھے تمھارے اوپر پورا پورا وشواش ہے میرے دوست۔“ روپ کمار نے کہا اور ہم خاموش ہو گئے۔ پھر باہر سے کچھ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ کچھ فراخدل لوگ تھے جو مقابلے میں ہار گئے تھے اور ہمیں بدھائی دینے آئے تھے۔ ہم نے بھی خلوصِ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر شام ہو گئی۔ سورج چھپے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ راجہ ترکھان کا آدمی میرے پاس پہنچ گیا۔ ”مہاراجہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔ کیا آپ تیار ہیں مہاراج؟“ اس نے کہا۔

”ہاں!“ میں نے جواب دیا۔

روپ کمار اس وقت اپنے خیمے میں تھا۔ میں نے اس سے ملنا ضروری نہ سمجھا۔ میں یہ بات اسے بتا چکا تھا چنانچہ میں راجہ ترکھان کے آدمی کے ساتھ چل پڑا۔ خیمے سے باہر دو گھوڑے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے گھوڑے پر بیٹھنے کی پیش کش کی اور میں گھوڑے پر بیٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستہ جانا پہچانا تھا، گھوڑے کا سفر زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا اس لیے جلد ہی میں راج محل پہنچ گیا۔

راج محل کے دروازے پر راجہ ترکھان کے چند خاص آدمیوں نے میرا استقبال کیا اور مجھے بڑے احترام سے اندر لے گئے۔ راج دربار کے پیچھے راجہ ترکھان کا خاص کمرہ تھا جہاں وہ شاید راج نیتی کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ راجہ ترکھان نے بھی ایک پُرخلوص مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا اور مجھے بڑے احترام و اعزازات کے ساتھ بیٹھنے کی پیش کش کی گئی۔ میں بیٹھ گیا۔ تب راجہ کے ساتھ موجود دوسرے لوگ کمرے سے باہر نکل گئے۔ راجہ ترکھان

خود بھی میرے سامنے ایک نشست پر بیٹھ گیا۔

اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں "تمھارا نام سروپ کمار ہے مہاراج؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں راجہ ترکھان!"

"اور تم روپ کمار کے داس ہو؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن نہ جانے کیوں یہ بات میرے من میں نہیں اُتر رہی؟" راجہ ترکھان بولا۔

"کون سی بات مہاراج؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ تم روپ کمار کے داس ہو سکتے ہو۔"

"اس میں من سے نہ اترنے والی کون سی بات ہے؟" میں نے بےتکلفی سے کہا۔

"تمھارا چہرہ، تمھارا انداز، کوئی چیز یہ ثابت نہیں کرتی کہ کسی کے داس ہو سکتے ہو بلکہ سچ پوچھو تو مجھے تم ہی راجکمار معلوم دیتے ہو۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولو مہاراج، میرا خیال ہے تم نے روپ کمار کے ساتھ کوئی وچن نبھایا ہے ورنہ یہ سوئمبر تم آسانی سے جیت سکتے تھے۔" راجہ ترکھان نے کہا۔

"ممکن ہے تمھارا خیال ٹھیک ہو راجہ ترکھان، لیکن اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، سوئمبر ابھی نہیں ہوا اور نہیں کہا جا سکتا کہ مالا کس کے گلے میں ڈالی جائے لیکن پھر بھی میرا مالک، میرا دوست روپ کمار تمھاری بیٹی کی قسمت کا مالک بن جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔ مجھے مسرت ہوگی۔" میں نے کہا۔

"مجھے کوئی کرودھ نہیں ہے مہاراج، بس میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم کون ہو؟ تمھارے بدن پر سادھوؤں کا سا لباس ہے، پرنت میدانِ جنگ میں تم ایسے سورما ثابت ہوئے کہ کوئی بھی تمھارے سامنے نہ ٹک سکا۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے سروپ کمار، میری منوکامنا یہی تھی کہ میری بیٹی جس سے بیاہی جائے وہ تمھارے جیسا ہی کوئی جوان ہو جو بہادری میں یکتا اور بےمثل ہو۔" راجہ ترکھان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"روپ کمار بھی تمھارے لیے بُرا ثابت نہ ہوگا راجہ ترکھان!"

"ٹھیک ہے ۔ جو بھگوان کی مرضی ـــ لیکن میں نے تمھیں صرف اسی لیے بلایا تھا کہ تمھیں تمھارا فیصلہ بدلنے کے لیے کہوں۔ میں چاہتا ہوں سروپ کہ تم میری راجدھانی کے مالک بنو اور تم ہی میری بیٹی کی قسمت کے مالک ہو۔"

"یہ کسی طور ممکن نہیں ہے راجہ ترکھان۔ بھگوان نہ کرے اگر میں روپ کمار کا ساتھی نہ بھی ہوتا تب بھی میں یہ بات پسند نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"آخر کیوں؟" راجہ ترکھان نے کہا۔

"بس، مجھے سنسار کا لوبھ نہیں ہے۔ میں راجہ بننا نہیں چاہتا میرے شریر پر سادھوؤں کا لباس ہے۔ بس تم سمجھ لو کہ میں سادھو ہی ہوں۔ مجھے سنسار کا کوئی لوبھ نہیں ہے۔ مجھے راج سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے مہاراج، پھر یوں کہو کہ میرا خیال ٹھیک تھا۔"

"یہ میری اور تمھاری آپس کی بات ہے راجہ ترکھان لیکن اگر سارے راجکماروں کے سامنے تم یہی بات کروگے تو میں خود کو روپ کمار کا داس ہی بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میں تم سے سب کے سامنے یہ سوال نہیں کروں گا مہاراج۔" راجہ ترکھان ٹھنڈی سانس لیکر بولا "بہرحال جو میری آشا تھی، وہ میں نے تمھیں بتا دی۔ واگیاوان ہے روپ کمار کہ اسے تمھارے جیسا مِتّر، ساتھی یا داس ملا۔ ہاں ایک بات میں تم سے کہوں گا اور کہہ سکتا بھی ہوں، کیا اجازت ہے؟"

"ہاں ہاں۔ مہاراج ۔کہیے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"سوئمبر میں کوئی بھی کامیاب ہو، مالا کسی کے گلے میں پڑے لیکن اگر تم پسند کرو اور اگر روپ کمار سے تمھارا کوئی ایسا رشتہ نہ ہو، کوئی ایسا ناطہ نہ ہو جس کی وجہ سے تم اس کی بات ماننے پر مجبور ہو تو میری اِچّھا ہے کہ تم کچھ سمے میرے ساتھ میری راجدھانی میں گذارو۔" راجہ ترکھان نے نہایت خلوص سے کہا۔

"اگر تمھاری پدمنی میرے مِتّر کو پسند کر لیتی ہے تو شاید میں کافی عرصہ تمھارے ساتھ رہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔" راجہ ترکھان بولا۔ "مجھے تم سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ میدانِ جنگ میں تم شیر کی طرح نڈر نظر آ رہے تھے اور میں دلیروں کی قدر کرتا ہوں۔"

"میں تمھاری اس محبت کی قدر کرتا ہوں مہاراج ترکھان۔" میں نے جواب دیا۔

"رات کا بھوجن تم میرے ساتھ ہی کرو۔" راجہ نے کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا اور پھر راجہ ترکھان مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ درحقیقت وہ مجھ سے بہت متاثر نظر آتا تھا اور یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی پروفیسر۔ گذرے ہوئے ادوار میں میں نے ہمیشہ ایک خاص حیثیت حاصل کی تھی۔ میری شخصیت ہی ایسی تھی کہ کوئی مجھے نظرانداز نہیں کر پاتا تھا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کچھ معاملات میں کچھ لوگ مجھے ناپسند بھی کرتے تھے لیکن ناپسند کرنے والوں کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔

رات کے کھانے پر میں نے راجہ ترکھان سے کہا "مہاراج! آپ نے مجھے جتنی محبت دی ہے، جتنا پریم دیا ہے، اس کا سہارا لیکر میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں کہو سروپ جی۔ کیا بات ہے؟"

"میں چاہتا ہوں مہاراج کہ تمھاری پدمنی کل سوئمبر سے پہلے ایک بار میرے مِتّر سے مل لے۔ ہمارا تمھارا ناطہ اس وقت بہت مضبوط ہو جائے گا جب میرا مِتّر تمھارا داس بن جائے گا۔"

"اوہ۔" راجہ پُرخیال انداز میں بولا "اگر کماری پدمنی نے اسے پسند نہ کیا تو؟"

"یہ میرے مِتّر کے بھاگ کی بات ہے لیکن اگر آپ میری بات مانیں تو ان کو ملنے کا موقع دیں۔"

"ٹھیک ہے ۔ میں کماری سے بات کر لیتا ہوں۔" راجہ ترکھان بولا۔

"مجھے آگیا دیں مہاراج۔" میں نے اس سے اجازت چاہی اور راجہ ترکھان نے مجھے شاہی لباس سے نوازا۔

"میں نے تمھارے بدن کا لحاظ کر کے یہ لباس تیار کرایا ہے، اسے میری خوشی کے لیے پہن لو۔" اس نے کہا اور میں نے اس کی خوشی پوری کر دی۔ پھر میں گھوڑے پر بیٹھ کر واپس چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ روپ کمار میرا انتظار کر رہا ہوگا۔

میرا خیال ٹھیک تھا۔ روپ کمار دُور سے ہی مجھے اپنے خیمے کے سامنے ٹہلتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کے انداز سے بےچینی صاف جھلک رہی تھی۔ میرے گھوڑے کو دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا۔ پھر میرے بدن کے لباس کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور پھر اس کی آنکھوں سے خوشی جھانکنے لگی۔ اس نے میرے گھوڑے کی باگیں پکڑ لیں اور میں نیچے اُتر آیا۔ روپ کمار پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"بڑے ہی سُندر لگ رہے ہو بھیّا!" اس نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"شاید۔ لیکن اِن لباس کے بغیر ٹھیک نہیں لگ رہا تھا؟"

"بھگوان کی سوگند بھیّا، اُس وقت بھی تم بڑے ہی سُندر لگ رہے تھے۔ بس میں تمھیں ایسے کپڑوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"تم میرا انتظار کر رہے تھے روپ کمار؟" میں نے اس کے ساتھ اپنے خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"بڑی بےچینی سے بھیّا۔"

"تمھارے من میں بہت سے بُرے بُرے خیالات آ رہے ہوں گے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا اور روپ کمار میری شکل دیکھنے لگا۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"میری بات پر وشواش کروگے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں۔ میں دھرم کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ میرے من میں کوئی بُرا خیال نہیں آیا۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میرا بھیّا کوئی ایسا کام کرے گا جو میرے لیے بُرا ہو اور یہ سوچنا بےوقوفی بھی تھی بھیّا۔ جس منش نے بھرے بیچ میرا داس بن کر میری سہائتا کی ہے وہ میرے خلاف کوئی کام کیسے کرے گا۔ میں تو بس اس لیے تمھاری باٹ تک رہا تھا کہ پوچھوں تو سہی راجہ ترکھان تم سے کیا کہنا چاہتا ہے۔"

"ہوں۔ راجہ ترکھان میرے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں۔ کیا میں واقعی روپ کمار کا داس ہوں اور میں نے اسے وشواش دلا دیا۔"

"کیا وشواش دلا دیا؟" روپ کمار نے بےچینی سے پوچھا۔

"یہی کہ میں روپ کمار کا داس ہوں۔"

"اوہ!" روپ کمار نے گردن جھکا لی۔ کافی دیر تک اسی طرح گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لیکر بولا "میں تم سے بہت شرمندہ ہوں سروپ بھیّا!"

"پگلا ہے تو۔" میں نے اس کے گال پر پیار سے چپت لگائی۔ "بس اب اس بارے میں کچھ مت سوچ اور ہاں تھک تو نہیں گیا؟"

"کیوں؟" روپ کمار نے چونک کر پوچھا۔

"پوچھ رہا ہوں، تھکن تو نہیں ہو گئی؟"

"تم نے مجھے کرنے ہی کیا دیا ہے بھیّا جو میں تھکتا۔ سارے کشٹ تو تم نے خود بھوگے ہیں۔" روپ کمار نے درد بھرے انداز میں کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر کے بعد کماری پدمنی کی کوئی داسی تمھارے پاس آئے گی۔ میرا خیال ہے پدمنی آج رات تم سے ملاقات کرے گی۔"

"مجھ سے؟" روپ کمار متحیرانہ انداز میں بولا۔

"ہاں!"

"مگر کیا ۔ کیا راجہ ترکھان نے ایسی کوئی بات کہی ہے؟" اس نے بےچینی سے پوچھا۔

"ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"راجہ ترکھان نے؟" روپ کمار کے لہجے کی حیرت اور بڑھ گئی۔

"تجھے ان باتوں سے کیا غرض روپ کمار، تو بتا کیا تو پدمنی سے ملنا چاہتا ہے؟"

"میں اس سے مل کر کیا کروں گا بھیّا، کیا کہوں گا؟"

"اب یہ بھی میں ہی بتاؤں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم ہی بتا دو۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے عقل نام کی کوئی چیز میرے پاس ہی نہ رہی ہو۔"

"ہوں۔" میں نے گہری سانس لیکر کہا "من کا بھید کہہ دینا اس سے۔"

"کیا اس کا موقع ملے گا؟" روپ کمار نے پوچھا۔

"ظاہر ہے وہ تجھ سے باقاعدہ ملاقات کرے گی۔" میں نے کہا۔

"لیکن بھیّا، کیا وہ اس بات کا بُرا نہیں مان جائے گی؟"

"اب یہ تو تیری کوششوں پر ہے تو اسے شیشے میں اتارنے پر کس قدر کامیاب ہوتا ہے۔ اگر آج رات کو تو اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے تو کل سوئمبر میں مالا کے فیصلے میں کوئی تاخیر نہ ہوگی۔"

روپ کمار کی آنکھوں میں آشا کے دیپ جل اٹھے۔ تصور کی آنکھوں سے اس نے مالا پدمنی کے ہاتھ میں اور پھر اپنے گلے میں دیکھی، اس نے محسوس کیا جیسے سینکڑوں کینہ توز نگاہیں اسے دیکھ رہی ہوں، گھور رہی ہوں اور اس کا سینہ خوشی سے پھول گیا۔ ہاں پدمنی نے اسے اپنے پتی کی حیثیت سے چُن لیا تھا۔ پدمنی آکاش سے اتری ہوئی اپسرا، اس کے گھر کا جلتا ہوا دیپ، وہ دیری موجودگی بھول کر خوابوں میں کھو گیا اور میں نے اسے ان خوابوں سے نہ چونکایا۔ خواب زندگی کا سہارا ہوتے ہیں۔ خوابوں میں آدمی سکون کی وادیاں حاصل کر لیتا ہے۔ اگر خواب نہ ہوں تو انسان کے سینے میں ویران صحرا پیدا ہو جائیں۔ سو میں نے اسے خوابوں میں کھوئے رہنے دیا اور اس وقت تک کچھ نہ بولا جب تک باہر سے کسی کی آواز نے اسے

چونکا نہ دیا۔

"میں اندر آسکتی ہوں مہاراج؟" ایک نسوانی آواز ابھری۔

میں چونک پڑا اور روپ کمار اچھل پڑا۔

"آجاؤ۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی اندر داخل ہوگئی۔ اس نے ہم دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"داسی ہوں مہاراج!" وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ "روپ کمار جی کون ہیں؟" اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہیں۔ بتاؤ کیا بات ہے؟" میں نے روپ کمار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"روپ جی! کیا میرے ساتھ باہر چلیں گے؟" اس نے روپ کمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر میرا گھر والا بھی موجود ہے۔"

"جاؤ، روپ کمار تم اس کے ساتھ باہر جاؤ اور ہاں فکر نہ کرو۔ باہر اس کا گھر والا بھی موجود ہے۔" اور روپ کمار جھینپے ہوئے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ میری طرف معذرت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا اور میں نے دونوں نگاہوں سے اسے چلے جانے کو کہا۔ روپ کمار لڑکی کے ساتھ باہر نکل گیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جا بھائی۔ رام بھلی کرے۔" میں نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اطمینان سے اپنی جگہ لیٹ گیا۔ دو عاشق عشق کر رہے تھے۔ میرا بھلا اس میں سوچنے یا دخل دینے کا کیا جواز تھا۔ چنانچہ میں سارے خیالات ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور پھر دوسری صبح ہی روپ کمار سے ملاقات ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ رات کے کس حصے میں واپس آیا تھا۔ مجھے اس کے آنے کی کوئی خبر نہ تھی میرے خیمے میں آکر اس نے میرے پاؤں چھوئے اور میں چونک پڑا۔

"آؤ۔ روپ کمار میں تو تمھاری واپسی کا انتظار بھی نہ کر سکا اور پھر انتظار کرنا بھی فضول تھا۔ جب ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو ملنے کسی جگہ جائے تو اس کے دوست کو اس کی واپسی کے وقت کا تعین نہیں کرنا چاہیے کیونکہ محبوبہ سے ملاقات میں واپسی کے وقت کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔" میں نے کہا اور روپ کمار مسکرا دیا۔

روپ کمار کے چہرے کی تازگی اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ رات کی ملاقات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو کتنی ہی کٹھن کیوں نہ ہو، بہرصورت خوشگوار رہی ہے اور اس میں ایسی کوئی بات پیدا نہیں ہوئی جس کی وجہ سے روپ کمار آزردہ ہو۔ بہرصورت میں اس ملاقات کا حال جاننے کیلیے بے چین تھا۔

"کہو مادھولال، منہ سے تو بولو، کیا ہوا، ملاقات ہوئی؟"

"ہاں بھیا!" روپ کمار شرماتے ہوئے بولا۔

"ارے واہ میرے شیر تو پدمنی سے بہت کچھ سیکھ آیا ہے۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"پدمنی سے؟" روپ کمار نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

"یہ شرم و حیا، یہ لجانا لچکنا۔" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا اور روپ کمار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"ارے نہیں بھیا میں نے اس سے یہ سب کچھ نہیں سیکھا۔"

"چلو ٹھیک ہے مان لیا یہ ساری باتیں تمھیں پہلے سے آتی تھیں لیکن اب یہ تو بتاؤ پدمنی سے ملاقات کیسی رہی؟"

"بالکل ٹھیک بھیا۔ میں تو سوچتا ہوں کہ تم بھگوان کا روپ ہو۔ تم میرے جیون میں کیا آئے روشنیاں ہی روشنیاں جل اٹھیں۔" روپ کمار عقیدت سے بولا۔

"اچھا، اچھا۔ میں کہتا ہوں پدمنی کی باتیں کرو اور تم میری ہی باتیں کرنے لگ گئے۔"

"پدمنی کی کیا بتاؤں بھیا۔ پہلی نگاہ میں اجنبیت تھی، دوسری میں پسندیدگی اور تیسری میں محبت۔ بس یہ ساری کہانی ہے۔" روپ کمار بولا۔

"واہ، واہ۔ ایسے نہیں چھوڑوں گا ساری بات بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"ساری بات کیا بتاؤں بھیا۔" روپ کمار بولا۔

"اچھا اچھا ابھی نہ مالا گردن میں آئی نہ سگن ہوئے نہ پھیرے اور ہم سے باتیں چھپانا بھی شروع کر دیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں بھیا، بھلا آپ سے کیا چھپاؤں گا بس داسی مجھے اس کے پاس لے گئی۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی میں تمھیں بتا چکا ہوں، وہ مجھے دیکھتی رہی، پہلے شرم کی وجہ سے کچھ نہ بول سکی اور اس کے بعد اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میں نے مختصراً اسے اپنے بارے میں بتایا پھر اس نے میری خاطر مدارت کی۔ مجھ سے مزید سوالات پوچھتی رہی۔ اب میں تمھیں کیا بتاؤں بھیا ایسا لگتا تھا جیسے اس کے من میں بھی میرے لیے کوئی جگہ بن گئی ہو۔"

"واہ کیوں نہیں بنتی۔ کوئی معمولی انسان ہے میرا روپ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس بھیا اس نے کہا کہ اس کے پتا نے اسے آگاہ دی ہے کہ مجھ سے مل لے پھر بس کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ اس نے چلتے سے مجھ سے پوچھا کہ کیا کل میں سوئمبر میں آؤں گا۔ عجیب سوال تھا۔ ظاہر ہے میں سوئمبر میں شریک ہونے کے لیے ہی آیا تھا پھر بھی میں نے اس کے سوال کا یہی جواب دیا کہ میں ضرور آؤں گا۔

اور پھر چلتے سمے اس نے مجھ سے پھر کہا اس وقت جب میں اس کے کمرے کے دروازے سے نکل رہا تھا کہ وہ کل میری باٹ تکے گی۔" روپ کمار کا انداز اس کے چہرے پر شرم کی سرخی، بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے دل کھول کر اس کا مذاق اڑایا، اس سے شرارت بھری باتیں کیں اور پھر اسے سو جانے کیلیے کہا۔

"رات بھر جاگتے رہے ہو تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ ورنہ ایسا نہ ہو کہ کل سوئمبر کے سمے اونگھ رہے ہو۔"

"اونگھ نہیں آئے گی بھیا۔ تم اطمینان رکھو۔"

"ارے ہاں اب تو تم مہینوں نہیں سوؤ گے بہرحال میری طرف سے بدھائی ہو۔" میں نے خلوص دل سے کہا اور روپ کمار نے ایک بار پھر عقیدت سے میرے پاؤں چوم لیے۔

سوئمبر کا دن آگیا۔ روپ کمار جی خوب بن ٹھن کر سوئمبر کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔ میری ان کے ساتھ جانے کی کوئی تک نہ تھی چنانچہ میں خیمے پر ہی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا حالانکہ میرے مل میں یہ رسم دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔

لیکن پروفیسر اس خواہش کو دبانا ہی پڑا۔ بعد میں اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کی جا سکتی تھیں لیکن اس وقت وہاں جانا ٹھیک نہ تھا حالانکہ مشرقی لڑکیوں کے بارے میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایک بار جسے دل میں بسا لیتی ہیں پھر دوسرا مرد شادی ان کی نگاہ میں جگہ پا سکتا ہے لیکن میں احتیاطاً وہاں جانا نہیں چاہتا تھا جو کسی حادثے کا سبب بن جائے۔ چنانچہ میں انتظار کرتا رہا اور پھر سوئمبر کی تفصیلات مجھے روپ کمار ہی سے معلوم ہوئی تھیں۔

وہ لوگ جو سوئمبر میں مدعو نہیں کیے گئے تھے اپنا کاٹھ کباڑ سمیٹ کر واپس جا چکے تھے۔ جانے والوں میں دلاور سنگھ بھی تھا اور دلاور یہ دھمکی دے گیا تھا کہ راجہ ترکھان نے اسے اپنے ادوار بلا کر اس کا اپمان کیا اور وہ اس اپمان کا بدلہ ضرور لے گا بہرحال راجہ ترکھان بھی موم کا بنا ہوا نہیں تھا۔ یہی بہتر تھا کہ دلاور سنگھ نے اس کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی ورنہ شاید اسی وقت ہنگامہ شروع ہو جاتا۔

بہرحال دلاور سنگھ کے علاوہ وہ دوسرے راجکمار جو سوئمبر میں شریک تھے ناکام ہونے کے بعد منہ لٹکائے لٹکائے اپنے خیموں میں واپس آگئے تھے۔ بہت کم ایسے تھے جن کی نگاہوں میں روپ کمار کے لیے نفرت کے جذبات نہ ہوں، بہرحال وہ بے بس تھے۔ راجکماری پدمنی نے روپ کمار کو پسند کر لیا یہ تو اس کے بھاگ تھے۔ پھر بہت سے لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے سے باہر آئے اور روپ کمار کے نزدیک پہنچ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ اب اس کی حیثیت راجہ کے مہمان کی سی ہے اسے چند روز راج محل میں رہنا ہوگا۔

ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا یہاں بھی راجہ کے مہمان تھے اور راج محل میں بھی انھی کے مہمان رہیں گے چنانچہ میں اور روپ کمار ان لوگوں کے ساتھ چل پڑے۔ راج محل میں ہمارے قیام کا اچھا خاصا بندوبست کیا گیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ جگہ اس عقبی باغ سے دور نہیں تھی جہاں پہلی بار میں نے اور روپ کمار نے راجکماری پدمنی کو دیکھا تھا۔ گویا اگر راج کمار روپ، پدمنی سے ملنا چاہتا تو اس کو زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔

مالا روپ کمار کے گلے میں ڈالی جا چکی تھی اس لیے اب اس کی حیثیت پدمنی کے منگیتر کی سی تھی اور خود راجہ ترکھان کو ان دونوں کی ملاقات پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا اور یہی ہوا بھی۔ محل میں داسیاں اور دوسرے نوکر ہماری بہترین مہمانداری کر رہے تھے۔ خود راجہ ترکھان دن میں دو تین بار مجھ سے ملاقات ضرور کرتا تھا اور ویسے بھی وہ مجھ سے بہت متاثر تھا اور اس نے کئی بار کہا تھا کہ صحیح بات تو یہ ہے کہ میری ہی وجہ سے روپ کمار کو یہ عزت اور یہ حیثیت ملی ہے ورنہ شاید بذات خود روپ کمار یہ مقام حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ بھی کہتا کچھ بھی کرتا میں نے اپنے دوست سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ پھر تقریباً دس یا بارہ روز کے بعد روپ کمار کو وہاں سے جانے کی اجازت مل سکی تھی۔ اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے پتا سے مہورت نکلوا کے آئے اور تاریخ بھجوا دے کہ کب وہ پدمنی کو بیاہنے آرہے ہیں۔ میں نے بھی روپ کمار کے ساتھ جانا چاہا لیکن راجہ ترکھان نے مجھے روک لیا۔

"نہیں مہاراج، تم نہیں جاؤ گے۔ تم کہاں جاؤ گے؟"

"اوہو۔ ترکھان جی روپ میرا بھیا ہے اور میں اپنے بھیا کے ویاہ میں شریک نہ ہوں گا کیا؟"

"اور میں جو تمھارا سب کچھ ہوں مہاراج، مجھے ٹھکرا دو گے۔" راجہ ترکھان نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ تم ایک اچھے انسان ہو، میں تمھاری دل سے عزت کرتا ہوں۔"

"تب پھر مہاراج تم میرے ساتھ رہو۔"

اور میں نے روپ کمار سے راجہ ترکھان کے پاس رہنے کی اجازت لے لی۔ روپ کمار نے کہا تھا کہ اس کی دلی خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ اس کی راجدھانی چلوں جہاں اس کے پتا سے ملوں اور اس کے بعد اس وقت یہاں آؤں جب روپ کمار، پدمنی کو بیاہنے آئے لیکن بہرحال راجہ کے اصرار کی وجہ سے اس نے بھی خوشی سے اجازت دے دی تھی بس اس کے بعد کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ راج محل تھا، راجہ ترکھان تھا اور میں۔

وہ میری بہت سی باتوں سے واقف ہو گیا تھا اور پروفیسر کوئی مجھے جانے مجھ سے واقف ہو اور اسے مجھ پر حیرت نہ ہو یہ بھی تو حیرت انگیز بات تھی۔ راجہ ترکھان بھی میرے بارے میں تجسس میں ڈوب گیا تھا اور اس کی ذہنی وسعت اس قدر نہ تھی کہ وہ مجھے پہچان سکتا یا میری حقیقت جان سکتا۔ ہاں اس کے سوا جو کچھ میں اسے بتا نہ دوں۔ بہرصورت میں نے یہاں اپنی کسی خاص قوت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور ایک عام سادھو کے انداز میں راجہ ترکھان کے پاس رہ رہا تھا۔

کچھ وقت گذرا تو روپ کمار کی طرف سے اس کے پتا اور اس کی راجدھانی کے چند بڑے یہاں آئے اور آنے کے بعد شادی کی مہورت طے کر دی گئی اور پروفیسر اس وقت کے حالات اس وقت تک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے جب تک کہ شادی کے دن قریب نہ آگئے۔ پہرے داروں نے اطلاع دی کہ کوئی عظیم الشان گروہ ہتھیاروں سے مسلح اس طرف آرہا ہے۔

راجہ ترکھان حیران رہ گیا تھا اور پھر اس نے اپنا گھوڑا تیار کروایا اور چند سواروں کو ساتھ لیکر چل پڑا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ جنگ کی نیت سے آرہے یا کوئی اور مقصد ہے۔ شاید اس بات پر اسے حیرت بھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے دشمنوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا اور پھر قلعے کی فصیلوں کے اوپر چڑھ کر ہم نے بہت دور پڑاؤ کرنے والے لشکر کو دیکھا۔ بے شمار افراد تھے اور ان کے جھنڈے فضا میں لہرا رہے تھے۔ راجہ ترکھان ان جھنڈوں کو دیکھ کر چونک پڑا اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔

"اوہ! دلاور سنگھ!"

”دلاور سنگھ؟“ میں نے متعجبانہ لہجے میں پوچھا۔

”کرنا کا نیا نیا راجہ دلاور سنگھ!“ راجہ ترکھان نے سرد لہجے میں کہا۔

”کیا یہ وہی دلاور سنگھ ہے جو سوئمبر میں شامل نہ ہو سکا تھا اور جس نے مجھ سے شکست کھائی تھی؟“

”وہی ہے ___ اور یہاں سے جاتے ہوئے وہ دھمکی دے گیا تھا کہ اپنے اپمان کا بدلہ لے گا۔“

”تو وہ بدلہ لینے آیا ہے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں۔ بدلہ لینے آیا ہے۔“ راجہ ترکھان نے بھی مذاق اڑانے والے انداز میں کہا اور پھر دلاور سنگھ کی فوجوں کی طرف نگاہیں دوڑا کر بولا۔ ”مگر اس کے قبیلے میں تو اتنے لوگ نہ تھے، یہ فوجیں کہاں سے جمع کر لایا ہے؟“

”کافی افراد ہیں ترکھان!“ میں نے کہا۔

”اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ سب اس کے قبیلے سے نہ ہوں گے۔“

”ممکن ہے اس نے کسی دوسرے قبیلے کے لوگوں سے مدد حاصل کی ہو۔“

”سب کچھ ممکن ہے۔ دلاور سنگھ کا گرم خون ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اس کے جیون کا پہلا رن ہوگا۔ اس کے باپ کو مرے ہوئے زیادہ سمے نہیں گذرا اور وہ بے چارہ اتنا برا انسان بھی نہ تھا لیکن بعض اوقات پوتر جگہوں سے بھی سانپ نکل آتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ مہورت قریب آ گئی ہے، صرف اسی کا خیال ہے کہیں رنگ میں بھنگ نہ ہو ___ لیکن پھر بھی چاہے کچھ بھی ہو دلاور سنگھ کو اس کی جرأت کا مزہ ضرور چکھایا جائے گا۔“

”تم فکر نہ کرو راجہ ترکھان۔ ایک بات تو تم جانتے ہو کہ میں تمھارا دوست ہوں!“ میں نے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ مجھے تمھاری دوستی پر ناز ہے۔“ ترکھان نے جواب دیا۔

”تب پھر یوں کرو کہ قلعے کے اندر تم راجکماری پدمنی کی شادی کی تیاریاں کرتے رہو، میں میدان میں جا کر دلاور سنگھ کے حواس درست کر کے آتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔ میرے سورما مجھے تجھ پر پورا پورا وشواش ہے مگر تو مہمان ہے اور ہم مہمانوں کو جنگ کرنے نہیں بھیجتے۔“ راجہ ترکھان نے جواب دیا۔

”میں مہمان ہوں راجہ ترکھان؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔ مہمان ہو ___ مگر اپنوں سے بڑھ کر۔“

”نہیں نہیں ایک بات پر قائم رہنا ہوگا ترکھان۔ کیونکہ اگر میں مہمان ہوں تو میرے خیال میں مہمان کی حیثیت سے کسی کے گھر رہنا زیادہ دیر تک اچھی بات نہیں ہے۔ مجھے جانے کی آگیا دو ___ اور اگر میں مہمان نہیں ہوں، تمھارے گھر کا ایک فرد ہوں تو پھر تم مجھے دلاور سنگھ کے مقابلے پر جانے دو۔“

راجہ ترکھان پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے لیے میری یہ ضد بڑی پریشان کن تھی۔ لوگوں سے یہ بھی نہ کہلوانا چاہتا تھا کہ راجہ ترکھان خود محل میں رہے، مہمانوں کو جنگ کے لیے بھیجنا چاہتا ہے اور خود محل میں رہ کر بیٹی کی شادی کی تیاری کر رہا ہے لیکن میری ضد کے آگے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ البتہ فوجوں کی نگرانی اس نے خود کی تھی۔ اپنی نگرانی میں اس نے فوجیں تیار کروائیں اور پھر انھیں میرے حوالے کر دیا۔ راجہ ترکھان کا خیال تھا کہ چونکہ دلاور سنگھ کی فوجیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں اس لیے قلعہ بند کر کے دلاور سنگھ کے حملے کا انتظار کیا جائے اور قلعے کے اوپر فصیلوں پر ساری جنگی تیاریاں مکمل کر لی جائیں اور وہیں سے دلاور سنگھ کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے۔ جب اس کی افرادی قوت مفلوج ہو جائے تو پھر تازہ دم فوجوں کے ساتھ باہر نکل کر اسے پسپا کر دیا جائے۔

تجویز بری نہیں تھی لیکن پروفیسر مجھ جیسے انسان کے سامنے پیش کی گئی تھی، جس کے سامنے کوئی دشمن ہو تو وہ کسی شکاری کتے کی طرح زنجیریں تڑانے لگتا ہے۔ میں یہ بات کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ قلعے میں بند ہو کر اپنے دشمن کا انتظار کروں جس سے مجھے جنگ کرنی تھی۔ میں نے راجہ ترکھان کی یہ بات نہیں مانی اور راجہ ترکھان نے اس بات پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کیونکہ اتنا وہ بھی جانتا تھا کہ قلعوں میں بند ہو کر لڑنا بہادری نہیں ہوتی۔

اور بہادر مصلحتوں کے قائل نہیں ہوتے۔

”واہ۔ کیا عمدہ بات کہی ہے تم نے۔“ پروفیسر خاور بے اختیار بول اٹھا اور اس نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے تاریخ کی کہانی بے کم و کاست تمھیں سنائی ہے پروفیسر میں نے بعض جگہوں پر مصلحت سے بھی کام لیا لیکن وہ مصلحت مکاری کی حد تک نہیں تھی۔“

”ہاں مجھے اعتراف ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔

”پھر کیا ہوا؟“ فرزانہ بول اٹھی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تمھاری لڑکیاں جس صبر و سکون سے یہ کہانی سن رہی ہیں پروفیسر، وہ قابلِ داد ہے۔ مس فرزانہ تو اس میں سکتہ برداشت ہی نہیں کر سکتی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دراصل، اس ماحول سے واپس آنے کے بعد دوبارہ وہاں جانا بے حد عجیب لگتا ہے۔ ہم خود کو وہیں محسوس کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ہماری آنکھیں اچانک بند کر دی گئی ہوں۔“ فرزانہ نے اسے دادِ تحسین پیش کی۔

”میں نے اپنے طور پر فوجوں کو منظم کیا اور اپنے انداز میں جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے فوجوں کو قلعے کے چوبی دروازے کے پیچھے منظم کیا اور انھیں تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ بظاہر فصیلوں پر کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ بس یوں لگتا تھا جیسے دلاور سنگھ کی فوجوں کی نگرانی کی جا رہی ہو اور قلعے کی طرف سے کسی حملے کا کوئی امکان نہ ہو۔ چنانچہ دلاور سنگھ مطمئن تھا۔ وہ اپنی فوجوں کی کثرت سے ترکھانی والوں کو خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر جب اچانک چوبی دروازہ کھلا اور اس نے ایک دم فوجیں اگل دیں تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کی فوجیں منظم بھی نہیں تھیں اور غیر فوجی کاموں میں مصروف تھیں۔ ترکھان کی فوجیں شکاری کتوں کی طرح ان

پر ٹوٹ پڑیں۔ پہلے ہی حملے میں سخت نقصان پہنچا تھا دلاور سنگھ کی فوجوں کو۔ اور اس وقت تک جب تک وہ سنبھل کر جنگ کرنے کے لیے تیار ہوتیں، میرے ساتھی اس کی آدھی فوجوں کا صفایا کر چکے تھے اور پھر وہ باقی فوجوں کو بھی جلد از جلد کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

رہی میری بات تو کبھی کبھی تو کھیت کاٹنے کے مواقع نصیب ہوتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ میں نے اپنے لیے اپنی پسند کا ایک کھانڈا تیار کر لیا تھا اور بہت عرصے کے بعد کھانڈے پر ورزش کرنے کا موقع ملا تھا۔ کھیتی سرسبز تھی۔ کمی نہ تھی چنانچہ میں نے پوری قوت سے اس کی صفائی شروع کر دی اور دلاور سنگھ کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ اس نے خوفناک غلطی کی ہے لیکن ایسے مواقع تو احساس کے لیے بھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں تو اس کی تاک میں تھا ہی، اپنے سامنے کے گھاس پھونس کو صاف کرتا ہوا میں بالآخر اس تک پہنچ گیا۔ ”دلاور سنگھ! سورما۔ آؤ جنگ سے پوری طرح لطف اٹھاؤ۔“ میں نے اسے للکارا۔

”تم ابھی تک یہاں موجود ہو سروپ کمار؟“ دلاور سنگھ خوفزدہ انداز میں بولا۔

”ہاں۔ تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ تم اپمان کرنے کا بدلہ لینے کو کہہ کر گئے تھے نا؟“

”مگر میری تم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔“

”تمھیں معلوم ہے کہ ترکھانی ریاست اب میرے دوست روپ کمار کی ہے اور تم نے میرے دوست کی ریاست پر حملہ کیا ہے۔“

”لیکن ابھی روپ کمار یہاں کا راجہ نہیں بنا ہے؟“

”آئندہ تو بنے گا۔“ میں نے کہا اور پھر میں اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا اور پھر میں نے اسے للکارا۔ ”بہانے کیوں تلاش کر رہے ہو دلاور سنگھ، بہادروں کی طرح لڑو۔ تم تو بڑے مان سے آئے تھے اب بغلیں کیوں جھانک رہے ہو۔ کیا اسی بل پر کماری پدمنی کے سوئمبر میں آئے تھے۔ کیا تم نے یہ نہ سوچا تھا کہ وہاں سورماؤں سے واسطہ پڑے گا؟“

”تم میرا اپمان کر رہے ہو۔“ دلاور سنگھ گرجا۔

”ہاں ہاں۔ اپمان تو کر رہا ہوں۔ ایک اپمان کا بدلہ لینے کے لیے تم اپنی راجدھانی سے یہاں تک آئے ہو۔ دوسرے اپمان کا بدلہ تم مجھ سے لو۔ تلوار کیوں نہیں اٹھاتے، موت سے ڈرتے ہو؟“ اور میں نے اس گدھے کو بہرحال غیرت دلا ہی دی۔ اس نے میرے اوپر تلوار کے وار شروع کر دیے اور میں انھیں خالی دیتا رہا۔ پھر میں نے کھانڈا اٹھایا اور دلاور سنگھ کی آنکھوں میں موت ناچ گئی۔

”کیسا ہے یہ ہتھیار دلاور سنگھ؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ دلاور سنگھ نے میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر پھرتی سے تلوار کا وار میری بغل کی طرف کیا۔ گو میں نے یہ وار خالی دے دیا تھا لیکن اگر وہ کامیاب بھی ہو جاتا تو کونسا فرق پڑتا سوائے اس کے کہ تلوار کی دھار برباد ہو جاتی۔ پھر میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر کھانڈے کے ایک وار نے نہ صرف دلاور سنگھ کو زندگی کے بوجھ سے آزادی دلا دی بلکہ اس کا گھوڑا بھی درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔

یوں دلاور سنگھ کا مان ٹوٹ گیا اور اس کی فوج کے بچے کھچے سپاہی گرفتار ہو گئے۔ ترکھان کا اندازہ درست تھا۔ یہ ساری فوجیں صرف دلاور سنگھ کی نہیں تھیں بلکہ اس نے قرب و جوار کے چند چھوٹے علاقوں سے جو اس کے اسیر تھے، بھی فوجیں طلب کر لی تھیں۔ بہرحال اسے نہ صرف بدترین شکست ہوئی تھی بلکہ زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ میں فاتح کی حیثیت سے واپس ترکھانی میں داخل ہوا۔ راجہ ترکھان فصیل سے میری جنگ کا منظر دیکھ چکا تھا اور اس کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں تجھے کیا کہوں سروپ! کیا سمجھوں میں تجھے؟ بھگوان کی سوگند! اگر تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اب میں جیون بھر تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ میں۔ میں کیا کہوں۔ تو نے خود ہی میری پتری کو سوئیکار نہیں کیا ورنہ ___ ورنہ میری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں ہوتا۔“

اس وقت میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس کی فتح کی خوشیوں میں شریک تھا۔ ترکھان نے فوری طور پر اپنے خاص آدمیوں کو تیار کیا اور اپنی فوجوں کے ساتھ دلاور سنگھ کی راجدھانی بھیج دیا تاکہ بغیر راجہ کی حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ رات کو اس نے اپنے محل میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا اور اس دعوت کا روحِ رواں میں تھا۔ راجہ نے میرے بارے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا اور میری تعریفوں کے گن گائے جاتے رہے اور پھر دعوت کے اختتام کے بعد ترکھان میرے پاس بیٹھ گیا۔

”مجھ سے بس یہ کہہ دو سروپ کہ تم جیون کے کسی حصے میں مجھے چھوڑ دو گے تو نہیں؟ میرے من کو شانتی مل جائے گی۔“

”میں تمھیں جھوٹی شانتی نہیں دے سکتا مہاراج ترکھان!“ میں نے کہا۔

”ایں۔ کیا ___ کیا کہا تم نے؟“ ترکھان حیرت سے بولا۔

”میں نے کہا ترکھان جی، میں تم سے ایسا وعدہ کیسے کر سکتا ہوں جسے میں پورا ہی نہ کر سکوں۔“

”کیا مطلب؟ آخر اس بات کا کیا مطلب؟“ ترکھان اسی انداز میں بولا۔

”میں سادھو منش ہوں راجہ ترکھان۔ آج یہاں کل وہاں۔ آج تمھیں بتاؤں کہ میں سرے سے سوئمبر میں حصہ لینے ہی نہیں آیا تھا۔ میں تو یونہی اس طرف آ گیا۔ یہ قلعہ دیکھ کر میں نے ادھر کا رخ کیا، پھر خیمے دیکھے اور وہاں پہنچ گیا۔ پھر روپ کمار سے دوستی ہوئی اور اس کے بعد یہ سارے ہنگامے۔ میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں ترکھان مہاراج!“

”تو۔ تو کیا اب تم یہاں سے چلے جاؤ گے؟“ ترکھان افسردگی سے بولا۔

”ابھی نہیں۔ ابھی میں اس وقت تک تمھارے ساتھ رہوں گا جب تک میرے دوست کی شادی نہ ہو جائے۔ میں روپ کمار کو بہت چاہتا ہوں ترکھان مہاراج۔“

”ہاں۔ تو نے جس طرح اس کے لیے جنگ کی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔“

"چنانچہ میں اپنے دوست کی خوشیوں میں ضرور شریک ہوں گا۔"
"اچھا۔ پھر تم سے اتنا من ہی نہ لگایا جاتا تو اچھا تھا۔ تم جاؤ گے کہاں؟"
"کوئی منزل نہیں ہے راجہ ترکھان۔"
"پھر یہاں سے کیوں جا رہے ہو؟"
"گیان کی تلاش میں۔"
"تو کیا تم من سے بھی سادھو ہو؟" راجہ عقیدت سے بولا۔
"یوں ہی سمجھ لو ترکھان جی۔"
"ٹھیک ہے۔ بھگوان تمھاری رکھشا کرے۔" وہ ایک گہری سانس لیکر بولا۔ دلاور سنگھ کو جس طرح شکست دی گئی تھی اس کی وجہ سے قرب وجوار کے سارے علاقے اس سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ چاروں طرف ترکھان کی دھوم مچ گئی تھی اور بہت سے چھوٹے چھوٹے راجہ اس کی امان میں آنے کی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ روپ کمار کو بھی معلوم ہوا اور وہ ایک فوجی دستے کے ساتھ پہنچ گیا۔ میں نے اور راجہ ترکھان نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ روپ کمار نے آتے ہی اس کے بارے میں پوچھا۔ راجہ ترکھان نے فخریہ انداز میں اسے میرا کارنامہ بتایا اور روپ کمار کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ "اب کوئی ترکھانی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔" اس نے کہا اور پھر اس نے مجھ سے درخواست کی۔ "سروپ بھیا! اب تمھیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔ کیا میری برات میں میرے ساتھ نہیں آؤ گے؟ پتا جی نے بھی یہی سندیس بھیجا ہے۔"
"مجھے کیا اعتراض ہے۔" میں نے کہا۔
"لیکن روپ کمار میں چاہتا ہوں کہ سروپ کمار جب تک ہمارے درمیان ہیں میرے پاس رہیں۔ میں ان کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم انھیں میرے پاس چھوڑ دو تو تمھاری کرپا ہوگی۔"
"سروپ جی جائیں گے کہاں مہاراج۔ میری اچھا ہے کہ میرے ساتھ جائیں۔" روپ کمار بولا۔
"اوہ۔ تو تمھیں بھی ان کا ارادہ نہیں معلوم؟"
"کیا مطلب؟" روپ کمار نے پوچھا اور ترکھان نے روپ کمار کو میرے ارادے کے بارے میں بتایا۔ روپ کمار تو سرے سے ہی اکھڑ گیا تھا۔
"یہ نہیں ہو سکتا بھیا۔ ہم تمھارے لیے سب کچھ یہیں لے آئیں گے۔ ہم تمھاری من پسند یاترا بنا دیں گے۔ بس بھیا تم ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔" روپ کمار بولا۔
میں ان لوگوں کی محبت کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ وہ آسانی سے مجھے نہیں چھوڑیں گے اس لیے وہی ترکیب اچھی ہے کہ انھیں آگاہ ہی نہ کرو اور کسی دن خاموشی سے نکل چلو۔ صبر تو آ ہی جاتا ہے۔ روپ کمار بھی کچھ دن مجھے یاد کرے گا اور پھر خاموش ہو جائے گا۔ بہرحال میں روپ کمار کی ضد کے سامنے اس انداز میں خاموش ہو گیا جیسے اس سے ہار مان لی ہو اور پھر میں روپ کمار کے ساتھ تلنکا چل پڑا۔
ریاست تلنکا میں بھی میرا شاندار استقبال ہوا تھا۔ روپ کمار کی حیثیت بھی اب بدل گئی تھی۔ روپ کمار کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اب ایک ریاست کا مطلق العنان راجہ ہے اس لیے اس کی بات بھی سُنی جانے لگی تھی اور میری شہرت تو دُور دُور پھیل گئی تھی۔ لوگ جوق در جوق آکر مجھ سے ملے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی میری۔
لیکن میں زیادہ خوش نہیں تھا۔ ان ہنگاموں میں پھنس کر میں اپنے سارے کام بھول گیا تھا۔ نہ ہی منورما سے ٹکراؤ ہوا تھا۔ میں اب اسے کیفرِ کردار تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اب تو اس کے گُر بھی میرے ہاتھ میں تھے لیکن ابھی میں ان لوگوں میں مصروف تھا۔ روپ کمار کی شادی ہو جائے تو اس کے بعد میں خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں گا۔
اور پھر میں نے یہی کیا —— روپ کمار کی شادی اسی طرح ہوئی جیسے راجکماروں کی ہو سکتی ہے۔ دونوں ریاستوں نے دل کھول کر حسرتیں نکالی تھیں۔ میں نے بھی ان معاملات میں پوری پوری دلچسپی لی۔ میں نے ان لوگوں کی شادی کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل کیں، ان کی رسومات کی رُوح معلوم کی اور اس مذہب کے بارے میں بہت سے اندازے لگائے۔
روپ کمار بہت خوش تھا —— لیکن اب مجھ پر اکتاہٹ سوار ہو رہی تھی اور پھر ایک رات مجھے موقع مل ہی گیا۔ میں نے ایک عمدہ سا گھوڑا انتخاب کر لیا تھا۔ کچھ ضروری چیزیں بھی ساتھ لے لی تھیں جن میں میرا کھانڈا سرِ فہرست تھا۔ یہ میرے لیے سب سے عمدہ چیز تھی اور ہمیشہ میرے کام آئی تھی۔
اور پھر رات کی تاریکی میں، میں گھوڑے پر بیٹھ کر نکل پڑا۔ میں راتوں رات اتنی دور نکل جانا چاہتا تھا کہ یہ لوگ میرا نشان نہ پا سکیں۔ میں نے اتنے عمدہ گھوڑے کا انتخاب کیا تھا کہ جو بے مثال تھا اور دوڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ گھوڑا ہوا کی طرح سفر کر رہا تھا اور بہت سی آبادیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ میں اس گھوڑے کی بے پناہ طاقت کا قائل ہو گیا۔ پوری رات اسے ایک ہی رفتار سے دوڑتے گذری تھی لیکن ابھی تک اس کے انداز میں تھکن کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔
صبح کی روشنی پھوٹی تو میں ایک بستی کے قریب تھا لیکن میں بستی سے دُور سے ہی نکل گیا اور پھر کافی دُور جا کر میں صرف گھوڑے کے خیال سے رُک گیا۔ وفادار جانور اگر ساتھ دے رہا تھا تو اس کے ساتھ زیادتی کسی طور مناسب نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے ایک سرسبز علاقے میں اسے کھول دیا اور وہ گھاس کی طرف دوڑ پڑا۔ میں بھی ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا تھا۔ پوری رات سفر کرتے گذری تھی لیکن میرے بدن پر تھکن کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ان معمولی چیزوں سے تو میں متاثر ہی نہیں ہوتا تھا۔
مجھے یقین تھا کہ روپ کمار میری گمشدگی کا احساس ہوتے ہی چاروں طرف ہنگامہ برپا کر دے گا۔ مجھے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن میں نے ایک رات میں جتنا سفر کر لیا تھا اس کی رو سے اگر روپ کمار کے آدمی تین دن بھی اسی راستے پر بھاگتے پھریں تب بھی مجھے نہ پا سکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے رات میں سفر کیا تھا اور بستیوں سے بچ کر نکلا تھا اس لیے کسی طرف سے میری نشاندہی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

ویسے اب میرے بدن پر اچھا خاصا لباس تھا اس لیے مجھے سادھو بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا اور پھر سادھو بنے رہنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ بس اتنا جانتا تھا۔ ٹھیک ہوں۔ اب تو مجھے منورما کی تلاش تھی —— ہاں منورما پھر میرے ذہن میں اُبھر آئی تھی اور میں اب پوری قوت سے اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ پروفیسر، بہت دن خشک گذر گئے تھے۔ مرد کی زندگی میں اگر عورت کی رنگینی نہ ہو تو زندگی کا کوئی مقصد ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟
"اس سلسلے میں میری رائے محفوظ رہنے دو۔" پروفیسر خاور مسکرا کر بولا۔
"کیوں؟ شاید اپنی بچیوں کی وجہ سے؟" اس نے کہا۔
"اوہ نہیں —— یہ بات نہیں ہے۔" پروفیسر گڑبڑا گیا۔
"میرا خیال ہے پروفیسر، زندگی کے حقائق سے منہ موڑنا کسی طور ممکن نہیں ہے۔ ہم ہر اچھی بُری چیز کو دیکھتے ہیں۔ آنکھ بُری شے کو دیکھ کر بند نہیں ہو جاتی۔ ہم دیکھتے ضرور ہیں۔ چنانچہ ہمیں دیکھنا چاہیے۔"
"شاید —— تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"
"کیا تمھیں میری اس بات سے اتفاق ہے؟"
"کون سی بات؟"
"عورت کے بغیر —— مرد کسی ویرانے میں تنہا پڑی بے آب وگیاہ چٹان کی مانند ہے۔"
"شاید۔"
"تم اپنا تجربہ بتاؤ۔"
"میرا تجربہ تمھارے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔"
"اوہ، کیوں؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔
"دراصل تمھاری تخلیق میں فرق ہے۔ تم خود اپنے بارے میں نہیں بتا سکتے کہ تم کیا ہو۔ اسی لحاظ سے تم سوچتے بھی ہو جبکہ ہمارا نظریہ مختلف ہے۔"
"کس لحاظ سے پروفیسر۔ براہِ کرم مجھے بتاؤ۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں محقق ہوں۔ میں ہر اس نظریے کے بارے میں جان لینا چاہتا ہوں جو دُور کی عکاسی کرتا ہو۔"
"بھئی یوں سمجھ لو۔ میری بیوی کو مرے ہوئے گیارہ سال گذر چکے ہیں لیکن میں نے آج تک اس کے نعم البدل کی ضرورت نہیں محسوس کی۔"
"گیارہ سال؟" وہ پُرخیال انداز میں بولا۔
"ہاں پورے گیارہ سال۔" پروفیسر فخریہ انداز میں بولا۔
"بات ایمانداری سے ہو رہی ہے پروفیسر۔ کچھ اخلاقی کچھ مذہبی ذمہ داریاں محسوس کر کے تم نے اپنی زندگی پر اگر پاکبازی کا خول چڑھائے رکھا تو دوسری بات ہے لیکن کیا کبھی تنہائیوں میں تم نے کسی ایسے مونس کی ضرورت نہیں محسوس کی؟" اس نے پوچھا اور پروفیسر خاور بغلیں جھانکنے لگا۔ لڑکیوں کے سامنے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔
"اور میرا خیال ہے گفتگو پھر غلط موضوع کی طرف بھٹک گئی ہے۔" فرزانہ نے پھر درمیان میں مداخلت کی اور وہ ہنس پڑا۔
"پروفیسر کو اس بروقت امداد کے لیے آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے مس فرزانہ۔ بہرحال میں آپ لوگوں کے احترام میں اس بحث کو ختم کیے دیتا ہوں۔ میں صرف اپنی بات کر رہا تھا اور اگر میں صرف اپنی بات کرتا ہوں تو پھر وہ عام انسانوں پر لاگو نہیں ہوتی کیونکہ میں بہرحال عام انسانوں سے بہت مختلف ہوں۔"
"یہ بات ماننے سے کسی کو انکار نہیں ہے۔" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"چنانچہ یہ خشک زندگی اب تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ یہاں اس دیش میں ابھی تک میرا کوئی کام بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے ایک انوکھے علم سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ وہ علم درحقیقت بہت شاندار تھا لیکن اس کے حصول کا ذریعہ، اس کے پیروکار، وہ بڑے نفرت انگیز تھے اس لیے اب آہستہ آہستہ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میں اس کے حصول میں ناکام رہوں گا اور دوسری چیز عورت تھی۔ کم بخت منورما نے ایسا چکر چلا رکھا تھا کہ اب میں عورت کے تصور سے خوفزدہ ہونے لگتا تھا۔ میں کسی کی زندگی سے کھیلنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔
لیکن یہ منورما —— یہ منورما —— اس سے تو میں ایسا انتقام لینا چاہتا تھا کہ بس —— جس وقت تک مناسب سمجھا میں نے وہاں قیام کیا پروفیسر اور اس کے بعد میں نے وہاں سے آگے کا رُخ کیا —— اور جب رات ہوئی تو میں پھر ایک بستی کے قریب تھا۔
میں نے دُور ہی سے دیکھ لیا تھا مشعلیں روشن تھیں اور جھونپڑیاں بکھری نظر آ رہی تھیں۔ میں نے جتنا سفر کر لیا تھا اس سے احساس ہوتا تھا کہ میں اب اتنی دُور نکل آیا ہوں کہ کم از کم روپ کمار کے آدمی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے چنانچہ اب انسانوں سے اجتناب بے مقصد تھا۔
میں نے گھوڑے کو آہستہ روی سے بستی کی طرف بڑھا دیا اور تھوڑی دیر میں بستی کی پہلی جھونپڑی کے نزدیک پہنچ گیا۔ ابھی میں نے گھوڑا جھونپڑی کے قریب ہی کیا تھا کہ جھونپڑی میں سے چھن چھن کی آواز نکلی اور پھر ایک مست خرام رنگین لباس میں ملبوس، پیروں میں گھنگرو باندھے آنکھوں میں کاجل لگائے، ہونٹوں پہ لالی لگائے باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر شوخی برس رہی تھی۔ چال میں الھڑپن تھا۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ مست آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی اور پھر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔
"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔ آواز سہمی ہوئی تھی۔
"مسافر ہوں۔ تمھاری بستی کے نزدیک سے گذر رہا تھا کہ رات ہو گئی۔ کیا اس بستی میں رات گذارنے کی جگہ مل سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں جوان ضرور تھیں مگر تاریکی میں دیکھنے کی عادی نہیں تھیں اس لیے اس نے مجھے بغور نہیں دیکھا تھا جبکہ میرے

لیے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی یکساں حیثیت رکھتی تھی۔ میں اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ وہ بولی۔

"مسافر ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر مکھیا کے پاس چلو۔"

"کون مکھیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا مکھیا، ورجن لال!"

"کہاں ہے وہ؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"اس وقت تو چوپال میں ہوگا" وہ بولی۔

"چوپال کہاں ہے؟"

"راکھو کے بیٹا ہوا ہے سب اس کی خوشی منارہے ہیں۔ سب نے اسے بدھائی دی ہے اور چوپال میں ناچ رنگ سبھا لگی ہے۔ سبھا میں بڑا مزہ آتا ہے، لیکن کیا تم تھکے ہوئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں دیوی" میں نے آہستہ سے جواب دیا اور وہ شرارت آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تو پھر چلو گے چوپال؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر تم مجھے اپنے گھوڑے پر بٹھالو" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

گھر بیٹھے انگلش سکھانے والی بہترین کتابیں

5 DAYS TO VOICE

اس کتاب کے ذریعے بغیر کسی ٹیچر کی مدد کے صرف پانچ دن میں، ایکٹو پیسو وائس پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ قیمت پانچ روپے

7 DAYS TO NARRATION

یہ کتاب سات دن کی قلیل ترین مدت میں ڈائرکٹ اِن ڈائرکٹ اسپیچ سکھا دیتی ہے۔ قیمت چار روپے

3 DAYS TO PRECIS

بی۔ اے کے طلباء کے لیے گرانقدر تحفہ۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ پریسی لکھنا کتنا آسان ہے۔ قیمت دو روپے

ENGLISH WORD-BOOK

انگریزی کی استعداد میں قابل قدر اضافہ کرنے کے لیے۔ قیمت چار روپے

چاروں کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف

اقبال بُک ڈپو، اقبال ۱/۱۸ فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

اور پروفیسر میری کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مارنے لگا۔ یہ تو وہ ہو رہا تھا جس کا میں خواہش مند تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھالیا اور پھر میں نے سُست روی سے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

لیکن میرا ذہن بھٹک رہا تھا، میری سوچ گمراہ ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر چوپال کیوں جایا جائے؟ چوپال کے بجائے جنگل کا کوئی تاریک حصّہ، بستی سے دُور کوئی ویرانہ، میری خواہشات کا مسکن، جہاں میں ہوں اور یہ جوانی ہو۔

جوان جسم میرے بدن سے مس ہو رہا تھا اور میرا خون گرم ہوا جا رہا تھا۔ لڑکی کے جسم کے چبھتے ہوئے حصّے اور میرے خیالات بھٹک رہے تھے۔

"کیا نام ہے تمھارا لڑکی؟" میں نے پوچھا۔

"گوندی!" اس نے جواب دیا۔

"ہوں" میں نے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور اپنے پہلے ارادے کو ترک کر دیا۔ اتنی بے صبری بھی کسی طور مناسب نہ تھی۔ میں اس سے چوپال کا راستہ معلوم کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور کچھ دیر بعد ہم چوپال پہنچ گئے۔

گوندی اسی اطمینان سے میرے پاس بیٹھی رہی تھی اور پھر وہ چوپال کے قریب ہی گھوڑے سے اتری اور چلّائی۔

"چاچا مکھیا! دیکھو مسافر آیا ہے اور میں اسے تمھارے پاس لے آئی ہوں۔"

اور چوپال پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنیں میری طرف اٹھ گئیں۔ میں گھوڑے سے اتر کر آہستہ آہستہ قدموں سے چوپال میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے قریب جا رہا تھا۔

اور چھوٹی سی بستی کے چھوٹے چھوٹے دل والے لوگوں کے چہروں سے پتہ چل گیا کہ وہ میرے لباس سے کافی مرعوب ہوئے ہیں اور میری شخصیت سے بھی۔ شمع کی روشنی میں بہرحال میں صاف نظر آ رہا تھا۔

جسے مکھیا کہا گیا تھا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دبلا پتلا لمبا سا آدمی تھا، بوڑھا کمزور قوا کا مالک۔

"آؤ بھگوت، مسافر تو بھگوان کا نمنہ ہوتے ہیں۔"

"میں بہت دور سے آ رہا ہوں، تمھاری بستی کے قریب سے گذرا تو سوچا کہ ایک رات یہاں گذار لوں" میں نے کہا۔

"جگ جگ مہاراج، جگ جگ۔ آؤ بیٹھو۔ جاؤ رے جاؤ۔ مہاراج کے لیے جل پانی لاؤ" مکھیا نے کہا۔

سادہ دل لوگوں کی سادہ سی محفل میں بیٹھ کر میں نے خوب لطف اٹھایا۔ مکھیا نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہاں بیٹا ہونے کی خوشی منا رہے ہیں اور میں چاہوں تو میں بھی شریک ہو سکتا ہوں اور میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ کیا ہرج تھا تھوڑی سی تفریح ہی سہی۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں میرے سامنے لائی گئیں اور میں نے یہاں بھی کافی بے تکلفی برتی اور اس کے بعد ڈھول پیٹے گئے۔ کنواریوں کا بے ہنگم رقص شروع ہو گیا جس میں کوئی فن نہ تھا کوئی کلا نہ تھی۔ ہاں جوانی کی اچھل کود بذاتِ خود بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ خاص طور پر مجھے گوندی نے متاثر کیا تھا۔

اور خاصی رات گئے سبھا ختم ہوئی۔ اس دوران مکھیا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو مجھے آرام کرنے کے لئے بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن اس دل کش ماحول کو چھوڑ کر جانا مجھے اچھا نہ لگا۔ ہاں جب سبھا ختم ہو گئی تو میں نے مکھیا سے آرام کی اجازت مانگی اور شاید یہ قسمت کی نوازش ہی تھی کہ مکھیا نے گوندی سے کہا:

"سجاری جا، مسافر کو رگھوا کے جھونپڑے پر لے جا۔ یہ وہاں آرام کرے گا۔"

"اچھا مہاراج!" گوندی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس درمیان میں نے محسوس کیا تھا کہ ناچتے ہوئے بھی گوندی کی چمکدار آنکھیں میرے اُوپر جمی ہوئی تھیں۔ مشعلوں کی تیز روشنی میں میں نے دیکھا تھا اور اگر میرا خیال غلط نہ تھا تو پسند بھی کیا تھا۔ ویسے بھی میں بہت جلد غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہوں۔ لیکن گوندی جس وقت مجھے جھونپڑے میں چھوڑنے آئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شرما گئی۔

"کیا بات ہے مہاراج؟" وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"کیا مجھے یہاں اکیلا رہنا پڑے گا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم کہو تو چاچا کو بھیج دوں؟" اس نے شرارت سے کہا۔

"تم یہاں نہیں رہ سکتیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہائے رام میں کیا کروں گی یہاں رہ کر؟"

"میری یہ خواہش ہے گوندی۔ ویسے بھی ایک رات کا مسافر ہوں، تمہاری بستی کا مہمان ہوں۔ صبح چلا جاؤں گا۔ تم چاہو تو اس رات میری میزبان بن جاؤ۔"

"ہم کچھ نہیں جانتے مہاراج، پرنت جب ہم گھر نہ جائیں گے تو چاچا پریشان ہوگا۔"

"یوں بھی آدھی رات گزر چکی ہے گوندی! کیا تمہارا چاچا سونے کے لئے نہ لیٹ گیا ہوگا؟" میں نے اس کے بازوؤں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہائے رام تم تو بڑے کٹھور ہو۔ جان نہ پہچان مہمان بن کر آئے ہو اور اب نہ جانے کیا بننے جا رہے ہو۔" اس کے الفاظ سے، اس کے انداز سے مجھے احساس ہو گیا کہ وہ مرد کی دُنیا میں اجنبی نہیں ہے اور نہ اس کی زندگی میں کوئی مرد اجنبی اور یہ اچھی ہی بات تھی پروفیسر۔ ورنہ ایک رات میں کسی کو متاثر کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ پھر بہت سی باتیں ہوئیں اور بالآخر وہ رات میرے پاس رہنے پر آمادہ ہو گئی۔ بالکل اتفاق تھا کہ وہ کام اتنی آسانی سے ہو گیا جس کا میں شدت سے طلبگار تھا۔

گوندی خوبصورت تھی۔ اس کا جسم حسین تھا۔ لیکن میرا ابھی اندازہ درست تھا۔ وہ مرد ناآشنا نہ تھی۔ بھرپور عورت تھی وہ۔ ناتجربہ کاری اس میں نہ تھی اور میں نے ساری باتیں بُھلا دی تھیں لیکن حیرت کی بات یہ تھی پروفیسر کہ گوندی پر منورما کا بالکل اثر نہ ہُوا تھا۔ اس لئے کہ شاید یہ سب کچھ اچانک ہُوا تھا۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منورما دھوکا کھا گئی ہو۔ ویسے میں نے گوندی کے ہاتھ کے ناخن بھی دیکھے تھے اور انہیں غلط نہیں پایا تھا۔

گوندی میری آغوش میں اس طرح سما گئی کہ پھر اُسے مجھ سے دُور جانے کا خیال نہ آیا۔ نہ چاچا یاد آیا نہ کوئی اور، نہ میری اجنبیت۔ ساری رات اس نے میرے ساتھ گزار دی اور دوسری صبح اس نے سُورج نکلنے سے پہلے ہی مجھے جگا دیا۔

"مسافر۔ مسافر۔ واپس نہ جاؤ گے کیا؟"

"سورج نکل آیا ہے گوندی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں مسافر"

"مگر مجھے جانے کی جلدی نہیں ہے۔" اور میری نگاہیں گوندی کے چکنے بدن پر پھسلنے لگیں۔ اس نے شرما کر اپنے بدن کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور میں نے اس کے کپڑے اس کی طرف اُچھال دیئے۔

"مجھے تو جلدی ہے مسافر" وہ شرمائے ہوئے انداز میں بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"میں بھی تہارے ساتھ چلوں گی۔" اس نے کہا۔

"کہاں گوندی؟"

"جہاں تم جاؤ گے مسافر۔"

"لیکن یہ اچھی بات نہ ہوگی گوندی۔ میں ایک رات کا مسافر تمہیں پہلی بار ملا اور تم اس طرح میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئیں۔"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی مسافر۔ اگر تم نہیں لے جاؤ گے تو میں کنویں میں ڈوب کر جان دے دوں گی۔"

"آخر کیوں؟"

"بس تم نہیں جانتے مسافر"

"تم بتاؤ تو سہی۔" میں نے پوچھا۔

"چاچا جی نے تین سال قبل میری سگائی کر دی تھی مگر گونا ابھی تک نہیں ہُوا اور پھر میری پوتر تا تو کبھی کی ختم ہو چکی۔ پنڈت جی میری جان کے گاہک بن گئے ہیں۔ روزانہ مجھے بلاتے ہیں اور بستی والے ایسے اندھے ہیں کہ پنڈت جی کو مہان گیانی سمجھتے ہیں۔ ان کے کرتوت کیا ہیں یہ کوئی یاد نہیں رکھتا۔ تم اگر مجھے نہ لے جاؤ گے مسافر، تب بھی میں اس بستی میں تو نہ رہوں گی۔ کچھ کھا کر سو رہوں گی۔" گوندی نے کہا۔

"مگر میں تجھے کہاں لے جاؤں گا، میں تو خود ایک آوارہ گرد ہوں۔"

"ہوں، آوارہ گرد ہوں۔ رات بتانے کے لئے میرے ساتھ تھے، اور جب میں اس رات کا ادھیکار مانگ رہی ہوں تو جان بچا کر بھاگنے کے چکر میں پڑ گئے۔ پاپی کہیں کے۔ سارے مرد ایسے نردوئی ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے، بس تم چلے جاؤ۔ میں تو بس اب آتم ہتیا کروں گی۔"

عجب مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ اتنی اچھی بھی نہ تھی۔ کوئی پاک پوتر لڑکی بھی نہ تھی لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا وہ مجھے لرزا دینے کے لئے کافی تھا۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔

اور پروفیسر جو حالات مجھ پر گزر رہے تھے یا جن حالات سے میں گزر رہا تھا ان میں یہ لڑکی بھی میرے لئے کافی کام کی تھی اور اس وقت یہ غنیمت تھی۔ نہ جانے کیوں اس وقت اس پر منورما کا جادو نہ چل سکا تھا۔ میرے ذہن میں ایک شُبہ نے سر اُبھارا لیکن کرنامی مہاراج کی بات تو غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کے سارے ناخن بغور دیکھے تھے، سب سلامت تھے اور اس کے کسی انداز میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ میں نے

اچھی طرح دیکھا تھا۔

کافی دیر تک میں گومگو کے عالم میں رہا۔ اس دوران گوندی مجھے متواتر جھنجوڑتی رہی۔ وہ ساتھ چلنے کے لئے بضد تھی اور اس دوران اس نے جو خوفناک باتیں کہی تھیں، تب اس سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہونے کے باوجود اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں اس جھونپڑے سے نکل آیا۔ واہ رے بستی والو۔ کیا خوب داد دوگے کہ کس کو مہمان ٹھہرایا تھا۔ اب تمہیں کیا معلوم کہ مہمان کون تھا، کیسا تھا۔ بعض اوقات ہم جو کچھ نہیں کرنا چاہتے، بہت کچھ کر بیٹھتے ہیں۔ اتفاقات، حادثات، واقعات۔ میں نے گوندی کو گھوڑے پر بٹھایا۔ اور یہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

صورت حال وہی تھی۔ میں اتنی دور نکل جانا چاہتا تھا کہ بستی والے میرے پیچھے نہ آسکتے۔ اور اب تو یوں لگتا تھا کہ جیسے بھاگتے ہی بھاگتے زندگی گزر جائے گی۔ گھوڑا دوڑتا تھا۔ گوندی بے پناہ خوش تھی۔ بس بار بار میرے سینے سے چمٹتی تھی۔ کبھی میرے ہونٹ اونچے کرکے انہیں چومتی تھی۔ کبھی میری ٹھوڑی سے اپنے گال رگڑتی تھی۔ غرض وہ ہر طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتی تھی، اور میں اپنی زندگی سے بیزار آگے بڑھ رہا تھا۔

کن لعنتوں میں پھنس گیا ہوں، کن مصیبتوں میں گرفتار ہوگیا ہوں۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ لعنت ہے اس ودّیا پر جس کے حصول کے لئے اتنی مشکلات پیش آرہی ہیں، اور لعنت ہے اس علم پر۔ جب کہ اس سے پہلے میں نے بے شمار علم حاصل کئے تھے اور بہرصورت ان کے حصول کا ذریعہ پُر دقار تھا۔

سفر جاری رہا نہ جانے کب تک کے لئے پوری زندگی ہی سفر کے لئے تھی یا شاید زندگی بذاتِ خود ایک سفر ہے لیکن اس میں جو گوندی کا اضافہ ہوا تھا وہ عجیب و غریب تھا، ایسے لگتا تھا جیسے وہ آسمان سے ٹپک پڑی ہو، بلاوجہ، بے مقصد۔ مجھے اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بس نہ جانے کیوں میں اسے ساتھ لے آیا تھا۔ البتہ گوندی بہت خوش تھی، پہاڑوں کے درمیان وہ پہلی رات سے زیادہ خوش تھی، پنڈت جی نے اسے کافی تجربہ کار بنادیا تھا اس لئے وہ اپنے تجربات کا مظاہرہ بھی کر رہی تھی اور میں بس اسے قبول ہی کر رہا تھا۔

رات گزرنے لگی، گوندی میری آغوش میں چھپی ہوئی تھی شاید یہ پہلی لڑکی تھی جس سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بس وقت گزارنے کی بات تھی لیکن وقت بھی بڑی مشکل سے گزارا جا رہا تھا۔ رات کے آخری پہر اس کی نہ سونے دینے والی کوششوں کے باوجود میں سوگیا اور پھر زیادہ دیر آنکھ بھی نہیں لگی تھی کہ اس کمبخت نے پھر جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔ وہ میرا لباس کھینچ رہی تھی مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس سے نفرت ہونے لگی تھی، میں نے خوفناک نگاہوں سے اسے گھورا اور پھر سخت لہجہ میں بولا، "سونے دو گوندی اب تم اتنی دلکش بھی نہیں ہو کہ تمہارے لئے پوری رات آنکھوں میں گزار دوں"۔ گوندی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اس کی خاموشی میرے لئے تعجب خیز تھی۔ میں نے اچانک اسے دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ شاید گوندی کسی تکلیف میں مبتلا ہے، اس پر تشنج کی کیفیت طاری تھی، ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے، اس کے کھینچنے اور جھنجوڑنے کے انداز میں کوئی طلب نہیں تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ اذیت کے عالم میں ہو۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے دانت بھینچے ہوئے تھے اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے قرب و جوار میں دیکھا لیکن وہاں کچھ نہ تھا شاید وہ کسی مرض کا شکار تھی۔ میں اس کے لئے کچھ بھی نہ کرسکا اور رفتہ رفتہ وہ خود ہی اعتدال پر آگئی۔ پھر وہ گہری گہری سانس لینے لگی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد رفتہ رفتہ خود ہی پرسکون ہوگئی۔

"کیا ہوا تھا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں مہاراج بچپن سے یہ حالت ہے کبھی کبھی اس طرح کا دورہ پڑجاتا ہے" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا واقعی سچ مچ کا دورہ تھا؟"

"ہاں مہاراج میں سچ کہہ رہی ہوں" گوندی نے بدستور مسکرا کر کہا۔

"لیکن میرا خیال کچھ اور ہے۔"

"کیا خیال ہے تمہارا مہاراج؟"

"اس طرح تم مجھے جگانا چاہتی تھیں"

"نہیں مہاراج آپ سو جائیے۔"

درحقیقت میں کچھ اس قدر جھلایا ہوا تھا کہ کروٹ بدل کر دوبارہ سوگیا۔ اور دوسری صبح جب خوب دن چڑھے آنکھ کھلی تو میرا سر گوندی کے زانوؤں پر رکھا ہوا تھا اور وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

بہرحال اب اتنی بےحسی بھی نہ تھی اور میں بھی اتنا پتھر دل نہ تھا کہ اس کی اس حرکت سے متاثر نہ ہوتا۔ میں اسے پیار کرتا ہوا آہستہ سے اٹھ گیا۔

گوندی میری ہر طرح سے خدمت کر رہی تھی، اس نے گھوڑے کو بھی تیار کردیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور سوچا ٹھیک ہے چلو جب تک کسی اور لڑکی کا انتظام نہیں ہوجاتا یہ پھر بھی غنیمت ہے۔ یہ میں نے اپنے طور پر سوچا۔ اور اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔

پھر میں نے اسے گھوڑے پر بٹھا لیا اور... پھر وہی تکلیف دِہ، اکتاہٹ آمیز سفر۔

ابھی ہم تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ اتفاقیہ طور پر میری نگاہ گوندی کے ہاتھوں پہ پڑگئی اور اگر میں فوری طور پر خود کو نہ سنبھال لیتا تو گھوڑے کو زوردار ٹھوکر لگتی۔

میں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور پھر گھوڑے کو۔ گوندی کے ہاتھوں کے ناخن اچانک غائب ہوگئے تھے اور یہ علامت تھی اس بات کی کہ گوندی اب گوندی نہیں بلکہ منورما ہے۔

میرے حواس جواب دینے لگے، مجھے گوندی کا وہ تشنج دورہ یاد آیا۔ یقیناً منورما اس کی آتما کھینچ کر اس کے بدن پر قابض ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور جب وہ کامیاب ہوگئی تو پھر اس نے گوندی بن کر ہی مجھ سے بات کی۔

"تو آگئی یہ چنڈال" میں نے دل میں سوچا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا، بڑی خوشی ہو رہی تھی اس وقت منورما بکل کر مجھے جو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ ایک بار پھر مجھے دھوکہ دینے میں کامیاب ہوگئی۔ اور بھلا ہو سوامی کرناجی کا جنھوں نے مجھ میں منورما

ویت نام

ویت نام کی جنگ کے دوران ایک امریکی سپاہی کو جو ویت نام میں محاذ پر تھا، اپنی منگیتر کا خط ملا جسے پڑھ کر وہ بہت نااُمید اور پریشان ہوگیا۔ منگیتر نے لکھا تھا "میں اب تمہارا انتظار نہیں کرسکتی۔ اس منگنی کو توڑ دینا بہتر ہے تم میری تصویر واپس کردو۔"

سپاہی بہت دل شکستہ ہُوا۔ اور وہ بے وفا منگیتر کا دل جلانے کے لیے اپنے دوستوں کے پاس گیا۔ اور ان کی منگیتروں کی پرانی تصویریں لے کر آیا۔ اپنی منگیتر کی تصویر بھی ان تصویروں کے ساتھ لفافے میں رکھی اور خط میں لکھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ان سب میں سے تمہاری تصویر کون سی ہے۔ اپنی تصویر خود نکال لو اور باقی مجھے واپس کردو ــــ شکریہ۔"

دل جلا

کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا کردی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں دیکھوں گا منورما۔" اور میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہی بال تو مجھے درکار تھے۔ گوندی کی وجہ سے جس قدر مشکلات کا شکار رہا تھا اب منورما کے ملنے کے بعد وہ الجھنیں ختم ہوگئیں تھیں، میں نے اور زیادہ چاہت سے اسے اپنے سینے سے چپکا لیا۔

اور سلسلہ جاری رہا اس کے دل میں گدگدیاں ہو رہی تھیں۔ منورما جو آج تک مجھے چوٹ دیتی رہی تھی، جس نے اتنی زندگیاں تباہ کردی تھیں آج میرے جال میں پھنس جائے گی۔ اور اس کے بعد کم از کم میں اس کا ہر رُوپ پہچان سکوں گا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ اب وہ کمبخت بہ آسانی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی تھی۔

میری آنکھوں میں چمک تھی۔ ہم نے دوسرا پڑاؤ بستی سے دور ہی ڈالا۔ آج رات تو میں اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ میں گوندی سے خاصی لگاوٹ کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے لئے کھانے پینے کی چیزیں بھی مہیا کردی تھیں جنہیں ہم دونوں نے خوب لطف لے کر کھایا تھا۔ اور پھر میری آغوش کی شوقین منورما مجھ میں داخل ہوگئی تھی۔ وہ میرے بدن کو بلیوں کی طرح بھنبھوڑ رہی تھی اور میں اسے خود سے کھل کھیلنے کا موقع دے رہا تھا۔

میں چاہتا تھا وہ بےخود ہوجائے اور اسے کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔

اور یہی ہوا۔ اس کی دیوانگی عروج پر پہنچ گئی۔ ہم کھلے آسمان کے نیچے تھے۔ چاند روشن تھا اور چاندنی نے ماحول کو بالکل صاف ستھرا بنا دیا تھا۔ گوندی کے روپ میں منورما میری آغوش میں مچل رہی تھی۔ اور اس وقت وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ میں پیار سے اس کے خوبصورت بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اس کے بالوں کی ایک موٹی لٹ میری ایک انگلی میں لپٹتی جارہی تھی اور میں اسے زیادہ سے زیادہ بل دیئے جارہا تھا، یہاں تک کہ وہ اچھی طرح میری انگلی میں لپٹ گئی اور پھر یہاں تک میں نے اس پر قوت صرف کی اور منورما کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"ارے۔ ارے۔ یہ کیا آہ۔ آہ۔ آہ" آخری چیخ بڑی زوردار تھی کیونکہ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا تھا اور منورما کی گردن ٹیڑھی ہوگئی تھی لیکن دوسرے جھٹکے سے اس کے بالوں کی پوری لٹ میرے ہاتھوں میں آگئی۔ اس بار منورما کی چیخ بدلی ہوئی تھی۔ ایک ایسی چنگھاڑ جس سے پہاڑ گونج اٹھے اور وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے سر کے اس حصے سے خون رس رہا تھا۔

"یہ کیا کیا مہاراج۔ یہ تم نے میرے بال کیوں خراب کردیئے۔" وہ کراہتی ہوئی بولی۔

"گوندی" میں نے مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔

"ہائے تم نے میری تو صورت بھی بگاڑ دی۔ میرے کیسے خوبصورت بال ہیں ذرا دکھاؤ تو۔ ہائے کیسی موٹی لٹ ہے اور دیکھو تو خون بھی تو نکل رہا ہے۔ یہ تم نے کیا کیا۔ لاؤ میرے بالوں کی لٹ دو۔" اس نے میرے ہاتھ پر جھپٹا مارا لیکن میں نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔ اور پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تیرے یہ بال تو مجھے بھی بہت پسند ہیں گوندی۔ ہائے کیسے خوبصورت ہیں" میں نے بالوں کی لٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ گوندی جھوٹ موٹ رونے لگی تھی۔

"اب میرا سر تو ٹھیک کرو۔ خون نکل رہا ہے۔ لاؤ میرے بال دو۔"

"خون نکل رہا ہے تو تمہیں کیا تکلیف ہے منورما۔ تم گوندی کا بدن چھوڑ دو۔" میں نے کہا اور منورما سکتے میں رہ گئی۔ اب تک وہ جتنے ناز نخرے کر رہی تھی سب ایک دم ختم ہوگئے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا خیال ہے منورما؟" میں نے بڑے پیار سے اسے پکارا لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔

"ارے کچھ تو بولو میری جان۔"

"تم ہمیں منورما کیوں کہہ رہے ہو ناتھ۔ ہم گوندی ہیں۔"

"تم منورما ہو سمجھیں۔ منورما میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اب یہ بتاؤ منورما کہ گوندی کا کیا حشر ہوا۔ اگر تم اس کا بدن چھوڑ دو تو کیا اسے جیون مل جائے گا؟"

"تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ ٹھنک کر بولی۔

"میری بات کا جواب دو۔" میں غرایا۔

"میں گوندی ہوں تم دیکھ نہیں رہے۔"

"اوہ اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ ابھی پتہ چل جائے گا" میں نے کہا اور میں نے اس کے بالوں کی لٹ سے ایک بال نکال لیا۔ پھر میں نے

دو پتھر تلاش کئے اور انہیں رگڑ کر آگ پیدا کی، دوسرے لمحے میں نے اس بال کو آگ لگا دی۔ گوندی نے پھر ایک بھیانک چیخ ماری اور اس کی شکل سیاہ ہونے لگی، اور پھر وہ گوندی سے ایک بھیانک چڑیل بن گئی۔ میں نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"اے گوندی، یہ تمہیں کیا ہو گیا؟"

"پاپی، ہتھیارے تو نے یہ گر کہاں سے سیکھ لیا؟" وہ چیخی، اور میں نے پہلے سے زوردار قہقہہ لگایا۔

"میرے بال واپس کر دے ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

"کیا ہو گا گوندی؟" میں نے پوچھا۔

"میں — میں تیری دیوانی ہوں۔ لیکن میرے بال واپس کر دے، ورنہ میں تیری دشمن ہو جاؤں گی، میں تیرا یہ سندر مکھڑا سیاہ کر دوں گی۔ میں تیری دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گی، میں تجھے اپاہج بنا دوں گی، میرے پاس اب بھی بڑی شکتی ہے۔"

"اوہ۔ تو اب تک تو نے وہ شکتی کیوں نہ آزمائی؟" میں نے پوچھا۔

"تو جانتا ہے، تو اچھی طرح جانتا ہے۔ میں تجھ سے پریم کرتی ہوں۔ اتھاہ پریم کرتی ہوں، یہ میرا پریم ہی ہے جو مجھے جگہ جگہ تیرے لئے بھٹکنے پر مجبور کر رہا ہے ورنہ میں تو تجھے اب تک کسی اندھے کنوئیں میں یا دھکیل چکی ہوتی۔ مجھے اپنا دشمن نہ بنا۔ میرے بال واپس کر دے، میں کہتی ہوں میرے بال واپس کر دے۔"

اس کا چہرہ بے حد خوفناک ہو گیا۔

"بڑی ہی بے وقوف ہے گوندی۔ میں تیرا ازلی دشمن ہوں۔ میں تجھ سے بے پناہ نفرت کرتا ہوں۔ یوں سمجھ اس پوری دنیا میں مجھے سب سے زیادہ نفرت تجھ سے ہے۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں تجھے فنا کر دوں اور ایک دن میں اس میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ سن مجھے تیرے ان بالوں کی لٹ چاہیئے تھی اب یہ میں نے حاصل کر لی ہے، تو اپنی شکتی سے اسے چھین لے، ورنہ میں اسے ہر اس موقعے پر جلاؤں گا جب تجھے اذیت دینا مقصود ہو گی۔"

"اوہ — اوہ۔ پاپی — ہتھیارے، آخری بار کہہ رہی ہوں، دیکھ، سن لے آخری بار کہہ رہی ہوں۔"

"گوندی کا کیا ہوا، یہ جواب دے۔"

"مر گئی ہتھیاری کہیں کی، اب اس کا شریر بھی نہیں مل سکے گا۔"

"تو نے ایک اور خون کر دیا؟" میں نے اسے نفرت سے گھورا۔

"میں ہر اس عورت کو ختم کر دوں گی جو تیرے نزدیک آئے گی۔ سمجھا۔ تو میرے سوا سنسار کی کسی عورت کو نہیں اپنا سکے گا۔ تیرا شریر میرا ہے، صرف میرا ہے۔"

"اے ہاں، ایک بات تو بتا، تو نے گوندی کو کیوں معاف کر دیا، کیا اس کی پہلی رات تیرے علم میں نہیں تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو سائے کی طرح تیرے پیچھے رہتی ہوں اور صرف اس سمے تیرے آڑے آتی ہوں، جب کوئی عورت تیرے پاس ہوتی ہے، اور بھروسہ رکھ کہ کبھی کوئی عورت جو تیرے نزدیک آئے گی، زندہ نہ بچ سکے گی۔"

"اب ایسا نہ ہو گا منورما۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ ہو گا؟" وہ غرائی۔

"تو دیکھ لینا، اب میں جلد ہی کسی لڑکی کو اپنے قریب لاؤں گا، جہاں میں اس کے ساتھ سوؤں گا وہاں آگ بھی روشن ہو گی اور تیرے بال میرے پاس ہوں گے۔ اگر تو نے کوئی گڑبڑ کی تو میں تیرا ایک ایک بال آگ میں ڈالتا ہوں گا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس طرح تو روشنی میں بھی آ جاتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ منورما کا یہ حشر دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہو گیا تھا اور میں اسے تڑپانے میں بڑا لطف محسوس کر رہا تھا۔ منورما کا چہرہ سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سخت پیچ و تاب کھا رہی تھی، پھر وہ آخری بار بولی۔

"تو تم مجھے میرے بال واپس نہیں کرو گے؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے لٹ اس کی طرف جھلائی۔

"تو پھر یاد رکھنا، اب منورما صرف ان عورتوں کی دشمن نہ ہو گی جو تیرے نزدیک آئیں گی، بلکہ اب میں تیری بھی دشمن ہوں، اب میں تجھے بھی نقصان پہنچاؤں گی۔"

"ابھی سے شروع کر دے منورما، تو جانتی ہے تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھ لوں گی، میں تجھے دیکھ لوں گی۔" وہ آگے بڑھ گئی اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے بالوں کی اس لٹ کو چوم لیا جس کے آخری سرے پر بے چاری گوندی کا خون لگا ہوا تھا۔ بہرحال چونکہ لٹ اس وقت اکھاڑی گئی تھی جب گوندی کے بدن پر منورما کا قبضہ تھا اس لئے یہ لٹ منورما کے بالوں کی لٹ ہی تھی۔

منورما غائب ہو گئی، لیکن میرا کام اب بن گیا تھا، میں نے ایک بات اب بھی منورما سے چھپائی تھی وہ یہ کہ میں اس کے ناخنوں سے اسے پہچان سکتا ہوں، یہ نکتہ میں نے ابھی چھپا ہی رکھا تھا اور اس کا پوشیدہ رہنا ہی بہتر تھا۔ بہرحال پھر میں تنہا رہ گیا۔ بالوں کی لٹ میں نے نہایت احتیاط سے رکھ لی، اور پھر اسی جگہ لیٹ گیا۔ منورما اگر میرے خلاف کچھ کرنے کی کوشش بھی کرتی تو اس کی طاقت تھی۔ اب اس کی یہ شکتی بھی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے بھڑ جائے۔

دوسرے دن صبح میں پھر چل پڑا، آج میری ذہنی کیفیت زیادہ درست نہیں تھی، میں اب اس ملک سے ہی نکل جانا چاہتا تھا۔ جتنا وقت میں نے یہاں گذارا تھا اور جتنی الجھنوں میں یہاں گرفتار ہوا تھا اتنا کسی اور سلسلہ میں نہیں ہوا تھا۔ میں بے دین تھا پروفیسر، بے دین ہوں۔ لیکن جادو سیکھنے کے لئے جو کچھ کرنا پڑتا تھا، اسے میری لاابالی فطرت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، اور بقول سادھو کے دوسرے قسم کا گیان تو اس کے حصول میں بھی بے پناہ مشکلات تھیں۔ سادھوؤں کو تلاش کیا جائے، ان کی خوشامدیں کی جائیں اور اس کے بعد بھی سینکڑوں ہنگامے سینکڑوں تجربے سینکڑوں جھگڑے۔ چنانچہ میں نے اس علم سے بھی دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور سوچا کہ یہاں سے نکل ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ لیکن کہاں

اشتہار

خدمت میں پیش پیش
آپ کے لئے
ایک اور خدمت

اس سے تو ہر کوئی واقف ہے کہ اکسیری دواخانہ گزشتہ پچانوے سال سے بین الاقوامی مثالی شہرت و عزت کا حامل رہا ہے۔ اس معتبر ادارہ کا بزرگ مقصد عوام کی بے لوث خدمت، سستے آسان اور موثر علاج سے کرنا رہی ہے۔ اب ایک منفرد خدمت عوام کو پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

آپ پاکستان میں ہوں یا پاکستان سے باہر
ہم آپ کی صحت کی حفاظت کر سکتے ہیں

کراچی سے دو شہروں اور بیرون پاکستان ایران، عراق، دوبئی، سعودی عرب، ابوظہبی، بحرین، کویت انگلینڈ، امریکہ، افریقہ میں مقیم پاکستانیوں کے استفادے، آسانی اور سہولت کے پیش نظر اس ادارہ نے ان کے لئے ایک علیحدہ "شعبۂ تشخیص و تجویز" قائم کر دیا ہے۔ جس کا کام صرف خط و کتابت کے ذریعہ ان بیمار، دکھی دل مریضوں کے علاج کے لئے ہمدردانہ غور و فکر کے بعد آسان علاج، صحتمند اور کامیاب زندگی گزارنے کے اصولوں اور راہوں سے آشنا کرنا ہے۔

آپ بھی گھر بیٹھے اپنا علاج کرائیں

اپنی بیماریوں و شکایتوں کے تفصیلی کوائف کے ساتھ اس شعبہ سے بذریعہ خط رابطہ قائم کریں۔

اوقاتِ طلب: صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک (اتوار کو بند رہتا ہے)

شعبۂ تشخیص و تجویز: فون: ۲۱۳۱۹۷

اکسیری دواخانہ (قائم شدہ ۱۹۲۵ء)

مورس والہ بلڈنگ۔ بالمقابل میونسپل کارپوریشن۔ ڈسٹرکٹ کورٹ۔ ایم۔ اے۔ جناح روڈ۔ کراچی

جاؤں، کسی دوسرے ملک، کسی دوسری سرزمین کی تلاش میں! اس کے بارے میں معلومات کرنا ضروری ہے، تب مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک طویل عرصہ سے اپنے سب سے سچے سب سے مخلص دوستوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے میرے ہمراز میرے محسن۔ میری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں، ستارے ابھی پوشیدہ تھے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ آج کی رات اپنے دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے گذاروں گا، وہ میرے سچے ہمدرد ہیں۔ یقیناً میرا ساتھ دیں گے۔

میں نے گھوڑے کے انداز میں تھکن محسوس کی اور بے دلی سے اسے ایک جگہ روک دیا، زین کھولی اور اسے آزاد چھوڑ دیا۔ خود میں ایک پہاڑی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے صرف رات ہونے کا انتظار تھا۔ میں اس علاقے سے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ تب اچانک پشت پر مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور میں نے گھوم کر دیکھا اور اچھل پڑا۔

سادھو کرنامی کی صورت میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے میری جانب آ رہا تھا۔ بہرصورت یہ ایک عمدہ انسان تھا اور میں اس سے کسی حد تک متاثر بھی تھا، چنانچہ میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور کرنامی میرے نزدیک پہنچ گیا۔

" کیسے ہو بالک؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

" ٹھیک ہوں، تمہارا دیش چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

" ارے۔ کہاں۔ کیا یہ تمہارا دیش نہیں ہے؟"

" میں نے شاید تمہیں پہلے بھی بتایا تھا مہاراج کہ میں ساری دھرتی کا انسان ہوں، میری دنیا محدود نہیں ہے۔"

" بات میری سمجھ میں نہیں آئی بالک؟"

" تم نے خود ہی کہا تھا کرنامی مہاراج کہ میں عام لوگوں میں سے نہیں ہوں۔"

" غلط تو نہیں کہا تھا، میرا گیان یہی بتاتا ہے۔ تیرے جنم کنڈل کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ تیرے بارے میں معلوم کر دوں، پرنتو میں اس میں ناکام رہا، تب میرے ویروں نے بتایا کہ تیرے ستارے آکاش کے ان کونوں میں چھپے ہوتے ہیں جو منش کی نگاہوں سے اوجھل ہیں، اور بالک جن کے ستارے منش نہ دیکھ سکیں وہ دیوتا ہوتے ہیں، اوتار ہوتے ہیں یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے بارے میں بھگوان نے منش کو بتانا ٹھیک نہیں سمجھا۔ میں نے وہی بات کہہ دی جو مجھے معلوم ہے۔"

" تمہارا خیال درست ہے کرنامی مہاراج! میں تو صدیوں کا انسان ہوں۔ اور جب میں زندگی سے تھک جاتا ہوں تو پھر سکون کی نیند اپنا لیتا ہوں۔ مجھے نہ انسانوں سے بیر ہے نہ محبت۔ میں تو ان کے درمیان آتا ہوں، ان کے ماحول کو ان کی تہذیب کو دیکھتا ہوں اور اپنی کتاب مرتب کرتا رہتا ہوں۔ سب سے زیادہ محبت مجھے اپنی کتاب کے اوراق سے ہے جو تاریخ کی سچی کہانی سناتے ہیں جس میں حقائق توڑ مروڑ کر نہیں درج کئے جاتے، یہ تو انسان کی سچی کہانی ہے جسے میں رقم کر رہا ہوں۔"

" میرا من کہتا تھا تو مہان ہے بالک، بلاشبہ تیرے پاس سنسار کے بہت سے آدرش ہوں گے۔"

" ہاں۔ میں نے صدیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے گذرتے دیکھا ہے مجھے علم سے محبت رہی ہے اور آج بھی میں علم کے لئے سرگرداں ہوں اور شاید صدیوں بعد بھی، صدیوں بعد کے انسان سے کچھ سیکھ لینے کا خواہاں ہوؤں گا۔"

" میرے دیش سے تمہارا من کیوں بھر گیا؟"

" بس یہاں کچھ نہیں ہے، میں یہاں سے آگے جانا چاہتا ہوں۔ میں یہ دیش چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ یہ الجھنوں کی سرزمین ہے اور میں آزاد ذہن کا مالک!"

" اور منورما سے بدلا نہ لوگے؟" کرنامی نے پوچھا۔

" نہیں۔ وہ عورت میرا کیا بگاڑ سکتی ہے، اس نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ بس مجھے اس سے یہی پرخاش تھی کہ اس نے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جن کا تھوڑا بہت تعلق مجھ سے تھا، لیکن اب یہ میرا معاملہ نہیں ہے، میں تو یہ دیش چھوڑ ہی رہا ہوں۔" اور یہ حقیقت تھی پروفیسر کہ اچانک میرے ذہن میں کچھ جھنجلاہٹوں نے جنم لیا تھا۔ میں نے واقعی سوچا تھا کہ اب یہاں رہنا فضول ہے۔ اگر فوری طور پر میرے مطلب کی کوئی سرزمین نہ مل گئی تو پھر میں سونا پسند کروں گا، طویل اور گہری نیند۔

" میرے دیش سے ایسے نہ جا بالک، یہاں ابھی بہت کچھ ہے۔ تجھے بہت کچھ ملے گا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر تو گیان چاہتا ہے تو میں تجھے راستے دکھا سکتا ہوں۔ آج بھی میں وہی بات کہہ رہا ہوں۔"

" تم اس دیش کے ایک اچھے انسان ہو کرنامی، میری کتاب میں تمہارا نام ایک اچھے انسان کی حیثیت سے درج ہو گا اور اگر کبھی کسی بھی دور میں تاریخ کی یہ سچی کتاب اس دور کے انسانوں کے سامنے آئی تو وہ اس میں تمہارا نام ضرور دیکھیں گے۔" میں اٹھ گیا، اور اب مجھے ستاروں کی آمد کا بھی انتظار نہیں تھا مجھے سمندر کی تلاش تھی۔ ذہن پر جو کچھ سوار ہوا تھا اسے میں فوری طور پر پورا کر دینا چاہتا تھا۔ کرنامی نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں، لیکن میں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی اور چلتا رہا۔ راستوں سے بے نیاز، مجھ پر نیند سوار تھی اور پھر جب سمندر کی چنگھاڑ سنائی دی تو مجھے یوں لگا جیسے ماں کی آغوش میرے لئے وا ہو، موجیں دھیمے سروں میں کوئی لوری گنگنا رہی ہوں۔ میری آنکھیں ایک دوسرے سے جڑنے لگیں، بمشکل میرے قدم مجھے سمندر تک لے گئے۔ اور پھر میں نے خود کو سمندر کے نرم بستر پر گرا دیا، گہرے اور گہرے سمندر کی طرف۔ اور پھر میں دنیا سے بے خبر ہو گیا۔ موجیں میری محافظ بن گئیں، نہ جانے کب تک کے لئے۔

باقی آئندہ ماہ

جھوٹا کیس

س، م، جمیل

ایک بے وفا بیوی اور ایک بے اعتبار شوہر کی کہانی

غلط نتائج اخذ کرنے والوں کیلئے قصۂ عبرت

"مسز کیرول" اجنبی نے کہا۔ "میں اس حقیقت سے باخبر ہوں کہ آپ کے شوہر بیحد شکی مزاج ہیں۔"

مسز کیرول کے لیے یہ اطلاع بہت پرانی تھی۔ اس کا شوہر رابرٹ کیرول دیوانگی کی حد تک شکی مزاج تھا۔ "تمہاری معلومات درست ہیں، لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

اجنبی بڑی مکاری سے مسکرایا۔ "اب میں اسی طرف آ رہا ہوں۔"

"تم اس مکان میں یہ کہہ کر داخل ہوتے تھے کہ تمہارا تعلق کسی جریدے سے ہے۔" مسز کیرول نے خشک لہجے میں کہا۔ "اور تم ٹی وی پر پیش کیے جانے والے پروگراموں کے بارے میں ناظرین کی آراء اکٹھی کر رہے ہو۔ تم نے ٹی وی کے متعلق ایک بھی سوال نہیں کیا، اس کے برعکس تم نے فوراً میری ذاتی زندگی پر تبصرے شروع کر دیئے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو ظاہر کرتے ہو، تم ایک فراڈ ہو۔"

"آہ مادام۔" اجنبی نے تیسرے درجے کے پٹے ہوئے اداکار کی مانند سر کو خم دیتے ہوئے کہا۔ "بے شک میں فراڈ ہوں، ہم سب فراڈ ہیں، ہم وہ نہیں ہیں جو ظاہر کرتے ہیں۔"

"تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم بلا تاخیر فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

مسز کیرول نے سرد مہری سے جواب دیا۔

اجنبی نے صوفے پر سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ کچھ اور پھیل گیا جیسے وہ کسی بھی لمحے جوتے اتار کر خراٹے لینا شروع کر دے گا۔ "اگر آپ کے شوہر کو کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ آپ اس کی لاعلمی میں ایک غیر مرد سے عشق لڑاتی ہیں اور اس کا پہلو گرم کرتی ہیں تو مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسٹر کیرول فوراً اس شخص کو گولی مار دیں گے۔"

اجنبی کا یہ انکشاف بھی مسز کیرول کے لیے نیا نہیں تھا۔ رابرٹ نے کئی بار اپنا ریوالور فضا میں لہراتے ہوئے اس قسم کا اعادہ کیا تھا۔ "اگر میں نے کسی مرد کو تمھیں چومتے ہوئے بھی دیکھا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ اس مرد کا بھیجہ پاش پاش کر دوں گا، اس کی ماں بھی اپنے لاڈلے کو پہچان نہ سکے گی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں یہ معلومات کس نے مہیا کی ہیں۔" مسز کیرول نے محتاط لہجے میں کہا۔ "تمھاری معلومات درست ہیں لیکن اس کے باوجود میں تم سے اپنی نجی زندگی پر کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتی۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔"

اجنبی نے بڑی لاپروائی سے جماہی لی اور کاہلی سے مسکرا دیا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ پولیس کو فون کرنے کی حماقت نہیں کریں گی، مسز کیرول کیونکہ آپ بے وقوف نہیں ہیں اور اب آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میری یہاں موجودگی کا کیا مقصد ہے، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

مسز کیرول کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ اجنبی کی گفتگو سے اسے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ اس کی نجی زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ باخبر ہے جتنا کہ اس نے ظاہر کیا ہے۔ وہ اس امکان کو بھی رد نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس کی نجی زندگی کے بارے میں اس کے شوہر رابرٹ سے زیادہ معلومات رکھتا ہے لیکن ایک اجنبی کے منہ سے اپنی جنسی زندگی کے بارے میں کچھ سننا کوئی بھی عورت پسند نہیں کرتی۔ "میرا خیال ہے کہ میری گھریلو زندگی کے بارے میں تم نے جس قدر معلومات جمع کی ہیں ان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کے شوہر ہر وقت اپنے پاس ایک بھرا ہوا ریوالور رکھتے ہیں۔ ۳۸۔۶ کا کولٹ کوبرا ریوالور جس کی کارکردگی کسی طاقتور رائفل سے کم نہیں ہوتی۔"

"میرے شوہر پیشے کے اعتبار سے جوہری ہیں۔" مسز کیرول نے کہا۔ "عام طور پر انھیں اپنے ہاں قیمتی پتھر اور بڑی رقمیں رکھنی پڑتی ہیں۔ یہ ان کے کاروبار کا تقاضہ ہے اس لیے وہ ہر وقت مسلح رہتے ہیں۔ ان کے پاس ریوالور رکھنے کا اجازت نامہ موجود ہے۔"

"بے شک، بے شک، مجھے معلوم ہے میں سب جانتا ہوں۔" اس نے ستائشی نظروں سے ڈرائنگ روم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس مکان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کامیاب تاجر ہیں، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"اب تم مجھے بور کرنے لگے ہو۔" مسز کیرول نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور پلٹ کر ٹیلی فون کے آلے کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے پولیس کو فون کر دینا چاہیے، تم ٹلتے ہوئے نظر نہیں آتے۔"

"آہ بے چارہ ولیم۔" اجنبی نے دھیمے لہجے میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

مسز کیرول کے اٹھتے ہوئے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اس نے آہستہ آہستہ گھوم کر اجنبی کو دیکھا۔ "کیا کہا تم نے؟"

"کیوں اب بوریت نہیں ہو رہی؟" اجنبی کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"تم نے ابھی کیا کہا تھا؟"

"آہ بے چارہ ولیم۔" اجنبی نے دہراتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ جب ۳۸۔۶ بور کے ریوالور کی گولی اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑائے گی تو وہ فوراً مر جائے گا، کیسی فضول موت ہو گی بے چارے کی۔ محض ایک خوبصورت عورت کی خاطر!"

مسز کیرول کو اپنے پیروں کی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے دائیں جانب تین قدم بڑھائے اور ایک کرسی کا سہارا لے لیا۔ "کون ولیم؟ پورا نام کیا ہے؟" اس نے کمزور لہجے میں سوال کیا۔

اجنبی نے مسکراہٹ کا لبادہ اتار پھینکا اور سرد نظروں سے مسز کیرول کی طرف دیکھا۔ "کیا تم واقعی پورا نام سننا چاہتی ہو مسز کیرول؟ کیا تمھاری زندگی میں ایک سے زیادہ ولیم آتے ہیں؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں ولیم نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی۔" اس نے کرسی کی پشت پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ جھوٹ بولنے کی چغلی کھا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اجنبی کو ولیم کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟

"اوہ، تب تو مجھے ولیم کا پورا نام اور پتہ بتانا پڑے گا۔" اس نے مصنوعی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مادام، اس کا پورا نام ولیم کار۔۔۔!"

"خاموش!"

وہ مسکرایا۔ اس کے دانت بالکل سفید اور آب دار تھے۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں مسز کیرول کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جائیے مسز کیرول! آپ کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔"

وہ گھوم کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میرے۔۔۔۔ میرے شوہر کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، ممکن ہے وہ ابھی۔۔۔۔۔!"

اجنبی نے لاپروائی کے اظہار میں ہاتھ ہلایا۔ "مسٹر کیرول ایک بجکر پندرہ منٹ سے پہلے نہیں آئیں گے اس لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے کاروباری لہجے میں کہا۔ وہ صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گیا، اس کے انداز سے ظاہر ہونے والی کاہلی سستی لمحہ بھر میں غائب ہو گئی تھی۔ "ایک بجے انھیں آخری ملاقات کرنی ہے اور جس جگہ یہ ملاقات ہو گی اس کا یہاں سے پندرہ منٹ کا فاصلہ ہے۔ اس لیے مسٹر کیرول سوا بجے سے پہلے گھر نہیں آسکتے

آپ نے دیکھا مسز کیرول، میں پوری تیاری کے بعد آیا ہوں۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"اب آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں اور اب تک میں نے گفتگو کرنے کے علاوہ کوئی مطالبہ پیش نہیں کیا۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟"

مسز کیرول نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب سوال یہ ہے مسز کیرول کہ کیا آپ اپنے بہترین دوست ولیم کی موت کو برداشت کر سکتی ہیں؟ کیا آپ یہ پسند کریں گی کہ آپ کی وجہ سے اسے قتل کر دیا جائے؟"

اس دہشت ناک خیال نے اس کی شریانوں میں خون منجمد کر دیا۔ ولیم! میرا سرمایۂ حیات، میری زندگی، زندہ رہنے کی واحد امید، کیا میں اس کے بغیر ایک لمحے بھی زندہ رہ سکوں گی؟ مسز کیرول سوچنے لگی۔ اپنے شوہر کی امانت میں سے کچھ وقت چرا کر اگر وہ ولیم سے ملاقاتیں نہ کرتی تو اب تک وہ رابرٹ کو برداشت نہ کر پاتی، ان کے درمیان علیحدگی ہو جاتی، یا وہ پاگل ہو چکی ہوتی۔

ہزاروں بار اس نے بڑی شدت سے اس امر کی خواہش کی تھی کہ رابرٹ کی بجائے اس کا محبوب دولت مند ہوتا یا وہ اتنا مفلس نہ ہوتا، لیکن شاید غربت ہر شاعر کا مقدر ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ تنگ دست رہتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی مہیا کردہ آسائشوں کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اب انھیں ترک کرنے کا تصور بھی اس کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا۔ ولیم کو چھوڑنے کا خیال اس سے زیادہ دہشت ناک تھا۔ اسے رابرٹ کی دولت اور ولیم کی محبت کی ضرورت تھی۔

اجنبی بڑے غور سے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھر آئی۔ "میں سمجھ گیا مسز کیرول، آپ اپنے عزیز ترین دوست کی موت برداشت نہیں کر سکتیں، وہ آپ کے لیے بہت اہم ہے۔"

"ہاں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہاں، وہ میرے لیے بہت اہم ہے۔"

جب تک اس کی ملاقات ولیم سے نہیں ہوئی تھی، وہ دنیا کے ہر مرد کو وحشی درندہ تصور کرتی آئی تھی۔ یہ اس کی ماں کے تجربات کا نچوڑ تھا۔ جب اس کا باپ اس کی ماں کو بے سہارا چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا تو اس کا یہ عقیدہ ایمان کی حیثیت اختیار کر گیا کہ ہر مرد وحشی درندہ ہوتا ہے لیکن اس وحشت ناک دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ہر عورت کو ایک مرد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ حسن و شباب کی دولت سے مالا مال تھی۔ جیسے ہی اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، مردوں کے ہوسناک پنجے چاروں طرف سے اسے دبوچنے کے لیے بڑھنے لگے۔ ان پنجوں سے بچنے کے لیے اسے ایک مرد کی ضرورت تھی۔ اس نے رابرٹ کا انتخاب محض اس لیے کیا تھا کہ وہ دولت مند تھا۔ اسے ایک برائی کا انتخاب کرنا تھا۔ اس نے ایسی برائی کا انتخاب کیا جو اسے آرام و آسائش بھی مہیا کر سکے لیکن ولیم سے ملاقات ہونے کے بعد اسے اپنے عقیدے میں ترمیم کرنی پڑی۔ اسے ایک ایسا تجربہ ہوا جس کا تصور بھی اس کی ماں نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی تھی کہ دنیا کا ہر مرد وحشی نہیں ہوتا، اس کلیے سے کچھ مرد مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ولیم اس کی بہترین مثال تھا جس کی دیوانہ وار محبت نے اس کے وجود کو سرشار کر دیا تھا۔ وہ شاعر تھا اور محبت کے نازک ترین جذبے کو اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا، اسے خوبصورت لفظوں میں بیان کر سکتا تھا اور اپنی گرمجوشی سے ان لفظوں کی تعبیر پیش کر سکتا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" مسز کیرول نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آہ مادام، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" اجنبی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، اللہ کا دیا سب کچھ میرے پاس موجود ہے سوال یہ نہیں ہے کہ مجھے آپ سے کیا چاہیے، سوال یہ ہے کہ آپ کو مجھ سے کیا چاہیے۔"

ان خواتین کے لیے،
جو اپنے آپ کو سمجھنا چاہتی ہیں
اور وہ مرد جو خواتین کو سمجھنا چاہتے ہیں
عورتوں کی نفسیات
ان سب کے لیے، پڑھنا ضروری ہے:
اس موضوع پر اب تک اس سے اچھی کتاب نہیں لکھی گئی
اس کتاب کا دنیا کی ۱۶ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے
قیمت: ۹/۵۰ روپے
مکتبہ نفسیات ۵۔ ای ناظم آباد، کراچی

مسز کیرول نے تعجب بھری نظروں سے اجنبی کو دیکھا۔ "میں سمجھی نہیں ہے"

اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر سے ایک لفافہ نکال کر اسے مسز کیرول کی طرف اچھال دیا۔ "یہ ان پر ذرا ایک نظر ڈالیں، پھر آپ سمجھ جائیں گی۔"

لفافہ مسز کیرول کی گود میں گرا تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر اندر سے تصاویر نکالیں اور ان پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ اس کمرے کو پہچان گئی جہاں یہ تصاویر اتاری گئی تھیں۔ وہ شہر کے مضافاتی علاقے میں واقع ایک گھٹیا درجے کے ہوٹل کا کمرہ تھا۔ ہر تصویر میں دونوں چہرے بہت صاف اور واضح تھے۔ ان تصاویر میں شرمناک لمحے مقید تھے جن کی یادیں تو خوشگوار ہوتی ہیں لیکن جن کی تصاویر دیکھ کر چہرے کی رنگت اُڑ جاتی ہے۔

"آپ کو ان کی ضرورت ہے مسز کیرول۔" اجنبی نے سفاکانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کی اور ان کے نیگیٹیوز کی۔"

اس پر سکتے جیسی کیفیت طاری تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے جیسے خواب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمھارا مطلب ہے کہ تم یہ..... یہ تصویریں رابرٹ کو دکھا دو گے اور وہ.....!"

"ارے نہیں، مجھے خون خرابہ قطعی پسند نہیں۔ خاص طور پر ولیم جیسے عمدہ اور جواں سال آدمی کی موت مجھے غمگین کر دیتی ہے۔ ہاں اگر آپ ان تصاویر اور ان کے نیگیٹیوز کو اپنے پاس رکھنا پسند نہ کریں تو ظاہر ہے مجھے پھر آپ کے شوہر کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔"

"کیا قیمت ہے ان کی ہے"

"میں نے اس موضوع پر ذرا بھی غور نہیں کیا۔" وہ مسز کیرول کی ناگفتہ بہ حالت سے محظوظ ہوتے ہوتے مسکرایا۔ "یہ فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے کہ ان تصاویر کی آپ کے نزدیک کیا اہمیّت ہے مسز کیرول۔ ذرا دیکھیں تو کس قدر خوبصورت تصویریں ہیں۔ یہ ان بے شمار ناقابل فراموش لمحوں میں سے چند یادگار لمحوں کی تصویریں ہیں جو آپ نے ولیم کے ساتھ دنیا کی نظروں سے چھُپ کر گزارے ہیں۔"

مسز کیرول نے بے اختیار تصویروں کی طرف دیکھا، اس کے ذہن میں کہیں کھٹکا سا ہوا اور وہ دہشت زدہ گھوڑے کی طرح بے قابو ہو گئی۔ "میں..... میرا خیال..... میں بے ہوش.....!" اس کی آواز دھیمی ہوتی ہوئی خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ لہراتی ہوئی کرسی سے نیچے قالین پر لڑھک گئی۔

اجنبی کے لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اپنی نشست سے اٹھا اور دوڑتا ہوا مسز کیرول کے قریب پہنچا، اس نے گھٹنوں کے بل جھُک کر مسز کیرول کی نبض ٹٹولی اور جلدی جلدی اس کے رخساروں پر طمانچے مارے، ہتھیلیاں سہلائیں، اپنے رومال سے مسز کیرول کے چہرے پر ہوا جھلی، بدحواسی کے عالم میں وہ کبھی مسز کیرول کے رخساروں پر طمانچے مارتا تھا، کبھی اس کی ہتھیلیاں سہلاتا تھا اور کبھی رومال سے پنکھا جھلتا تھا۔ جلد ہی اس کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور مسز کیرول نے آنکھیں کھول دیں۔

"آپ..... آپ ٹھیک ہیں مسز کیرول ہے"

"میرا دل۔" مسز کیرول نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "میرا دل کمزور ہے۔" اپنے دل کے بارے میں مسز کیرول کا یہ بیان غلط تھا لیکن موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے یہ جھوٹ بولنا مناسب سمجھا۔

اس بیان کا اجنبی پر فوراً ہی اثر ہوا۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا اور وہ مسز کیرول سے دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ..... آپ آرام فرمائیں مسز کیرول، آپ کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ ن..... نہیں، ملنے کی ضرورت نہیں، آپ لیٹی رہیں، آرام کریں۔ اس موضوع پر پھر کبھی گفتگو ہو سکتی ہے۔"

"شکریہ۔" مسز کیرول نے کمزور لہجے میں کہا اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ "مجھے واقعی آرام کی ضرورت ہے۔ آپ..... آپ مجھے ٹیلیفون کر لیں۔ ہم باہر کہیں ملاقات کر سکتے ہیں۔"

"بے شک، بے شک۔ درست فرمایا آپ نے۔"

"آج شام چھ بجے ٹیلیفون کرنا، چھ بجے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اور فون پر اپنا نام بورس بتانا۔"

"بورس!" اجنبی نے دہرایا۔ "ٹھیک ہے مسز کیرول، میں ایسا ہی کروں گا۔" اس نے جلدی جلدی تمام تصاویر لفافے میں ڈالیں اور تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ "میں ٹھیک چھ بجے فون کروں گا۔"

باہر موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز سنتے ہی مسز کیرول نے آنکھیں کھول دیں اور پھُرتی کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لباس جھاڑتے ہوئے وہ ٹیلیفون کی طرف بڑھی اور ڈائل پر ایک نمبر گھمایا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے جواب دیا۔ "ڈارلنگ۔" مسز کیرول نے اپنی آواز میں شہد گھولتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ۔" دوسری طرف سے مردانہ آواز نے چیخ کر جواب دیا۔

"ولیم ہے"

"اوہ میری جان۔ میرا دل، میری زندگی، میری محبّت.....!"

"ڈارلنگ میں تم سے.....!" مسز کیرول نے کچھ کہنا چاہا۔

"ڈارلنگ! ڈارلنگ! ڈارلنگ!"

"شکریہ میرے محبوب۔ میں یہ کہنا.....!"

"میری زندگی، میری محبّت، میری کائنات۔"

"ولیم!" مسز کیرول نے جھلا کر کہا۔

دوسری طرف اچانک خاموشی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد مردانہ آواز

نے بڑے کمزور لہجے میں کہا۔ "ہاں مونا! کیا بات ہے ہے"

محبوب کا شاعر ہونا جہاں رُوح کی آسودگی کا باعث ہوتا ہے وہیں شاعر محبوب کبھی کبھی مصیبت بھی ثابت ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس کی توجہ اصل معاملے کی جانب مرکوز کرنا ناممکن بن جاتا ہے۔ مسز کیرول آخر کار اپنے شاعر محبوب کے ہوش و حواس درست کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"ولیم! میں آج رات نہیں آسکتی۔"

"آہ جانِ من! میں مر جاؤں گا، مجھ پر رحم کرو۔" ولیم نے درد بھری آواز میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے ولیم، یقین کرو میں مجبور ہوں۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"گڑبڑ ہے" اس کی آواز دھیمی ہوتی ہوئی سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ "کیا..... کیا اسے معلوم ہو گیا ہے ہے" ولیم کا اشارہ مسز کیرول کے شوہر کی طرف تھا۔

"نہیں، نہیں۔ یہ بات نہیں ہے ڈیر۔" مسز کیرول نے جلدی سے اپنے محبوب کو تسلی دی۔ "ایک اور معاملہ ہے، میں کل تفصیل سے بتاؤں گی۔"

"تو اب کل ملاقات ہو گی۔" ولیم کی آواز سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ لفظ کل اس نے اس طرح ادا کیا تھا جیسے وہ اگلے سال کا ذکر کر رہا ہو۔

"ہاں، دوپہر کو بارہ بجے، میوزیم کے پاس۔"

"آہ۔ میری زندگی، اب وقت کے پر ٹوٹ جائیں گے، پتا نہیں کل کب آئے گی۔"

بڑی مشکل سے مسز کیرول نے ٹیلی فون کا رابطہ منقطع کیا کیونکہ ابھی اسے کئی اشد ضروری کام کرنے تھے۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر اس نے گیراج سے گاڑی نکالی اور سیدھی خریداری کے قریب ترین مرکز پر پہنچی۔ وہاں اس نے ایک لمبا چوڑا سگار اور شوخ رنگ کی نکٹائی خریدی اور واپس گھر آگئی۔

اس نے ڈرائنگ رُوم کے صوفے پر بیٹھ کر سگار جلایا۔ وہ جلدی جلدی سگار کے کش لیتے ہوئے گاڑھا گاڑھا دھواں اُگلتی رہی۔ چند منٹ بعد وہ سگار پیتی ہوئی اُوپر اپنی خواب گاہ میں گئی۔ اس نے شوخ رنگ کی نکٹائی خواب گاہ میں رکھی ہوئی الماری کے ہینڈل پر لٹکا دی اور بستر پر بیٹھ کر جلدی جلدی سگار پھونکنے لگی۔ سگار کے جلتے ہوئے سرے پر سخت قسم کا گُل جمع ہو گیا تھا۔ اس نے احتیاط سے وہ گُل اپنے شوہر کی راکھ دانی میں جھاڑ دیا۔ سگار کا دھواں پوری خواب گاہ میں بھر گیا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ کھانسی کے دوران نے اس کی بُری حالت کر دی۔ وہ باہر نکل آئی اور نیچے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ کر سگار کے چند کش لے کر باورچی خانے میں آگئی۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے سگار بجھایا اور سگار کوڑے کے ڈرم میں کچرے کے نیچے چھُپا دیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے اعصاب کو سکون پہنچانے والی دو گولیاں کھائیں اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔

رابرٹ ایک بج کر پچیس منٹ پر گھر پہنچا۔ "موناجان!" اس نے گرجدار آواز میں چیختے ہوئے کہا اور جھُومتا ہوا باورچی خانے میں داخل ہوا۔ "تم یہاں ہو میری زندگی۔" اس نے آگے بڑھ کر مونا کو اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔ اس کے اظہار محبّت سے مونا کی ہڈیاں کڑکڑا گئیں۔

یہ فرق ہے رابرٹ اور ولیم میں۔ مونا نے اکھڑی ہُوئی سانس کو جوڑتے ہوئے سوچا۔ "میری زندگی" کہتے ہوئے اس کے شوہر نے سارا زور لفظ "میری" پر دیا تھا۔ اس کی جگہ ولیم ہوتا تو وہ لفظ "زندگی" پر زور دیتا۔

حسب معمول کچھ دیر تک وہ اپنے شوہر کے بپھرے ہوئے محبّت کے منہ زور جذبات کے ہاتھوں جسمانی و روحانی اذیتیں برداشت کرتی رہی، پھر رابرٹ صبح کا اخبار پڑھنے کے لیے ڈرائنگ رُوم میں چلا گیا، اور وہ کھانا تیار کرنے میں مشغول ہو گئی۔

مونا نے باورچی خانے سے آواز دے کر کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ رابرٹ جب کھانے کی میز پر بیٹھا تو معمول کے خلاف چپ چپ سا تھا۔ اس نے کھانے کے دوران صرف ایک سوال پوچھا، جس کے لیے سرسری انداز اختیار کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ "آج کوئی آیا تھا ڈارلنگ ہے"

مونا سوپ پی رہی تھی، اس کے ہاتھ سے چمچہ چھُوٹ گیا۔ "میں بھی کتنی بے ہودہ ہو گئی ہوں۔" اس نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کہہ رہے تھے ڈیر ہے"

رابرٹ کی پتلیاں سکڑ گئیں، اس نے غور سے اپنی حسین بیوی کو دیکھا

علم روحیت پر ایک

ٹیلی پیتھی
اور
مستقبل بینی

ایک کتاب میں ۲ کتابیں

اپنا پیغام دُوسروں کے ذہنوں تک پہنچانے اور اُن کے دِل کا حال جاننے
— کا سائنسی طریقہ : —
قیمت : ۸/۵۰ روپے

مکتبۂ نفسیات
۵۔ ای، ناظم آباد — کراچی

"میں پوچھ رہا تھا کہ آج کوئی آیا تھا؟"

"نن..... نہیں تو ڈیر۔" مونا نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمھیں یہ خیال کیسے آیا ڈارلنگ؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے جواب دیا اور چپ چاپ سوپ پینے لگا۔

کھانے کے بعد اس نے کہا۔ "میں ذرا آرام کرنے اوپر جا رہا ہوں، مجھے تین بجے جگا دینا۔"

مونا نے ٹھیک تین بجے اپنے شوہر کو جگا دیا۔ اس نے جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ "میں ساڑھے پانچ بجے آؤں گا۔" اس نے کہا اور خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

رابرٹ کے جانے کے بعد مونا نے خواب گاہ پر نظر ڈالی، اس نے شوخ رنگ کی نکٹائی الماری کے ہینڈل پر لٹکائی تھی، وہ اپنی جگہ سے غائب تھی، کمرے میں اب بھی سگار کی ہلکی سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

رابرٹ جب ساڑھے پانچ واپس آیا تو دوپہر سے زیادہ خاموش تھا۔ خلاف معمول اس نے اپنے مخصوص مردانہ انداز میں محبت کا اظہار نہیں کیا، گرمجوشی اس کے لہجے میں بھی نہیں تھی۔ وہ چپ چپ عجیب نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ غور سے مونا کے ہیجان انگیز جسمانی خطوط پر نظریں گڑا دیتا۔ کبھی اس کی نظریں اپنی بیوی کے خوبصورت چہرے پر پھسلنے لگتی تھیں۔ اس کی نظروں نے مونا کو نروس کر دیا۔ وہ مجرمانہ انداز میں ہنستی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے سے ٹل جاتی تھی۔

چھ بجے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو مونا باورچی خانے میں تھی۔ "میں اٹھا رہی ہوں ڈیر۔" اس نے باورچی خانے سے چلا کر اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ "میرا ٹیلیفون ہوگا میں سن لیتی ہوں۔"

اس نے رسیور کان سے لگایا۔

"میں بورس بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ٹھیک ہے۔"

"کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں۔ رابرٹ ڈریسنگ روم میں ہے، میری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ آج رات تم سے ملنا بہت ضروری ہے، اس معاملہ پر گفتگو کرنی ہے۔"

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی۔ "جیسی آپ کی مرضی، مجھے امید ہے کہ آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہوگی؟"

"ہاں، میں اب ٹھیک ہوں۔ دوپہر کو بس ذرا چکر آ گیا تھا۔ سنو تم فلیٹ وے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لو اور اس کے لیے کلارک کا نام استعمال کرنا، میں....."

"ہوٹل میں کمرہ؟"

"ہاں، گفتگو ذرا لمبی ہوگی تم فکر نہ کرو، کمرے کا کرایہ میں ادا کروں گی۔"

"ٹھیک ہے، مجھے بھلا....."

"سنو، میں زیادہ دیر گفتگو نہیں کر سکتی، پتا نہیں کب رابرٹ اندر آ جائے۔ میں نو بجے کے قریب آؤں گی تم میرا انتظار کرنا۔"

"بہت بہتر۔"

مونا نے جلدی سے ٹیلیفون کا رابطہ منقطع کر دیا اور ٹہلنے والے انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اس میز کے قریب کھڑا تھا جس پر ٹیلیفون کا دوسرا آلہ رکھا ہوا تھا۔ اس مکان میں ٹیلی فون کے تین آلے تھے جن کا آپس میں سلسلہ قائم تھا۔

"بس کھانا تیار ہونے میں تھوڑی سی دیر ہے ڈارلنگ۔" مونا نے اپنے شوہر کو اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے، کھانا لگا کر اطلاع کر دینا۔" رابرٹ کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ اس کے بھاری بھرکم ڈیل ڈول پر بولنے کا یہ انداز بڑا مضحکہ خیز لگا لیکن وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کر گئی۔

کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ مونا نے حسب معمول ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں لیکن اپنے شوہر کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور رابرٹ شام کا اخبار پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

نو بجے مونا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ سوٹڈ جیکٹ پہنے ہوئی تھی۔ رابرٹ بدستور اخبار سے الجھ رہا تھا۔ "میں ذرا باہر جا رہی ہوں ڈیر!"

"کہاں؟" رابرٹ نے خود پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے دریافت کیا۔

"بس خداشہر تک کچھ خریداری کرنی ہے، ناخن پالش چھڑانے کا لوشن ختم ہو گیا۔"

"اچھا.... ٹھیک ہے۔"

مونا گیراج میں آئی اور اپنی گاڑی باہر نکالنے لگی۔ پچاس گز دور جانے کے بعد اس نے عقب نما آئینے میں پیچھے دیکھا، اس کے شوہر نے خواب گاہ کی روشنی گل کر دی تھی۔ ظاہر تھا کہ رابرٹ نے ناخن پالش چھڑانے والا لوشن اس کی سنگھار میز میں تلاش کر لیا تھا جس کی پوری بوتل بھری ہوئی تھی، اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ خواب گاہ کی روشنی گل کر کے باہر آ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی باہر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

فلیٹ وے ہوٹل پہنچ کر مونا نے استقبالیہ کلرک کے اوپر لگے ہوئے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ نو بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ "میں مسز کلارک ہوں۔" اس نے کلرک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ بتا سکتے ہیں میرے شوہر کس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

کلرک نے پسندیدہ نظروں سے مونا کو دیکھا۔ وہ اس قسم کی بیویوں کا عادی تھا جو اپنے شوہروں کو تلاش کرتی ہوئی آتی تھیں اور وہی سوال مختلف انداز میں دہراتی تھیں۔ اس نے رجسٹر کھول کر ایک نظر ڈالی۔ "دو سو

چھ نمبر خاتون۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"شکریہ۔" مونا نے کہا اور جلدی سے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔

لفٹ آپریٹر کو متوجہ کرنے کے لیے اس نے بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا منصوبہ مکمل اور بے داغ ہے، وہ سوچنے لگی۔ یہ منصوبہ اچانک ہی اس کے ذہن میں اس وقت آیا تھا جب وہ اس بلیک میلر سے ان تصویروں کی قیمت دریافت کر رہی تھی۔ وہ خود بھی اس کی خوبصورتی پر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی دولت اور اپنے محبوب کو بیک وقت ایک ساتھ حاصل کر سکتی ہے۔ اس منصوبے کی اصل خوبصورتی اس نکتے میں پوشیدہ تھی کہ وہ رابرٹ کی دولت حاصل کرے گی اور اس کے ساتھ اس سے چھٹکارا بھی پا لے گی، وہ آزاد ہو جائے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے ولیم سے جدا نہیں کر سکے گی۔

لفٹ نیچے آ کر رکی، وہ اندر داخل ہوئی۔

دوسری منزل پر کمرہ نمبر چھ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ ایک آزاد اور دولت مند عورت ہوگی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ اجنبی نے دروازہ کھولا اور راہداری میں دائیں بائیں دیکھ کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ بلیک میلر نے دروازہ مقفل کر دیا۔

"نہیں۔ دروازہ کھول دو۔" مونا نے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں لیڈی۔" بلیک میلر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ، نہیں مجھے صرف آپ کی دولت چاہیئے۔"

"دروازہ کھول دو ورنہ میں چلی جاؤں گی۔" مونا نے اسے دھمکی دی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ بلیک میلر نے دروازے کا قفل کھول دیا۔

"اب ٹھیک ہے۔" مونا نے کہا اور اپنی جیکٹ اتار کر بستر پر پھینک دی۔

"اب ہم معاملے کی بات کریں گے۔" بلیک میلر نے مسرت سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"بے شک۔" مونا نے بلاؤز اتارتے ہوئے جواب دیا۔

بلیک میلر نے پلکیں جھپکائیں۔ "ارے۔ ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"

"فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہے۔" مونا نے اپنی چست پتلون کی زپ کھولتے ہوئے اسے تسلی دی۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور حلقوں سے باہر ابلنے لگیں۔ "رک جاؤ، رک جاؤ۔" وہ دور سے چیخا۔ "آپ مجھے غلط سمجھیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا، رک جایئے، خدا کے لیے رک جایئے۔"

"میں تمھارا مطلب ٹھیک سمجھی ہوں، غلطی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔" مونا نے چست پتلون اتارتے ہوئے جواب دیا اور دوڑ کر بلیک میلر سے لپٹ گئی۔

وہ دہشت سے منجمد ہو گیا، اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ "میں، میں..... لل..... لیکن ولیم نے کہا تھا....."

تو ولیم کے لیے وہ رقم کافی نہیں تھی جو میں اسے خرچ کے لیے ہر ماہ دیتی تھی۔ مونا نے بڑی تلخی سے سوچا۔ وہ رقم کسی بھی تنہا آدمی کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ اماں ٹھیک کہتی تھی، دنیا کا ہر مرد وحشی درندہ ہوتا ہے سارے مرد جانور ہوتے ہیں۔

ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھلا اور رابرٹ کا بھاری بھرکم وجود آندھی طوفان کی مانند اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ۳۸ بور کا ریوالور تھا جسے وہ دیوانگی کے عالم میں فضا میں لہرا رہا تھا۔

مونا نے مڑ کر اپنے شوہر کو دیکھا اور اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ اب تک اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اب اسے یہ سوچ سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس ذلیل شخص کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھی جو دوسرے مردوں کی طرح جانور تھا۔ وہ اس کمینے مرد کے لیے دو انسانی جانوں کو داؤ پر لگا رہی تھی، اپنے شوہر رابرٹ کو اور اس بلیک میلر کو جس کی موت کو اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ بلیک میلر کو قتل کر کے رابرٹ اس جرم کی پاداش میں پھانسی پا جائے گا یا اسے عمر قید سزا ہو جائے گی اور وہ درندوں کی اس دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ ولیم زندہ رہے گا اور وہ اپنے شوہر کی ساری دولت و جائداد کی مالک بن جائے گی، اب وہ زندگی بھر ولیم کی صورت نہیں دیکھے گی، اسے پھر ایک موتلاش کرنا پڑے گا یا پھر....

ریوالور پر نظر پڑتے ہی مونا چونک کر ہوش میں آ گئی کیونکہ ریوالور کی نال کا رخ اس کی طرف تھا۔ رابرٹ ایک بھیانک غلطی کرنے جا رہا تھا۔

"نہیں، نہیں۔ ادھر، اس کی طرف۔" اس نے چیخ کر بلیک میلر کی طرف اشارہ کیا۔

پہلا دھماکہ ہوا اور گولی اس کے کان کے قریب سے گزرتی ہوئی سنگھار میز کے شیشے میں لگی جو ایک چھناکے کے ساتھ چور چور ہو گیا۔

مونا پہلے دائیں جانب بھاگی پھر بائیں طرف دوڑی، وہ نیم برہنہ پورے کمرے میں دوڑ رہی تھی۔ بلیک میلر بندروں کی مانند مسہری کے نیچے گھس کر چھپ گیا تھا۔ دوسری گولی چلی، وہ مونا کے برہنہ بازو کو خراش پہنچاتی ہوئی دیوار میں گھس گئی۔

"تم جھوٹے ہو، تم جھوٹے ہو۔" مونا دوڑتے ہوئے چیخی۔

تیسری گولی مونا کی گردن میں لگی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح بستر پر گر گئی۔ مرنے سے پہلے اس کے ذہن میں آخری خیال یہی تھا کہ دنیا کا ہر مرد وحشی درندہ ہوتا ہے۔ رابرٹ نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس مرد کو قتل کر دے گا جو اس کا بوسہ بھی لینے کی کوشش کرے گا لیکن اس کی قسم جھوٹی تھی، دنیا کے کسی مرد پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

ابو المنصور

ایک مظلوم اور بے سہارا عورت کا قصہ

جرم و سزا کی ایک تاثر انگیز کہانی

جیک نے پہلی مرتبہ اس وقت لولا ٹیلر کو دیکھا جب وہ ہیگرٹی کے ریستوران میں بیٹھا چھ نمبر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دفتر میں دیر تک کام کرتا رہا تھا اور سخت تھکا ہوا تھا۔ یہ ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب گھر پہنچنا بھی ایک کڑی آزمائش معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کام کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ بسا اوقات وہ بعض طویل رپورٹیں مطالعے کے لئے گھر بھی لے جاتا۔ اس وقت وہ ہیگرٹی کو بتا رہا تھا کہ سینٹ لوئیس سے اسے ایک بڑی اچھی ملازمت کی پیشکش موصول ہوئی ہے۔

عین اس وقت اس نے سامنے لولا کو سڑک پر آتے دیکھا اس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں چھوٹا سا چرمی بیگ تھا وہ اس سردی اور دھند میں نہایت تیزی سے چل رہی تھی۔ دروازے میں پہنچ کر وہ سوٹ کیس اور بیگ کی وجہ سے پھنس کر رہ گئی۔ ریستوران کے اندر بیٹھے ہوئے نصف درجن افراد دلچسپ نظروں سے اسے کشمکش کرتا دیکھتے رہے لیکن کوئی اس کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ بالآخر جیک اپنی سیٹ سے مسکراتا ہوا اٹھا اور اس کا سوٹ کیس پکڑ کر ایک قریبی میز پر رکھ دیا لڑکی نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اکھڑے ہوئے سانس کے درمیان جیک کا شکریہ ادا کیا۔ وہ چھوٹے سے قد کی معصوم سی لڑکی تھی۔ بالکل گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ اس نے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر پلنڈیری طرز کی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپی نظر آ رہی تھی۔ ٹوپی کی داہنی طرف خوبصورت موتی جڑے ہوئے تھے جیک نے اندازہ لگایا کہ وہ سینٹ لوئیس سے آنے والی ٹرین سے اتر کر آ رہی ہے جو گیارہ بج کر دس منٹ پر اسٹیشن پہنچتی ہے اور اب چھ نمبر بس کے ذریعے آگے جانا چاہتی ہے۔ وہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگا لیکن سڑک بالکل خالی تھی بس کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا اتنا کام کرنے کے باوجود اس کا ذہن کام کی طرف لگا ہوا تھا کیونکہ تا حال بہت سا کام باقی تھا۔

باہر سڑک پر کھمبے کے ساتھ ایک درمیانے قد کا شخص کھڑا تھا جیک نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ بھی بس کا انتظار کر رہا ہے۔ تاہم وہ سڑک کی طرف دیکھنے کی بجائے ریستوران کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیک کے خیال میں اس شخص کا یہ انداز بڑے صبر اور سکون کو ظاہر کرتا تھا۔ باہر نہ صرف سردی اور دھند تھی بلکہ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے جیک کو تعجب بھی ہوا لیکن نیند اور تھکن کے باعث وہ اس خیال پر زیادہ غور نہ کر سکا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔

اس کا چہرہ سفید اور ستا ہوا تھا۔ وہ بالکل سیدھی بیٹھی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت گھبرائی ہوئی ہے اور گھبراہٹ میں سانس روکے ہوئے ہے۔ دفعتاً اس کے کندھے جھک گئے۔ پھر اس نے بیگ کھول کر اندر سے رومال نکالا۔ جیک اس کی حرکات کا جائزہ لینے میں کچھ اس حد تک محو ہوا کہ باہر آنے والی بس کی آواز بھی نہ سن سکا۔ بس کو دیکھ کر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بھی اس کی نظریں لڑکی پر مرکوز تھیں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے لڑکی کو مخاطب کر کے کہا:

"مس.... بس آگئی ہے، چھ نمبر بس۔"

لڑکی ایک دم چونک گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔

"بس؟" اس نے بے خیالی میں کہا۔ پھر یوں معلوم ہوا جیسے وہ پوری طرح ہوش میں آگئی ہو۔ "اوہ ہاں!" اس نے اپنے سامان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "شکریہ، شکریہ۔" پھر وہ اپنے سامان کو اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

جیک نے باہر کی طرف منہ کر کے ڈرائیور کو تھوڑا انتظار کرنے کے لئے آواز دی اور آگے بڑھ کر لڑکی کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ پھر وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا بس کی طرف بڑھا۔ لڑکی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ اس کا جسم تنا ہوا اور قدم کچھ لڑکھڑا رہے تھے۔ باہر نکلتے ہی وہ تیزی سے بس کی طرف لپکی اور بے خیالی میں جیک کے ساتھ ٹکرا گئی۔ جیک نے دیکھا، اس کا سر نیچے کو جھکا ہوا ہے اور اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا ہے۔

کھمبے کے ساتھ کھڑا ہوا شخص بدستور وہاں کھڑا تھا۔ اس نے برساتی کوٹ پہنا ہوا تھا اور ہیٹ کا کونا آنکھوں پر جھکا ہوا تھا۔ شاید اس کا بس پر چڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جیک نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا:

"جلدی سے چڑھ جاؤ۔"

لڑکی نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور زیر لب کوئی ناقابل فہم بات کی۔

"آرام سے سوچ لو۔" بس ڈرائیور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کہاں میں رہو استاد!" جیک نے ڈرائیور سے کہا۔ پھر لڑکی کی طرف دیکھتا ہوا بولا "کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آرام سے چڑھو۔"

پھر وہ اسے دھکیلتا ہوا اپنے ساتھ ہی اندر لے گیا اور ایک خالی سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر سوٹ کیس نیچے رکھنے کے بعد خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"میں لنکن اسکوائر پر اتر جاؤں گا۔" اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "وہاں سے تمہیں شہر کے ہر حصے کی طرف جانے والی بس مل جائے گی۔"

لڑکی نے ایک ثانیے کے لئے نہایت عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کا سر کندھوں کے درمیان جھکا ہوا تھا اور وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر دبکی بیٹھی تھی جب وہ ملی اسٹریٹ کے قریب پہنچے تو جیک نے ایک کار کو بس کے پیچھے آتے دیکھا جب بس رک گئی تو وہ کار بھی کچھ فاصلہ چھوڑ کر رک گئی اور پھر بس کے ساتھ ہی چل پڑی۔ یہ دیکھ کر جیک کی دلچسپی بڑھی اور وہ پوری دلچسپی سے اس کار کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کار ہر اسٹاپ پر بس کے پیچھے رک جاتی اور بس کے ساتھ ہی چل پڑتی تھی۔ اس کار کی ایک ہیڈ لائٹ خاصی مدھم تھی اور دوسری تیز تھی جس سے اسے پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد بس مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچ گئی۔

"لنکن اسکوائر آگیا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا "کیا میں تمہاری مدد کروں؟"

لڑکی دونوں مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں جنہیں اس نے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔ جیک کی آواز سن کر اس نے مٹھیاں کھول دیں اور غیر یقینی انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

پھر دونوں بس سے اتر کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ جب بس روانہ ہو گئی تو جیک نے پیچھے کی طرف نگاہ کی۔ ناڑس ہیڈ لائیٹس والی کار نصف بلاک پیچھے کھڑی تھی۔ اب شاید اس نے بس کا تعاقب ترک کر دیا تھا۔

"تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" جیک نے لڑکی سے پوچھا "اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں بس کا نمبر بتا دوں۔"

لڑکی نے پہلی مرتبہ آنکھیں اٹھا کر جیک کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور منہ لٹکا ہوا تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ فی الوقت لڑکی کی کوئی منزل نہیں۔ وہ اس خزاں رسیدہ پتے کی مانند معلوم ہو رہی تھی جو ہوا کے دوش پر اِدھر اُدھر اڑتا پھرتا ہے۔ جیک بذاتِ خود اس قدر تھکا ہوا تھا کہ اس کے اندر سوال جواب کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دوسری طرف اسے اس لڑکی سے ہمدردی بھی تھی۔ بس اس نے سوٹ کیس اٹھا لیا اور کہا:

"آؤ میرے ساتھ۔ اگر تم اپنی منزل کا تعین نہیں کر سکتیں تو آؤ میرے ساتھ میں یہ بتانے اور سننے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ تم کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو اور فی الوقت تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں چلو۔"

وہ ایک قدم کا فاصلہ چھوڑ کر اس کے پیچھے چل پڑی۔ چند گز چلنے کے بعد جیک

ایک پارک میں داخل ہوگیا۔ پارک کے اندر پڑے ہوئے بنچ اوس سے بھیگے ہوئے تھے اور چمک رہے تھے۔ چاروں طرف سدابہار پودوں اور پھولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف بچوں کا مخصوص گوشہ تھا جس میں پانی کا چھوٹا سا تالاب، جھولے اور تفریح کی دیگر چیزیں پارک کی مدھم روشنی میں چمک رہی تھیں۔ مجموعی طور پر پارک میں پُراسرار خاموشی سی ہوئی تھی۔ جیک ان تمام چیزوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا رُخ اس چار منزلہ عمارت کی طرف تھا جو پارک کے عقب میں بنی ہوئی تھی۔

جب انھوں نے عمارت کی سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں تو پارک کے عقبی حصے میں سے کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ پھر کار دوبارہ چل پڑی۔ کبھی وہ آہستہ ہوجاتی تھی، اور کبھی تیز۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کار چلانے والا فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کر رہا ہے کہ اُسے رُکنا چاہیئے یا چلنا چاہیئے اور کس طرف جانا چاہیئے۔ اس اثنا میں جیک اور لڑکی عمارت کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔

"لوٹ کے بدّھو گھر کو آئے۔" جیک نے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اس نے نشست گاہ کی بتی روشن کی اور لڑکی کی طرف مُڑتے ہوئے کہا "آؤ۔ یہ ہے میرا غریب خانہ۔"

لڑکی جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ کمرے کے اندر جا بجا چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ اخبارات، رسائل، میلے کپڑے، سگریٹوں سے بھری ایش ٹرے اور دیگر سامان انتہائی بے ترتیبی سے پڑا تھا۔ ایک ٹائی ٹیبل لیمپ پر لٹک رہی تھی۔ بستر جوں کا توں پڑا تھا۔ جب سے ڈیزی اسے چھوڑ کر گئی تھی اس کی ہر چیز منتشر ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے اندر اور باہر کوئی شے بھی ٹھیک نہیں تھی۔ دو سال کے دوران صفائی کرنے والی عورت کے سوا کسی عورت نے ان کمروں میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی اس بے ہنگم حالت پر کچھ شرمندگی بھی محسوس کی۔

"بیٹھو۔ یہاں آجاؤ۔" اس نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی غیر یقینی حالت میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی تھی۔ "میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" اس نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دماغ ٹھیک کس کا ہے؟"

اس نے اپنا کوٹ اور ہیٹ اتار کر ہینگر پر لٹکا دیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھونے سے پہلے اس نے شیلف پر سے پُرانے بلیڈ ہٹا دیئے، واش بیسن صاف کر دیا اور گندہ تولیہ اتار کر اس کی جگہ دُھلا ہُوا تولیہ رکھ دیا۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر اور دانتوں میں منجن کر کے کمرے میں آگیا۔ لڑکی کمرے کے کونے میں ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی گھبراہٹ نظر آرہی تھی۔

"یہ صوفہ خاصا آرام دہ ہے۔" جیک نے کہا "اگر تمہارا سونے کا خیال ہو تو الماری سے کمبل اور چادر نکال لینا۔"

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" لڑکی نے سکڑتے ہوئے جواب دیا "شکریہ!"

"اور اگر بھوک لگے تو ریفریجریٹر سے کچھ نکال کر کھا لینا۔ باورچی خانہ اس پردے کے پیچھے ہے۔ میں بہت تھک چکا ہوں۔ اس لئے تمہاری کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔" خوابگاہ کے دروازے میں رُکتے ہوئے اس نے مزید کہا "اور سنو۔ اگر جانا چاہو تو دروازہ بند کرتی جانا۔ تاہم میرے خیال میں رات کے وقت جانا کوئی خوش کُن بات نہیں۔" پھر وہ کان کے پیچھے کھجانے لگا۔ کسی اجنبی لڑکی سے بات کرتے وقت ہمیشہ الجھن سی محسوس کرنے لگتا تھا۔ پہلے اس نے جانے کا ارادہ کیا، پھر سوچا کوئی نہ کوئی بات حوصلہ افزائی کی ضرور کرنی چاہیئے۔ "اگر اس وقت تمہارے حالات سازگار نہیں تو ممکن ہے کل ٹھیک ہو جائیں۔ اس لئے کسی قسم کا تردد نہیں کرو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کل دن بھر یہاں کوئی نہیں ہوگا۔ تم پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے لئے کوئی بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ کوئی شخص چابی کے بغیر اس عمارت میں داخل نہیں ہو سکتا۔"

وہ آنکھیں جھپکائے بغیر جیک کو گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نہایت درجے کی بے یقینی کیفیت پائی جاتی تھی۔ دفعتاً اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا جسم شدت جذبات کے باعث کانپ رہا تھا۔

"بس بس، سونے کی کوشش کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بند کر لیا اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ چند لمحوں کے اندر وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو لڑکی افغانی کمبل اوڑھے صوفے پر سو رہی تھی۔ یہ وہ کمبل تھا جو ڈیزی نے اپنے ہاتھوں سے بُنا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس نے عجیب قسم کی خوشی محسوس کی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گھر میں بہار آگئی ہو۔ لڑکی کے خوبصورت اور ملائم بال صوفے سے نیچے لٹک رہے تھے اور وہ کسی معصوم کلی کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔ جیک نے سوچا اگر اس نے ناشتہ وغیرہ بنانے کی کوشش کی تو اس حسنِ معصوم کی نیند خراب ہو جائے گی پس وہ ناشتہ، شیو اور شاور کئے بغیر کپڑے بدل کر چپکے سے باہر نکل گیا۔

ناشتہ ایک چھوٹے سے ریستوران میں کیا پھر ایک حمام سے شیو کرانے اور نہانے کے بعد دفتر پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ اپنی کرسی پر بیٹھا اسے یاد آیا کہ عجلت میں وہ ایک ضروری رپورٹ گھر چھوڑ آیا ہے۔ ساڑھے دس بجے اُس نے اپنے اپارٹمنٹ کا نمبر ملایا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے سوچا شاید اب تک سو رہی ہوگی۔ پس اس نے نصف گھنٹے بعد دوبارہ فون کیا لیکن دوبارہ مایوسی ہوئی۔ اسے افسوس بھی ہوا اور کچھ اطمینان بھی۔ اس نے سوچا ایک رات کی ملاقات کو زیادہ جذباتی رنگت نہیں دینا چاہیئے۔ تاہم دل کی گہرائیوں میں اسے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے خیالات اس حد تک پراگندہ ہو گئے کہ اس نے اپنی پتلون پر سیاہی گرا لی۔

"سر، ایک پولیس آفیسر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" اس کی سیکرٹری نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"اسے اندر بھیج دو، سویٹی۔"

ان کی فرم کا کام کچھ اس نوعیت کا تھا کہ عام طور پر پولیس سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ ایک منٹ بعد ایک بھاری بھرکم پولیس آفیسر اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔

"آؤ، بیٹھو۔" اس نے کہا "میں یہاں بیشتر پولیس والوں کو جانتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ اس سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"مجھے لوگ نارمن کہتے ہیں۔" اس نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا "میرا شمار ہیڈ

کوارٹر کے پرانے گھوڑوں میں سے ہوتا ہے۔"

"خوب، تمہارے اندر خاصا ذوقِ لطیف پایا جاتا ہے۔"

نارمن قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

"رات کو تم ایک دم گم ہوگئے۔" اس نے کہا "ہم تلاش کرتے رہ گئے۔ ہم نے تمہیں پارک میں داخل ہوتے ضرور دیکھا تھا۔ اس کے بعد تمہارا کچھ پتہ نہیں چلا۔ پھر میں نے ہیگرٹی سے پوچھا کہ رات کو جس شخص نے اُس چھوٹے قد کی خاتون کو بس میں سوار ہونے میں مدد دی تھی وہ کون تھا۔ تو اس نے تمہارا نام بتایا۔ تم نے ہمارے آدمی کو خوب چکمہ دیا۔"

"تو گویا تم لوگ اس لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔" جیک نے کہا "بے چاری اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگی ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں اسے ساتھ لیجاتے ہوئے زیادہ خوش نہیں تھا۔ مجھے شروع ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"اب وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"رات وہ میرے اپارٹمنٹ ہی میں رہی تھی۔" یہ سنتے ہی نارمن نے پُرخیال انداز میں آنکھیں گھمائیں۔ "فکر نہیں کرو۔ فکر نہیں کرو۔" جیک نے جلدی سے کہا "میں کسی ایسی ویسی نیت سے اسے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ دراصل میں رات کو بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لئے فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ لڑکی چونکہ بہت پریشان نظر آتی تھی اس لئے میں اسے ساتھ ہی لے گیا۔"

"جب ہیگرٹی نے مجھے تمہارا پتہ بتایا تو میں بہت خوش ہوا۔" نارمن نے اپنا چشمہ اتارتے ہوئے کہا "میں نے سوچا کہ مطلوبہ آدمی مل گیا ہے۔ اب مجھے یقین آگیا ہے کہ ہیگرٹی نے تمہارے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک ہی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جیک کلیفورڈ کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ وہ کسی شخص کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کوئی شرابی شراب کے نشے میں گٹر کے اندر گر جائے تو جو شخص اُس کی مدد کو آئے گا وہ جیک کلیفورڈ ہوگا۔ بہت قابلِ تعریف جذبہ ہے۔" پھر اس نے ایک ہی سانس میں پوچھا "کیا وہ لڑکی اب بھی تمہارے اپارٹمنٹ میں ہے؟"

"شاید تم مجھ سے بہتر اندازہ لگا سکو۔" جیک نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "جب میں صبح گھر سے نکلا تو وہ سو رہی تھی۔ اب میں صبح سے دو مرتبہ فون کر چکا ہوں لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ رات کو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میرا خیال ہے کہ رات کو اس نے مشکل درجن بھر الفاظ ادا کئے ہونگے اور وہ بھی تمام بے معنی۔ تم نے اسے ہیگرٹی کے ریستوران پر ہی گرفتار کیوں نہ کر لیا؟"

"دراصل اسے گرفتار کرنا ہمارا مقصد نہیں۔" نارمن نے کہا "ہمیں اس کے شوہر کی تلاش ہے۔ وہ قتل کے الزام میں مطلوب ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے شوہر سے رابطہ کرے گی۔ ہم پورے دو ہفتوں سے اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس کا نام لولا بٹلر ہے اور رہائش سینٹ لوئیس میں ہے۔ چند روز قبل اس نے بینک سے پانچ ہزار ڈالر نکلوائے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ رقم وہ اپنے شوہر تک پہنچانا چاہتی ہے۔" اس نے بغیر رکے مزید کہا "اچھا تو تم نے دو مرتبہ فون کیا تھا؟"

"ہاں لیکن جواب نہیں ملا۔ میرا خیال کہ وہ چلی گئی ہوگی۔"

پارکنگ

صدر میں ایک کانسٹبل نے دیکھا کہ ایک شخص فٹ پاتھ پر سر رکھ کر سڑک پر سیدھا لیٹا ہوا ہے۔ وہ اس کے قریب گیا اور بولا۔

"کیوں جناب؟ کیا بہت پی لی ہے؟"

"نہیں بھائی۔" جواب ملا۔

"تو پھر سڑک پر کیوں لیٹے ہوئے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پارکنگ کے لیے یہ جگہ بڑی مشکل سے نظر آئی ہے۔ بیوی کو بھیجا ہے کہ کار لے آئے اور یہاں پارک کر دے۔"

"کیا میں کوشش کر کے دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور، کیوں نہیں۔" جیک نے کہا "تم بھی قسمت آزما کر دیکھ لو۔"

کچھ دیر تک کوشش کرنے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اور کہا۔

"میرا خیال ہے محترمہ پرواز کر چکی ہیں۔" پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ "شکریہ مسٹر کلیفورڈ۔ ویسے ہم نے ہر طرف اپنے آدمی پھیلا دیئے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس اُس کے شوہر بٹلر کی تصویر نہیں ہے۔ اگر وہ ہمارے سامنے بھی آجائے تو ہم اسے پہچان نہیں سکتے۔ اس کی گرفتاری کا واحد طریقہ یہی ہے کہ لولا کا تعاقب جاری رکھا جائے۔ دونوں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ضرور آپس میں رابطہ قائم کریں گے۔"

"اور ہاں ایک بات یاد آئی۔" جیک نے کہا "مسٹر نارمن اپنی کار کی ہیڈ لائٹ ٹھیک کروا لو۔ بہت مدھم روشنی دیتی ہے۔ گزشتہ رات جب تم بس کا تعاقب کر رہے تھے تو میں نے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی تھی۔ کیا تم ہمیشہ اس قسم کی گاڑیوں سے مجرموں کا تعاقب کرتے ہو جنھیں ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد بھلایا نہیں جا سکتا۔"

"شکریہ میں آج ہی اسے چیک کروا لیتا ہوں۔" نارمن نے کہا "مسٹر کلیفورڈ کیا تمہارے پاس کوئی پستول وغیرہ بھی ہے؟"

"ہاں، ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو مجھے کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بلکہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ گھر کے اندر کس جگہ پر پڑا ہے۔"

نارمن نے پُرخیال نظروں سے اپنے چشمے کو گھورتے ہوئے کہا "اسے آج ہی چیک کر لو تو بہتر ہے۔ ایک مایوس عورت کوئی بھی خطرناک حرکت کر سکتی ہے۔ بالفرض اگر تمہارا پستول گھر پر نہ ملے تو ہمیں فوراً اس کا سیریل نمبر بتا دینا۔ خدا حافظ۔"

٭ ٭ ٭ ٭

دن کے ڈیڑھ بجے جب جیک اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو موسیقی کی مدھم آواز نے اس کا استقبال کیا۔ لولا بٹلر جو کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ ایک دم گھوم کر پیچھے دیکھنے لگی۔ بوجہ خوف اُس کے منہ سے چیخ نکلتی

نکلتی رہ گئی لیکن جب اس نے جیک کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو اس کے ہونٹوں پر خفت آمیز مسکراہٹ آ گئی۔

"اوہ ... تم نے تو کہا تھا کہ دن بھر تمہارا اپارٹمنٹ خالی پڑا رہتا ہے۔" لولا نے کہا۔

"میں کچھ کاغذات بھول گیا تھا۔" جیک نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ لینے آیا ہوں۔" پھر کمرے کی صفائی دیکھتے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم خاصی مصروف رہی ہو ننھی تتلی۔"

"بیکار بیٹھے بیٹھے جی گھبرانے لگا تو میں نے سوچا کیوں نہ کچھ کام کر لیا جائے۔"

فرنیچر اور ایش ٹرے چمک رہی تھی۔ رسالے اور اخبارات نہایت صفائی کے ساتھ اپنی جگہ پر رکھے تھے۔ صوفوں کے کشن سلیقے سے رکھے تھے۔ بستر کی چادر بدل دی گئی تھی۔ جوتے پالش کئے ہوئے تھے۔ باتھ روم چمک رہا تھا۔ البتہ نائلون اسٹاکنگ کا ایک جوڑا شاور کے اوپر لٹک رہا تھا جو نسوانیت اور نزاکت کی عکاسی کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر جیک کے دل میں ایک بار پھر ڈیزی کا خیال آ گیا۔ لولا نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اسٹاکنگ اُٹھانے کا خیال نہیں رہا۔ میں نے تمہارا باتھ ٹب استعمال کیا تھا۔ جسم کچھ گندہ محسوس ہو رہا تھا۔"

جیک نے کچھ مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کا تعلق اس بات سے نہیں تھا جو اس نے کہی تھی بلکہ اُس بات سے تھا جو جیک نے نیچے گلی میں دیکھی تھی۔

"کیا تم باہر تو نہیں گئی؟" اس نے کھڑکی کے قریب کھڑے ہوئے کہا۔

"نہیں لیکن جانے کی تیاری کر رہی تھی۔"

جیک دوبارہ گلی کی طرف دیکھنے لگا۔ گلی کے اندر ایک چھوٹا سا ورکشاپ تھا۔ جس کے سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ کار کا ہُک اوپر اٹھا ہوا تھا اور ایک شخص بمپر پر بیٹھا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میکنک کا انتظار کر رہا ہو۔ جیک کھڑکی سے ہٹ کر ٹیلیفون کی میز کے قریب آ گیا جہاں اس نے رات کو اپنے ضروری کاغذات رکھے تھے۔

"میں نے آج کئی مرتبہ فون کیا۔ مگر تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

لولا نے ہیٹ سر پر رکھا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے دانستہ جواب نہیں دیا۔ یقیناً تم یہ بات پسند نہیں کروگے کہ تمہارے دوست اپارٹمنٹ میں کسی عورت کی موجودگی سے آگاہ ہوں۔ اس لئے میں نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ فون کون کر رہا ہے۔ تاہم ایک مرتبہ میں نے ریسیور اُٹھا لیا تھا لیکن پھر جواب دیئے بغیر واپس رکھ دیا۔"

رات کے مقابلے میں وہ زیادہ حسین اور پُر اعتماد نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ باہر اس کے لئے خطرہ موجود ہے لیکن وہ پوری طرح خطرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار نظر آتی تھی۔ اس لئے جیک نے اسے کوئی مشورہ نہیں دیا۔ اس نے سوچا بہتر یہی ہے کہ جلدی وہاں سے رُخصت ہو جائے۔ پھر اس نے پتلون پر پڑے ہوئے سیاہی کے دھبے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا پتلون تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے نشستگاہ میں چلی گئی۔ جیک نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور ٹیلیفون کی میز پر رکھی ہوئی رپورٹ اٹھالی۔ دفعتاً اس کی نظر ایش ٹرے کے نیچے رکھے ہوئے ایک خط پر پڑی۔ اس نے ایش ٹرے ہٹا کر خط اٹھا لیا اور اسے پڑھنے لگا۔

"پیارے دوست۔

دوست ایک نہایت سیدھا سادہ لفظ ہے لیکن مجھے یہ لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔ شاید بہت کم لوگ اس لفظ کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ میری نظر میں اس لفظ کی بہت عظمت اور وقعت ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں دوست کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ کبھی کبھی ایک اجنبی بھی دوست بن جاتا ہے۔ تم نے رات کو میری جو پُر خلوص مدد کی ہے میں اُسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ تمہاری خوشگوار یاد ہمیشہ میرے خیالات میں بسی رہے گی۔ میں نے تمہارا نام ایک پرانے لفافے پر لکھا ہوا دیکھا ہے لیکن تم میرا نام نہیں جانتے۔ اور میں سمجھتی ہوں اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ بہر حال میں دل کی گہرائیوں سے تمہاری مشکور ہوں۔ شکریہ، شکریہ، شکریہ۔ اور خدا حافظ۔"

جیک نے خط واپس ایش ٹرے کے نیچے رکھ دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ پہلے پڑا تھا کیونکہ اصولی طور پر یہ خط لولا کے جانے کے بعد اُسے ملنا چاہیئے تھا جب وہ نشستگاہ میں پہنچا تو اس کے چہرے پر ندامت اور عجلت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ گو وہ خط اُسی کے نام تھا لیکن اس طرح چوری چھپے اسے پڑھنے پر وہ کچھ خفت محسوس کر رہا تھا۔

"خدا حافظ! مجھے اُمید ہے کہ تُم نے اپنے بارے میں کوئی یقینی فیصلہ کر لیا ہوگا۔" اس نے بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں مجھے ذرا جلدی دفتر پہنچنا ہے۔"

"کک ... کیا میں تمہارے ساتھ ہاتھ ملا سکتی ہوں؟" لولا نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔ "میں زیادہ اچھی طرح اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتی لیکن میں تمہاری بہت زیادہ احسانمند ہوں۔"

جیک نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ لولا نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور نیچے جھک کر کسی عقیدتمند کی طرح اس پر بوسہ دیا۔ جیک نے محسوس کیا کہ فرطِ جذبات کی وجہ سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ چند لمحوں تک جیک اپنی جگہ پر بے حرکت کھڑا رہا پھر اس نے دروازہ بند کر دیا اور اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ فی الوقت تمہیں باہر نہیں جانا چاہیئے۔ اس علاقے کی نگرانی کی جا رہی ہے۔"

"کیا؟"

"پولیس کے آدمی اس عمارت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر تم باہر نکلی تو وہ تمہارا تعاقب شروع کر دیں گے۔ ایک اس طرف گلی میں کھڑا ہے۔" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور دو پارک کے قریب کھڑے ہیں۔ میں ان دونوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ تمہارا باہر نکلنا بالکل مناسب نہیں مسز ٹیلر۔"

لولا نے کسی فوری ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ چند لمحوں تک وہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔

"کیا میرے متعلق اخبار میں کچھ شائع ہوا ہے؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"نہیں، اور امید بھی نہیں۔" جیک نے جواب دیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا پھر اس نے نارمن کے ساتھ ہونے والی گفتگو اسے سنا دی۔

"میں نے رات کو اُسے کھمبے کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔" لولا نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ میں اُسے جُل دینے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں اس معاملے میں ملوث سمجھا جائے۔ اسی وجہ سے میں بس میں سوار ہوتے وقت ہچکچا رہی تھی کیا تم کسی مشکل میں گرفتار تو نہیں ہو گئے؟"

"میں تو نہیں البتہ تم ضرور مشکل میں گرفتار ہو۔" جیک نے جواب دیا۔ "اور اسی طرح تمہارا شوہر بھی۔"

اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "میں یہ ساری تکلیف اپنے شوہر کے لئے ہی اٹھا رہی ہوں۔ مجھے بہر حال کچھ نہ کچھ کرنا پڑیگا۔ ہر صورت میں کچھ کرنا پڑے گا۔ نہ معلوم وہ کس حال میں ہوگا۔"

"آہ ... میری بھی ایک بیوی ہے، یا تھی ... یعنی قانونی طور سے میری بیوی ہے لیکن عملی طور پر نہیں۔ اگر مجھ پر اس قسم کی مصیبت پڑ جائے تو شاید وہ میری خیریت پوچھنے بھی نہ آئے۔ بہر حال میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اپنے شوہر کی مدد کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔"

"اُسے اس وقت پیسوں اور کپڑوں کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے چند روز پیشتر بینک سے پانچ ہزار ڈالر نکلوائے ہیں جو اس وقت میرے پاس ہیں۔ میں بہر صورت یہ رقم اس کے ہاتھوں میں دینا چاہتی ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت اُسے پیسوں کی اور کپڑوں کی ضرورت ہے لیکن یقین کرو اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ پیسوں کو مٹی میں ملانے والی بات ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔"

"دراصل یہ پیسے اُسی کے ہیں۔ دو سال قبل اس کے باپ نے اپنی وفات سے چند روز پہلے اپنی جائداد میرے نام لگا دی تھی جس میں سات ہزار ڈالر نقد میرے بنک میں موجود تھے۔ اس کے باپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہ رقم ٹیلر کے ہاتھ میں نہیں دوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیلر جوئے اور شراب کا عادی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کبھی پیسہ نہیں ٹکتا۔ یہ رقم بیماری، انشورنس یا جائداد کی خریداری میں استعمال کی جا سکتی ہے لیکن جوئے کے قرضے ادا کرنے میں خرچ نہیں کی جا سکتی۔" کسی اچانک خیال کے تحت اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ "کاش میں اس شرط کی پابندی نہ کرتی۔ اگر میں اسے رقم دیتی تو وہ پیسوں کے لئے اُس لڑکی کو قتل نہ کرتا۔ اور ہم اتنی بڑی مصیبت سے بچ جاتے۔" اس کی پلکیں نم آلود ہو گئیں۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے جانا چاہیئے۔ کیا میں تمہارا فون استعمال کر سکتی ہوں؟ ٹیکسی منگوانے کے لئے۔"

"جیسے ہی تم باہر نکلو گی پولیس کے آدمی تمہارے پیچھے لگ جائیں گے۔" جیک نے کہا۔ "اور اس مرتبہ وہ تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے۔"

"تمہیں یہاں کے ٹیکسی اسٹینڈ کا نمبر تو معلوم ہوگا۔ کیا تم فون کر کے مجھے ٹیکسی منگوا دو گے؟"

"نہیں۔" جیک نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جیسے ہی تم اپنے شوہر سے ملو گی پولیس کے آدمی اسے گرفتار کر لیں گے۔ اور سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔"

وہ کسی ہارے ہوئے شخص کی طرح صوفے پر گر گئی۔ "اوہ میں کیا کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"اس وقت بہترین صورت یہی ہے کہ خاموش رہو۔ اور کچھ نہ کرو۔"

لولا کے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھ کر جیک کو اپنا پستول یاد آ گیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اسے یاد آیا کہ باورچی خانے کے اندر ایک پُرانے سگار بکس میں رکھا ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا پستول تھا۔ اس کے اندر جو گولیاں پڑی ہوئی تھیں وہ اس نے پستول کے ساتھ ہی خریدی تھیں۔ وہ جوں کی توں پڑی تھیں۔ اس نے پستول کو ڈبے سے نکال کر جیب میں ڈال لیا۔ اور دوبارہ نشستگاہ کے اندر آ گیا۔

"مجھے اب دفتر پہنچنا ہے۔" اس نے سوال کیا۔ "بہتر یہی ہے کہ اب تم گھر کے اندر ہی موجود رہو۔ میں ساڑھے پانچ بجے تک واپس آ جاؤں گا۔"

دفتر سے واپسی پر جب وہ بس سے اُترا تو پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے سپر مارکیٹ سے گوشت اور دیگر اشیائے خوردنی خریدیں اور باہر آ گیا۔ اس علاقے میں عام طور پر موٹر سائیکل پر گشت کرنے والے سپاہی کبھی نہیں آتے۔ لیکن باہر آتے ہی جیک نے دو موٹر سائیکل سوار سپاہیوں کو دیکھا جب وہ پارک کے قریب پہنچا تو اُس کی نظر ایک سراغرساں پر پڑی جسے وہ تھوڑا سا جانتا تھا پس وہ نظر بچا کر نکل گیا۔ اسے یقین تھا کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس آس پاس کچھ اور سپاہی بھی ہوں گے جن سے اس کی شناسائی نہیں تھی۔ اور اب نارمن بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوگا۔

"کیا خبر لائے؟" جب وہ اندر داخل ہوا تو لولا نے پوچھا۔

"عمارت کی نگرانی بدستور جاری ہے۔ ابھی کچھ وقت یہ لوگ پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ میں راستے سے کچھ کھانے پینے کا سامان خرید لایا ہوں۔ لیکن مجھے پکانا نہیں آتا۔ کیا تمہیں کچھ شوق ہے؟"

"کیوں نہیں۔" لولا نے اس کے ہاتھ سے سامان لیتے ہوئے کہا پھر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

خوابگاہ میں ہونے کے بعد جیک نے دیکھا کہ میز پر رکھا ہوا خط غائب تھا۔ کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر وہ خط کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ورکشاپ کے سامنے کھڑی ہوئی کار اب وہاں موجود نہیں تھی۔ البتہ ایک چھوٹی سی اسٹوریج بلڈنگ کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا جس میں سے ہلکا ہلکا دھواں باہر نکل رہا تھا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس کی ننھی سی مہمان پورے انہماک سے کھانا پکانے میں مصروف

تھی۔ ان آوازوں نے ایک بار پھر اس کے دل میں ایک پُرمسرت گھر کی یاد بیدار کر دی جس میں ایک محبت کرنے والی بیوی اور بھولے بھالے بچے ہوں۔ اس کے چہرے پر اداسی کی گھٹا چھا گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر جیک نے برتن صاف کرنے میں لولا کی مدد کی۔ پھر دونوں نشستگاہ میں آکر بیٹھ گئے۔

"رات کو تمہارا کہاں جانے کا ارادہ تھا؟" جیک نے پوچھا۔

"میں ریلوے اسٹیشن کے باہر ٹیلر سے ملنا چاہتی تھی۔" لولا نے جواب دیا۔ "میں اسے پانچ ہزار ڈالر اور کپڑے دینا چاہتی تھی جو سوٹ کیس میں رکھے ہوئے ہیں۔ ملاقات سے قبل اس بات کی تسلی کرنا ضروری تھی کہ ہماری نگرانی نہیں کی جا رہی۔ ایسی صورت میں پروگرام کے مطابق مجھے کسی ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ رات کو جب میں اسٹیشن سے باہر نکلی تو میرا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ پس میں سیدھی بس اسٹاپ پر آگئی، جہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔"

"لیکن تم دونوں نے آپس میں پروگرام کس طرح طے کیا؟"

"فون پر۔ ہماری بات چیت ایک قریبی ڈرگ اسٹور سے فون پر ہوئی تھی کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے گھر کا فون ٹیپ کیا جا رہا ہے۔ ٹیلر کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کے پیسے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ اسے نیکلس اور انگوٹھی کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوئی تھی اس کی اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی ہے۔"

"کیا وہ انگوٹھی اور نیکلس تمہارا تھا؟"

"ہاں۔ ٹیلر کی سلامتی کے مقابلے میں ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"لیکن میرے خیال میں یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ ....."

"پلیز۔ میں اس قسم کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔"

کچھ دیر بعد جیک اپنے معمول کے مطابق چہل قدمی کے لئے نکل گیا۔ چوک میں واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اس کی نظر نارمن پر پڑ گئی جو وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ نارمن نے بھی اسے دیکھ لیا۔

"اوہ... ہیلو۔ ہیلو۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "آؤ بیٹھو، کھانا کھاؤ۔ یہ بھنی ہوئی مچھلی بہت لذیذ ہے۔"

جیک ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"سناؤ کچھ کامیابی ہوئی؟"

"کوشش جاری ہے۔" نارمن نے جواب دیا۔ "آج ہمیں ٹیلر کے بارے میں مزید باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ برخوردار اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن بُری عادتوں میں پڑ گیا ہے۔ اس نے کئی دھندے پھیلا رکھے ہیں جن کا بنیادی مقصد دھوکا بازی ہے۔ ہر مہینے ایک نیا کام اختیار کرتا ہے لیکن کامیاب کسی میں بھی نہیں۔ پرانی کاریں، شراب، جائداد کی خرید و فروخت، کھیلوں کا سامان۔ غرضیکہ کوئی کام ایسا نہیں جو اس نے چھوڑا ہو۔ کبھی کسی ہوٹل میں جوئے بازی کرا رہا ہے تو کبھی لاٹری فروخت کرتا پھر رہا ہے لیکن ہر کام بڑی ہوشیاری سے کرتا ہے۔ قانونی گرفت میں نہیں آتا۔ ایک مرتبہ تو اس نے اپنی بیوی کو بھی جوئے میں ہار دیا تھا۔"

"انتہائی کمینہ شخص معلوم ہوتا ہے۔" جیک نے کہا۔

"ہمیشہ جوئے کے قرضے میں دبا رہتا ہے۔" نارمن نے کہا۔ "جس لڑکی کو اس نے قتل کیا ہے وہ اس کی گرل فرینڈ تھی۔ اچھے دنوں میں اس نے اس لڑکی کو اپنی بیوی کا کچھ زیور تحفے میں دیا تھا۔"

"چوری کیا ہوگا۔" جیک نے کہا۔

"ظاہر ہے کوئی بیوی خوشی سے اپنا زیور نہیں دیتی خصوصاً کسی آوارہ لڑکی کو تحفے میں دینے کے لئے۔ کچھ روز قبل اس نے لڑکی سے زیور واپس مانگا۔ تاکہ جوئے کا قرضہ ادا کر سکے لیکن لڑکی نے زیور دینے سے انکار کر دیا۔ پس اس نے طیش میں آکر اسے قتل کر دیا اور زیورات لے کر بھاگ گیا۔"

"قتل اور ڈکیتی۔" جیک نے کہا۔ "اس کی بیوی کا کیا ردِ عمل ہے؟"

"بیچاری بہت شریف النفس خاتون ہے۔ اسے چاہئیے تھا کہ فوراً اس سے طلاق لے لیتی۔ بلکہ آج سے چھ مہینے پہلے دونوں کے درمیان تقریباً علیحدگی ہو گئی تھی لیکن پھر اس کی بیوی نے کچھ نرم رویہ اختیار کر لیا اور طلاق تک نوبت نہیں پہنچی۔"

"خاصی افسوسناک صورتحال ہے۔" جیک اٹھتے ہوئے بولا۔ "دوبارہ یہیں کہیں ملاقات ہوگی۔"

"غالباً۔" نارمن نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جیک اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ لولا تاش کے پتوں سے دل بہلا رہی تھی۔

"کھیلو گی؟" جیک نے پوچھا۔

"اگر تم پسند کرو تو۔"

پھر دونوں رات کے دس بجے تک تاش کھیلتے رہے۔ اس دوران میں زیادہ تر خاموشی رہی۔ دس بجے دونوں اٹھ گئے۔ جیک الماری میں سے کمبل اور چادر نکال کر لے آیا۔

"تم آج بھی صوفے پر سو جانا۔" اس نے کہا۔ "کل دفتر میں چھٹی ہے اس لئے ناشتے پر ملاقات ہوگی۔"

لولا اُٹھ کر صوفہ درست کرنے لگی۔

"ناشتے میں تم کیا پسند کرو گے؟"

"اوہ... جو بھی مل جائے۔ ریفریجریٹر میں کچھ انڈے اور نمکین گوشت پڑا ہے۔ اس کے علاوہ کافی اور ڈبل روٹی بھی ہوگی۔"

پھر وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا۔ اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر لولا اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"آج میں رخصت ہو جاؤں گی۔"

"شاید اپنے شوہر کی یاد ستا رہی ہے۔" جیک نے کہا۔

"کاش ایسا ہوتا۔" لولا نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کتنا خوبصورت خیال ہے لیکن بدقسمتی سے مجھے ایسا شوہر نہیں ملا۔ سچ پوچھو تو میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ اور نہ ہی وہ اس قابل ہے۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں کیوں اس کی خاطر اتنی تکلیف اٹھا رہی ہوں۔ شاید یہ اس بھولی بسری محبت کی خاطر ہے جو کبھی ہم دونوں کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ میں صرف اس مصیبت میں اس کے کام آنا چاہتی ہوں۔ ورنہ میں اس کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی کیونکہ وہ ہماری مقدس محبت کا قاتل ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اس کے ساتھ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔"

"میں صرف اسے کپڑے اور رقم پہنچانا چاہتی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ فی الحال تو میں ہوٹل جا رہی ہوں جہاں اپنا سامان رکھنے کے بعد کسی طریقے سے پہلے پانچ ہزار ڈالر اسے پہنچانے کی کوشش کروں گی۔ نوٹوں کو میں نے ایک بھورے رنگ کے کاغذ میں اچھی طرح پیک کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اسے پیسے مل گئے تو شاید وہ شہر سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔"

کچھ دیر تک جیک سوچتا رہا۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار پائے جاتے تھے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں اپنی کار میں تمہیں ہوٹل تک چھوڑ آتا ہوں۔"

لولا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی جیک نے اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ لولا نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اسے اپنے گال کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ خوابگاہ میں بھاگ گئی۔

"مجھے سینٹ لوئیس میں بڑی اچھی ملازمت مل رہی ہے۔" جیک نے اس کے پیچھے آواز لگائی۔ "میں تمہیں ملنے آؤں گا۔"

کچھ دیر بعد دونوں تیار ہو کر گلی میں آگئے۔ جیک نے لولا کا سوٹ کیس اپنی کار کی ڈکی میں رکھ دیا۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے بک اسٹال ایک طویل القامت شخص کھڑا تھا۔ جو اسپورٹس شرٹ پہنے ہوئے تھا اور ایک رنگین رسالہ دیکھ رہا تھا۔ دونوں کو عمارت سے باہر آتا دیکھ کر اس نے رسالہ پھینک دیا اور لاپرواہی سے داہنی جانب چل پڑا۔ ایک عمر رسیدہ شخص جو بنچ پر بیٹھا بظاہر اونگھ رہا تھا اٹھ کر بائیں طرف چل دیا۔ اسپورٹس شرٹ میں ملبوس شخص نے گلی کی دوسری طرف کھڑی ہوئی ایک کار کا دروازہ کھولا لیکن اندر داخل ہونے کی بجائے پائدان پر پیر رکھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ پارک میں زندگی کی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ وہاں کھیلنے والے بچوں کے شور و غل کی آوازیں سارے ماحول میں گونج رہی تھیں جیک نے لولا کا چرمی بیگ پچھلی سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ اس کے بیگ کے اندر پانچ ہزار ڈالر کا پیکٹ رکھا تھا۔

"ایک سراغرساں ہمارے پیچھے اور ایک آگے ہے۔" وہ اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھتا ہوا بولا۔ "جیسے ہی ہم روانہ ہوں گے یہ لوگ ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔ بس ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دو۔ اطمینان سے بیٹھی رہو۔ ایک تیسرا آدمی بائیں طرف جھانک رہا ہے۔ یہ ہمارے اپارٹمنٹ کی نگرانی پر مامور ہے اور یہ شخص غالباً یہیں رہے گا۔"

جیک نے انجن اسٹارٹ کیا ہی تھا کہ ایک دیوقامت لانڈری ٹرک راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکالا تاکہ ٹرک ڈرائیور کو راستہ دینے کے لئے کہے۔ عین اسی وقت کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک شخص تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

"خبردار کوئی غلط حرکت نہیں کرنا۔" اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تم دونوں کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

ڈاکٹر جی ایم ناز کی بلند پایہ تصنیف

ازدواجی نفسیات

عورتوں کی نفسیاتِ جنسی

اس کتاب کا موضوع خواتین کے وہ دُکھ ہیں جو اُن کی زندگی کو گھُن کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ناز کو گزشتہ پندرہ سال میں جو ہزارہا خطوط مشوروں کے لیے ملے ہیں۔ اِس میں اُن تمام خطوط کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

قیمت: ۱۰/- روپے

مکتبۂ نفسیات ۵۶-اے ناظم آباد، کراچی

جیک نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس نے دیکھا کہ لولا دہشت زدہ نظروں سے اسے گھور رہی ہے۔ اس کا منہ کھلا ہوا ہے اور وہ چیخ مارنے والی ہے۔ دفعتاً اجنبی کا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے نہایت بے رحمی سے پستول کا دستہ لولا کے سر پر دے مارا۔

"اوہ ٹیلر!" لولا کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ پھر وہ جیک کے کندھے کی طرف لڑھک گئی۔ اس کی دلنـدیزی ٹوپی پر لگے ہوئے موتی بکھر گئے اور سر سے خون بہنے لگا۔ جیک کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ مذکورہ شخص لولا کا شوہر ٹیلر ہے۔ بیوی کی وفاداری اور شوہر کی کمینگی دیکھ کر وہ غصے سے کھولنے لگا لیکن وقتی مصلحت کے پیش نظر کوئی حرکت نہ کرسکا۔

"خاموش!" ٹیلر غراتے ہوئے بولا۔ "حرامزادی کو چیخنے کے سوا کوئی کام نہیں آتا۔ اپنے سائے سے بھی ڈرتی ہے۔ اے مسٹر گاڑی آگے بڑھاؤ!" اس نے جیک کو پستول سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "پارک کی دوسری طرف لے چلو۔ اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو تمہارا حشر لولا سے بھی خراب ہوگا۔"

"کیا تم اندھے ہوگئے ہو؟" جیک نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ "نظر نہیں آتا سامنے ٹرک راستہ روکے کھڑا ہے۔"

اوہ... سؤر کا بچہ۔" ٹیلر نے ٹرک ڈرائیور کو گالی دی۔ "اس گدھے کو کوئی اور جگہ نہیں ملی؟ چابی... چابی کہاں ہے؟" وہ لولا کے بیگ کی طرف متوجہ ہوا بولا۔ "اس کا پرس پیچھے پھینک دو۔ جلدی۔"

جیک نے لولا کی گود میں رکھا ہوا پرس پیچھے پھینک دیا۔

"اگر تمہاری بیوی واقعی ڈرپوک ہے تو تم نے اسے مارا کیوں پاگل؟"

"شٹ اپ۔ شٹ اپ۔ ورنہ تمہاری کھوپڑی بھی اڑا دوں گا۔" ٹیلر بیگ کے ساتھ کشمکش کرتا ہوا غرایا۔ "میں یہاں پیسوں کے انتظار میں مرا جا رہا ہوں۔ اور یہ حرامزادی تمہارے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھر رہی ہے۔"

"ٹیلر۔"

"شٹ اپ۔ بکواس نہیں کرو۔" ٹیلر نے غصے سے کہا۔ "اب تم پانچ منٹ تک اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رہو۔ اگر تم نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو میں فائر کرنے میں ہرگز تامل نہیں کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ جیک نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں بھورے رنگ کا وہ پیکٹ پکڑا ہوا تھا جس میں پانچ ہزار ڈالر رکھے تھے۔ اس نے کار کا ایک چکر لگایا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا پارک کی طرف چل پڑا۔ جیک نے اندازہ لگایا کہ ان کی نگرانی کرنے والے سراغرسان اس کارروائی سے غالباً بے خبر ہیں۔ کیونکہ لانڈری ٹرک کی وجہ سے ان کی کار اوٹ میں آگئی تھی۔ لولا کے سر سے بہنے والا گرم گرم خون اس کی قمیص میں جذب ہو کر کندھے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کا دماغ غصے کی وجہ سے کھول اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کار سے باہر آگیا۔

"ٹیلر!" اس نے چیخ کر کہا۔

ٹیلر جو پارک کے اندر بچوں کے تالاب کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اپنا نام سن کر ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ جیک نے جیب سے پستول نکال لیا جو محض... اتفاق سے اس نے جیب میں رکھ لیا تھا اور آوازیں دیتا ہوا ٹیلر کے پیچھے لپکا۔ ٹیلر کی رفتار اور زیادہ تیز ہوگئی۔ جیک نے اس پر فائر کرنے کی کوشش کی مگر درمیان میں دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں آگئیں۔ پھر دونوں کے درمیان زبردست دوڑ شروع ہوگئی۔ ٹیلر بچوں کے جھولوں کے اردگرد بھاگ رہا تھا۔ دفعتاً وہ ایک جھولے سے ٹکرایا اور اس کے ہاتھ سے بھورے رنگ کا پیکٹ گر گیا۔ اس اثنا میں پولیس کی سیٹیاں بھی بجنی شروع ہوگئی تھیں۔ ادھر ادھر گھومنے والے لوگ رک گئے اور حیرت سے یہ تماشا دیکھنے لگے۔ جیک نے زمین پر گرا ہوا پیکٹ اٹھا لیا اور دوبارہ فائر کرنے کے لئے ہاتھ سیدھا کیا۔ لیکن دوبارہ بچے درمیان میں آگئے۔

پھر لوگ شور مچاتے ہوئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ انہیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ صورتحال خاصی سنگین ہے۔ کیونکہ انہوں نے دونوں کے ہاتھوں میں پستول دیکھ لئے تھے۔ ٹیلر دوڑتا ہوا ایک دم رک گیا اور پیچھے مڑ کر جیک پر فائر کردیا تھا۔ جیک عین وقت پر غبارے بیچنے والے شخص کے پیچھے لیٹ گیا۔ ٹیلر کی گولی نصف درجن غباروں کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ ان کے پھٹنے کی آواز مشین گن کی مانند گونجتی چلی گئی تھی۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" جیک کو اپنے عقب سے ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس کے سامنے ایب نارمن کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جیک تیز ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن ٹیلر کا کچھ پتہ نہ تھا۔

"اوہ تم شاید ٹیلر کو تلاش کر رہے ہو۔" نارمن نے مزید کہا۔ "اس کے بارے میں فکر نہیں کرو۔ ہمارے آدمیوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کرلیا ہے۔ تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ اگر تم اس کا نام پکارتے اس کے پیچھے نہ دوڑتے تو ہمیں کبھی یہ پتہ نہ چلتا کہ وہ ٹیلر ہے۔"

"تم نے اسے گرفتار کرلیا... ؟" جیک نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "بہت اچھا ہوا شکر ہے میں نے اس پر گولی نہیں چلائی۔ لولا کا کیا حال ہے؟"

لولا کا خیال آتے ہی اس نے زمین پر گرا ہوا بھورے رنگ کا پیکٹ اٹھا لیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کی طرف چل پڑا۔ لولا ایک ہاتھ سے سر کو دبائے سیدھی بیٹھی تھی۔ جیک کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر کمزور سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ عین اسی وقت پارک کی طرف سے یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔

"تم خیریت سے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "ٹیلر کا کیا بنا؟"

"غالباً اسے گرفتار کرلیا گیا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری چوٹ کا کیا حال ہے؟"

"معمولی چوٹ ہے چند روز میں آرام آجائے گا۔"

پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے جیک کا ہاتھ تھام لیا اور سر اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"چلو گھر چلیں ڈارلنگ۔"

مسیحائی

محی الدین نواب

سرورق کی پہلی کہانی

عورتوں کے لئے وہ قیامت کا دن تھا۔ ڈاکٹر جبار یوسفی کی شاندار لیبارٹری کے اطراف مردوں سے زیادہ عورتوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور وہ سب کی سب یوں پریشان نظر آرہی تھیں جیسے میدانِ حشر میں ان کا نامہ اعمال کھل رہا ہو۔

لیبارٹری کے برآمدے اور لان میں ہر ساز اور ہر ذات کی عورتیں تھیں دبلی بھی تھیں، موٹی بھی تھیں، بوڑھی بھی تھیں اور جوان بھی تھیں۔ ویسے عورتوں کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ عورتیں کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔ کم از کم عمر کے حساب سے خوش نصیب ہوتی ہیں۔ سولہ برس میں جوان ہوتی ہیں اور ساری زندگی گزارنے کے بعد بمشکل ستر برس کی عمر میں وفات پاتی ہیں۔

اس وقت وہاں جتنی حسینائیں تھیں ان کے چہروں سے اداسی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل اور سہمی ہوئی نظروں سے لیبارٹری کے بند دروازے کو دیکھ رہی تھیں جس کے پیچھے تین مختلف عورتیں تھیں اور ڈاکٹر جبار یوسفی ان تین عدد کچی پکی عورتوں کے ساتھ کسی تجربہ سے گزر رہا تھا۔

باہر لان میں کھڑی ہوئی ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا۔

"کیا یہ ممکن ہے؟ کیا ڈاکٹر اپنے تجربے میں کامیاب ہوجائے گا؟"

"ناممکن۔۔!" دوسری نے جواباً کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ آج تک کوئی ایسا

میزان ایجاد نہیں ہوا جو عورت کے جھوٹ اور سچ کو الگ الگ تول سکے۔"

"ہاں!" تیسری عورت ان کی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ "ہم عورتیں جب سے پیدا ہوئی ہیں صرف ایک ہی جھوٹ سینے سے لگائے چلی آ رہی ہیں اور رہتی دنیا تک اس اکلوتے جھوٹ کو نبھاتی رہیں گی۔ ڈاکٹر یوسفی جیسے ہزاروں عالم الابدان پیدا ہو جائیں تب بھی ہمارے جھوٹ کو ننگا کرنے والا کوئی آلہ ایجاد نہیں کر سکتے۔"

یہ باتیں سُن کر دوسری عورتوں کے دلوں میں امیدیں روشن ہو گئیں۔ سب یہی سوچ کر خود کو تسلیاں دینے لگیں کہ ڈاکٹر کا تجربہ ناکام رہے گا۔ ان کی امیدوں کے برعکس وہاں جتنے مرد تھے وہ ڈاکٹر یوسفی کی اس حیرت انگیز ایجاد پر انہیں دلی مبارکباد دینے آئے تھے۔ ان میں کچھ سائنسداں تھے، کچھ حکومت کے اعلیٰ افسران تھے اور کچھ پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز اپنے شانوں سے کیمرے اور فلیش گن لٹکائے ڈاکٹر یوسفی کے منتظر تھے۔

یہ ظاہر تھا کہ ڈاکٹر کی شان میں اور ایجاد کی تعریف میں جو بڑے بڑے کالم لکھے جانے والے تھے ان میں عورتوں کے ازلی جھوٹ کا کس طرح مذاق اڑایا جائے گا۔ اس لحاظ سے وہاں جتنے مرد تھے وہ عورتوں کے دشمن تھے اور ان کی انانیت کو ٹھیس پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود عورتیں مردوں سے اور مرد عورتوں سے مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ لان میں میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہلکے پھلکے ناشتے اور مشروبات کا انتظام کیا گیا تھا۔ عورتیں زیادہ تر پریس رپورٹروں کے قریب بیٹھے رہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس طرح وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ کل صبح کے اخبارات میں وہ عورتوں کے متعلق کیا لکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے جب تک ڈاکٹر جبار یوسفی ان تین عورتوں کے ساتھ لیبارٹری سے باہر نہ آتا اس وقت تک پریس رپورٹرز بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ڈاکٹر کا تجربہ کس حد تک کامیاب ہے اور عورتیں کتنے فیصد کے حساب سے جھوٹ بولتی ہیں۔

وہ سب انتظار کرتے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر تو نہیں آیا، البتہ اس کا نوعمر بیٹا انصار یوسفی لیبارٹری کے پچھلے حصے سے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ باتیں کرتا ہوا وہاں آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی پریس رپورٹروں نے اسے گھیر لیا۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی کھنچی چلی آئیں۔ پھر چاروں طرف سے سوالات کی بوچھار شروع ہو گئی۔

"آپ ڈاکٹر کے صاحبزادے ہیں۔" ایک نے کہا۔ "اور لیبارٹری میں انہیں اسسٹ کرتے ہیں۔ آپ اس ایجاد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔"

"وہ کس قسم کا آلہ ہے؟" ایک عورت نے پوچھا۔

"اس آلے کا نام کیا ہے؟" ایک اور نے سوال کیا۔

"ڈاکٹر یوسفی لیبارٹری میں کیا کر رہے ہیں۔ وہ عورتیں بھی اندر ہیں۔ آخر وہ کتنی دیر تک اس ایجاد کو آزماتے رہیں گے؟"

انصار یوسفی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ سب سوال پر سوال کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح میں کسی کے سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ آپ اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ میں اپنے ڈیڈی کی اس ایجاد کے متعلق جہاں تک جانتا ہوں وہاں تک بیان کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد ڈیڈی آ کر اپنے طور پر بتائیں گے۔"

اس کی باتیں سن کر سب اپنی اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ لان میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ انصار یوسفی برآمدے سے اتر کر لان میں آیا۔ پھر میزوں کے درمیان پہنچ کر اپنی رسٹ واچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ گھڑی ہے۔ یہ صرف وقت نہیں بتاتی، دن اور تاریخ بھی بتاتی ہے جب تک یہ چلتی رہے گی، ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ ہم حضرت عیسیٰ مسیح کی وفات سے اب تک کتنا وقت گذارتے آ رہے ہیں۔ ہم اس گھڑی کو ٹائم میٹر بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ گذرتے ہوئے وقت کا حساب کرتی رہتی ہے۔"

ایک عورت نے بے چینی سے پوچھا۔

"آپ کے ڈیڈی کی ایجاد سے اس گھڑی کا کیا تعلق ہے؟ آپ برائے مہربانی اُس ایجاد کے متعلق بتائیں۔"

انصار یوسفی نے مسکرا کر اس عورت کی جانب دیکھا اور کہا۔

"میں آپ کی بے چینی کو سمجھتا ہوں۔ لیکن محترمہ! اپنے ڈیڈی کی ایجاد کو تفصیل سے سمجھانے کے لئے اس گھڑی کا ذکر ضروری ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ یہ ٹائم میٹر ہے۔ اسی طرح رکشے اور ٹیکسی کے میٹر ہوتے ہیں۔ یہ میٹر بتاتے ہیں کہ کتنے میل کا فاصلہ طے ہوتا جا رہا ہے۔ انسانی دماغ نے ایسے ایسے میٹر ایجاد کئے ہیں جو وقت اور فاصلوں کا حساب کرتے ہیں۔ ایک تھرمامیٹر بھی ہے جو ہمارے جسم کے صحیح درجۂ حرارت کو ظاہر کرتا ہے تو پھر ہم ایسا میٹر کیوں نہیں بنا سکتے جو انسان کی صحیح عمر بتاتا ہو۔ اسی خیال کے تحت ڈیڈی نے ایک ایسا ہی آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام ایج میٹر رکھا گیا ہے۔

ایج میٹر کسی کی بھی صحیح عمر بتا سکتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا بچہ۔ جس کے پاس برتھ سرٹیفکیٹ نہ ہو اور جسے اپنی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو اسے ایج میٹر کے ذریعہ اپنی پیدائش کا سال، مہینہ، دن اور تاریخ معلوم ہو جائے گی۔"

تمام عورتوں کے شگفتہ شگفتہ چہرے یوں مرجھا گئے جیسے بیٹھے بیٹھے انکی جوانی رخصت ہو گئی ہو۔ ان کے چشمِ تصوّر میں وہ ایج میٹر نظر آ رہا تھا اور ان کی عمر کا صحیح حساب بتا کر انہیں اختلاجِ قلب میں مبتلا کر رہا تھا۔

ایک پریس رپورٹر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر پوچھا۔

"کیا وہ ایج میٹر بتا سکتا ہے کہ اس وقت ہماری صحیح عمر کیا ہے؟"

"جی ہاں۔" انصار یوسفی نے پوچھا۔ "کیا آپ اپنی عمر معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں اپنی نہیں، اپنی بیوی کی صحیح عمر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

اس بات پر تمام مرد قہقہے لگانے لگے۔ عورتیں ناگواری سے منہ بنانے لگیں۔ ایک پریس رپورٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

"مسٹر انصار یوسفی! آپ کے کہنے کے مطابق وہ میٹر مردوں کی بھی عمر بتا سکتا ہے۔ پھر آپ کے ڈیڈی صرف تین عورتوں کو لیبارٹری میں کیوں لے گئے ہیں۔ کیا وہ ہم پر تجربہ نہیں کر سکتے تھے؟"

"بے شک آپ پر بھی تجربہ کیا جا سکتا ہے۔" انصار نے جواب دیا۔ "لیکن ابھی آپ سے آپ کی عمر پوچھی جائے تو آپ اپنی عمر بتا دیں گے۔ آپ کی طرح ہر مرد اپنی صحیح عمر بتا دیتا ہے۔ اسی لئے ڈیڈی ایج میٹر کو کسی مرد پر آزما کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

ایک عورت نے غصے سے اٹھ کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں اپنی عمر غلط بتاتی ہیں۔ آپ کو یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اس کا جواب سُننا چاہتی ہیں تو پہلے میری ایک بات کا جواب دیدیجئے۔ کیا آپ اپنی عمر بتا سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں بتا سکتی۔ ضرور بتا سکتی ہوں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس وقت میری عمر ...."

انصار یوسفی نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے۔ قسم کھا کر عمر بتانے سے پہلے یہ سوچ لیجئے کہ آپ کی صحیح عمر کا حساب کرنے کے لئے اس لیبارٹری میں ایج میٹر موجود ہے۔"

وہ حسینہ ایکدم سے گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اپنی عمر بتانا چاہئے یا نہیں۔ اس کی خاموشی کے باعث تمام عورتوں کے متعلق یہ رائے قائم ہو رہی تھی کہ سب ہی اپنی صحیح عمر چھپاتی ہیں۔ بھلا یہ الزام وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں؟ ایک عورت نے اس کی حمایت میں فوراً ہی اٹھ کر کہا۔

"مسٹر انصار یوسفی! آپ کو پرائی عورتوں کی عمر نہیں پوچھنا چاہیے۔ آخر یہ ایج میٹر ایجاد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اور آپ کے ڈیڈی کو خصوصاً عورتوں سے کوئی دشمنی ہے۔"

"مجھے اور میرے ڈیڈی کو عورتوں سے دشمنی نہیں ہے۔ صرف انکی خود نمائی سے شکایت ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور تاریخ کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ عورتیں مرد کے مقابلہ میں جلدی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ یہاں بڑھاپے سے مراد یہ ہے کہ حسن و شباب کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ مہنگا سنگار، عمدہ لباس اور نت نئے فیشن کا سہارا لینے کے باوجود ایسی لگتی ہیں جیسے باسی مٹھائی پر چاندی کا ورق چڑھایا گیا ہو۔ ایسی صورت میں اپنی عمر کو کم سے کم ظاہر کر کے ہی وہ سدا بہار بن کر رہ سکتی ہیں۔ ایسے وقت یہی سننے میں آتا ہے کہ آئے دن کی بیماریوں نے مجھے لاغر بنا دیا ہے ذرا چہرہ مُرجھا گیا ہے۔ ذرا آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔ اس وجہ سے عمر کچھ زیادہ لگتی ہے۔ ورنہ میں تو پورے سولہ برس چھ مہینے کی ہوں۔ جو ذرا صحتمند ہیں وہ صحت کی روشنی میں اپنی عمر کے اندھیرے کو چھپا لیتی ہیں۔ عام طور سے یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ دنیا کی نوّے فیصد عورتیں سولہ برس سے تیس برس تک ہوتی ہیں۔ کوئی عورت شاذ و نادر ہی تیس برس کے بعد دیکھی گئی ہے جو عورتیں نمائش کی عادی نہیں ہوتیں اور اماں جان، دادی جان اور نانی جان بن کر زندگی گذارتی ہیں ان کا شمار دس فیصد میں ہوتا ہے۔

لہٰذا میں اس وقت نوّے فیصد عورتوں کا ذکر کر رہا ہوں، ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری چھپائے۔ اگر اپنی عمر چھپا کر عورتوں کا غرور قائم رہتا اور مرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو ہم ان کے غرور اور انانیت کو کبھی ٹھیس نہ پہنچاتے لیکن ان کے بے جا اور بے وقت کے غرور نے اس معاشرے کی صورت بگاڑ دی ہے۔

مثال کے طور پر میرے ایک دوست نے ایک محترمہ سے شادی رچائی ہے۔ محترمہ ماشاءاللہ صحت مند ہیں۔ شادی سے پہلے انہوں نے اپنی عمر سویٹ سکسٹین

مہارت

پاگل خانے میں ایک مریض تنہا بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ ایک شخص اُس کے پیچھے کھڑا کھیل دیکھ رہا تھا۔ جب وہ چند بازیاں کھیل چکا تو وہ بولا:

"احمق کہیں کے! یہ کیا کر رہے ہو؟ خود سے بے ایمانی کر رہے ہو۔" تاش کھیلنے والے نے بے نیازی سے کہا۔ "تو کیا ہوا! میں تو ہمیشہ یہی کرتا ہوں۔"

"اور آج تک تمہیں کسی نے پکڑا نہیں؟"

"بالکل نہیں۔ میں اتنی مہارت سے بے ایمانی کرتا ہوں کہ مجھے خود پتہ نہیں چلتا۔"

تنویر کوثر رانا۔ گوجر خان

ہمرقص

بتائی تھی۔ عمر اور صحت کا اشتہار اتنا خوبصورت تھا کہ میں نے بھی یہی سمجھا کہ برس پندرہ کا یا کہ سولہ کا سن، جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ شادی کے بعد میرے مظلوم دوست پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ سمندر تھیں اور خود کو عمر کے کوزے میں بند کر رکھا تھا۔ اب وہ بیچارہ اسے طلاق نہیں دے سکتا کیونکہ مہر کی رقم پچاس ہزار ہے اور اس کی ماہانہ آمدنی صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ننگا کیا نہائے گا اور کیا نچوڑے گا؟

دوسری مثال میرے ڈیڈی کی ہے۔ ہوا یوں کہ میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ جب میں دس برس کا ہوا تو میرے ڈیڈی نے دوسری شادی کی۔ ان دنوں میری سوتیلی والدہ کی عمر بیس برس تھی۔ شادی کے بعد وہ میرے ڈیڈی کی بیوی تو بن گئیں لیکن انہوں نے میری ماں بننے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگیں۔ اگر میں دس برس کے بچے کی ماں بنوں گی تو لوگ میری عمر میں اور دس برس جوڑ کر مجھے تیس برس کی عورت سمجھنے لگیں گے۔ میں کتنوں کو یقین دلاتی پھروں گی کہ میں نے اسے جنم نہیں دیا ہے۔ ابھی میں خود نو شگفتہ ہوں۔

میری سوتیلی امّی صرف اس وجہ سے ماں بننے سے انکار کر رہی تھیں کہ انکی عمر کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے میرے ڈیڈی کو مشورہ دیا کہ وہ مجھے کسی دوسرے شہر کی بورڈنگ میں پرورش اور تعلیم کے لئے چھوڑ دیں۔ میرے ڈیڈی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس پر دونوں کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ آخر ڈیڈی نے تنگ آ کر دوسرے شہر میں میری سوتیلی امّی کی رہائش کے لئے کوٹھی خرید کر دیدی۔ تب سے وہ وہیں رہتی ہیں۔ ڈیڈی اکثر وہاں جاتے ہیں لیکن مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ میرا نام سن کر ہی یوں خوفزدہ ہو جاتی ہیں جیسے بوڑھی ہو گئی ہوں۔

اب میں پچیس برس کا نوجوان ہوں اور وہ پینتیس برس کی ہو چکی ہیں

میں نے آج تک ان کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ ڈیڈی نے پھر انہیں سمجھایا کہ بیگم اب تمہاری اتنی عمر ہو چکی ہے۔ اب تو اپنے اندر متانت پیدا کرو اور انصار کو بیٹا کہہ کر گلے لگا لو۔ وہ گھبرا کر کہنے لگیں۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ پچیس برس کا ہو چکا ہے اب میں اسے بیٹا کہوں گی تو لوگ میرے پینتیس برس میں انصار کے پچیس برس کو جوڑ کر مجھے ساٹھ برس کی بڑھیا سمجھنے لگیں گے۔"

"عورتوں کو عمر کی جمع تفریق میں کمال حاصل ہوتا ہے۔" میرے ڈیڈی نے چڑ کر پوچھا۔

"آخر تم کب تک اولاد سے محروم رہ کر جوان رہنا پسند کرو گی؟"

"اس میں پسند کا کیا سوال ہے؟ کیا میں جوان نہیں ہوں؟ کیا میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں؟ آج بھی میں ایسی ہوں کہ جو دیکھتا ہے مجھے بیس سے کچھ کم ہی سمجھتا ہے۔ کتنے ہی نوجوان مجھے کنواری لڑکی سمجھتے ہیں۔ عورت کی عمر کو وہیں ٹھہر جانا چاہیئے، جہاں تک دوسرے سمجھ کر یقین کر لیتے ہیں۔ آخر آپ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ دنیا مجھے بیس برس کی سمجھتی ہے آپ مجھے ساٹھ برس کی بنانا چاہتے ہیں۔"

ڈیڈی ان سے بحث نہ کر سکنے کے غصہ سے یہ کہہ کر چلے آئے کہ تم عورتوں کے لئے ایسا ایکسرے ایجاد ہونا چاہیئے جو تمہارے اندر کی چھپی ہوئی عمر کو اسکرین پر لے آئے۔ کہنے کو تو انہوں نے غصے سے کہا تھا لیکن اس کے بعد وہ سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ عورت کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔

ایک دن انہوں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھ کر سوچا کہ یہ وقت کے ایک ایک لمحے کا حساب بتاتی ہے۔ گھڑی سے خیال آگے بڑھتا ہوا رکشے اور ٹیکسی کے میٹر تک گیا۔ لیکن ان میٹروں کا تعلق انسانی جسم سے نہیں تھا۔ لہٰذا تھرمامیٹر سے ان کے نظریئے کو تقویت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں تھرمامیٹر کے پارے اور انسانی جسم کی حرارت کی کمی بیشی کے عمل اور ردعمل سے ہمیں درجہ حرارت یا درجہ انجماد کا پتہ چلتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ڈیڈی نے جوانی کی حرارت اور بڑھاپے کی سرد مہری کو دو حصوں میں تقسیم کیا پھر یہ دونوں حصے مزید چھوٹے چھوٹے نقطوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ انہوں نے اس فارمولے کو ابھی راز میں رکھا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے نقطے کس طرح گذری ہوئی عمر اور گذرنے والی عمر کو سال، مہینے، دن اور گھنٹوں میں ظاہر کرتے ہیں ابھی جو تین عورتیں لیبارٹری میں گئی ہیں وہ یہاں آ کر بتائیں گی کہ ڈیڈی اپنے تجربے میں کس حد تک کامیاب ....."

انصار یوسفی کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت لیبارٹری کے اندر سے شیشیوں کے آلات ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ڈاکٹر جبار یوسفی کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ لان میں بیٹھے ہوئے تمام مرد و زن لیبارٹری کے دروازے پر آئے اور دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر ڈاکٹر کو آوازیں دینے لگے۔ عورتیں اپنی جگہ جوں کی توں بیٹھی ہوئی تھیں۔ شاید ان کی دعائیں پوری ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر مر جائے

یا وہ ایچ میٹر ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہو جائے اس کے بعد ڈاکٹر کو ایسا ذہنی صدمہ پہنچے کہ وہ ایچ میٹر دوبارہ نہ بنا سکے۔ وہ سر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں کہ ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت حاصل ہو چکی ہے یا نہیں؟

ذرا دیر بعد لیبارٹری کے اندر سے ایک عورت نے دروازے کو کھول دیا۔ وہ اور اس کے پیچھے کھڑی ہوئی نوجوان لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ فرش پر شیشے کی کرچیوں کے درمیان ڈاکٹر اوندھا پڑا ہوا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہتا ہوا فرش کو بھگو رہا تھا۔

پھر لیبارٹری میں لوگوں کی ملی جلی آوازیں گونجنے لگیں۔

"ڈاکٹر کیسے زخمی ہو گئے؟ کس نے زخمی کیا؟"

جواب لینے کے لئے ڈاکٹر ہوش میں نہیں تھا۔ کسی نے دروازہ کھولنے والی عورت سے پوچھا۔

"یہاں تین عورتیں آئی تھیں۔ وہ تیسری عورت کہاں ہے؟"

"وہ۔ وہ بھاگ گئی ہے۔" اس نے لیبارٹری کے نیچے کھلنے والی کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

دو آدمی فوراً ہی کھڑکی کے راستے باہر آئے اور اس عورت کی تلاش میں نکل گئے۔ دو آدمیوں نے ڈاکٹر کو فرش پر سے اٹھایا۔ کچھ اور لوگوں نے زخمی ڈاکٹر کو ایک کار کی پچھلی سیٹ تک پہنچانے میں مدد دی۔ پھر اسے طبی امداد کے لئے کسی قریبی ہسپتال میں لے گئے۔ انصار یوسفی بھی اپنے باپ کے ساتھ چلا گیا۔ یہاں جو لوگ رہ گئے تھے انہوں نے ان دو عورتوں کو گھیر لیا اور ان سے سوالات کرنے لگے۔

ایک عورت نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتی کہ وہ تیسری عورت کون تھی ڈاکٹر یوسفی ایچ میٹر سے میری عمر معلوم کرنے کے بعد اسے نوٹ کر رہے تھے اچانک اُس تیسری عورت نے پیچھے سے ڈاکٹر پر حملہ کیا۔ ایک شیشے کی بوتل ڈاکٹر کے سر پر توڑ دی۔ وہ چوٹ کھا کر جیسے ہی گرنے لگے، اس عورت نے ان کے ہاتھ سے ایچ میٹر چھین لیا۔ اور اسے لیکر کھڑکی کے راستے فرار ہو گئی۔"

ایچ میٹر غائب ہو گیا۔ تمام مرد ایک دوسرے کو یوں تکنے لگے جیسے کوئی سہانا خواب ٹوٹ گیا ہو۔ اور عورتوں کے چہرے خوشی سے یوں کھل گئے جیسے حسین خواب کی تعبیر سامنے آ گئی ہو۔

ڈاکٹر جبار یوسفی بوڑھا اور لاغر تھا جسم میں برائے نام خون تھا، جو لیبارٹری کے فرش پر بہہ گیا تھا۔ اس لئے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

وہ دو عورتیں جو لیبارٹری میں تھیں انہیں تھانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر نے ان سے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے ایچ میٹر کو پہلے کس پر آزمایا تھا؟"

"مجھ پر آزمایا تھا۔" ایک نوجوان لڑکی نے کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"فریدہ بیگم۔ میں گرلز اسکول کی ٹیچر ہوں۔ ڈاکٹر نے آزمائش کے لئے میرا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ میں معاشرے کی ایک اہم فرد ہوں۔ کیونکہ مجھ سے سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔"

"آپ کا انتخاب کرنے کی اور بھی کوئی وجہ ہے؟"

"جی ہاں، ایک وجہ اور ہے۔ عام طور سے لیڈی ٹیچر کے لئے ملازمت کی یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ کم عمر ہو اور شادی شدہ نہ ہو۔ کیونکہ شادی شدہ عورتیں اپنے گھریلو معاملات میں الجھی رہتی ہیں اور ہر سال بچے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اس طرح وہ اسکول میں پڑھنے والی لڑکیوں پر پوری توجہ نہیں دیتیں۔ میں کم عمر ہوں اور ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر یوسفی یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مجھ جیسی لڑکی جو معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، وہ عمر کے معاملے میں کس حد تک سچ بولتی ہے۔"

"ہوں، تو پھر ایچ میٹر نے کیا بتایا؟"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر جھجکتی ہوئی بولی۔

"ڈاکٹر اپنے تجربے میں ناکام رہے یا پھر اُس ایچ میٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ میری موجودہ عمر سے سات برس زیادہ بتا رہا تھا۔"

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ ایچ میٹر میں خرابی پیدا ہو گئی تھی؟"

فریدہ نے جواب دیا۔ "مشین ہو، کوئی آلہ ہو یا انسانی جسم ہو بعض اوقات سب ہی میں خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا ہے کہ رکشے اور ٹیکسی کے میٹر کبھی کبھی تیزی سے چلتے ہیں اور فاصلے سے زیادہ کرایہ ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح ایچ میٹر کچھ تیز ہو گیا تھا اور میری عمر سے زیادہ عمر بتا رہا تھا۔"

"کیا ڈاکٹر یوسفی نے تسلیم کیا تھا کہ ایچ میٹر میں خرابی پیدا ہو گئی ہے؟"

"جی نہیں، وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کا تجربہ کامیاب ہے۔ اسی لئے انہوں نے ایچ میٹر کی خرابی کو تسلیم نہیں کیا۔"

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ڈاکٹر یوسفی جھوٹ کہہ رہے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ان کی سچائی کا ثبوت وہ ایچ میٹر تھا جسے ایک عورت چرا کر لے گئی ہے۔ کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟"

"نہیں، وہ میرے لئے اجنبی تھی۔"

انسپکٹر نے دوسری عورت کو مخاطب کیا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام حمیدہ بانو ہے"

"ڈاکٹر نے آزمائش کے لئے آپ کا انتخاب کیوں کیا تھا؟"

"میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک سوشل ورکر ہوں نچلے طبقے کی عورتوں اور اونچے طبقے کی عورتوں سے میرا رابطہ قائم رہتا ہے ڈاکٹر یوسفی نے اسی لئے میرا انتخاب کیا تھا کہ اس معاشرے کی تمام عورتوں سے میں ملتی رہتی ہوں۔ کتنے ہی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں میرا آنا جانا رہتا ہے۔ اس لئے ہر طرح کے مردوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ ڈاکٹر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مجھ جیسی عورت جو خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے اور ان کے حقوق کے لئے لمبی لمبی تقریریں کرتی رہتی ہے، وہ اپنی عمر کے معاملے میں کتنا سچ بولتی ہے۔"

"اچھا تو پھر ایچ میٹر نے کیا بتایا؟"

حمیدہ بانو نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا۔

"وہ ایچ میٹر میری نظروں میں ایک کھلونا تھا، جس سے ڈاکٹر کھیل کر خود کو بہت بڑا موجد کہلوانا چاہتے تھے۔ میں مس فریدہ کے خیال سے متفق ہوں اگر وہ واقعی ایچ میٹر ہی تھا تو اس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ آپ ہی بتائیے کیا میں آپ کو پچاس برس کی لگتی ہوں، میرا تیسرا خاوند اس بات کا گواہ ہے کہ میں کتنی عمر کی ہوں۔ مگر وہ ایچ میٹر طوفانی رفتار سے چلتا ہے۔ ساڑھے بیس برس کو پچاس برس بتاتا ہے۔"

انسپکٹر نے دونوں عورتوں کو باری باری دیکھا پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"اگر آپ دونوں کی باتیں درست ہیں کہ وہ ایچ میٹر ایک فضول سی چیز ہے تو پھر وہ تیسری عورت اس فضول سی چیز کو لیکر کہاں غائب ہو گئی ہے اسی کی خاطر اس نے ڈاکٹر کو مار ڈالا ہے۔ جس چیز کی چوری ہوا ور اس کے لئے قتل بھی ہو، کیا اُس کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتی کہ اس تیسری عورت نے اس ایچ میٹر کو اتنی اہمیت کیوں دی جو ایچ میٹر نہیں تھا بلکہ ہم عورتوں کا مذاق اڑانے کا ایک ناکام حربہ تھا۔"

انسپکٹر نے فریدہ بیگم سے پوچھا۔

"آپ بتائیں کہ اس ایچ میٹر کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو پھر وہ اسے لیکر کیوں بھاگ گئی، اس کے لئے قتل کیوں کیا؟"

فریدہ بیگم نے جواب دیا۔

"اس مہنگائی کے زمانے میں چار پیسے کی کیا اہمیت ہے؟ لیکن ایسے مجرم بھی ہوتے ہیں جو چار پیسے کے لئے کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ اگر اس نادان عورت نے ڈاکٹر کو ہلاک کیا ہے اور ایچ میٹر لے کر بھاگی ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ جس انداز میں عورتوں کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اسے وہ عورت برداشت نہ کر سکی۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اسے چرا کر لے جائے گی تو خواہ مخواہ اس فضول سی چیز کی اہمیت بڑھ جائے گی۔"

حمیدہ بانو نے انسپکٹر سے کہا۔

"آپ یقین کریں کہ ایچ میٹر کا تجربہ ایسا ہی ہے جیسے کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا، آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس ایچ میٹر کو صرف اس لئے اہمیت دیں کہ اس فضول سی چیز کے لئے ایک قتل ہوا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ چلئے اس قتل کے سلسلے میں میری مدد کیجئے اور یہ بتائیے کہ وہ تیسری عورت کون تھی۔ آپ تو اس شہر کی بے شمار عورتوں سے ملتی رہتی ہیں۔ اس عورت کو بھی یقیناً جانتی ہوں گی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں اُسے نہیں جانتی۔ جس وقت وہ ایچ میٹر لے کر بھاگ رہی تھی، میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ جسمانی طور پر مجھ سے مضبوط ہے۔ اس نے مجھے دھکا دیا میں ایک میز سے ٹکرا گئی شیشے کی کتنی ہی چیزیں گر کر ٹوٹ گئیں پھر وہ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی کھڑکی سے

کود کر بھاگ گئی۔"

تھانے میں کچھ اور لوگ موجود تھے۔ یہ لوگ ڈاکٹر کی لیبارٹری میں موجود تھے۔ انسپکٹر نے اُن سے بھی پوچھا کہ اگر کوئی اس تیسری عورت کو جانتا ہو تو اسکے متعلق بتائے۔ لیکن کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ وہ تیسری عورت ان سب کے لئے اجنبی تھی۔

دوسرے دن انسپکٹر نے انصار یوسفی سے ملاقات کی۔ انصار یوسفی اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا، باپ کی موت کا غم غلط کرنے کے لئے وہسکی پی رہا تھا۔ انسپکٹر نے تیسری عورت کے متعلق پوچھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باپ کی لائبریری میں گیا اور وہاں سے ایک نوٹ بک اٹھا کر لے آیا پھر انسپکٹر کی طرف اسے بڑھاتا ہوا بولا۔

"ڈیڈی نے اس نوٹ بک میں لکھا ہے کہ وہ تینوں عورتیں کون ہیں اور آزمائش کے لئے ان کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا۔"

انسپکٹر نوٹ بک کھول کر پڑھنے لگا۔ مس فریدہ اور حمیدہ بانو کے متعلق وہی باتیں لکھی ہوئی تھیں، جو وہ تھانے میں کہہ چکی تھیں تیسری عورت کے متعلق لکھا تھا کہ اس کا نام نازنین تھا اور وہ اس شہر کے ایک چکلے کی طوائف تھی۔

طوائف بھی اس معاشرے کی ایک اہم ہستی ہے۔ شریف آدمیوں کی غلاظتوں کو ڈسٹ بن کی طرح اپنے اندر سمیٹ کر اپنی ذات تک محدود کر لیتی ہے اور سوشل ورکر کی طرح مردوں کی فرحت و تازگی کے لئے دن رات مصروف رہتی ہے۔ یہ اتنی خوش اخلاق ہوتی ہے کہ ہر مرد کو مسکرا کر خوش آمدید کہتی ہے۔ ہمیشہ ایمانداری کا سودا کرتی ہے۔ اس ہاتھ لیتی ہے اُس ہاتھ دیتی ہے لین دین میں کبھی گڑبڑ نہیں کرتی، صرف اپنے کاروبار کو چمکانے کی خاطر اپنی عمر کم سے کم بتاتی ہے۔

ڈاکٹر یوسفی نے اچھے اور بُرے ماحول سے ایسی عورتوں کا انتخاب کیا تھا جو معاشرے میں اہم کردار ادا کرتی تھیں نوٹ بک میں ان تینوں عورتوں کے نام اور پتے درج تھے۔ نازنین اتنی ناداں تو نہیں تھی کہ اپنے ٹھکانے پر موجود رہتی۔ پھر بھی انسپکٹر نے انصار یوسفی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ نازنین کے کوٹھے تک چلے۔ انسپکٹر نہ کہتا تب بھی انصار اپنے فرض کو سمجھتا تھا کہ اسے اپنے باپ کی قاتلہ نازنین کو عدالت تک پہنچانا ہے۔ اگر بدقسمتی سے اس چکلے میں نازنین نہ ملتی تو خوش قسمتی سے دوسری کتنی ہی نازنینیں پینے پلانے کے لئے مل سکتی تھیں۔

وہ دونوں جب بازارِ حسن میں پہنچے تو رات جوان ہو رہی تھی۔ کوٹھوں کی کھڑکیوں، بالکونیوں اور برآمدوں میں ہر عمر کی جوانیاں جگمگا رہی تھیں۔ گلیوں میں دل والے اور دولت والے اِترا کر چل رہے تھے۔ اور حسن و شباب کی چکاچوند میں اپنی اپنی پسند کی عمر تلاش کر رہے تھے۔ لیکن سج دھج کر بیٹھنے والیوں کے چہروں پر اتنا گہرا میک اَپ تھا کہ سینکڑوں کینڈل پاور کی روشنی میں بھی ان کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ سب ہی کچی کلیاں نظر آتی تھیں۔

نازنین کے کوٹھے سے ناچنے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دونوں بڑے سے ہال میں پہنچے تو نازنین کی بہن مہ جبیں گھنگھرو باندھے تماشائیوں کے درمیان جھوم جھوم کر رقص کر رہی تھی۔ اس کی ماں پولیس انسپکٹر کو دیکھتے ہی جلدی سے دروازے پر آ گئی اور اسے بڑے ادب سے سلام کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلنے کے لئے کہا۔ انصار انسپکٹر کے ساتھ چلتے ہوئے مہ جبیں کی جانب دیکھنے لگا وہ بہت حد تک نازنین سے مشابہ تھی۔ انصار نے نازنین کو لیبارٹری میں جانے سے پہلے دیکھا تھا۔ اب مہ جبیں کو دیکھ کر نازنین کی پوری تصویر آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، گھنگھرو باندھے شعلے کی طرح مچل رہی تھی، اور رقص کے کتنے ہی زاویوں سے اپنے حسن و شباب کی شراب چھلکا رہی تھی۔ انصار کے اندر نشے کی پیاس بڑھ گئی تھی۔

مہ جبیں کی ماں انہیں ایک آرام دہ خواب گاہ میں لے آئی۔ انصار ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے بائی جی سے پوچھا۔

"نازنین کہاں ہے؟"

"کون نازنین؟" بائی جی نے پوچھا۔ "کیا آپ میری بڑی لڑکی کو پوچھ رہے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا کہ وہ تمہاری بڑی لڑکی ہے چھوٹی۔ مجھے اُس کی عمر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اسے یہاں بُلا دو۔"

"اے سرکار! آپ تو گڑھے مُردے اکھاڑنے آئے ہیں میں اسے کیسے بُلا دوں؟ وہ تو مر چکی ہے۔"

انسپکٹر اور انصار دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ کب اور کیسے مر گئی؟"

"کیا بتاؤں کہ کیسے مر گئی؟ اُسے ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ دو دن تک سخت بخار میں مبتلا رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ یہ ایک برس پہلے کی بات ہے لیکن آج اس کے متعلق آپ کیا پوچھنے آئے ہیں؟"

انصار اور انسپکٹر ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ نازنین پچھلی شام ڈاکٹر کی لیبارٹری میں موجود تھی اور اس کی ماں بتا رہی تھی کہ وہ ایک برس پہلے ہی مر چکی ہے۔ انسپکٹر نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا تم مذاق کر رہی ہو؟"

"اے سرکار! میری کیا مجال ہے کہ آپ سے مذاق کروں۔ اس محلے کی جتنی طوائفیں ہیں سب ہی گواہی دیں گی کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ڈاکٹر فاروقی نازنین کے معالج تھے مجھ سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ نازنین کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بہت مشہور ڈاکٹر ہیں آپ نے بھی ان کا نام سُنا ہو گا۔ میں اُن کا فون نمبر بتاتی ہوں آپ تصدیق کر لیں۔"

انسپکٹر اس کا بتایا ہوا فون نمبر نوٹ کرنے لگا۔ انصار نے بائی جی سے کہا۔

"کل دوپہر کے وقت میں نے نازنین کو اپنے ڈیڈی کی لیبارٹری میں جاتے دیکھا ہے۔ اگر نازنین ایک سال پہلے مر چکی ہے تو پھر میں نے اُس عورت کو دیکھا ہے جو ابھی دو سرے کمرے میں ناچ رہی ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"اُس کا نام مہ جبیں ہے۔ یہ اپنی بڑی بہن نازنین کی ہمشکل ہے۔ ٹھہریئے، میں آپ کو دونوں بہنوں کی تصویریں دکھاتی ہوں۔ پھر آپ کو یقین آ جائے گا۔"

وہ الماری کے پاس گئی، پھر اسے کھول کر ایک البم نکال کر لے آئی۔ البم میں دونوں بہنوں کی مختلف اوقات کی کتنی ہی تصویریں تھیں۔ بائی جی وہ تصویریں دکھاتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"دونوں بہنوں میں بے پناہ محبت تھی۔ نازنین کی موت کے بعد مہ جبیں صدمہ سے بیمار پڑ گئی تھی۔ وہ اکثر خود کو نازنین کہتی ہے۔ وہ اس غم کو اپنا کر اپنے اندر اپنی بہن کو محسوس کرتی ہے۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر کہتی ہے کہ میرے سامنے مہ جبیں کھڑی ہے اور میں نازنین ہوں۔ سرکار! خود کو بڑی بہن کے نام سے پکارنا جرم تو نہیں ہے؟"

"ہاں یہ جرم نہیں ہے۔ لیکن یہ اگر خود کو نازنین کہتی ہے تو ہم اسی کی تلاش میں آئے ہیں۔ اس نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو اپنا نام نازنین بتایا ہو گا۔"

"کون ڈاکٹر جبار یوسفی؟" بائی جی نے پوچھا۔ "میری بیٹی کسی ڈاکٹر یوسفی کو نہیں جانتی ہے اور نہ ہی کبھی اس کی لیبارٹری میں گئی ہے۔ کیا ڈاکٹر یوسفی نے میری بیٹی کے خلاف کوئی شکایت کی ہے؟"

"وہ شکایت کرنے کے لئے اب اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ تمہاری بیٹی نے انہیں ہلاک کر دیا ہے۔"

"نہیں۔!" وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے چلی گئی۔ "یہ میری بچی پر الزام ہے اس نے آج تک ایک چیونٹی کو نہیں مارا۔ اتنے بڑے آدمی کو کیا مارے گی۔"

"کیا وہ کل شام کو ڈاکٹر کی لیبارٹری میں نہیں گئی تھی؟"

"نہیں۔ کل شام کو وہ یہاں اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ صرف دوپہر کو اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی۔"

انصار نے کہا۔ "سہیلی سے نہیں، میرے ڈیڈی سے ملنے گئی تھی۔ میں نے دوپہر کو سوا دو بجے اسے لیبارٹری میں جاتے دیکھا ہے۔"

"آپ نے کسی اور کو دیکھا ہو گا۔ میں مہ جبیں کو بلاتی ہوں وہ آپ کو مطمئن کر دے گی کہ دوپہر کے وقت کہاں تھی؟"

یہ کہہ کر وہ خوابگاہ سے چلی گئی۔ انسپکٹر نے انصار سے پوچھا۔

"وہ تینوں عورتیں کل شام کو لیبارٹری میں گئی تھیں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے مہ جبیں کو دوپہر کے وقت دیکھا ہے۔ کیا تمہارے ڈیڈی نے اسے دوپہر کو بلایا تھا؟"

"جی ہاں۔ صرف اسی کو نہیں، ان دو عورتوں کو بھی تجربے سے تین گھنٹے پہلے بلایا تھا۔ لیبارٹری کے ساتھ تین کمرے اور ایک لائبریری ہے ڈیڈی نے ان تینوں کو تین مختلف کمروں میں آرام سے لیٹنے کے لئے کہا تھا اور خود لائبریری میں چلے آئے تھے وہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ تینوں عورتیں ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں آرام کر رہی ہیں تاکہ وہ ٹھنڈے کمرے میں ٹھنڈے دماغ سے ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں سوچتی رہیں۔ اس طرح وہ نارمل کنڈیشن میں رہیں گی اور ایچ میٹر ان کے نارمل ٹمپریچر سے ان کی صحیح عمر بتا سکے گا میں لیبارٹری کے کاموں میں انہیں اسسٹ کرتا ہوں۔ لیکن کل انہوں نے مجھے اس لئے لیبارٹری سے باہر رکھا کہ میں نوجوان ہوں اور عورتیں یہ پسند نہیں کرتیں کہ ایچ میٹر میرے سامنے ان کی صحیح عمر بتائے۔ اس لئے میں تجربے سے پہلے ہی لیبارٹری سے باہر آ گیا تھا۔

وہاں پریس رپورٹرز، فوٹو گرافرز اور حکومت کے چند اعلیٰ افسران اپنی بیگمات کے ساتھ شام کو آئے تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی عورتیں تھیں انہوں نے اخبارات میں ایچ میٹر کے متعلق پڑھا تھا۔ اس تجربے کے نتائج معلوم کرنے کے لئے وہ چلی آئی تھیں، لیکن ان میں سے کسی نے ان تین عورتوں کو نہیں دیکھا تھا۔ لیبارٹری کا دروازہ کھلنے کے بعد وہ دو عورتیں نظر آئی تھیں تیسری عورت کو صرف میں نے دوپہر کے وقت دیکھا تھا اور وہ تیسری عورت یہی مہ جبین ہے۔"

مہ جبین کا نام لیتے ہی اس نے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ گھنگھروؤں کی تال پر ایک ادائے ناز سے بل کھاتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس نے آتے ہی جھک کر آداب کیا۔

"فرمایئے سرکار! یہ کنیز آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ ماں جی نے بتایا ہے کہ آپ مجھ پر کسی کے قتل کا الزام لگانے آئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میں قاتلہ ہوں۔ میرا پیشہ یہی ہے۔ قانون نے مجھے نگاہوں سے اور اداؤں سے قتل کرنے کا باقاعدہ لائسنس دیا ہے۔"

اس کی باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ وہ بڑی تیز طرار ہے۔ انسپکٹر نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ جو کچھ میں پوچھتا ہوں اس کا صحیح جواب دو۔"

وہ بیٹھتی ہوئی بولی۔ "میرا مجرا سننے والے باہر بیٹھے بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہیں، اگر میں یہاں زیادہ دیر تک بیٹھی رہ گئی تو آج کی آمدنی ماری جائے گی۔"

انصار نے اس کے حسن کی آنچ سے پگھلتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری ایک رات کی آمدنی کتنی ہے؟"

"کبھی ہزار، کبھی دو ہزار۔ تماش بین موڈ میں آ جائیں تو پانچ ہزار بھی مل جاتے ہیں۔ کیا آپ بولی دیں گے؟"

"ہاں۔!" انصار نے کہا۔ "آج اپنی دکان بند کر دو اور اس خوابگاہ کے دروازے میرے لئے کھلے رہنے دو۔ میں تمہیں تین ہزار دوں گا۔"

اس کی بات سُن کر بائی جی دوسرے تماشائیوں کو رخصت کرنے چلی گئی۔ مہ جبین اپنے پاؤں کے گھنگھرو کھولنے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔

"انصار صاحب! آپ میری موجودگی میں ایسا سودا نہ کریں۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" مہ جبین نے پوچھا۔ "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں ایسے ہی سودے ہوتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "میری بات کا جواب دو کہ ڈاکٹر جبار یوسف سے تمہاری مُلاقات کب اور کہاں ہوتی تھی؟"

"میں کسی ڈاکٹر جبار یوسفی کو نہیں جانتی ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ ڈاکٹر کی نوٹ بک میں تمہارا نام اور پتہ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کل سے پہلے بھی تمہاری اُن سے ملاقات ہو چکی ہے انہوں نے ایچ میٹر کو آزمانے کے لئے تمہیں کل لیبارٹری آنے کے لئے کہا تھا۔ تم کل

دوپہر کو وہاں گئی تھیں۔ شام تک وہاں رہیں۔ پھر موقع پاکر تم نے ڈاکٹر پر حملہ کیا اور ایج میٹر لیکر وہاں سے چلی آئیں۔ انصار صاحب نے اپنی آنکھوں سے تمہیں لیبارٹری میں دیکھا تھا۔"

"اچھا ۔ !" مہ جبین نے حیرانی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے انصار کو دیکھ کر پوچھا "کیا واقعی آپ نے مجھے وہاں دیکھا تھا؟"

"ہاں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا"

مہ جبین نے اس کی عینک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ عینک لگا کر آپ نے دیکھا تھا؟"

"آں ۔ !" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "نہیں، میں برآمدے میں کھڑا ہوا رومال سے عینک کے شیشے صاف کر رہا تھا، اسی وقت تم برآمدے آخری سرے پر نظر آئیں۔ تم لیبارٹری کا دروازہ کھول کر اندر جا رہی تھیں۔ دوری کی وجہ سے تمہارا چہرہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اب تمہیں اس عینک سے دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تم ہی تھیں"۔

"آپ کے کہنے سے میں وہاں نہیں ہو سکتی۔ ایک تو آپ کی آنکھیں کمزور ہیں، اوپر سے آپ نے چشمہ نہیں لگا رکھا تھا۔ انسپکٹر صاحب! تعجب ہے کہ آپ ان کی بینائی پر کس طرح بھروسہ کر کے یہاں آئے ہیں"

انصار نے کہا "یہ درست ہے کہ میری بینائی کچھ کمزور ہے اس کے باوجود ہم دور سے کسی کو دیکھ کر یہ اندازے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم کسے دیکھ رہے ہیں"۔

"اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں" مہ جبین نے کہا "آپ کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کے علاوہ کسی اور نے مجھے وہاں دیکھا ہو تو بتایئے"؟

انسپکٹر نے کہا "نہیں کسی اور نے تمہیں نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کی نوٹ بک میں تمہارا نام اور پتہ درج ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لیبارٹری میں آنے والی تیسری عورت تم ہی ہو۔ تمہارا نام مہ جبین ہے لیکن تم خود کو نازنین کہتی ہو، اور یہی نام تم نے ڈاکٹر یوسفی کو بتایا تھا"۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"ہاں میں خود کو نازنین کہتی ہوں۔ کاش وہ زندہ رہتیں اور ان کے بدلے میں مر جاتی۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی تھیں، اتنا پیار کرتی تھیں کہ مرنے کے بعد بھی نہ مر سکیں۔ میرے اندر سما گئی ہیں۔ بعض اوقات میں بڑی شدت سے یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں نازنین ہوں اور مہ جبین مر چکی ہے"۔

یہ کہتے وقت مہ جبین کا چہرہ جوشِ محبت سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی آواز بھی قدرے بدل گئی تھی انسپکٹر اور انصار نے محسوس کیا کہ وہ بیٹھے ہی بیٹھے یکلخت بدل گئی ہے۔ اب وہ کچھ دیر پہلے کی مہ جبین نہیں ہے۔ شاید نازنین بن گئی تھی۔

وہ چند لمحوں کی تبدیلی تھی۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ انسپکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ تمہاری آواز کیسے بدل گئی ہے؟"

"آں ۔ نہیں تو۔ میری آواز تو بالکل ٹھیک ہے۔ میری یہ سُریلی آواز سننے کے لئے روزانہ سینکڑوں تماش بین آتے ہیں"۔

مہ جبین کی آواز واقعی سُریلی تھی اور وہ اپنی آواز میں بول رہی تھی۔ انسپکٹر نے سوچا کہ شاید اس کے سننے اور سمجھنے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی اس نے پوچھا۔

"کیا تم نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو اپنا نام نازنین نہیں بتایا تھا؟"

"میں تو سب ہی کو یہی نام بتاتی ہوں۔ لیکن ڈاکٹر یوسفی کو نہیں جانتی۔ خدا جانے انہیں میرا نام اور پتہ کیسے معلوم ہو گیا تھا۔ ویسے میری اتنی شہرت ہے کہ دل والے اپنے دل کی نوٹ بک میں میرا نام اور پتہ نوٹ کر کے رکھتے ہیں۔ کیا ان کی عمر ایسی تھی کہ وہ میرا پتہ نوٹ کر کے رکھتے؟"

انسپکٹر نے ناگواری سے کہا "فضول باتیں نہ کرو۔ جب تک میں تمہارے متعلق پوری تحقیقات نہیں کر لوں گا، اس وقت تک تم حراست میں ہو گی"۔

انصار یوسفی مایوسی سے مہ جبین کو دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیر پہلے اس حسینہ کی ایک رات کی بولی دی تھی اور انسپکٹر اسے حراست میں لینا چاہتا تھا۔

مہ جبین نے انصار کو قاتل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ میری ضمانت نہیں دے سکیں گے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" اس نے جلدی سے کہا "انسپکٹر صاحب! آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کی تحقیقات مکمل ہونے تک اگر میں مہ جبین کو اپنی کوٹھی میں رکھوں تو کیا آپ کو اعتراض ہو گا؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں پوری طرح ان کی نگرانی کروں گا"

انسپکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "آپ میرے ساتھ آیئے میں اس سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔

انصار انسپکٹر کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ مہ جبین اپنا لباس بدلنے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں خوابگاہ میں واپس آئے۔ انسپکٹر نے بائی جی سے نازنین اور مہ جبین کی دو چار مختلف تصویریں مانگیں۔ بائی جی نے البم سے نکال کر دیدیں۔ پھر اس نے انصار سے کہا "میں ان دو عورتوں سے ملوں گا جو آپ کے ڈیڈی کی لیبارٹری میں تھیں۔ انہوں نے نازنین کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ ان تصویروں کو دیکھتے ہی مجرمہ کو پہچان لیں گی۔ اب میں جاتا ہوں۔ کل صبح آ کر ملاقات کروں گا"۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ مہ جبین لباس بدل کر آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اور بائی جی انصار کی کار میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی میں آ گئیں۔ انصار نے بائی جی کے لئے ایک کمرہ کھلوا دیا اور مہ جبین کو لیکر اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد بائی جی اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں صوفوں کے درمیان میز پر ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کئے۔ پھر رابطہ قائم ہوتے ہی دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"ہیلو۔ میں بلقیس بائی بول رہی ہوں ۔ میڈم! آپ نے کہا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی، مگر ایک پولیس انسپکٹر میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ ڈاکٹر یوسفی کا لڑکا انصار یوسفی اسے ضمانت پر اپنی کوٹھی میں لے آیا ہے، میں اسی کوٹھی سے فون کر رہی ہوں"۔

خواتین کا سب سے مقبول اور سب سے پسندیدہ ماہنامہ

پاکیزہ

کا

سالگرہ نمبر

۱۲ پاکیزہ افسانے * ۳ پُر اثر سچی کہانیاں * ماہِ مبین کے ناول مضراب کی آخری قسط اور عذرا بیگ کے نئے ناول کی پہلی قسط * کارآمد مضامین اور تمام مستقل سلسلے

اپنے قریبی بک اسٹال سے خریدیے

*

پاکیزہ * پوسٹ بکس ۶۶۲، کراچی

دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا۔ "تم بے فکر رہو مہ جبیں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ انسپکٹر کو اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔"

باجی جی نے کہا۔ "انسپکٹر میرے ہاں سے نازنین اور مہ جبیں کی تصویریں لے گیا ہے۔ وہ ان دو عورتوں کے پاس جائے گا جو لیبارٹری میں تھیں۔ وہ تصویریں دیکھ کر انسپکٹر کو بتائیں گی کہ مہ جبیں وہاں موجود تھی۔"

"وہ نہیں بتائیں گی۔ میں نے مسز فریدہ اور حمیدہ بانو کو پہلے ہی سمجھا دیا ہے۔ پولیس کی شناختی پریڈ میں جتنی عورتیں آئیں گی وہ دونوں مجرمہ کو پہچاننے سے انکار کر دیں گی۔ اس طرح پولیس والے اصل مجرمہ کو تلاش کرتے رہیں گے۔ اور کبھی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ جاؤ تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ باجی جی بھی ریسیور رکھ کر زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

انصار کی خوابگاہ میں وہسکی کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ مہ جبیں پلا رہی تھی وہ پی رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے شراب اور شباب کا نشہ گڈمڈ ہو رہا تھا وہ مستی میں آکر اسے آغوش میں لینے کے لئے بڑھا۔ وہ کترانے لگی۔ بازاری عورت جانتی ہے کہ کس طرح مرد کے ہوسناک ارادوں سے بچنا چاہیئے۔ قریب آنے سے پہلے اسے خوب پلانا چاہیئے۔ اس کے لباس سے کترانا چاہیئے، دور ہی دور رہ کر اسے للچانا چاہیئے، وہ دیوانہ ہو کر اس کی خوشامدیں کرے گا۔ نشے میں لڑکھڑائے گا اور پاس آنے کی کوشش کرے گا۔ اس کوشش میں یا تو تھک کر ہانپنے لگے گا یا نشے میں گر پڑے گا۔ تھک جانے والا یا گر جانے والا مرد، مرد نہیں ہوتا ایک بیچارہ سا کاہک ہوتا ہے جسے وہ تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔

انصار پر نشہ حاوی ہو رہا تھا اس کے باوجود وہ کسی قدر ہوش میں تھا ہر شرابی کی طرح خود کو ہوشمند سمجھ رہا تھا لیکن مہ جبیں کچھ زیادہ ہی چالاک تھی۔ اس نے پلانے کے دوران اس کی عینک چھپا دی تھی۔

"کہاں ہے میری عینک؟" وہ بیک وقت عینک کو بھی تلاش کر رہا تھا اور مہ جبیں کے قریب پہنچنے کی بھی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ عینک کے بغیر دھندلی دکھائی دے رہی تھی اور نشے کی زیادتی سے ایک کی بجائے دو نظر آ رہی تھی۔ دو بہنوں کی تصویر کی طرح ایک طرف نازنین دکھائی دے رہی تھی دوسری طرف مہ جبیں۔ مہ جبیں نے کہا۔

"میں آپ کی عینک تلاش کروں گی۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کے ڈیڈی نے ایچ میٹر بنا کر عورتوں سے دشمنی کیوں کی ہے؟"

"انہوں نے کوئی دشمنی نہیں کی بلکہ عورتوں پر احسان کیا ہے۔ اب وہ ایچ میٹر کے خوف سے کبھی جھوٹ نہیں بولیں گی۔"

"آپ لوگ عورت کے جھوٹ کے ایک ہی پہلو کو دیکھتے ہیں کہ وہ خود کو جاذب نظر بنانے کے لئے اپنی عمر کم بتاتی ہے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ کتنی ہی لڑکیاں تیس برس اور پینتیس برس تک بن بیاہی بیٹھی رہتی ہیں اور محض اس لئے خود کو کم عمر کہتی ہیں کہ کوئی عزت آبرو سے انہیں شریک حیات بنا لے۔

آپ یہ نہیں سوچتے کہ عورتوں کو ملازمت دینے والی فرمیں سب سے پہلی شرط یہی رکھتی ہیں کہ عورت کم عمر ہو۔ ایسی صورت میں ملازمت کرنے کے لئے عورت کو جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔

آپ یہ نہیں سوچتے کہ ایچ میٹر عام ہو گیا تو ہم طوائفوں کا کتنا زبردست نقصان ہو گا۔ ہمارے گاہک ہمیں اپنی نگاہوں سے تولنے کے بجائے ایچ میٹر سے ہماری عمر معلوم کریں گے، عمر کم ہو گی تو بھاؤ بڑھائیں گے، زیادہ ہوئی تو بھاؤ گھٹائیں گے اور میں جانتی ہوں کہ ہمارا بھاؤ گرتا ہی جائیگا کیونکہ بازارِ حسن میں کھیلی کھلائی عورتیں آتی ہیں۔ باہر کی دنیا میں اچھی خاصی عمر گذارنے اور تجربے حاصل کرنے کے بعد چکلے کے جہنم میں داخل ہوتی ہیں۔ وہاں بھی اگر ایچ میٹر نے ان کی عمر کی چغلی کھائی تو پھر وہ سب دھندا کیسے کر سکیں گی۔

آپ نہیں جانتے کہ میری بہن نازنین اپنی عمر کا حساب کرتے کرتے مر گئی ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھاری بھرکم تھی جس نوجوان کو وہ چاہتی تھی اس نوجوان نے یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا تھا کہ اس کی عمر زیادہ ہے۔ جب مرد کا دل بھر جاتا ہے تو وہ اسے پرانی اور عمر والی سمجھ کر دوسری کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ نازنین یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ بارش میں بھیگنے کا بہانہ تھا۔ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا وہ بخار کی حالت میں بھی بڑبڑاتی رہی کہ اس کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ اور وہ جوانی میں بوڑھی ہو گئی ہے۔

میں جب بھی نازنین کی موت کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے مردوں سے نفرت

ہپناٹزم ایک سائنسی علم ہے پہلے اسے جادو، نظر بندی یا مسمریزم کہتے تھے۔ اب اس کی باقاعدہ تعلیم یورپ، امریکہ اور روس میں دی جا رہی ہے۔ تم نے اردو زبان میں ایک مکمل کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے

ہپناٹزم کے عملی طریقے

اس کتاب میں اس فن کی تاریخ ہے۔ مکمل گورس ہے اور مشقیں ہیں۔ اس کے ذریعے کسی شخص پر نیند طاری کر کے اس سے ہر کام لیا جا سکتا ہے۔ اس سے ماضی کے متعلق ہر بات معلوم جا سکتی ہے اور اسے اپنا تابع فرمان بنایا جا سکتا ہے۔

قیمت ۸/۵۰ روپے

ایک اور کتاب ہپناٹزم ڈاکٹر جی ایم ناز قیمت ۸/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ نفسیات۔ ۵۔ای۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

ہو جاتی ہے۔ مجھے دل و جان سے زیادہ چاہنے والی بہن صرف اس لئے مر گئی کہ اس کی عمر کا حساب کرنے میں ناانصافی کی گئی تھی۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم چند سکوں کے عوض اپنی جوانی کا سرمایہ آپ کے حوالے کر دیتی ہیں۔ آپ تو محض عمر کا دھوکا کھا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اب تو میں جب بھی کسی کو دھوکا دیتی ہوں تو میرے اندر نازنین زندہ ہو جاتی ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ ایچ میٹر چوری ہو گیا۔ آپ کے ڈیڈی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اب کوئی دوسرا ایچ میٹر تیار نہیں ہو سکے گا۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ آپ سب آیندہ بھی عمر کا فریب کھا کر خوش ہوتے رہیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ قہقہے لگانے لگی۔ اس کے ساتھ انصار نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"دوسرا ایچ میٹر میں تیار کروں گا۔ اس کے لئے ڈیڈی نے جو فارمولا تیار کیا تھا اس فارمولے کی تفصیل میرے پاس محفوظ ہے۔"

مہ جبیں کا ہنستا ہوا چہرہ یکلخت مرجھا گیا۔ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "تم جھوٹ بولتے ہو، تمہارے پاس فارمولا نہیں ہے۔"

"جھوٹ اور سچ کا پتہ چل جائے گا۔ میرا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ڈیڈی کی قاتلہ کو اس کے عبرتناک انجام تک پہنچاؤں۔ اس کے بعد میں دوسرا ایچ میٹر بناؤں گا اور اسے سب سے پہلے تم پر آزما کر تمہارے گاہکوں کو بتاؤں گا کہ تم اپنی بہن کی طرح بوڑھی ہو۔"

مہ جبیں نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں، اندر ہی اندر دانت پیسنے لگی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ ایک کرسی کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ اس وقت اس کے دماغ میں انصار کی ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ تم اپنی بہن کی طرح بوڑھی ہو۔

وہ کرسی کا سہارا لے کر ایسے جھک گئی جیسے بوڑھی ہو گئی ہو اور وہ سچ مچ بوڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ انصار نے دونوں بہنوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ تصویریں دونوں تقریباً ہمشکل تھیں۔ لیکن نازنین عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ذرا بھدی لگتی تھی۔ وہی بھدا پن رفتہ رفتہ مہ جبیں کے چہرے اور جسامت سے ظاہر ہو رہا تھا۔

انصار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ سمجھ رہا تھا کہ مہ جبیں کچھ بدلتی جا رہی ہے۔ اپنی سابقہ جسامت سے زیادہ بھاری بھرکم ہوتی جا رہی ہے۔ نشے کے عالم میں بھی اسے ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی وہ کہانی یاد آئی جس میں وہ دو رُخی زندگی گزارتا ہے۔ وہ عام حالات میں ڈاکٹر جیکل کی حیثیت سے نارمل زندگی بسر کرتا ہے۔ اور ایک خاص حالت میں جنسی انتقامی جذبات کے تحت مسٹر ہائیڈ کا رُوپ اختیار کر لیتا ہے۔

اور وہ رُوپ بدل رہی تھی۔ اس کے اندر ایک عمر رسیدہ بہن کی جو شخصیت چھپی ہوئی تھی، وہ اُجاگر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی۔ "میں خود اپنی بہن ہوں۔ مجھے دیکھ سکتا ہے تو دیکھ لے آنکھ کے اندھے! عینک کے محتاج! میں نازنین ہوں۔"

اگر تصویر کو سامنے رکھ کر دیکھا جاتا تو وہ ہو بہو نازنین تھی۔ نازنین کے اس رُوپ میں مہ جبیں کہیں گم ہو گئی تھی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تم سب کیسے مرد ہو؟ ہماری جوانی سے کھیلتے ہو اور ہمارے بڑھاپے کا مذاق اڑاتے ہو۔ میری زندگی میں گاہک بہت آئے لیکن محبوب ایک ہی آیا۔ وہ قسمیں کھا کر کہتا تھا کہ نازنین! تم میری زندگی ہو، میری جان ہو، میرا ایمان ہو۔ لیکن جب میں عمر کی منزلیں طے کرنے لگی، میں ذرا موٹی ہونے لگی، ذرا بھدی ہونے لگی اور میرے بدن کا بستر شکن آلود ہونے لگا تو وہ دوسرے بستر کی تلاش میں مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور مجھے یہ سکھا گیا کہ مرد کے زیادہ قریب نہ جاؤ، دُور ہی دُور سے اپنی کم عمری کا یقین دلاؤ۔ وہ آنکھوں کا اندھا بن کر یقین کرے گا اور ایک رات کے تین ہزار دے گا۔ جیسا کہ آج ایک رات کے لئے تم نے مہ جبیں کو دیا ہے۔"

"بتاؤ کہاں ہے مہ جبیں؟ جسے تم نے سولہ برس کی چھوکری سمجھ کر خریدا تھا۔ اس وقت تمہارے سامنے نازنین کھڑی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مرد اور عورت دونوں ہی ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی طرح دوہری زندگی گزارتے ہیں؟ مرد اوپر سے ایماندار اور اندر سے بے ایمان ہوتا ہے۔ عورت باہر سے جوان اور اندر سے بوڑھی ہوتی ہے۔

ہم عورتوں نے تمہارے لئے ایمان کا میٹر ایجاد نہیں کیا۔ تم نے ہمارے لئے عمر کا میٹر کیوں تیار کیا ہے؟ اُس ایچ میٹر کا فارمولا کہاں ہے؟ لاؤ مجھے دو۔ اگر وہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا ہے تو میں اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ اگر اس کی ترکیب تمہارے دماغ میں ہے تو میں تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گی۔ اس دنیا کی کوئی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اس کی عمر کا حساب کرے۔ بتاؤ اسے کہاں رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ اس کی جانب بڑھی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ انصار اس کا مطالبہ پورا نہ کرے تو وہ اس کا سر توڑ دے گی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ فارمولا ڈیڈی کی ایک ڈائری میں محفوظ ہے۔ میں اپنی جان سے زیادہ اس ڈائری کی حفاظت کرتا ہوں۔ تم اس کی پرچھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکو گی۔"

وہ تیزی سے قریب آ گئی۔ انصار نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر اس کے مُنہ پر ایک اُلٹا ہاتھ جما دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا صوفے کے قریب فرش پر گر پڑا۔ وہ اتنا کمزور نہیں تھا کہ ایک عورت سے مار کھا کر گر جاتا۔ دراصل شراب نے اسے کمزور بنا دیا تھا۔ نشے کے عالم میں وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ کوئی ایک انگلی سے چھُوتا تب بھی گر پڑتا۔ اس وقت وہ فرش سے اُٹھتے ہوئے چکرا رہا تھا۔ اس نے بار بار گرتے اور سنبھلتے ہوئے اس اجنبی عورت کو دیکھا جو کتابوں کے ریک میں ڈاکٹر جیکل یوسفی کی ڈائری تلاش کر رہی تھی۔

اس نے جھلا کر کہا۔ "خبردار! میری کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔۔۔"

وہ ایک ڈائری کھول کر دیکھ رہی تھی۔ انصار کے للکارنے پر اس

نے یہ سمجھا کہ وہی اس کی مطلوبہ ڈائری ہے جسے ہاتھ لگانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ اس نے ڈائری کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر سینے سے لگا لیا۔ اس ایک چھوٹی سی کتاب میں دنیا کی تمام عورتوں کی ایک مشترکہ کمزوری چھپی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسے جلا کر راکھ کر دیتی تو رہتی دنیا تک عورتیں اس کی احسانمند رہتیں اور وہ خود اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے راز کو چھپا لیتی۔ وہ اسے سینے سے لگا کر دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ انصار نے صوفے کا سہارا لیکر اُٹھتے ہوئے پھر اُسے للکارا۔

"ٹھہر جاؤ۔ رُک جاؤ۔ وہ ڈائری لیکر نہ جاؤ۔ اس میں میرے ڈیڈی کی زندگی کے چند اوراق....."

اس کی بات پورے ہونے سے پہلے ہی وہ اس کی آواز سے دُور ہو گئی تھی۔ اس نے اتنا ہی سُنا تھا کہ "وہ ڈائری لیکر نہ جاؤ"۔ یہ سُن کر ڈائری کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ اسے کھول کر دیکھنے اور پڑھنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر موقع ملتا تب بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ایچ میٹر کی تفصیلات واضح الفاظ میں ہیں یا اشاروں میں بیان کی گئی ہیں۔ اتنا ہی سمجھ لینا کافی تھا کہ وہ اسے ڈائری لے جانے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لئے وہ اس ننھی سی ڈائری کا بوجھ اُٹھائے بھاگی چلی جا رہی تھی۔

وہ کوٹھی سے باہر آئی تو ایک کتا بھونکنے لگا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئی۔ کتا بے ضرر تھا۔ دُور ہی دُور سے بھونک رہا تھا۔ اگر کاٹنے کی عادت ہوتی تو اب تک اس پر چھلانگ لگا چکا ہوتا۔ وہ ذرا مطمئن ہو کر پھر بھاگنے لگی۔ کوٹھی کے احاطے سے باہر آتے ہی کسی نے اس پر حملہ کیا۔ حملہ آور ایک درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس سے حملہ کرنے میں ایک ذرا سی چُوک ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہاتھ بھر کی آہنی سلاخ تھی جس کا آخری سرا مُڑا ہوا تھا۔ دُور سے دیکھنے پر وہ ایک لانبی سی ہتھوڑی نظر آتی تھی۔ اُس نے اس سلاخ سے بھاگنے والی کے سر پر حملہ کیا تھا مگر وہ اتنی تیزی سے بھاگ رہی تھی کہ نشانے سے آگے نکل گئی۔ وہ حملہ کرنے والا اپنا توازن نہ سنبھال سکا تھا۔ ضرب لگانے کے زور میں زمین پر اوندھے مُنہ گر پڑا۔ مہ جبین عرف نازنین نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ کوٹھی کا کوئی ملازم اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ گرنے والا اجنبی جلدی سے اُٹھ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔

وہ ایک پتھریلی سڑک پر آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں اُن کے قدموں کی آوازیں دُور تک سُنائی دے رہی تھیں۔ دُور سے ایک دُبلا پتلا سا آدمی عینک لگائے چلا آ رہا تھا۔ اس کے شانے سے ایک کیمرہ لٹک رہا تھا۔ اس کیمرے سے ایک فلیش گن منسلک تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ایک عورت بدحواسی میں بھاگتی چلی آ رہی ہے تو اُس نے کیمرہ سنبھال لیا۔ راستے کی نیم تاریکی میں ایک جھکا کا سا ہوا اور بھاگتی ہوئی نازنین کی تصویر اُتر گئی۔ پھر اُس نے فلم کا نمبر بدلتے ہوئے اس اجنبی کو دیکھا جو ہاتھ میں آہنی سلاخ پکڑے بھاگا آ رہا تھا۔

وہ اجنبی کو کیمرے کی زد میں لانے کے لئے بیچ سڑک پر آ گیا۔ پھر اسے للکارنے لگا۔ "اے رُک جاؤ۔ خبردار۔ تم ایک عورت کو وہ کرتے ہو یعنی کہ دہشت زدہ کرتے ہو۔ تمہیں وہ نہیں آتی یعنی کہ شرم نہیں آتی....."

وہ للکارتا ہی رہ گیا مگر تصویر نہ اُتار سکا۔ اس سے پہلے ہی وہ اجنبی اسے دھکا دے کر آگے نکل گیا۔ وہ دُبلا پتلا سا فوٹو گرافر معمولی سے دھکے میں چکرا کر سڑک پر گر پڑا۔ گرنے کے باوجود اس کا کیمرہ محفوظ رہا۔ البتہ ناک پر سے عینک نکل کر اس کے قریب گر پڑی۔ فوٹو گرافر نے ذرا سر اُٹھا کر کیمرے کے ویو فائنڈر سے دیکھا تو سڑک پر پڑی ہوئی عینک نظر آئی۔ جس کا ایک شیشہ نصف کے قریب ٹوٹ گیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے اور دوسری طرف کے سالم شیشے سے وہ اجنبی ہاتھ میں آہنی سلاخ لئے بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کیمرے کے بٹن کو دبا دیا۔ ایک ساعت کے لئے بجلی سی کوند گئی۔ پھر وہ بھاگنے والا عینک کے شیشوں سے نظر آتا ہوا کیمرے میں ریکارڈ ہو گیا۔

وہ ڈیڑھ پسلی کا فوٹو گرافر اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے اُٹھ گیا۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی عینک اپنی ناک پر جمائی اور دُور سڑک کے آخری سرے پر دیکھا جہاں وہ اجنبی بھاگا جا رہا تھا۔ اُس نے فضا میں گھونسا لہراتے ہوئے کہا۔

"ابے او بیل کے بچے! مجھے وہ مار کے چلا گیا یعنی کہ سینگ مار کے چلا گیا۔ اگر تجھ میں وہ ہے تو ٹھہر جا۔ سامنے آ کر مرد کی طرح وہ کر میں تجھے وہ کر کے رکھ دوں گا۔"

لیکن اُس کی یہ ہومہ سُننے سے پہلے ہی اجنبی ایک گلی میں مُڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ فوٹو گرافر بھی تیزی سے چلتا ہوا اُس طرف جانے لگا۔ وہ دوڑ نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اس کی پسلیاں دُکھ رہی تھیں۔

دوسری طرف مہ جبین عرف نازنین بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ ڈائری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک کے کنارے آ گئی۔ وہ ڈائری اسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اُسے فوراً ہی اُٹھا کر ڈائری تک پہنچنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ اُٹھ نہ سکی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر عمر رفتہ کی جو سختی اور پژمردگی تھی، وہ شگفتگی میں بدل رہی تھی۔ جسم کے نشیب و فراز ایک البیلی دوشیزہ کے سانچے میں ڈھل رہے تھے۔ نازنین کا وجود گم ہو رہا تھا اور گم شدہ مہ جبین واپس آ رہی تھی۔ اس دوران وہ پیچھا کرنے والا اجنبی اس کے قریب آ پہنچا تھا۔ لیکن اُس نے مہ جبین کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ دوشیزہ سڑک پر ہوتی یا پھولوں کی سیج پر، اُسے کسی کی دوشیزگی سے دلچسپی نہ تھی۔ اُس نے سڑک پر پڑی ہوئی ڈائری اُٹھائی اور اسی طرح تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔

رات کے سناٹے میں فوٹو گرافر کی للکارتی ہوئی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ مہ جبین کے قریب آ کر رُک گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچنے لگا کہ

کیا کرے؟ اُس مجرم کا پیچھا کرے یا اُس بے یار و مددگار دوشیزہ سے ہمدردی۔ اُس کی دُکھتی ہوئی پسلیوں میں اب اتنا زور نہیں تھا کہ وہ بھاگنے والے کا پیچھا کرتا۔ اس وقت اُسے دوشیزہ ہی میں کشش محسوس ہوئی۔ وہ گھٹنوں کے بل اُس پر جُھک گیا۔ پھر ٹوٹی ہوئی عینک کے آر پار دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ارے یہ تو وہ نہیں ہے ــــ وہ جو بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ تو وہ تھی یعنی کہ بوڑھی تھی۔ یہ تو وہ ہے یعنی کہ جوان ہے۔"

مہ جبین سڑک پر گم صم پڑی ہوئی سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ ابھی تو انصار کی خواب گاہ میں تھی۔ پھر اس کھلی فضا میں کیسے آ گئی ہے؟ فوم کے ملائم بستر کے بجائے پتھریلی زمین پر کیسے پہنچ گئی ہے؟ پھر وہ ایک ٹوٹی ہوئی عینک پہنے اجنبی کو دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ پوری طرح ہوش میں آتے ہی اُسے اپنا پرانا مرض یاد آیا کہ کبھی کبھی اُس پر اُس کی بہن نازنین کی شخصیت حاوی ہو جاتی ہے۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ ابھی میں انصار کو پلا رہی تھی۔ اس دوران ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔

مجھے اتنا ہی یاد آ رہا ہے کہ ایچ میٹر کے متعلق کچھ باتیں ہو رہی تھیں اور مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش آ رہا۔ مجھے فوراً ہی انصار کی خواب گاہ میں واپس جانا چاہیئے۔ اگر کوئی بات بگڑی ہو تو میں اُسے بنا لوں گی۔ یوں بھی مجھ پر خواہ مخواہ ایک قتل کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ مجھے تمام شبہات سے بالاتر رہنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

یہ سوچ کر وہ اُٹھنے لگی۔ فوٹو گرافر دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ اس سڑک پر وہ کر رہی تھیں یعنی کہ سو رہی تھیں۔"

"تم کون ہو؟" مہ جبین نے بے رُخی سے پوچھا۔

اُس نے کیمرے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "میں وہ ہوں، میرا نام وہ ہے یعنی کہ جمشید۔ ایک شخص ایک عورت کے پیچھے وہ کر رہا تھا یعنی کہ بھاگ رہا تھا۔ میں اُس شخص کے پیچھے وہ کرنے لگا۔ پھر آپ کو دیکھ کر رُک گیا کیا میں آپ کی وہ کر سکتا ہوں یعنی کہ مدد کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ۔" مہ جبین نے بے دلی سے کہا۔ "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی، اچانک چکرا کر گر پڑی۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ جمشید فوٹو گرافر ہونق کی طرح دیکھتا رہ گیا۔ مہ جبین کوٹھی کا راستہ تلاش کرتی ہوئی پھر اُسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے وہ ڈائری چُرا کر بھاگی تھی۔ کوٹھی کے احاطے میں کُتے نے اُسی طرح بھونکتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ وہ جتنی تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی، اتنے ہی اطمینان سے چلتی ہوئی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ انصار اُسی طرح مدہوشی کی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ مہ جبین نے گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ اُس کی عدم موجودگی میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے؟ اُسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ کتابوں کے ریک میں کچھ کتابیں بے ترتیب نظر آئیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر انہیں ترتیب سے رکھ دیا۔ پھر وہ انصار کے پاس آئی اور اُس کے شانے کو ہولے ہولے جھنجھوڑتے ہوئے اُسے آوازیں دینے لگی پھر اُسے یاد آیا کہ وہ آواز کی پہنچ سے دُور چلا گیا ہے کیونکہ وہ اُسے کئی پیگ پلا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، اس کے بعد اُس نے بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ اپنے نازک بدن کو لباس سے آزاد کر دیا۔ ریشمی لباس فرش پر بکھر گیا اور وہ انصار کے پہلو میں آ کر لیٹ گئی۔ اُس نے نشے کی حالت میں بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی۔ ایک ذرا سی آنکھ کھول کر اُس نے حسنِ عریاں کو دیکھا، اپنے بازو اُس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ اس کے بعد نشے کے بوجھ سے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ خراٹے لینے لگا ــــ بلا سے خراٹے لیتا رہے۔ دوسری صبح مہ جبین یہ ثابت کر سکتی تھی کہ اُس کے گاہک نے تین ہزار روپے وصول کر لئے ہیں۔

دوسری صبح جب انصار کی آنکھ کھُلی تو وہ بہت دیر تک اپنے قریب نازک بدن کی نرمی و گرمی کو محسوس کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھنے لگا کہ اُس کے پہلو میں مہ جبین ہے۔ اُس نے تین ہزار میں اُس کی ایک رات کا سودا کیا تھا اور اب وہ رات گزر چکی ہے۔ پچھلی رات کی تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ اس حد تک یاد آیا کہ وہ مستی کے عالم میں اُسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ مہ جبین کب اور کیسے اُس کی آغوش میں بے لباس ہو گئی تھی۔ شرابی مدہوش ضرور ہوتا ہے لیکن ذہنی طور پر بالکل ہی اُلو کا پٹھا نہیں ہوتا۔ نشے کے باوجود اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ اُس کے سامنے کیا کچھ ہو رہا ہے ــــ تب اُسے یاد آیا کہ پچھلی رات مہ جبین عمر کے معاملے میں اُس سے جھگڑا کر رہی تھی ــــ لیکن نہیں وہ مہ جبین تو نہیں تھی، وہ کوئی دوسری عورت تھی۔ مجھے عینک کے بغیر اچھی طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر منظر دھندلایا ہوا بھی ہو، تب بھی اتنا تو پتہ چل ہی جاتا ہے کہ منظر بدل گیا ہے یا شخصیت بدل گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ شخصیت بدل گئی ہے۔ وہ یقیناً کوئی دوسری عورت تھی جو میرے ڈیڈی کی ڈائری طلب کر رہی تھی۔ شاید وہی میرے ڈیڈی کی قاتلہ تھی۔ کاش کہ میں واضح طور پر اُس کا چہرہ دیکھ سکتا۔ اس شراب نوشی کی عادت نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ میں اپنی عینک تلاش کر کے اُسے پہچان سکتا اور اُسے گرفت میں لے کر قانون کے حوالے کر سکتا۔ لیکن اُس وقت مہ جبین تو ہوش میں تھی۔ اُس نے تو اُس عورت کو ضرور دیکھا ہو گا۔ تعجب ہے کہ اُس وقت مجھے مہ جبین کا خیال نہیں آیا ــــ کہاں چلی گئی تھی وہ؟

وہ دیر تک سوچتا رہا۔ کچھ باتیں اُس کی سمجھ میں آئیں اور کچھ باتوں نے اُسے اُلجھا دیا۔ یہ اُلجھنیں مہ جبین دُور کر سکتی تھی لہٰذا اُسے نیند سے بیدار کرنے کے لئے اُس کے بدن کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ پھُول کو پھُول کی سی نزاکت سے چھُونا چاہیئے۔ اُسی نزاکت سے اُس کے ہاتھ بھٹکنے لگے اور وہ ہولے ہولے اُبھرنے لگی، یہ دھیرے دھیرے ڈھلنے

لگا۔ وہ آنکھیں کھول کر انگڑائی لینے لگی۔ نیند میں ڈوبی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے شراب کے بھولے ہوئے نشے کو یاد دلانے لگی۔ شراب کی بوتل خالی ہو چکی تھی، شباب کی بوتل لبریز تھی۔ لیکن وہ ایک گھونٹ بھی نہ پی سکا۔ اُسی وقت دروازے پر دستک سُنائی دی۔

مہ جبین جلدی سے اُٹھ بیٹھی اور فرش پر سے اپنا لباس اُٹھا کر پہننے لگی۔ انصار نے جھلا کر دروازے کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

بند دروازے کے باہر سے ملازم نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب ملنے آئے ہیں۔"

انصار طوعاً و کرہاً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ کبھی خوابگاہ سے باہر نہ جاتا۔ لیکن باپ کے قتل کے سلسلے میں انسپکٹر سے مل کر یہ جتانا تھا کہ وہ باپ کی خاطر ایک حسینہ کی آغوش سے نکل کر آگیا ہے۔ اُس نے خواب گاہ سے جانے سے پہلے مہ جبین کو حسرت سے دیکھا اور کہا۔

"دل کی حسرت دل میں ہی رہ گئی اور رات یُوں ہی گزر گئی۔"

"یُوں ہی کیسے گزر گئی؟" مہ جبین نے ایک ادائے ناز سے شکایتاً کہا۔ "آپ نے تو رات بھر مجھے خوب پریشان کیا۔ پینے کے بعد آپ لوگوں کو اتنا ہوش نہیں رہتا کہ کیسے ایک نازک سی عورت کو درندے کی طرح بھنبھوڑتے رہتے ہیں۔"

انصار پھر اُلجھ گیا۔ اُسے گہری نظروں سے تاڑنے لگا کہ وہ کہاں تک درست کہہ رہی ہے۔ بعض مرد عورت کی زبان سے اپنی مردانگی کی تعریف سُن کر خوش ہو جاتے ہیں اور مہ جبین اُسے درندہ کہہ کر اُس کی مردانگی کا اعتراف کر رہی تھی۔ جب عورت ہار مانتی ہو تو انصار جیسے مرد اپنے اوپر لادی ہوئی جیت سے انکار نہیں کرتے۔ وہ خوش ہو کر مُسکرانے لگا۔ پھر اُس کا ذہن دوسری عورت کی طرف بھٹک گیا۔ اُس نے پوچھا۔

"کیا پچھلی رات یہاں کوئی عورت آئی تھی؟ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تھوڑی دیر کے لئے تمہیں بھول گیا تھا یا تم میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں اور میں اس کمرے میں کسی دوسری عورت کو دیکھ رہا تھا۔"

"دوسری عورت ——!" مہ جبین نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔ "کیا یہاں کوئی دوسری عورت بھی آئی تھی؟ پتہ نہیں آپ جیسے مرد کتنے بھوکے ہوتے ہیں۔ نجانے ایک رات میں کتنے شکار کھیلتے ہیں اور اُلٹا مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ یہاں میری کوئی سگی آئی تھی یا نہیں؟"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے مہ جبین! میں نے تمہارے علاوہ کسی دوسری عورت کو یہاں نہیں بلایا تھا۔ لیکن یہاں کوئی دوسری ضرور آئی تھی۔ وہ کتابوں کے ریک سے ایک ڈائری نکال کر لے گئی ہے۔ میں نشے میں لڑکھڑا رہا تھا اس لئے اُسے روک نہ سکا۔ مگر ایسے وقت تم کہاں تھیں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کس عورت کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تمام رات آپ کے ساتھ رہی۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی عورت کو دیکھیں اور میں اُسے نہ دیکھ سکوں —— ہاں یاد آیا، میں آدھے گھنٹے کے لئے باتھ روم میں گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس دوران یہاں آئی ہو۔"

اتنے میں دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس بار انسپکٹر کی آواز آئی۔

"مسٹر انصار! میں ڈیوٹی پر ہوں، زیادہ دیر آپ کا انتظار نہیں کر سکتا۔ کیا آپ مہ جبین کو ڈرائنگ روم تک لانے کی تکلیف گوارا کریں گے؟"

"جسٹ اے منٹ۔ آپ ڈرائنگ روم میں چلیں، میں ابھی مہ جبین کے ساتھ آرہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ مہ جبین اپنی زُلفیں سنوارنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئے تو وہاں انسپکٹر کے علاوہ مس فریدہ اور حمیدہ بانو بھی اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔ انسپکٹر نے مہ جبین کی جانب ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے ان دونوں عورتوں سے کہا۔

"یہ وہی نازنین ہے جو آپ لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر کی لیبارٹری میں موجود تھی۔ اس کا اصل نام مہ جبین ہے لیکن یہ دوسروں کو اپنا نام نازنین بتاتی ہے۔ ڈاکٹر جبار یوسفی کی ڈائری میں اس کے کوٹھے کا پتہ درج تھا۔ اب آپ دونوں تصدیق کر سکتی ہیں کہ یہ وہی مہ جبین عرف نازنین ہے۔"

وہ دونوں عورتیں مہ جبین کو یوں تکنے لگیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پھر مس فریدہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں۔ وہ تیسری عورت یہ نہیں ہیں۔ وہ تو کوئی اچھی خاصی عمر والی عورت تھی۔"

حمیدہ بانو نے بھی اُس کی تائید کی۔ "انسپکٹر صاحب! مس فریدہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اگر ان کا نام نازنین ہے تو پھر یہ کوئی دوسری نازنین ہیں۔ میں آج پہلی بار انہیں دیکھ رہی ہوں۔"

انسپکٹر مایوسی سے اس کا مُنہ تکنے لگا۔ نازنین کا نام سُن کر انصار کو خیال آیا کہ پچھلی رات اُس کے کمرے میں جو دوسری عورت آئی تھی اُس کا چہرہ اگرچہ دھندلایا ہوا تھا تاہم وہ مہ جبین کی ہمشکل معلوم ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس کی بڑی بہن نازنین ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ تو ایک سال پہلے ہی مر چکی تھی۔ اُس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"کیا آپ نے اُس ڈاکٹر سے ملاقات کی تھی جس نے ایک سال پہلے نازنین کا علاج کیا تھا؟"

"جی ہاں۔ میں نے اُس ڈاکٹر سے بھی ملاقات کی تھی اور اُس رئیس آدمی سے بھی جس کے پاس نازنین آخری بار داشتہ رہ چکی تھی۔ اُن دونوں نے اس کی موت کی تصدیق کی ہے۔"

انصار سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اُس نے آہستگی سے کہا۔

"وہ مر چکی ہے لیکن کل رات میں نے اُسے اپنی خواب گاہ میں دیکھا تھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی لگا کہ وہ نازنین ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی آپ نے لیبارٹری کے دروازے پر کسی عورت کو دیکھا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ وہ عورت مہ جبین ہے۔ اُس وقت آپ نے عینک نہیں لگائی تھی۔ کیا پچھلی رات آپ نے عینک لگا کر دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ میں عینک کہیں رکھ کر بھُول گیا تھا۔ دراصل نشے کے وقت مجھے یاد نہیں رہتا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔"

"آپ کی آنکھوں پر عینک نہیں تھی اور آپ نشے میں تھے۔ نشے کی حالت میں آپ نازنین جیسی ایک عورت تو کیا دس عورتیں دیکھ سکتے ہیں۔"

"لیکن انسپکٹر! میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ میری خواب گاہ میں آئی تھی۔ وہ کتابوں کے ریک سے میرے ڈیڈی کی ایک پرانی ڈائری لے گئی ہے۔ اُس بیوقوف عورت نے سمجھا تھا کہ ڈائری میں ایج میٹر کی تفصیلات درج ہیں لیکن اُسے مایوسی ہو گی۔ اُس ڈائری میں میرے ڈیڈی کی زندگی کے صرف واقعات درج ہیں، عورتوں کے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

اس بات پر وہ دونوں ڈائری کی چوری پر بحث کرنے لگے۔ بڑی دیر کی بحث کے بعد انسپکٹر اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈائری چرائی نہیں گئی ہے بلکہ انصار اپنی عینک کی طرح اس ڈائری کو بھی کہیں رکھ کر بھُول گیا ہے۔ عینک تو مل گئی ڈائری نہیں ملی۔ جب ڈائری مل جائے گی تو انصار یہ سوچنا چھوڑ دے گا کہ اُس کے بند کمرے میں کوئی دوسری عورت آئی تھی۔ مہ جبین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے انسپکٹر صاحب! کہ ہم عورتوں کی عمر کو ناپنے تولنے والے ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب اُن کے صاحبزادے نشے کی حالت میں بیک وقت مختلف عمر کی عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ میں اُسی خواب گاہ میں موجود تھی، مجھے کوئی نظر نہیں آئی۔ انہوں نے پہلے مجھ جیسی جوان عورت کو دیکھا۔ اس کے بعد میری عمر رسیدہ بہن نازنین کو دیکھنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ دراصل عورتوں کی بڑھتی اور گھٹتی ہوئی عمر مردوں کے حواس پر چھائی ہوئی ہے اس لئے انصار صاحب نشے میں عورتوں کی عمر کا موازنہ کرتے ہیں یعنی کہ چشمِ تصور میں دیکھتے ہیں لیکن افسوس کہ عینک کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ اگر دیکھتے بھی ہیں تو دیکھتے کسی کو ہیں اور پہچانتے کسی کو ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان کی طرح ہر مرد کی نظر کمزور ہوتی۔ اس طرح ہر عورت دھندلی دھندلی سی نظر آتی اور کوئی ان کی صحیح عمر تک نہ پہنچ سکتا۔"

"ہر عورت کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ مرد اگر آنکھ کا اندھا نہ ہو تو عقل کا اندھا ضرور ہو۔ مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہیں ہوتی۔ وہ عورت جو ڈائری چُرا کر لے گئی ہے اُسے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اصل ڈائری میرے پاس محفوظ ہے میں اُس کی مدد سے نیا ایج میٹر بناؤں گا۔" ایسا کہتے وقت وہ سوچ رہا تھا، کاش اس کے پاس ایسی کوئی ڈائری موجود ہوتی ——۔۔۔

روزنامہ "ہلچل" کے ایڈیٹر طارق محمود کو ہلچل مچا دینے والی سُرخیاں لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ پچھلے دنوں ایج میٹر کی چوری اور ڈاکٹر جبار یوسفی کے قتل پر اس نے تہلکہ مچا دینے والے کالم لکھے تھے۔ اُس روز کے اخبار کو عورتوں نے زیادہ پڑھا تھا۔ مضمون عورتوں کی حمایت میں تھا۔ اُس عورت کے حوصلے کو بھی سراہا گیا تھا جو ایج میٹر چُرا کر لے گئی تھی۔ طارق محمود نے لکھا تھا کہ اُس تیسری عورت نے ڈاکٹر کو جان بُوجھ کر قتل نہیں کیا تھا۔ وہ عورت اپنی اور تمام دنیا کی عورتوں کی توہین برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اس لئے وہ ڈاکٹر سے ایج میٹر چھین کر لے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ اسی کشمکش میں وہ زخمی ہو گیا۔ وہ عورتوں کی ڈھلکی چھُپی عمر تک پہنچنے والا خود عمر رسیدہ تھا۔ اتنا بوڑھا تھا کہ معمولی سے زخم کی بھی تاب نہ لا سکا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اُس نے دَم توڑ دیا تھا۔

طارق محمود اچھی طرح سمجھتا تھا کہ عمر کے معاملے میں اگر اُس نے عورتوں کی حمایت کی تو اُس کے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔ اس سلسلے میں اُسے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ملک کے گوشے گوشے سے عورتوں کے ٹیلیگرام اور خطوط آئے تھے۔ ان میں طارق محمود کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور اُسے یقین دلایا گیا تھا کہ روزنامہ "ہلچل" ان کا محبوب اخبار ہے۔ انجمن اتحاد الخواتین کی سیکریٹری اور صدر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس اخبار کو ملک کی ہر پڑھی لکھی خاتون تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔ انجمن کی طرف سے انہوں نے اخبار کی اشاعت کو مزید بڑھانے کے لئے پچیس ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔ اس طرح وہ اخبار خواتین کے لئے مخصوص ہو کر اچھا خاصا منافع دے رہا تھا۔

اس روز بھی طارق محمود اپنے دفتر میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ ایج میٹر کی مخالفت میں اور خواتین کی حمایت میں کوئی دھماکہ خیز کہانی تراشنا چاہیئے۔ جسے پڑھنے کے بعد اس اخبار سے عورتوں کی دلچسپی اور بڑھ جائے —— وہ سوچ رہا تھا اور لکھ رہا تھا۔ اسی وقت پولیس انسپکٹر وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا۔

"مسٹر طارق محمود! آپ اُس عورت کی حمایت میں کالم کیوں لکھتے ہیں جس نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو ہلاک کیا ہے؟"

طارق محمود نے جواباً پوچھا۔ "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کسی عورت نے ڈاکٹر کو ہلاک کیا ہے؟ کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟ ڈاکٹر جبار یوسفی نے اُسے اپنی لیبارٹری میں بلایا تھا۔ یقیناً لیبارٹری میں اس کا نام اور پتہ موجود ہوگا۔ میں کل کے اخبار میں یہ لکھنے والا ہوں کہ وہ عورت قاتلہ نہیں ہے۔ پولیس والے محض شُبہ کی بنا پر اُس کے خلاف ثبوت تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی لئے اب تک کسی اخبار والے کو اس کا نام اور پتہ بتایا نہیں گیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ اخبار والے ذرا سی نمک مرچ لگا کر بارہ مسالے کی چاٹ بنا دیتے ہیں۔ خصوصاً آپ اس فن میں ماہر ہیں۔ اسی لئے عورتیں آجکل بڑی دلچسپی سے آپ کا اخبار پڑھتی ہیں۔ مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ تصویر کا دوسرا رُخ نہیں دیکھتے ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ ہم پولیس والوں کی مجبوریوں کو بھی سمجھا کریں۔ ہمیں ایک معمولی سے کیس میں بھی بعض اوقات بہت بڑی اُلجھنوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب یہی

بقیہ

دیکھئے کہ ڈاکٹر صاحب کی ڈائری میں اس تیسری عورت کا نام نازنین لکھا ہوا ہے۔ وہ کوٹھے کی رہنے والی ہے۔ اس ڈائری کے مطابق نازنین ڈاکٹر کی لیبارٹری میں آئی تھی اور تمہاری تحقیقات کے مطابق وہی نازنین ایک سال پہلے ہی مر چکی ہے۔"

طارق محمود نے چونک کر انسپکٹر کو دیکھا۔ پھر جلدی سے کاغذ اور قلم کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "ذرا ٹھہریئے۔ مجھے کل کے اخبار کے لئے ایک ہلچل مچا دینے والی سُرخی مل گئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ سُرخی لکھنے لگا۔ "بازارِ حسن کی نازنین کی رُوح نے ڈاکٹر جبار یوسفی کو قتل کیا ہے۔"

انسپکٹر نے اس سُرخی کو پڑھنے کے بعد کہا۔ "میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا ہے کہ نازنین کی رُوح نے ڈاکٹر کو قتل کیا ہے۔"

"آپ نے یہ نہیں کہا۔ لیکن کہنے کا انداز یہی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ ایک سال پہلے مر چکی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ نازنین کی رُوح ڈاکٹر کی لیبارٹری میں گئی۔ ڈاکٹر کو اپنا نام اور پتہ بتایا' اس سے ایچ میٹر چھین لیا اور اسے قتل کر کے رخصت ہو گئی۔ قانون کے ہاتھ زندہ مجرموں تک پہنچ سکتے ہیں لیکن کسی مجرم رُوح تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے کل کے اخبار کے لئے بہت ہی دلچسپ مواد فراہم کیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "کمال ہے آپ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا رہے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نازنین کی رُوح آئی تھی۔ ہمیں اس کی چھوٹی بہن مہ جبین پر شُبہ ہے۔ وہ نازنین کی ہمشکل ہے۔ یہ دیکھئے' یہ دونوں بہنوں کی تصویریں ہیں۔ دونوں کے چہروں میں صرف عمر کا فرق ہے۔ مہ جبین کم عمر نظر آتی ہے' نازنین عمر رسیدہ ہونے کے باعث موٹی اور بھدّی دکھائی دیتی ہے۔"

طارق محمود تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا لیبارٹری میں آنے والی دوسری دو عورتوں نے مہ جبین کو مجرمہ کی حیثیت سے پہچان لیا ہے؟"

"نہیں — وہ دونوں کہتی ہیں کہ لیبارٹری میں مہ جبین نہیں آئی تھی۔ نازنین کی تصویر دیکھ کر بھی یہی کہتی ہیں کہ وہاں نازنین نہیں آئی تھی۔ بہرحال ایک مُردہ عورت کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مہ جبین پر صرف اس لئے شُبہ کر رہا ہوں کہ وہ دوسروں کو اپنا نام نازنین بتاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے ڈاکٹر کو بھی یہی نام بتایا ہو۔ میرے خیال میں وہ لیبارٹری میں آئی' وہاں اُن دو عورتوں کو اپنی رازدار بنایا' ڈاکٹر کو زخمی کیا اور ایچ میٹر لے کر چلی گئی۔ وہ دو عورتیں محض اس لئے اسے پہچاننے سے انکار کر رہی ہیں کہ اس نے ایچ میٹر چُرا کر دنیا کی تمام عورتوں پر احسان کیا ہے۔"

"یہ محض آپ کے خیالات ہیں۔ ویسے میں آپ کے خیالات بھی شائع کروں گا لیکن آپ کسی طرح یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ وہ دو عورتیں مہ جبین کو قانون کی گرفت سے بچا رہی ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر سے جمشید فوٹو گرافر کی آواز سُنائی دی۔ "کیا مجھے اندر آنے کی وہ مل سکتی ہے یعنی کہ اجازت مل سکتی ہے؟"

طارق محمود نے ناگواری سے کہا۔ "آج پھر پور کرنے آ گئے ہو۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے اخبار میں تمہاری اوٹ پٹانگ تصویریں شائع نہ ہو سکیں گی۔ اخبار میں ایسی تصویریں شائع ہوتی ہیں جن میں تھرلنگ اور سسپنس ہو۔ فوٹو گرافر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایسی تصویریں اُتارتے ہیں۔"

جمشید نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "پچھلی رات میں نے بھی اپنی وہ ہتھیلی پر رکھ کر وہ اتاری ہیں — یہ دیکھئے۔" اس نے ایک لفافے سے ایک تصویر نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا اخبار عورت کی وہ پر بہت کچھ لکھتا ہے یعنی مظلومیت پر بہت کچھ لکھتا ہے۔ کل رات ایک مظلوم عورت ایک ظالم مرد سے وہ بچا کر یعنی کہ عزت بچا کر بھاگ رہی تھی۔ اسی وقت میں نے اُس کی وہ اُتار لی یعنی کہ یہ تصویر اُتار لی۔۔۔۔۔۔"

طارق محمود ہاتھ میں تصویر لے کر دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اُس نے حیرت سے کہا۔ "ارے یہ تو نازنین کی تصویر ہے۔"

"نازنین!" انسپکٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میز پر جھک کر اُس تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس میں کسی شُبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ جمشید مُردہ نازنین کی تصویر اُتار کر لے آیا تھا۔ لیکن تصویر میں وہ مُردہ نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ڈائری کو تھامے اور اُسے سینے سے لگائے بدحواسی میں بھاگی جا رہی تھی۔ بھاگنے کے دوران ہی جمشید نے تصویر اُتار لی تھی۔ انسپکٹر نے جمشید سے پوچھا۔

"کیا یہ تصویر تم نے پچھلی رات اُتاری ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو' یہ عورت ایک سال پہلے ہی مر چکی ہے پھر تم نے اس کی تصویر کیسے اُتار لی؟"

"اب میں کیا بتاؤں وہ تصویر اُتارتے وقت وہ نہیں تھی یعنی مُردہ نہیں تھی۔ اگر وہ ہوتی تو زندہ وہ کی طرح بھاگتی ہوئی نظر نہ آتی۔ یہ تصویر اس بات کا وہ ہے۔"

طارق محمود اب تک اُس تصویر کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے انسپکٹر سے کہا۔ "جمشید ٹھیک کہتا ہے۔ اگر آپ کی تحقیقات کے مطابق وہ ایک سال پہلے مر چکی ہے تو پھر اُس کی موت ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی۔ اب اس تصویر کو دیکھئے اس میں نازنین نے جو ڈائری پکڑی ہوئی ہے اُس پر جلی اعداد میں ۱۹۷۶ء لکھا ہوا ہے۔ اس تصویر کے مطابق یہ اپنی موت کے ایک سال بعد سالِ رواں کی ڈائری لئے بھاگ رہی ہے۔"

انسپکٹر اس تصویر کو لے کر دوبارہ توجہ سے دیکھنے لگا۔ واقعی تصویر میں نازنین سالِ رواں کی ڈائری تھامے ہوئے تھی۔ اُس نے

جمشید سے پوچھا۔ "تم نے کل رات اُسے کہاں دیکھا تھا؟"

"گلبرگ کے علاقے میں وہ تیرہ نمبر کی وہ ہے نا۔ وہاں بھاگی جا رہی تھی۔"

انسپکٹر نے جھلا کر پوچھا۔ "یہ وہ کیا چیز ہے؟ تم سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے۔"

"وہ دراصل میرا وہ ہے یعنی کہ تکیہ کلام۔ میں دراصل وہ کہہ رہا تھا کہ وہ تیرہ نمبر کی گلی میں بھاگی جا رہی تھی۔"

انسپکٹر بڑبڑانے لگا۔ "گلبرگ — تیرہ نمبر کی گلی — انصار یوسفی کی کوٹھی بارہ نمبر میں ہے اور وہ تیرہ نمبر کی گلی میں دیکھی گئی ہے۔ انصار کا بیان ہے کہ پچھلی رات اُس نے اپنی خواب گاہ میں نازنین کو دیکھا تھا۔ وہ کتابوں کے ریک سے ڈائری لیکر بھاگی تھی اور اس تصویر میں بھی نازنین کے ہاتھوں میں ڈائری ہے۔ اس طرح واقعات کا یہ تسلسل قائم ہوتا ہے کہ نازنین سچ مچ انصار کی خواب گاہ میں گئی تھی۔ وہاں سے وہ ڈائری لیکر بھاگتی ہوئی بارہ نمبر کی گلی سے نکل کر تیرہ نمبر کی گلی سے گزر رہی ہے۔ میں نے انصار کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا کیونکہ اُس نے بغیر عینک سے اُسے دیکھا تھا۔ اب سوچنا پڑتا ہے کہ نازنین زندہ ہے' وہ ایچ میٹر چُرانے اور ڈاکٹر کو ہلاک کرنے کے بعد کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ اُس کی موت کی تصدیق کرنے والے سب جھوٹے ہیں۔ مہ جبین پر میرا شُبہ غلط تھا۔ اُس کا جُرم صرف اتنا ہے کہ اُس نے بہن کے متعلق غلط بیان دیا ہے۔ اب میں نئے سرے سے اس کیس کو ہینڈل کروں گا۔"

وہ نازنین کی تصویر لیکر دفتر سے جانے لگا۔ جمشید نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جناب میں نے اپنی وہ ہتھیلی پر رکھ کر نازنین کی وہ اتاری ہے یعنی کہ تصویر اُتاری ہے۔ مجھے اس کا وہ ملنا چاہیئے یعنی کہ معاوضہ ملنا چاہیئے۔"

انسپکٹر نے اُس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"تم نے اس کیس میں میری بہت بڑی مدد کی ہے۔ تمہیں معاوضہ بھی ملے گا اور انعام بھی — آیندہ اس قسم کی جب بھی تصویر اتارو سیدھے میرے پاس لے آؤ۔ تمہاری اچھی خاصی آمدنی ہو جایا کرے گی۔"

جمشید نے خوش ہو کر لفافے سے دوسری تصویر نکالتے ہوئے کہا۔

"خدا آپ کو وہ نصیب کرے۔ اس سلسلے کی ایک اور وہ ہے یعنی کہ تصویر ہے۔ یہ دیکھئے۔۔۔۔۔۔"

انسپکٹر نے تصویر کو ہاتھ میں لے کر دیکھا وہ ایک ٹوٹی ہوئی عینک کا کلوز اپ تھا۔ عینک کے شیشوں میں ایک بھاگتا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ اُس نے دائیں ہاتھ میں ایک لوہے کی سلاخ تھام رکھی تھی۔ بھاگنے کا ایکشن یوں تھا کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا صرف پشت نظر آ رہی تھی۔

جمشید نے کہا۔

"یہ شخص نازنین کا وہ کر رہا تھا۔ میں نے سامنے سے اُس کی تصویر اتارنی چاہی لیکن اُس نے مجھے زور سے وہ دے کر سڑک پر گرا دیا اور آگے نکل گیا۔ کیمرہ پیچھے رہ گیا اس لئے تصویر میں اس کی وہ نظر آ رہی ہے یعنی کہ پشت نظر آ رہی ہے۔"

انسپکٹر تصویر کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے۔ جس طرح یہ آہنی سلاخ لئے بھاگ رہا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نازنین کو ہلاک کرنا چاہتا ہے یا اُس سے کچھ چھیننا چاہتا ہے — کیا وہ ڈائری چھیننا چاہتا تھا؟ اس کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا تو ڈائری کی اہمیت واضح ہو گئی۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اُس ڈائری کو کوئی مرد بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورتوں کی عمر سے مردوں کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ کوئی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا اُسی ڈائری کی خاطر نازنین کا پیچھا کر رہا تھا جس کے ذریعے عورتوں کی گھٹتی بڑھتی عمر کا راز فاش ہوتا ہے۔

وہ آہنی سلاخ والا ایک صوفے پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اُس کے سامنے والے صوفے پر ایک چھوٹے سے قد کا گینڈے نما انسان بیٹھا ہوا ڈائری کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ پہلے صفحے سے لیکر آخری صفحے تک ڈائری کو کھنگالنے کے بعد اُس نے جھلا کر اُسے ایک طرف پھینک دیا پھر سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو غصّے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا اُٹھا لائے ہو؟ اس میں ایچ میٹر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔"

"جناب! انصار اُس عورت سے یہی کہہ رہا تھا۔ آپ کے حکم کے مطابق میں انصار کا پیچھا کر رہا تھا۔ آپ کے خیال کے مطابق وہ تیسری عورت مہ جبین تھی جو ایچ میٹر لے کر فرار ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اُس سے ایچ میٹر چھین لوں گا یا پھر اُسے اٹھا کر لے آؤں گا لیکن وہاں ڈائری کی بات نکل پڑی۔ میں خواب گاہ کے باہر کھڑکی سے لگا کھڑا تھا۔ کھڑکی بند تھی لیکن اس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اندر کا پردہ ذرا سرکا ہوا تھا۔ باہر سے دیکھنے پر خواب گاہ کا وہ حصّہ نظر آ رہا تھا جہاں مہ جبین اُسے دھمکی پلا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نشے میں بہکنے لگا۔ مہ جبین کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے اِدھر سے اُدھر لڑکھڑانے لگا۔ مہ جبین اُس سے کتراتی ہوئی' پیچھے ہٹتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ اُن کے درمیان کس طرح ڈائری کی بات شروع ہوئی۔ انصار کہہ رہا تھا کہ ایک ڈائری میں ایچ میٹر تیار کرنے کی تمام تفصیلات لکھی گئی ہیں۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مہ جبین پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے میں انصار سے وہ ڈائری حاصل کروں گا۔ اتنے میں مجھے اس خواب گاہ میں کسی دوسری عورت کی آواز سُنائی دی۔ پتہ نہیں مہ جبین کہاں چلی گئی تھی۔ وہ بڑے غصّے سے عمر کے موضوع پر باتیں کر رہی تھی۔ پھر اُس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انصار کے مُنہ پر طمانچہ رسید کیا۔ وہ مدہوشی میں لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ اُس وقت میں نے اس عورت کو دیکھا کیونکہ وہ خواب گاہ کے اُس حصّے میں آ گئی تھی جو مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ عورت

مہ جبین کی ہمشکل تھی لیکن مہ جبین نہیں تھی۔ کیونکہ مہ جبین جوان ہے اور وہ عورت بوڑھی تھی۔ جسمانی لحاظ سے موٹی اور بھدی تھی۔ وہ انصار کو زمین پر گرانے کے بعد کتابوں کے ریک سے ایک ڈائری نکال کر کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ میں فوراً ہی دوڑتا ہوا کوٹھی کے احاطے سے باہر آگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ جیسے ہی وہ باہر نکلے گی میں زخمی کر کے اس سے ڈائری چھین لوں گا۔"

اس گینڈے نما شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بس کرو اتنی لمبی چوڑی کہانی سنانے کا فائدہ کیا ہے۔ وہ ڈائری یہ نہیں ہے جسے تم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انصار نے اصل ڈائری کہیں چھپا کر رکھی ہے۔ اس ڈائری کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں انصار کی کمزوریوں سے کھیلنا ہوگا۔ وہ عورت اور شراب کا رسیا ہے ہم اسے شراب ——— اور شباب میں الجھا کر ہی ڈائری حاصل کر سکتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر کار کا ہارن سنائی دیا۔ آہنی سلاخ والا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور باہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جناب! مادام روزینہ آئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم باہر جاؤ اور مادام کو یہاں بھیج دو ——— اور سنو، کیا مادام نے ایچ میٹر کے متعلق تم سے کچھ پوچھا تھا؟"

"جی ہاں، میں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ وہ تیسری عورت ہماری نظروں میں ہے، ہم بہت جلد اس سے ایچ میٹر چھین لیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

وہ چلا گیا، تھوڑی دیر بعد مادام روزینہ اپنی ساڑی کے آنچل کو سنبھالتی، اٹھلاتی لہراتی اور تبسم کی بجلیاں گراتی اس کے سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"نادر صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں کتنی مصروف رہتی ہوں، بار بار یہاں نہیں آسکتی، آپ نے کہا تھا کہ فون پر باتیں کریں گے۔ میں ساری رات اپنے سرہانے فون رکھے آپ کی کال کا انتظار کرتی رہی، مگر آپ کی کال نہیں آئی، مجھے ہی آنا پڑا۔"

"مادام! آپ ساری رات میری کال کے انتظار میں جاگتی رہیں اور میں ساری رات آپ کے حکم کے مطابق مہ جبیں کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ پچھلی رات انصار کی خواب گاہ میں تھی، میرا ایک آدمی اسے ہلاک کرنے گیا تھا لیکن اس کی خواب گاہ میں دوسری عورت چلی آئی، پھر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مہ جبیں کہاں چلی گئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مادام روزینہ نے پوچھا۔ "مہ جبیں خواب گاہ سے کہاں جا سکتی ہے، آپ کے آدمی نے اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟"

"میرے آدمی نے اس لئے مہ جبیں کا پیچھا نہیں کیا کہ اس دوسری عورت کی اہمیت اس سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک ایسی ڈائری چرا کر بھاگ رہی تھی، جس میں ایچ میٹر تیار کرنے کی تفصیلات درج تھیں۔"

"اچھا۔" مادام نے ذرا سنبھل کر دلچسپی سے پوچھا۔ "کیا واقعی انصار کے پاس ایسی کوئی ڈائری ہے؟"

"تعجب ہے مادام کہ آپ کسی ایسی ڈائری کے متعلق نہیں جانتی ہیں جبکہ آپ ڈاکٹر جبار یوسفی کی بیوہ ہیں، آپ کو اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کے سوتیلے بیٹے نے آپ سے کیا کچھ چھپا رکھا ہے؟"

"آپ اسے میرا بیٹا نہ کہیں، بیٹا کہنے سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ میری عمر زیادہ ہے حالانکہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں ابھی کتنی کم سن ہوں، اسی لئے میں نے کبھی اس لڑکے کا سامنا نہیں کیا، اس نے بھی آج تک مجھے نہیں دیکھا ہے لیکن اب ایک دوسرے کا سامنا ہوگا، کیونکہ مجھے اپنے مرحوم شوہر کی جائیداد سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے مگر اس سے پہلے میں مہ جبیں سے انتقام لینا چاہتی ہوں، جس نے میرے خاوند کو قتل کیا ہے، میں اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتی، اسی لئے میں نے آپ کو معاوضہ کی آدھی رقم پیشگی دی تھی، لیکن آپ نے اب تک اسے ٹھکانے نہیں لگایا۔"

"میرا آدمی اسی مقصد کے لئے گیا تھا، لیکن میں پہلے ہی یہ کہہ چکا ہوں کہ مہ جبیں اچانک ہی اس کی خواب گاہ سے لاپتہ ہو گئی تھی اور اس کی جگہ کوئی دوسری عورت آگئی تھی۔"

"یہی تو میں نے بھی پوچھا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ مہ جبیں کہاں چلی گئی؟ وہ دوسری عورت کون تھی؟ کیا آپ کے آدمی نے اس کا حلیہ بتایا ہے؟"

"ہاں۔ وہ دوسری عورت مہ جبیں کی ہمشکل تھی، لیکن کچھ بوڑھی سی نظر آتی تھی۔"

مادام روزینہ نے چونک کر کہا:

"اوہ۔ اگر وہ مہ جبیں کی ہمشکل تھی تو اسے ہی مار ڈالنا چاہئے تھا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اس دوسری عورت سے آپ کو کیا دشمنی ہے؟"

"آپ نہ پوچھیں کہ مجھے کس سے دشمنی ہے اور کیوں ہے؟ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ وہ مہ جبیں کی ہمشکل ہے، اس لئے وہی میرے خاوند کی قاتلہ ہو سکتی ہے اور وہی عورت نازنین ہو سکتی ہے جو اتنے پراسرار طریقے سے لیبارٹری میں گئی تھی کہ اس وقت مہ جبیں اور نازنین کے درمیان جو عمر کا فرق ہے وہ سمجھ میں نہیں آیا تھا، ویسے آپ کو یہ سب کچھ سمجھنے کی کیا ضرورت ہے، آپ اپنے کام سے کام رکھیں، مہ جبیں یا نازنین میں سے جو بھی ہتھے چڑھ جائے فوراً ختم کر دیجئے۔"

"اگر آپ پہلے ہی یہ بات کہہ دیتیں تو کل رات نازنین کا کام تمام ہو جاتا۔ آپ نے تو صرف مہ جبیں کو ختم کرنے کے لئے کہا تھا۔ بہرحال نازنین اس کی ہمشکل ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مہ جبیں کی بڑی بہن ہے یا اس کی ماں ہے۔ میں کوٹھے پہ جا کر اس کے متعلق معلومات حاصل کروں گا۔"

"کوٹھے پہ جانے سے آپ کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہاں نازنین نام کی کوئی عورت نہیں ملے گی، آپ کو یہی بتایا جائے گا کہ وہ ایک سال پہلے مر چکی ہے، اس کی موت کی تصدیق کرنے والے ڈاکٹر اور اس کے یار موجود ہیں۔"

"آپ اس کے متعلق بہت کچھ جانتی ہیں، آپ نے پہلے نازنین کے متعلق کچھ نہیں بتایا اور اب بھی بہت کچھ چھپا رہی ہیں۔"

"میں اتنا ہی بتاتی ہوں جتنا کہ ضروری ہوتا ہے۔"

"مادام، کسی کو قتل کرنے کے لئے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نازنین کے متعلق جو کچھ جانتی ہیں وہ مجھے بتا دیں۔ اس طرح اسے شکار کرنے میں آسانی ہوگی۔"

مادام روزینہ صوفے پر پہلو بدلتی ہوئی کچھ سوچنے لگی، پھر اس نے کہا۔

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی، وہ دونوں آپس میں بہنیں ہیں۔ وہ آپ کو کبھی ایک جگہ نظر نہیں آئیں۔ جہاں آپ مہ جبیں کو دیکھیں گے وہاں کبھی نازنین کو نہیں دیکھ سکیں گے، اگر اتفاقاً نازنین کو دیکھ لیا تو مہ جبیں نظر نہیں آئے گی۔"

"آپ تو پہیلیاں بجھوا رہی ہیں، صاف صاف بتائیے تاکہ میری سمجھ میں بھی کچھ آئے۔"

"صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ مہ جبیں اور نازنین دو الگ ہستیاں نہیں ہیں ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں، ایک جوانی کا دوسرا بڑھاپے کا۔ یہ ایک نفسیاتی کیس ہے، اسے ماہر نفسیات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ بعض اوقات عورت اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے متعلق اتنی شدت سے سوچتی ہے کہ سوچتے سوچتے وہ جسمانی طور پر تبدیل ہو جاتی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے آپ کا ذہن مشکل سے تسلیم کرے گا، اور پھر آپ کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے، آپ کو تو صرف معاوضہ لینا ہے اور قتل کرنا ہے خواہ وہ مہ جبیں ہو یا نازنین۔"

"اچھی بات ہے، آج رات مہ جبیں جہاں بھی ہو گی قتل کر دی جائے گی۔"

مادام روزینہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آج رات یہ کام ہو گیا تو صبح آپ کو معاوضے کی رقم مل جائے گی، آپ اس ڈائری کے پیچھے اپنا وقت برباد نہ کریں، اسے میں حاصل کر لوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی، نادر جیب سے سگار نکال کر سلگاتے ہوئے ایک ہی عورت کے دو روپ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا عورت اپنی عمر کے متعلق اتنی شدت سے سوچتی ہے کہ جسمانی طور پر تبدیل ہو کر کبھی نازنین کی طرح بوڑھی اور کبھی مہ جبیں کی طرح نوجوان بن جاتی ہے، یہ نفسیاتی مسئلہ نادر کے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔

انصار نے پلٹ کر دیکھا تو سامنے ایک لانبے قد کا دبلا پتلا سا آدمی اپنی بتیسی نکالے کھڑا تھا، اس کے شانے سے کیمرہ لٹک رہا تھا، اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام وہ ہے، میں آپ سے بہت ضروری وہ کرنے آیا ہوں۔"

انصار حیرانی سے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھنے لگا، اس کی حیرانی دیکھ کر اس نے کہا:

"شاید آپ نہیں سمجھے، میرا نام وہ ہے، وہ یعنی جمشید ہے، میں آپ سے بہت ضروری وہ —— وہ —— لاحول ولا قوۃ، میرا وہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"فرمائیے۔" انصار نے کہا۔ "آپ ایسی کونسی ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کل رات آپ کے گھر سے وہ چوری ہو گئی تھی یعنی ڈائری چوری ہو گئی تھی۔ مجھے انسپکٹر صاحب نے بتایا ہے، میں آپ کے غم میں برابر کا وہ ہوں۔"

انصار نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ڈائری کے چرائے جانے کا کوئی غم نہیں ہے۔ کیا یہی ضروری باتیں آپ کرنا چاہتے تھے؟"

"جی نہیں، اور بھی دوسری ضروری وہ ہیں۔ میں وہ ہوں یعنی فوٹو گرافر ہوں، جس عورت نے آپ کی وہ چرائی ہے، میں نے اس کی وہ اتاری ہے یعنی تصویر اتاری ہے، کیا وہ آپ دیکھنا پسند فرمائیں گے؟ یہ دیکھئے۔"

اس نے لفافے سے نازنین کی تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ تصویر کو دیکھتے ہی انصار کی دلچسپی بڑھ گئی، اسے تصویر میں مہ جبیں کا بڑھاپا نظر آرہا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ پچھلی رات اس نے نشے کی حالت میں اسی عورت کو دیکھا تھا۔ تصویر میں جو ڈائری نظر آرہی تھی وہ اس کے ڈیڈی کی تھی۔ وہ بغیر عینک کے اس ڈائری کو پہچان سکتا تھا۔ اس نے جمشید سے کہا۔

"آپ بہت کام کے آدمی ہیں۔ انسپکٹر کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی دوسری عورت میری خواب گاہ میں آئی تھی اور ڈائری چرا کر لے

بیرونی ممالک میں مقیم اُردو جاننے والوں کیلئے

نوشخبری

اگر آپ اُردو جانتے ہیں اور دُنیا کے کسی بھی حصے میں مقیم ہیں تو اُردو رسائل و جرائد سالانہ اور ششماہی خریدار کی حیثیت سے گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔ رسالے بذریعہ ہوائی ڈاک رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔ مقامی افراد بیرونی ممالک میں مقیم اپنے کسی عزیز یا دوست کو اُردو رسائل جاری کرانا چاہیں تو بخوشی سے رابطہ قائم کریں۔

تفصیلات کے لیے لکھیے

PAREKH SUBSCRIPTION AGENCY.
Post Office Box No. 567,
Karachi-1, (PAKISTAN).

گئی تھی، یہ تصویر اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ میری خواب گاہ میں آنے والی نازنین ہی تھی، وہ مردہ نہیں ہے زندہ ہے، ہمیں اب تک دھوکہ دیا جا رہا تھا۔"

"انسپکٹر صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے یہ عورت وہ نہیں ہے وہ ہے۔ یعنی مردہ نہیں ہے زندہ ہے اسی لئے وہ پھر سے تحقیقات کرنے گئے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ میری فوٹوگرافی کا دم ہے کہ ایک مردہ عورت کو وہ ثابت کر دیا۔ یعنی یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ روزنامہ ہلچل کے ایڈیٹر طارق محمود نے اس تصویر کے وہ دیئے ہیں، یعنی پچاس روپے دیئے ہیں۔ انسپکٹر صاحب نے اتنے ہی وہ دیئے ہیں اور سرکار سے وہ دلانے کا وعدہ کیا ہے، یعنی انعام دلانے کا وہ کیا ہے، اگر آپ بھی ایک تصویر وہ کر لیں تو میری وہ ہو جائے گی یعنی آمدنی ہو جائے گی، میرا پیشہ یہی ہے۔"

انصار نے اس کے شانے تھپکتے ہوئے کہا۔

"میں یہ تصویر ضرور خرید دوں گا، آؤ اندر چلو میں ابھی تمہیں پچاس روپے دوں گا۔"

جمشید اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پورچ سے گذرتا ہوا کوٹھی کے اندر ڈرائنگ روم میں آ گیا، وہ انصار کو پچھلی رات کا واقعہ بتا رہا تھا کہ ایک شخص آہنی سلاخ لئے ہوئے کس طرح نازنین کا پیچھا کر رہا تھا، اس نے بھی تصویر اتارنے کے بعد آہنی سلاخ والے کا پیچھا کیا تھا، وہ بدمعاش ڈائری لیکر بھاگ گیا، وہ مزید اس کا پیچھا نہ کر سکا کیونکہ بیچ سڑک پر ایک لڑکی اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مجبوراً رک گیا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ بھاگنے والی اور سڑک پر پائی جانے والی دونوں ہمشکل ہیں، ان کے درمیان صرف عمر کا فرق ہے، یہ بات اس لئے سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ نازنین اس کے سامنے تیزی سے بھاگتی ہوئی گذر گئی تھی۔ فوٹو پرنٹ کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ سڑک پر پائی جانے والی اس تصویر والی کی ہمشکل تھی۔

اس کی باتیں سن کر انصار سوچ رہا تھا کہ نازنین کی ہمشکل مہ جبیں ہے، اور کوئی دوسری نہیں ہو سکتی، اس نے جمشید سے پوچھا:

"کیا واقعی وہ دونوں ہمشکل تھیں؟ کیا سڑک پر پائی جانے والی نازنین کے مقابلے میں جوان تھی؟"

"جی ہاں وہ جوان تھی اور نازنین کی چھوٹی وہ تھی یہ بات مجھے روزنامہ وہ کے دفتر سے معلوم ہوئی ہے۔ انسپکٹر صاحب نے وہ صاحب کو یعنی طارق صاحب کو ان دونوں بہنوں کی تصویر دکھائی، طارق صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ کل تمام رات آپ کے یہاں تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو آپ ہی وہ کر سکتے ہیں یعنی بتا سکتے ہیں کہ مہ جبیں کل رات آپ کی اس کوٹھی سے نکل کر وہ پر کیسے پہنچ گئی تھی، یعنی سڑک پر کیسے پہنچ گئی تھی؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ میری خواب میں تھی، پھر سڑک پر کیسے پہنچ گئی، اس تصویر کو دیکھنے کے بعد یقین ہو گیا ہے کہ نازنین زندہ ہے، جب وہ ڈائری چرا کر بھاگ رہی تھی تو مہ جبیں نے بھی اس کا ساتھ دیا ہوگا۔ وہ اپنی بہن کو بحفاظت کوٹھی سے نکال کر لے گئی ہوگی، پھر کہیں ٹھوکر کھا کر گر پڑی ہوگی۔

اور ایسے ہی آپ اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔"

جمشید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، بھاگنے والی دو نہیں ایک تھی، صرف نازنین وہ کر رہی تھی یعنی بھاگ رہی تھی، میں نے مہ جبیں کو وہ کرتے نہیں دیکھا، جب میں آگے بڑھا تو اسے بیچ سڑک پر پایا۔"

انصار پریشانی سے سوچنے لگا کہ مہ جبیں سڑک پر کیسے پہنچ گئی تھی اگر وہ اپنی بہن کے ساتھ ڈائری چرا کر لے گئی تھی، تو پھر خواب گاہ میں واپس کیسے چلی آئی، وہ بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن اس الجھن کو نہ سلجھا سکا۔

کچھ دیر بعد اس نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر انسپکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگا، اس سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے نازنین کے متعلق پوچھا، انسپکٹر نے بتایا کہ نازنین جس کے زیر علاج تھی۔ وہ ڈاکٹر اور اس کے گاہک اور بازار حسن کے چیمبر مین وغیرہ سبھی اس کی تصدیق کر رہے ہیں، اس محلے کے کتنے ہی لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ نازنین کے جنازے کو کاندھا دے چکے ہیں۔ روزنامہ ہلچل کے ایڈیٹر یہ خبر شائع کرنے والے ہیں کہ ڈاکٹر جبار یوسفی کو نازنین کی روح نے ہلاک کیا ہے، سوچا جائے تو ان حالات میں یہی ایک سوال ابھرتا ہے کیا واقعی اس کی روح نے ڈاکٹر کو ہلاک کیا ہے؟

جواب میں انصار نے کہا:

"میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے، ہو سکتا ہے کہ اس تدبیر پر عمل کرنے سے مہ جبیں یا نازنین کی اصلیت سامنے آ جائے، کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے یہاں آنا پسند کریں گے؟"

انسپکٹر نے آنے کا وعدہ کر کے ریسیور رکھ دیا۔

رات کے دس بجے تھے، انصار اپنی خواب گاہ میں بیٹھا وہسکی کا دوسرا پیگ چڑھا رہا تھا، حالانکہ جو تدبیر اس نے انسپکٹر کے سامنے پیش کی تھی اس پر عمل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ شراب سے پرہیز کرتا، لیکن وہ عادت سے مجبور ہو کر پی رہا تھا۔ جمشید اس کے سامنے بیٹھا ہوا اس کا منہ تک رہا تھا۔ تدبیر کے مطابق وہاں جمشید فوٹوگرافر کی موجودگی بھی بہت ضروری تھی۔

تدبیر یہ تھی کہ مہ جبیں کو دوبارہ خواب گاہ میں بلایا جائے۔ انصار کا خیال تھا کہ مہ جبیں یا اس کی بہن نازنین اصل ڈائری حاصل کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔ اگر مہ جبیں سے پھر ایک رات کا سودا کر لیا جائے اور اسے خود ہی یہاں آنے کا موقع دیا جائے تو اس کی بہن نازنین بھی اس کے پیچھے آئے گی۔ (اگر وہ زندہ ہو)

جمشید کو اسی لئے وہاں روکا گیا تھا کہ اگر نازنین آئے تو اس کی مختلف تصویریں اتار لی جائیں۔ انسپکٹر نے کہا تھا کہ اس کے سپاہی کوٹھی کے باہر موجود رہیں گے۔ اگر نازنین یا کوئی بھی عورت ڈائری لے کر کوٹھے سے نکلے گی تو وہ اسے حراست میں لے لیں گے۔

اس رات کے لئے مہ جبیں سے سودا ہو چکا تھا، اسے پیشگی رقم دے دی گئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آدھی رات کے بعد مجرے سے فارغ ہو کر وہاں آئے گی، لیکن آدھی رات سے پہلے ہی ملازم نے بتایا کہ کوئی عورت ملنے آئی ہے، انصار نے جمشید سے کہا کہ وہ پاس والے کمرے میں چلا جائے۔ اگر خواب گاہ میں نازنین آئے یا کوئی دوسری عورت ڈائری کے سلسلے میں جھگڑا کرے تو وہ ایسے مواقع کی خاص خاص تصویریں اتار لیا کرے۔

جمشید دوسرے کمرے میں چلا گیا، اس کے جاتے ہی وہ اٹھلاتی لہراتی اور تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی خواب گاہ میں آ گئی۔ انصار مدہوش نہیں تھا۔ لیکن اتنی پی چکا تھا کہ سرور میں آ گیا تھا۔ اس نے خمار میں ڈوبی ہوئی نظروں سے آنے والی کو دیکھا تو وہ دنیا کی سب سے حسین عورت نظر آئی، نشے کی خوبی یہ ہے کہ عورت کی عمر کا پتہ نہیں چلتا، بوتل کے سامنے آ کر آدھی عمر گھٹ جاتی ہے، چالیس برس کی بڑھیا بیس برس کی حسین گڑیا نظر آتی ہے، آنے والی نے کہا۔

"میں انجمن اتحاد الخواتین کی سیکریٹری ہوں، تم سے ایچ میٹر کے متعلق باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"آؤ یہاں بیٹھو" انصار نے بڑے پیار سے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"روزینہ!" وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

انصار نے اپنے گلاس سے آخری گھونٹ پینے کے بعد کہا:

"جب میں دس برس کا تھا تو میرے ڈیڈی نے ایک جوان لڑکی سے شادی کی تھی اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہوگی، اس کا نام بھی روزینہ ہے، وہ مجھ سے اس لئے نفرت کرتی ہے کہ مجھے بیٹا کہے گی تو بہت زیادہ عمر والی سمجھی جائے گی، اسے انصار نام کے ہر نوجوان سے نفرت ہے اور میں روزینہ نام کی ہر عورت کو بوڑھی سمجھتا ہوں، لیکن تعجب ہے کہ تم بوڑھی نظر نہیں آ رہی ہو، یوں لگتا ہے کہ تم وینس کے مجسمے کی طرح صدیوں سے جوان ہو اور ایچ میٹر تمہاری جوان عمری کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

روزینہ اس کے خالی گلاس میں وہسکی انڈیلنے لگی، پھر اس نے گلاس اٹھا کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"آخر ایچ میٹر تیار کرنے کا فائدہ کیا ہے، یہ دنیا اتنی رنگین نہیں ہے ہم عورتیں اپنی عمر گھٹا کر یا جوانی کا خول چڑھا کر اسے تم لوگوں کے لئے رنگین بناتی ہیں، اگر ہماری زندگی میں تھوڑا سا جھوٹ اور فریب نہ ہو تو یہ دنیا پھیکی پھیکی اور ویران نظر آئے گی، تم جس رنگ کے شیشے کی عینک لگا کر دیکھو گے۔ آس پاس کے نظارے اسی رنگ کے نظر آئیں گے، نشے کی عینک چڑھا کر دیکھو گے تو اس دنیا کی کوئی روزینہ بوڑھی نظر نہیں آئے گی، وہ نشے کی ترنگ اور دل کی امنگ کی طرح جوان دکھائی دے گی۔"

"دیکھو، میری باتیں سمجھنے کی کوشش کرو، انسان سچائی کی تلخیوں سے گھبرا گیا ہے، وہ چھوٹے چھوٹے جھوٹ سے بہلنا چاہتا ہے، تم خود ہی کہو، اگر ایچ میٹر ابھی یہ کہے کہ میں کم عمر نہیں ہوں، بوڑھی ہوں تو کیا تم یقین کر لو گے؟"

"نہیں ــ کبھی نہیں" وہ نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔ "جو تمہیں بوڑھی کہے گا میں اس کی زبان کھینچ لوں گا، میں ایسے ایچ میٹر کو توڑ کر پھینک دوں گا جو تمہاری توہین کرے گا۔"

"تمہارے پاس ایچ میٹر نہیں ہے، وہ چوری ہو چکا ہے، تم اس ڈائری کو جلا ڈالو، جس میں ایچ میٹر بنانے کے طریقے لکھے ہیں۔"

"آں ــ ڈائری ــ نہیں ایسی کوئی ڈائری میرے پاس نہیں ہے۔"

"نشے کی حالت میں انسان سچ کہتا ہے، لیکن تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارے پاس ڈائری ہے۔"

"تمہاری قسم ایسی کوئی ڈائری نہ میرے پاس ہے نہ میرے باپ کے پاس تھی، میں نے مہ جبیں کو چڑانے کے لئے جھوٹ کہا تھا۔ اس کی بہن نازنین نے سمجھا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں، وہ ایک فضول سی ڈائری چرا کر لے گئی۔ ایک بات بتاؤں، وہ نازنین جو ایک سال پہلے مر گئی تھی، اب زندہ ہو گئی ہے اگر وہ یہاں آئے گی تو میں تمہیں اس سے ملاؤں گا۔"

"تم نازنین کی باتیں نہ کرو، ڈائری کے متعلق بتاؤ، کیا واقعی ایچ میٹر بنانے کے طریقے کہیں درج نہیں ہیں؟"

"نہیں۔ میرے ڈیڈی کو کیا معلوم تھا کہ وہ اچانک مر جائیں گے اگر معلوم ہوتا تو وہ ایچ میٹر بنانے کی تفصیلات لکھ کر میرے حوالے کر دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمہاری جوانی کی قسم کھاتا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں، آؤ میری سچائی پر مجھے بوسہ دو۔"

روزینہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی، پھر اس کے سر پر ایک چپت مارتے ہوئے بولی،

"الو کے پٹھے! میں تیرے باپ کی بیوی تھی، اب بیوہ ہوں، کیا تو میرا بوسہ لے گا۔ اگرچہ میں نے تیری ماں کہلانا کبھی منظور نہیں کیا۔ لیکن تم کیسے لوگ ہو کہ نشے میں ماں اور محبوبہ کی عمر کا فرق نہیں سمجھ سکتے، تم ایک نہیں، ہزار ایچ میٹر بناؤ مگر تم اسی طرح بہکو گے اور عمر کا فریب کھاؤ گے اور ایک کم عمر داشتہ سمجھ کر اپنی ماں سے بوسہ طلب کرو گے، لعنت ہے تم پر ــ میں تو اس لئے یہاں آئی ہوں کہ تمہارا قصہ ہی تمام کر دوں۔ نہ ڈائری رہے گی، نہ تم میرے خاوند کی جائیداد کے حصہ دار بن کر رہو گے۔"

یہ کہہ کر اس نے انصار کی ناک پر سے عینک کھینچ لی، انصار نے غصہ سے کہا۔

"چڑیل، میری عینک واپس کر دے۔ میں تجھے پہچان گیا ہوں، تو میری جان کی دشمن ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتے ہوئے ایک اندھے کی طرح روزینہ کی طرف بڑھنے لگا۔ عینک کے بغیر نگاہوں کے سامنے ہر چیز دھندلا گئی تھی۔ نشے کی وجہ سے سر گھوم رہا تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے، وہ خود کو نہیں سنبھال سکتا تھا۔ پھر روزینہ کا ہاتھ کیسے پکڑ سکتا تھا۔ روزینہ نے وہسکی کی بوتل اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری، بوتل ٹوٹ کر بکھر گئی۔ سر لہولہان ہو گیا

اور وہ چکرا کر گر پڑا۔

دوسرے کمرے میں جمشید کیمرہ سنبھالے کھڑکی کے پاس کھڑا تھا لیکن وہ اتنے اہم موقعہ کی تصویر نہ اتار سکا کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے، اس ڈیڑھ پسلی کے آدمی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بوتل اسی کے سر پر توڑی گئی ہے، اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو قتل ہوتے اور کسی کا خون بہتے نہیں دیکھا تھا، اس لئے وہ خوفزدہ تھا، اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ تصویر اتارتے ہی مادام روزینہ ٹوٹی ہوئی بوتل لے کر اس پر پل پڑے گی، اس خیال کے آتے ہی وہ جس کمرے میں تھا اسے اندر سے بند کرنے لگا۔

روزینہ کی توجہ الفصار پر تھی، وہ بے حس و حرکت فرش پر پڑا ہوا تھا اور یوں سانس لے رہا تھا جیسے آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہو، وہ حقارت سے کہنے لگی:

" میں نے تمہارے باپ کو بھی اسی طرح ہلاک کیا تھا، کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہماری عمر کو ننگا کرے؟ اس روز لیبارٹری میں دوپہر کو مہ جبیں آئی تھی، میں نے اسے رخصت کر دیا، اس کی جگہ میں لیبارٹری میں موجود رہی۔ اور ڈاکٹر کو سمجھاتی رہی کہ وہ ایج میٹر کو عام نہ کرے، بہتر ہے کہ اسے ضائع کر دے، لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔ مجبور ہو کر میں نے اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور ایج میٹر لے کر وہاں سے چلی آئی۔ اس ایج میٹر کو میں نے توڑ کر برباد کر دیا ہے۔ لیبارٹری میں آنے والی دونوں عورتیں مس فریدہ اور حمیدہ بانو کبھی میرے خلاف گواہی نہیں دیں گی، کیونکہ میں نے ایج میٹر کو برباد کر کے دنیا کی تمام عورتوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مہ جبیں پر بھی مجھے پورا بھروسہ تھا کہ وہ میرے خلاف گواہی نہیں دے گی، کیونکہ وہ ایک طوائف ہے اور کوئی طوائف یہ نہیں چاہتی کہ ایج میٹر عام ہو جائے اور اس کے گاہک دام لگانے سے پہلے ایج میٹر سے اس کی عمر کا حساب کرے۔

لہٰذا مجھے مہ جبیں پر بھروسہ تھا مگر اسے ایک بیماری ہے۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کو شدت سے سوچتی ہے تو سوچتے سوچتے اپنی بوڑھی بہن نازنین کا روپ اختیار کر لیتی ہے، وہ جسمانی لحاظ سے صرف مہ جبیں ہے لیکن دوہری شخصیت کے اعتبار سے نازنین بھی ہے، اس سے اس بات کا خطرہ ہے کہ نازنین کے روپ میں اسے بہت غصہ آتا ہے، وہ غصہ کی حالت میں کسی کو بھی بتا سکتی ہے کہ لیبارٹری میں آنے والی تیسری عورت میں ہوں، اس لئے میں نے مہ جبیں کو بھی راستے سے ہٹانے کا انتظام کر لیا ہے، وہ مر جائے گی تو پولیس والے مہ جبیں اور نازنین کے الجھاوے سے نہیں نکل سکیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی، کیونکہ الفصار مرنے کے بجائے آہستہ آہستہ سر اٹھا رہا تھا، اس کا چہرہ لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگی۔ الفصار تھرتھراتے ہوئے فرش پر سے اٹھنے لگا۔ شراب کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ اب جان دینے کا نشہ حاوی تھا، اس نے دونوں ہاتھ اس طرح بڑھائے جیسے روزینہ کا گلا گھونٹنا چاہتا ہو لیکن اس کی ظاہری حالت سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں گلا گھونٹنے کی سکت نہیں ہے۔

روزینہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی لیکن الفصار کو زندہ چھوڑ کر جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کے جرم پر سے پردہ اٹھنا شروع ہو جاتا وہ جانا نہیں چاہتی تھی، اس ادھ مرے کو تھکا کر گرانا چاہتی تھی، اتنے میں اس کے پیچھے والی کھڑکی سے جمشید نے کہا:

" اے خبردار! ادھر وہ کرو، یعنی کہ ادھر منہ کرو۔"

روزینہ نے چونک کر ادھر دیکھا، وہاں ایک شخص کو کیمرے کے ساتھ دیکھ کر وہ گھبرا گئی، جمشید نے کیمرے کا بٹن دبایا مگر اس سے پہلے ہی اس نے منہ پھیر لیا۔ اس وقت تک الفصار قریب آ گیا تھا، اس نے روزینہ کی گردن کی جانب ہاتھ بڑھائے لیکن وہ اس کے شانوں پر ٹیک کر رہ گیا۔ اس کی آخری قوتیں بھی ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ روزینہ نے اسے کمزور پڑتے دیکھ کر فوراً ہی اس کی گردن دبوچ لی۔

الفصار میں اب جان ہی کیا رہ گئی تھی، اس لئے ایک عورت کے نازک ہاتھ اس کا گلا دبوچ رہے تھے اور اس کے دیدے پھیلتے جا رہے تھے جمشید نے پھر کیمرے کا بٹن دبایا۔ فلیش بلب کی روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور تصویر اتر گئی، لیکن اس وقت بھی روزینہ کی پشت کیمرے کی جانب تھی۔ جمشید اسے للکارنے لگا۔

" اے! تم اس کا وہ دبا کر یعنی گلا دبا کر میرے پاس نہیں آسکتیں۔ میں بہت وہ ہوں، میں عورتوں سے لڑنا اپنی وہ سمجھتا ہوں، یعنی توہین سمجھتا ہوں، اسی لئے میں نے دروازے وہ کر دیئے ہیں، تم اندر نہیں آسکو گی۔"

اس وقت تک الفصار ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی، اس کی موت کا یقین ہوتے ہی روزینہ وہاں سے بھاگنے لگی، کیمرے کا فلیش بلب پھر ایک بار پھر روشن ہو کر بجھ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی خواب گاہ سے باہر چلی گئی، جمشید بند کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روزینہ شاید کہیں چھپ گئی ہے۔ اگر اس نے دروازہ کھولا تو وہ اس پر بھی حملہ کرے گی۔ خواب گاہ میں الفصار کی لاش کو اور بہتے ہوئے لہو کو دیکھ کر اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ منہ پھیر کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور خود میں حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا، یہ سوچ کر اپنی حوصلہ افزائی آپ کرنے لگا کہ اس نے قتل کی واردات کی تصویریں اتار کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

بہت دیر بعد اس نے دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکی ہے تو وہ دوڑتا ہوا ٹیلیفون کے پاس آیا۔ اور ریسیور اٹھا کر انسپکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ اپنے ڈارک روم میں فلم نگیٹو کی دھلائی کر رہا تھا۔ انسپکٹر اس کے پاس کھڑا ہوا تصویریں دیکھنے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ ان تصویروں کے ذریعہ وہ مادام روزینہ کو مجرمہ ثابت کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ جمشید کی حوصلہ کر رہا تھا کہ اس کے اس کارنامے کا معقول معاوضہ

دیا جائے گا اور سرکار کی طرف سے اسے انعام بھی ملے گا۔

لیکن نگیٹو دھلنے کے بعد کسی عورت کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ ان کے پرنٹ تیار ہونے کے بعد انسپکٹر نے تصویریں دیکھیں تو غصہ سے جھلا گیا۔ کیونکہ تمام تصویروں میں روزینہ کی پشت نظر آ رہی تھی، جس تصویر میں وہ الفصار کا گلا دبوچ رہی تھی، اس میں بھی اس کے سر کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا اور الفصار کا خون آلود چہرہ سامنے تھا اور اس کے پھیلے ہوئے دیدے نظر آ رہے تھے۔

انسپکٹر نے تمام تصویریں جمشید کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

" تمہیں فوٹو گرافر بننے کا مشورہ کس نے دیا تھا جب بھی تصویریں اتارتے ہو تو مجرم کا چہرہ غائب کر دیتے ہو، اس رات بھی جب ایک اجنبی آہنی سلاخ لئے نازنین کا پیچھا کر رہا تھا، تم نے اس کی پشت کی جانب سے تصویر اتاری تھی، روزینہ کی تصویروں میں بھی اس کی پشت نظر آ رہی ہے۔ ہم عدالت میں یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ یہ سب روزینہ کی تصویریں ہیں۔"

" جناب! میں کیا کر سکتا ہوں، وہ قاتلہ بہت وہ ہے یعنی چالاک ہے وہ ہمیشہ اپنی پشت کیمرے کی طرف وہ کر لیتی تھی، اس میں میری کوئی وہ نہیں ہے۔"

انسپکٹر نے جھلا کر تمام تصویریں سمیٹ لیں، انہیں اس خیال سے جیب میں رکھ لیا کہ شاید وہ سب کسی کام آ جائیں۔ اگرچہ ہر تصویر میں روزینہ کی پشت نظر آ رہی تھی۔ لیکن روزینہ ان تصویروں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو سکتی تھی۔ اور اپنے جرم کا اعتراف کر سکتی تھی۔

جب وہ روزینہ کی کوٹھی میں پہنچا تو وہاں ڈرائنگ روم میں روزینہ کی حمایت کرنے والی کتنی ہی عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے، ان میں روزنامہ بلبل کے ایڈیٹر طارق محمود بھی تھے۔ انجمن اتحاد الخواتین کی صدر بھی تھیں۔ ان کے علاوہ حکومت کے اعلیٰ افسران سے ڈھکے چھپے تعلقات رکھنے والی حسینائیں بھی روزینہ کی حفاظت کے لئے موجود تھیں۔ انسپکٹر نے اسے مجرم ثابت کرنے کے لئے وہ تصویریں پیش کیں تو روزینہ نے بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ وہ اس کی تصویریں نہیں ہیں۔

طارق محمود نے کہا:

" انسپکٹر! پتہ نہیں آپ کس عورت کا جرم مادام روزینہ کے سر تھوپ رہے ہیں۔ ان تصویروں میں مادام کہیں نظر نہیں آ رہی ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا: " وہ فوٹو گرافر اس بات کا گواہ ہے کہ مادام نے اپنے سوتیلے بیٹے کو ہلاک کیا ہے اور اس کے سامنے اعتراف کیا ہے کہ اپنے خاوند کو بھی انہوں نے ہلاک کیا تھا، ان کی زبانی پتہ چلا کہ مہ جبیں دوہری شخصیت کی حامل ہے۔ بعض اوقات اس پر نازنین کی شخصیت حاوی ہو جاتی ہے۔ ہم اب تک دھوکہ کھاتے رہے، مہ جبیں اور نازنین کے درمیان الجھتے رہے، اور مادام نے ہمیں مزید الجھانے کے لئے آج ہی رات مہ جبیں کو قتل کرا دیا ہے اس کے مرنے سے مادام کا یہ فائدہ ہوتا کہ ہمارا دھیان مادام کی طرف نہ جاتا لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ ایک فوٹو گرافر نے اپنی آنکھوں سے انہیں الفصار کو قتل کرتے دیکھا ہے۔"

" آپ کا فوٹو گرافر اور اس کی تصویریں سب بیکار ہیں۔" طارق محمود نے کہا " میں جمشید کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ اول درجے کا احمق اور بزدل ہے عدالت میں ایسے احمق آدمی کی گواہی قبول نہیں ہو گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے سے جمشید کی آواز سنائی دی۔

" کیا مجھے اندر آنے کی وہ مل سکتی ہے؟ جناب انسپکٹر صاحب! جب آپ میرے ڈارک روم سے چلے گئے تو میرے وہ میں وہ آیا یعنی میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا۔ میں فوراً ہی آپ سے وہ کرنے آ گیا، کیا میں آپ کو اپنا وہ بتا سکتا ہوں۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو انسپکٹر اسے جھڑک کر بھگا دیتا۔ لیکن اس وقت تمام مخالفوں کی موجودگی میں جمشید اسے اپنا اپنا سا محسوس ہوا۔ اس نے کہا: " یہاں آؤ اور جلدی سے بتاؤ کہ کیا آئیڈیا لے کر آئے ہو۔"

جمشید نے قریب آتے ہوئے کہا۔

" آپ نے وہ کرنے والوں یعنی محبت کرنے والوں کی باتیں سنی ہوں گی وہ کہتے ہیں میری جان میں تمہاری آنکھوں میں بستا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں آنکھوں میں تو ساری دنیا وہ ہوتی ہے۔ آپ میرے سامنے ہوں گے تو میری آنکھوں کی وہ میں یعنی پتلیوں میں آپ نظر آئیں گے اور آپ کی آنکھوں کی وہ میں میں نظر آؤں گا۔"

" یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟"

" بکواس نہیں وہ ہے یعنی کہ حقیقت ہے۔ اس طرح الفصار کی آخری وہ دیکھئے یعنی تصویر دیکھئے۔ اس میں الفصار کے دیدے پھیلے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھوں کی وہ میں روزینہ نظر آ رہی ہے۔"

وہ ایسا اچھوتا آئیڈیا تھا کہ انسپکٹر حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے وہ تصویر دیکھی جس میں روزینہ الفصار کا گلا دبوچ رہی تھی، الفصار کے دیدے پھیلے ہوئے تھے اور ان میں روزینہ کا ننھا سا مبہم سا عکس نظر آ رہا تھا۔

جمشید نے کہا " اس میں صاف طور سے وہ نظر نہیں آئے گی۔ میں اس کے بڑے سائز کا وہ لایا ہوں یعنی کہ بڑے سائز کا فوٹو لایا ہوں۔ یہ دیکھئے۔" اس نے بڑے سے لفافے سے ایک بڑی سی تصویر نکالی بڑی تصویر کی مناسبت سے الفصار کی آنکھوں کا بہت بڑا کلوز اپ نکالا۔ ان آنکھوں کی بڑی بڑی پتلیوں میں مادام روزینہ صاف نظر آ رہی تھی۔

اس تصویر کو اس کے سب ہی حمایت کرنے والوں نے دیکھا اور سب ہی کے چہرے لٹک گئے۔ احمق فوٹو گرافر اپنی کامیابی پر بتیسی نکالے کھڑا تھا۔ انسپکٹر نے فاتحانہ انداز سے روزینہ کو دیکھا تو وہ ایک دم سے مرجھا گئی تھی۔ اس پر چڑھا ہوا مصنوعی جوانی کا خول اتر رہا تھا۔ وہ بیٹھے ہی بیٹھے اپنی چھوٹی عمر سے بہت آگے نکل گئی تھی، اس وقت کسی ایج میٹر کے بغیر ہی اس کا بڑھاپا واضح ہوتا جا رہا تھا۔

اثر نعمانی

رات کے سوا گیارہ بجے تھے. انسپکٹر ریاض گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی، اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا، دوسری طرف سے سب انسپکٹر شمیم بات کر رہا تھا۔

" انسپکٹر صاحب! ایک خاتون کا ٹیلیفون آیا ہے" سب انسپکٹر شمیم نے بتایا" اور وہ جو کچھ کہہ رہی ہیں اس کے پیش نظر اس کیس کا تعلق آپ کے شعبہ سے معلوم ہوتا ہے"

" لائن ملا دو" انسپکٹر ریاض نے جواب دیا اور پھر چند لمحوں کے بعد بولا۔ " ہیلو، میں انسپکٹر ریاض بات کر رہا ہوں"

" انسپکٹر صاحب" ایک عورت کی آواز ابھری. اور اگر آواز سے عمر کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو انسپکٹر ریاض کے خیال میں بولنے والی عورت کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان معلوم ہوتی تھی.

" میں نوبہار کالونی سے مسز اشرف بول رہی ہوں" خاتون کہہ رہی تھی " ہمارے پڑوس میں ڈاکٹر انصاری نامی ایک سائنسدان رہتے ہیں. ابھی کوئی دس منٹ پہلے ان کے بنگلہ سے شور ہنگامہ کی آوازیں سنائی دیں، یوں معلوم ہوا جیسے ان کی لیبارٹری میں توڑ پھوڑ کی جا رہی ہو، پھر فوراً ہی تین فائر ہوئے. میں نے اپنے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو دو آدمی بھاگتے ہوئے بنگلہ سے باہر آئے اور گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی کار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے"

" آپ نے ڈاکٹر انصاری کے بنگلہ میں جا کر دیکھنے کی کوشش کی؟" ریاض نے پوچھا.

" جی نہیں، میں گھر میں تنہا ہوں اور میری ہمت نہیں"...

" ٹھیک ہے" ریاض نے بات کاٹی" آپ اپنے بنگلہ ہی میں ٹھہریں. ہم ابھی چند منٹ میں پہنچتے ہیں"

اس نے ریسیور رکھتے ہوئے میز کے دوسری طرف بیٹھے سب انسپکٹر ممتاز کی طرف دیکھا.

" کیا کوئی کیس"... ممتاز نے پوچھا

" ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" ریاض نے ٹوپی سر پر جماتے ہوئے کہا" تم ہیڈ کانسٹیبل محمد خاں سے کہو کہ گشتی پولیس کی کسی کار سے رابطہ قائم کرے اور اسے نوبہار کالونی بنگلہ نمبر ایک سو ستائیس پر پہنچنے کی ہدایت دے"

" جہاں تک میرا خیال ہے آپ نے فون پر پتہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا بلکہ میں کہنے بھی والا تھا کہ"...

" ڈاکٹر انصاری کے بنگلہ سے توڑ پھوڑ کی اور فائروں کی آواز سنی گئی ہے" ریاض نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا" اور ڈاکٹر صاحب اتنے گمنام آدمی نہیں کہ مجھے ان کے بنگلہ کا پتہ پوچھنے کی ضرورت پڑتی، چلو اٹھو"

" یہ وہی ڈاکٹر انصاری تو نہیں جن کے انوکھے تجربات کے بارے میں آئے دن اخبارات میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا رہتا ہے"

" تم ٹھیک سمجھے"

" اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی دھماکہ خیز تجربہ کر رہے ہوں اور"

" بیکار باتیں مت کرو" ریاض نے کچھ ناگواری سے کہا" محمد خاں سے جا کر کہو کہ وہ کسی گشتی کار کو وہاں بھیج دے اور پھر جلدی سے گیٹ پر آؤ. میں اتنی دیر میں کار نکالتا ہوں"

" ہوں" ممتاز ایک گہری سانس لیکر کھڑا ہو گیا" معلوم ہوتا ہے آج کی رات سونا نصیب نہیں ہوگا"

اور پھر اس سے پہلے کہ ریاض بگڑ کر کچھ اور کہتا وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا.

جس وقت انسپکٹر ریاض بنگلہ نمبر ۱۲۷ پر پہنچا تو گشتی پولیس کی ایک جیپ جس میں سب انسپکٹر رشید اور دو کانسٹیبل سوار تھے پہلے سے وہاں موجود تھی ڈاکٹر انصاری کا بنگلہ سڑک کے موڑ پر واقع تھا. نوبہار کالونی میں بنگلوں کی تعمیر اس انداز میں کی گئی تھی کہ بنگلوں کی ہر قطار کے درمیان ایک سڑک موجود تھی دوسرے الفاظ میں ان کے نزدیک ترین پڑوسی بنگلہ نمبر ۱۲۶ کے مکین تھے. بنگلہ میں تاریکی چھائی ہوئی تھی صرف پورچ میں ایک بلب جل رہا تھا. گیٹ کھلا ہوا تھا.

ریاض کار سے اتر کر جیپ کی طرف بڑھا، سب انسپکٹر رشید نے اسے سلام کیا۔

" تمہیں آئے کتنی دیر ہو گئی؟" ریاض نے پوچھا.

" تین چار منٹ"

" بنگلہ کے اندر گئے تھے؟"

" جی نہیں. مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ تشریف لا رہے ہیں" رشید نے جواب دیا" اس لئے میں نے دونوں کانسٹیبلوں کو بنگلہ کی عقبی جانب روانہ کر دیا اور خود یہاں آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا"

" ٹھیک ہے، تم یہیں ٹھہرو" ریاض نے کہا اور ممتاز کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے بنگلہ کی جانب بڑھ گیا.

پورچ کے آگے کافی وسیع ہال تھا، ریاض نے ٹارچ کی روشنی میں بٹن تلاش کر کے آن کر دیا. ہال میں کئی کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے، دو بیڈ روم تھے، ایک ڈرائنگ روم اور ان دونوں کے درمیان اسٹڈی روم جس میں ڈاکٹر انصاری نے اپنی لیبارٹری بنا رکھی تھی. جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی. ایک طرف دیوار کے سہارے تین الماریاں جن میں کتابیں اور فائل رکھے ہوئے تھے. دوسری طرف آہنی ریکس کی قطاریں جن پر بے شمار چھوٹی چھوٹی شیشیاں اور سائنسی آلات رکھے تھے. درمیان میں ایک لمبی سی میز اور یہ میز اس وقت بڑی ابتری کا نمونہ پیش کر رہی تھی. میز کے ارد گرد فرش پر ٹوٹی ہوئی شیشیاں، نلکیاں، بیکرز اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی کرچیاں پھیلی پڑی تھیں، کرسیاں الٹی ہوئی تھیں. ریاض نے ایک نظر میں صورت حال کا جائزہ لیا اور گھوم کر میز کے دوسری جانب آیا، اس وقت اس کی نگاہ ڈاکٹر انصاری پر پڑی جو اوندھے منہ فرش پر گرے ہوئے تھے، وہ لپک کر ان کے پاس آیا، انہیں سیدھا کیا، ایک نظر ڈالنا ہی کافی تھا وہ مر چکے تھے، جسم پر گولیوں کے تین زخم نظر آ رہے تھے، وہ تینوں سینہ پر تھے ایسے زخم جن میں سے ہر ایک مہلک ہو سکتا، غالباً انہیں تڑپنے کی مہلت بھی نہ ملی ہوگی. فرش پر جہاں وہ گرے تھے، چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا.

ریاض ایک گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا، ممتاز کے ساتھ بنگلہ کے باقی حصے دیکھے، ایک کمرے کے باتھ روم میں ایک نوجوان ملا جس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا. ممتاز نے جلدی سے اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور ہاتھ پاؤں کھولے.

" کون ہو تم؟" ریاض نے اس سے پوچھا.

" میرا نام قیصر ہے اور میں ڈاکٹر صاحب کا لیبارٹری اسسٹنٹ ہوں" نوجوان نے اپنی کلائیاں سہلاتے ہوئے بتایا" میں نے لیبارٹری میں گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں، ڈاکٹر صاحب تو بخیریت ہیں؟"

" پہلے تم بتاؤ کہ تمہیں یہاں کس نے باندھ ڈالا تھا اور یہ واقعہ کب پیش آیا؟" ریاض نے سوال کیا.

" جیسا کہ میں نے بتایا میں ڈاکٹر انصاری کا لیبارٹری اسسٹنٹ ہوں. میرا کام بازار سے دوائیں لانا، ان کا ریکارڈ رکھنا اور حسب ضرورت ڈاکٹر صاحب کے حکم کے مطابق جن دواؤں کی ضرورت ہو وہ اسٹور روم سے نکال کر انہیں پہنچانا اور کبھی کبھی مختلف تجربات میں ان کا ہاتھ بٹانا ہے"

" ڈاکٹر صاحب اکیلے ہی تجربات کیا کرتے تھے؟" ریاض نے درمیان میں

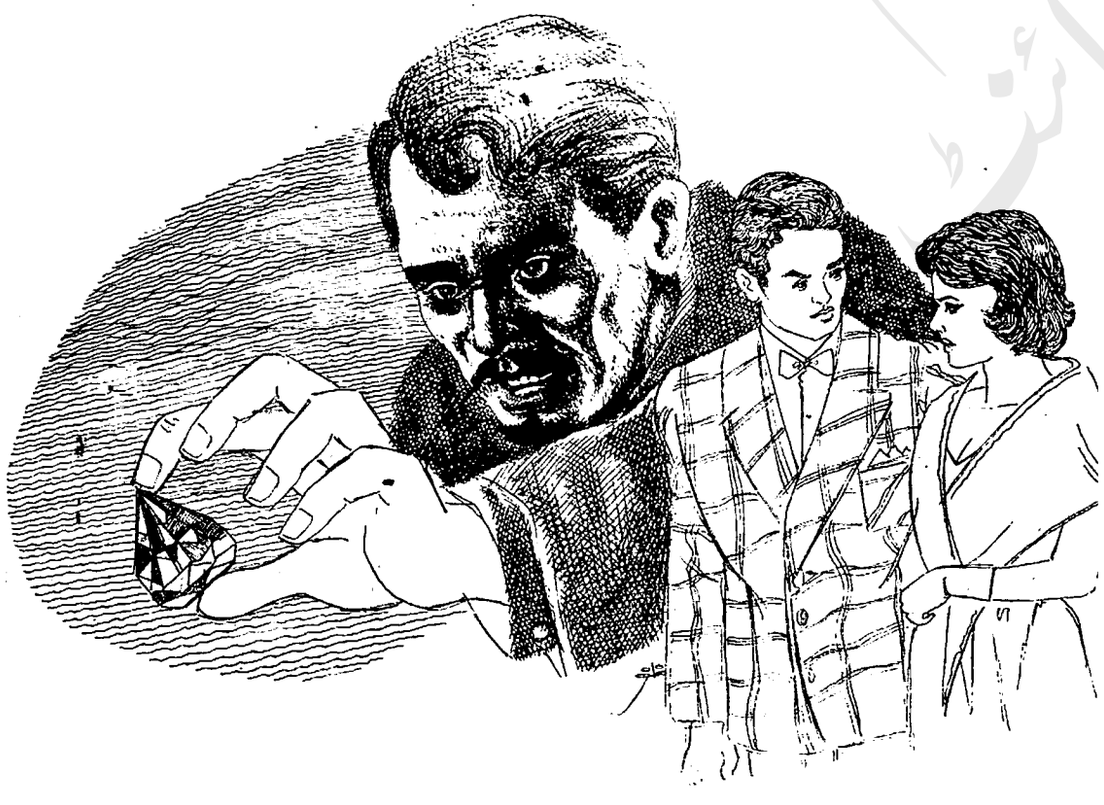

بولتے ہوئے پوچھا۔

" کیا کرتے تھے ۔۔" قیصر چونکا" اس کا مطلب ہے کہ ان ظالموں نے ڈاکٹر صاحب کو قتل کر دیا؟"

ریاض کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا، مگر اب بات زبان سے نکل چکی تھی۔

" ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔" مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب قتل کر دیئے گئے ہیں، لیکن تم اس بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہو اسے ٹھیک ٹھیک بیان کر کے قاتل یا قاتلوں کی گرفتاری میں ہماری مدد کر سکتے ہو، اب میرے سوال کا جواب دو، کیا ڈاکٹر انصاری اکیلے ہی تجربات کرتے تھے یا کوئی اور بھی ان کی مدد کرتا تھا، میرا مطلب ہے تمہارے علاوہ؟"

" ڈاکٹر قاسم ان کے ساتھ کام کرتے تھے، میری حیثیت تو ایک اسٹور کیپر کی تھی، یوں بھی میں ان کے تجربات میں مدد دینے کی اس قدر صلاحیت نہیں رکھتا تھا"

" اچھا خیر یہ بتاؤ کہ آج کیا ہوا؟"

" میں اسٹور روم میں بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر قاسم حسب معمول لیبارٹری میں اپنے تجربات میں مشغول تھے، گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر قاسم میرے پاس آئے اور بتایا کہ لیبارٹری میں پانی نہیں آ رہا ہے، میں باتھ روم میں جا کر دیکھوں کر وہاں کا کنکشن والو بند تو نہیں ہے، لیبارٹری میں پانی کی سپلائی کا نل باتھ روم سے لے جایا گیا ہے۔ میں ان کی ہدایت کے مطابق ابھی باتھ روم میں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک ہپی ٹائپ نوجوان جس کے بڑے بڑے بال تھے اور جس نے چمڑے کی جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی، معلوم نہیں کہاں سے نکل کر اچانک میرے سامنے آگیا، اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے ہاتھ میں رسی تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی حرکت کی یا کوئی آواز نکالی تو وہ بلا تامل مجھے گولی مار دے گا۔ آپ مجھے بزدل کہہ لیں لیکن میں ریوالور دیکھ کر ہی کانپ گیا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں کوئی مزاحمت نہیں کروں گا۔ اس پر اس نے رسی کا ایک سرا میری طرف پھینکا کہ میں فرش پر بیٹھ کر اپنے دونوں پاؤں اچھی طرح کس کے باندھ لوں، میں نے ایسا ہی کیا، پاؤں بندھ جانے کے بعد اس آدمی نے ریوالور جیب میں رکھ لیا، میرے ہاتھ پشت کے پیچھے باندھے، منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور باتھ روم کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے لیبارٹری سے توڑ پھوڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ ڈاکٹر صاحب چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آسکا، فوراً ہی تین فائر ہوئے اور خاموشی چھا گئی، یہاں تک کہ آپ لوگوں نے آکر مجھے آزاد کرایا"

" تم رات کے گیارہ بجے تک اسٹور روم میں تھے: ریاض نے پوچھا" تو کیا کام کے لئے وقت کا کوئی تعین نہیں تھا؟"

" جی نہیں" قیصر نے جواب دیا" کبھی کبھی کئی کئی دن گذر جاتے تھے، اور میری کوئی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور کبھی سارا دن اور ساری رات بھی ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ خصوصاً گذشتہ ایک ماہ سے ڈاکٹر صاحب کسی بہت اہم تجربے میں مصروف تھے، اس لئے وقت کی کوئی پابندی باقی نہیں رہ گئی تھی"

ریاض باتھ روم میں لگے ہوئے واٹر کنکشن دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر دو تین والو چیک کئے" تعجب ہے" وہ بولا" تم کہہ رہے ہو کہ ڈاکٹر قاسم نے لیبارٹری میں پانی نہ آنے کی شکایت کی تھی مگر یہاں تو تمام والو کھلے ہوئے ہیں، مزید یہ کہ پورے بنگلہ میں ڈاکٹر قاسم کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر قاسم اور اس ہپی نوجوان میں کوئی تعلق ہو اور ڈاکٹر انصاری کا قتل ان کی باہمی سازش کا نتیجہ ہو" وہ کچھ رکا اور پھر قیصر سے پوچھا" تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ ڈاکٹر انصاری کس قسم کا تجربہ کر رہے تھے؟"

" جی نہیں" قیصر نے نفی میں سر ہلایا" صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ کوئی ایسا تجربہ تھا جس میں چینی کی بہت بڑی مقدار استعمال ہوتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری اب تک تین بوری چینی منگوا چکے تھے"

ریاض کے مزید سوالات کے جواب میں قیصر نے بتایا کہ وہ اور ڈاکٹر قاسم بنگلہ میں ہی رہتے تھے، گھر کے کام کاج اور کھانا پکانے کے لئے ایک ملازمہ تھی۔ جو روز صبح آٹھ بجے آتی تھی اور شام کو آٹھ بجے تک چلی جاتی تھی۔ ریاض کے کہنے پر قیصر اسے ڈاکٹر قاسم کے کمرے میں لے گیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا، وہاں ڈاکٹر قاسم کے کپڑے، روزمرہ استعمال کی اشیاء یا اسی طرح کی کوئی شے موجود نہیں تھی، اس سے اس شبہ کو اور تقویت ملتی تھی کہ قاتل اور ڈاکٹر قاسم میں ضرور کوئی تعلق تھا اور ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری کا قتل اس تجربے کے حاصل شدہ نتائج کے لئے کیا گیا ہو جو وہ کر رہے تھے۔

عمدہ کام

ھر قسم کے ڈیزائن، سینما سلائڈز، رنگین و بلیک اینڈ وہائٹ پوزیٹو اور بلاک بنوانے کیلئے درج ذیل پتے پر تشریف لائیں۔

بہترین کام، مناسب دام

ایسٹرن گرافکس اے۔ ایم ۱۱
فریر روڈ۔ کراچی ۱
فون نمبر:۔ ۷۳۶۴۹

ریاض نے بنگلہ میں اپنی تحقیقات مکمل کر لیں۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے مردہ خانے روانہ کر دیا گیا، پڑوس کی مسز اشرف کا بیان لیا اور ہیڈ کوارٹر واپس چلا آیا۔ دوسرے دن اخبارات نے ڈاکٹر انصاری کے قتل اور ڈاکٹر قاسم کی پراسرار گمشدگی کی خبر تصویروں کے ساتھ بڑے نمایاں طور پر شائع کی تفصیل میں اگرچہ اس بات کا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ پولیس واردات کا شبہ ڈاکٹر قاسم پر کر رہی ہے، لیکن یہ ضرور بیان کیا گیا تھا کہ پولیس کو ڈاکٹر قاسم کی تلاش ہے جو پولیس کے خیال میں اس واردات کی تحقیقات کے سلسلہ میں بعض اہم معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔

دولت آباد کی ایک پس ماندہ بستی رتن پورہ کے ایک چھوٹے سے مکان کے اندرونی کمرے میں ڈاکٹر قاسم پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں ایک میز کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ میز پر درجنوں چھوٹی بڑی شیشیوں میں مختلف ادویات، سفوف یا سیال کی صورت میں رکھی تھیں، ایک اسپرٹ لیمپ کے اوپر ایک بڑے بیکر میں کوئی محلول کھول رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر لوہے کا ایک ہاون دستہ رکھا تھا جو نصف سے زیادہ چینی سے بھرا ہوا تھا۔

کمرے کے ایک گوشے میں ایک ہپی ٹائپ نوجوان جس کا نام سلطان تھا چمڑے کی جیکٹ اور پتلون پہنے کرسی پر لاپرواہی کے انداز میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ڈاکٹر قاسم رسٹ واچ ہاتھ میں لئے بیکر کے محلول کے ایک خاص وقت تک جوش کھانے کا انتظار کر رہے تھے، وقت پورا ہونے پر اسپرٹ لیمپ بجھا دیا، پھر میز پر قریب ہی رکھے ہوئے شیشے کے ایک پیمائشی گلاس کو اٹھایا جس پر مختلف اوزان کے لئے نشان لگے تھے اور سامنے رکھی شیشیوں سے دوائیں نکال نکال کر اس پیمائشی گلاس سے ناپ کر ہاون دستے میں ڈالنے لگے دوائیں نکالتے ہوئے وہ سامنے رکھے کلپ بورڈ پر لگے ہوئے کاغذ پر بھی نظریں ڈالتے جا رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہر دوا کو کاغذ پر لکھے ہوئے وزن کے مطابق نکال رہے ہیں، جب سب دوائیں ہاون دستے میں ڈالی جا چکیں تو آخر میں انہوں نے بیکر کا پورا محلول بھی اسی میں ڈال دیا اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔

محلول ہاون دستے میں پڑتے ہی ایک زبردست شعلہ سا اٹھا جس نے چند لمحوں کے لئے پیٹرومیکس کی روشنی کو بھی ماند کر دیا۔ شعلے میں اتنی حدت تھی کہ ہاون دستہ کے کنارے سرخ ہو گئے۔ اگر وہ ایک آہنی پلیٹ پر نہ رکھا ہوتا تو یقیناً میز بھی جل جاتی، شعلے کے دھوئیں میں تبدیل ہوتے ہی ڈاکٹر قاسم آگے بڑھے۔ میز کے نیچے رکھا ہوا پانی کا بڑا ٹب تھوڑا سا آگے سرکایا اور پھر ایک بڑی سنسی کی مدد سے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے ہاون دستہ اٹھایا اور اس ٹب میں ڈال دیا، بالکل ایسی آواز بلند ہوئی جیسے تپتے ہوئے لوہے کو پانی میں بجھانے سے نکلتی ہے۔

ڈاکٹر قاسم نے سنسی چھوڑ کر ہاون دستے کو ہاتھ لگایا۔ اگرچہ وہ اب بھی گرم تھا مگر اتنا نہیں کہ ہاتھ کو جلا سکے، انہوں نے اسے سیدھا کر دیا۔ ہاون دستے میں رکھی ہوئی چینی ایک بڑے سے سخت کوئلہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ انہوں نے وہ کوئلہ ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اس کے وزن کا اندازہ کیا اور کمرے کے ایک گوشہ کی طرف بڑھے جہاں پتھر کی ایک بڑی سل اور ایک بھاری ہتھوڑا رکھا تھا۔ سل پر اور سل کے چاروں طرف کوئلے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر قاسم نے وہ بڑا کوئلہ سل پر رکھا اور ہتھوڑا اٹھا کر اس پر ایک زوردار ضرب ماری۔ سلطان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اس کی لاپرواہی کسی قدر دلچسپی میں تبدیل ہو چکی تھی، وہ کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا تھا اور منتظر تھا کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے ہتھوڑے کی دو تین ضربوں سے کوئلہ ٹوٹ گیا۔ ڈاکٹر قاسم نے بیتابی سے اس کے ٹکڑوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کیا مگر پھر جلد ہی ان کی بیتابی مایوسانہ تاثرات میں تبدیل ہو گئی، وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑے ہو گئے۔

" تجربہ ناکام ہو گیا" انہوں نے بجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔

" کوئی نئی بات نہیں" سلطان نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ " گذشتہ ایک ماہ میں تم یہ فقرہ کم و بیش ایک ہزار مرتبہ دہرا چکے ہو"

" مجھے غصہ مت دلاؤ" ڈاکٹر قاسم نے تیزی سے کہا" یہ سب تمہاری حماقت کا نتیجہ ہے، تم نے مجھے اس بڈھے ڈاکٹر کا خفیہ فائل پوری طرح چیک کرنے کا موقع دیئے بغیر اسے قتل کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ ہیرے بنانے کے فارمولے اور دواؤں کے نام کے علاوہ ان کے صحیح اوزان اور تناسب بھی اس نے کسی جگہ لکھ رکھے ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا، یہ راز صرف اس کے دماغ میں محفوظ تھا۔ اگر تم اسے گولی نہ مارتے تو ہم اس کی زبان سے یہ راز اگلوا سکتے تھے۔ اب جب تک دواؤں کے صحیح اوزان اور باہمی تناسب نہ معلوم ہو تو فارمولا بے کار ہے"

" فارمولا بے کار نہیں ہے ڈاکٹر، یہ اب بھی بڑا کارآمد ہے" سلطان نے معنی خیز لہجہ میں کہا" تم اپنے تجربات میں مصروف رہے اور میں نے اس سے دولت کمانے کا ایک بہترین طریقہ سوچ لیا، تم اپنے تجربات میں ناکام رہے، اب میری تجویز پر عمل کر کے دیکھو، میں یقین دلاتا ہوں کہ بہت تھوڑی مدت میں ہم لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی بن سکتے ہیں"

" وہ کس طرح؟" ڈاکٹر قاسم نے قدرے اشتیاق سے پوچھا۔

" ڈاکٹر انصاری نے کتنے ہیرے بنائے تھے؟" سلطان نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

" پندرہ!"

" ہم ان میں سے کتنے فروخت کر چکے ہیں؟"

" مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔ تمام ہیرے تمہارے ہاتھوں بیچے گئے ہیں۔" ڈاکٹر قاسم نے ناگواری سے کہا" اور مجھے شبہ ہے کہ تم نے مجھے ان کی پوری قیمت نہیں دی ہے ورنہ بارہ ہیرے کم از کم ایک لاکھ میں بکنا چاہئیں تھے۔ جبکہ تم نے صرف ستر ہزار بینک میں جمع کرائے ہیں۔"

" دوسرے الفاظ میں ابھی تین ہیرے باقی ہیں" سلطان نے ڈاکٹر کی بات پر کوئی توجہ دیئے بغیر کہا" اور غالباً وہ باقی تمام ہیروں سے بڑے بھی ہیں۔" بہرحال مگر ان میں سے سب سے بڑا ہیرا چھبیس قیراط کا ہے۔ ان سب کو بیچ کر بھی ہم لکھ پتی نہیں بن سکتے اور تم ۔۔۔

"میں انہیں فروخت کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔" سلطان نے بات کاٹی۔

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ تمہیں اپنے چہرے پر خوبصورت سی سفید داڑھی، ایک چشمہ اور چند جھرّیوں کا اضافہ کرنا پڑے گا ڈاکٹر شیرازی۔"

نواب زادہ آفتاب احمد خاں کا شمار دولت آباد کے بڑے اُمراء اور رؤسا میں ہوتا تھا۔ انگریزوں کے دورِ حکومت سے ان کے خاندان میں ایک بڑی جاگیر چلی آرہی تھی۔ جاگیر کے علاوہ بھی بہت بڑی جائداد کے مالک تھے جن میں کوٹھیاں مکانات، باغات اور ایک بڑی شکارگاہ شامل تھی۔ جاگیرداری نظام کے خاتمہ کے بعد اگرچہ جاگیر ہاتھ سے جاتی رہی مگر انہیں اس کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ اوّل تو اس لئے کہ ان کی ذاتی زمین اور جائداد اتنی تھی کہ نہ صرف وہ بلکہ آئندہ نسلیں بھی گھر بیٹھ کر شان و شوکت سے زندگی بسر کرسکتی تھیں۔ دوسرے اس لئے کہ ان کا کوئی بہت بڑا خاندان نہیں تھا جمعت کی بات تھی کہ ان کے پردادا کے زمانے سے خاندان میں بہت ہی کم اولادیں ہورہی تھیں۔ پردادا کے تین بھائی تھے۔ ایک کا جوانی میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے اولاد کا منہ دیکھنے کے لئے صدی عمر ترستے رہے۔ خود پردادا کے بھی صرف دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا ایک لڑکی۔ لڑکی شادی کے بعد دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ جاگیر تقسیم کے بغیر دادا کو مل گئی۔ ان کے یہاں بڑی آرزوؤں اور منتوں کے بعد نوابزادہ کے والد صاحب پیدا ہوئے۔ یہ کیفیت اگلی نسل میں بھی برقرار رہی۔ نوابزادہ آفتاب احمد خاں اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھے نوابزادہ بھی اتنے خوش نصیب نہ نکلے۔ ان کے صرف ایک لڑکی ہوکر رہ گئی۔ انہوں نے اس کا نام منیرہ رکھا۔ بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی۔ خود شکار کا بے حد شوق رکھتے تھے اس لئے بیٹی کو گھڑ سواری اور نشانہ بازی میں طاق کردیا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ ان کی تقدیر میں کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے، ایک دُور کے خاندانی عزیز کے لڑکے شکیل کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ پڑھایا لکھایا اور جوان ہونے پر منیرہ کی شادی اس کے ساتھ کردی۔ اس شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد نوابزادہ پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ منیرہ کو فطری طور پر اپنے شفیق باپ کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔ شکیل نے اس کا دل بہلانے کی بہت کوشش کی مگر پھر یہ دیکھ کر کہ کوٹھی میں رہتے ہوئے جس کا گوشہ گوشہ اسے مرحوم باپ کی یاد دلاتا ہے، اس کا سنبھلنا مشکل ہے، وہ اسے تبدیلیٔ آب و ہوا اور سیر و شکار کی غرض سے فیض گنج لے گیا جہاں نوابزادہ کی ذاتی زمین کے علاوہ شکارگاہ بھی واقع تھی۔ نتیجہ بڑا خوشگوار نکلا۔ منیرہ جلد ہی گاؤں کے سرسبز مناظر، جنگل میں مرغابیوں کے شکار اور دیہاتی عورتوں کے پرخلوص محبت بھرے برتاؤ میں اپنا غم بھولنے لگی۔

ایک دن شکیل اور منیرہ جنگل میں شکار کھیل رہے تھے۔ گاؤں کا کھیپا افضل خاں بھی ان کے ساتھ تھا۔ دوپہر قریب تھی اور وہ دونوں اب تک بیس بائیس مرغابیاں مار چکے تھے۔ اتنے شکار کو کافی سمجھتے ہوئے انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا اور اس سڑک کی جانب چل پڑے جو شکارگاہ کے مغربی کنارے پر واقع تھی اور آس پاس کے قصبوں تک ہی نہیں بلکہ بعض بڑی منڈیوں اور شہروں تک جاتی تھی۔ یہی سڑک آگے جاکر قومی شاہراہ سے بھی جاملتی تھی۔ جہاں سے دارالحکومت دولت آباد کا فاصلہ ڈیڑھ سو میل سے زیادہ نہیں تھا۔

ابھی وہ جنگل کے درمیان سے گزرنے والی پگڈنڈی پر کچھ ہی دُور چلے تھے کہ بائیں جانب سے کسی کے چیخنے چلّانے اور مدد کے لئے پکارنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شکیل اور اس کے پیچھے منیرہ درختوں اور خودرو جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے آواز کی سمت لپکے۔ تقریباً سو گز آگے جاکر انھوں نے دیکھا کہ درختوں کے درمیان ایک قدرے کھلی ہوئی جگہ پر جھاڑیوں کی ایک باڑ کے پاس ایک بوڑھا آدمی زمین پر گرا ہوا ہے اور اس کے قریب ہی ایک بڈھے بڑے بالوں والا نوجوان جس نے چمڑے کا جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی ہاتھ میں لکڑی کا ڈنڈا لئے بوڑھے کے سر پر ضرب مارنے ہی والا ہے۔

"خبردار!!" شکیل نے دُور ہی سے للکارا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

نوجوان نے پلٹ کر شکیل کی طرف دیکھا اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ جلدی وہ جھاڑیوں کے دوسری طرف چھلانگ لگا کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ شکیل اس کے تعاقب میں دوڑا۔ اتنی دیر میں منیرہ اور افضل خاں نے آگے بڑھ کر بوڑھے کو سنبھالا۔ بوڑھے نے پرانی وضع کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ اور بڑے پائنچوں کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی سفید داڑھی تھی۔ سر کے بال بھی بیشتر سفید ہوچکے تھے۔ جہاں وہ زمین پر گرا تھا وہاں اس کے قریب ہی موٹے کپڑے کا ایک تھیلا تھا جو کسی چیز سے نصف بھرا ہوا تھا، اور ایک ٹوٹی ہوئی عینک پڑی تھی۔

منیرہ اور افضل خاں نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ چہرے سے خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس نے منیرہ کو ممنون نظروں سے دیکھا:

"خدا کا شکر ہے بیٹی کہ تم عین وقت پر پہونچ گئیں۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا "ورنہ آج یہ بدمعاش میری جان ہی لے لیتا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر زمین سے اپنی عینک اٹھائی جس کا ایک شیشہ ثابت اور دوسرا ٹوٹ چکا تھا۔ بوڑھے نے ٹوٹے شیشے کی بقیہ کرچیں نکال کر دوسرا شیشہ کوٹ کے دامن سے صاف کرتے ہوئے اسے ناک پر رکھ لیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنا تھیلا بھی اٹھالیا۔

"غنیمت ہے کہ ایک شیشہ سلامت رہ گیا۔" وہ بڑبڑایا۔

"آپ کون ہیں؟" منیرہ نے نرم لہجے میں پوچھا "اور وہ آدمی کون تھا جو آپ کو مارنا چاہتا تھا؟"

"مجھے ڈاکٹر شیرازی کہتے ہیں۔" بوڑھے نے کہا "میں ایک سائنسدان ہوں۔ دولت آباد میں رہتا ہوں اور آجکل ایک اہم ایجاد کے سلسلہ میں ریسرچ کر رہا ہوں۔ وہ بدمعاش مجھ سے اس ایجاد کا فارمولا معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

اسی وقت شکیل جو ہیٹی نوجوان کے تعاقب میں گیا تھا، واپس آگیا۔

"وہ بچ کر فرار ہوگیا۔" اس نے بتایا "یہاں سے کچھ فاصلے پر اس نے سڑک پر اپنی موٹر سائیکل کھڑی کر رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس تک پہونچوں، وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔"

"یہ ڈاکٹر شیرازی ہیں۔" منیرہ نے شکیل سے بوڑھے کا تعارف کرایا "سائنسدان ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایک خاص ایجاد کی ہے اور وہ شخص ان سے اس ایجاد کا فارمولا چھیننا چاہتا تھا۔"

"ڈاکٹر شیرازی!" شکیل نے کچھ حیرت سے دُہرایا۔ وہ غور سے بوڑھے کو دیکھ رہا تھا "میں نے یہ نام پہلے تو کبھی نہیں سُنا۔"

"عام پبلک کے لئے میں گمنام ہُوں۔" ڈاکٹر شیرازی نے لاپرواہی سے کہا "اور گمنام ہی رہنا چاہتا ہوں۔ البتہ ملک اور بیرونِ ملک کے تمام بڑے سائنسدان مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرے اکثر تحقیقاتی مضامین برطانیہ اور امریکہ کے سائنسی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔"

"مگر آپ یہاں جنگل میں کیا کر رہے تھے؟" منیرہ نے پُوچھا۔

مگر اس سے پہلے کہ ڈاکٹر شیرازی کوئی جواب دیتے شکیل بول اٹھا۔

"دھوپ میں حدت بڑھتی جارہی تھی۔ ہم لوگ ویسے بھی گھر واپس جارہے تھے کیوں نہ ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیں۔ پھر وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کی جاسکتی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔" منیرہ نے تائید کی اور ڈاکٹر شیرازی کی طرف دیکھا "کیا آپ ہمیں اپنی میزبانی کا شرف عطا کریں گے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ڈاکٹر شیرازی نے اپنے ایک شیشے کی عینک سے جھانکتے ہوئے کہا "لیکن مجھے اپنے محسن میزبانوں سے تعارف تو حاصل ہونا چاہیئے۔"

"میرا نام منیرہ ہے اور یہ میرے شوہر شکیل صاحب ہیں۔ یہ جنگل جہاں آپ کھڑے ہیں ہماری شکارگاہ کا ایک حصّہ ہے۔ ہم یہاں شکار کھیلنے آئے تھے اور اب گھر واپس جارہے تھے۔"

"تمہاری شکارگاہ۔" ڈاکٹر شیرازی نے خیال انگیز لہجہ میں کہا "مگر مجھے جہاں تک معلوم ہے فتح گنج شکارگاہ کے مالک تو..... ذرا ٹھہرو۔ کیا تم نواب زادہ آفتاب احمد خان کی صاحبزادی تو نہیں ہو؟"

"جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔" منیرہ نے جواب دیا "آئیے تو پھر چلیں۔"

"خوب بخوب۔ کیا حسنِ اتفاق ہے۔" ڈاکٹر شیرازی نے تھیلا کندھے پر ڈال کر قدم بڑھاتے ہوئے کہا "نواب زادہ صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں مگر اپنی سائنسی اور تجرباتی مصروفیتوں میں ایک مدت سے میرا خیال ہے کہ کوئی پندرہ بیس سال سے ان سے ملاقات نہیں ہوسکی ہے۔ تم لوگ یہاں ہو تو ممکن ہے نوابزادہ صاحب بھی آئے ہوئے ہوں گے چلو اسی بہانے ان سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکیں گے۔ میری شب و روز کی مصروفیات نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کردیا ہے۔"

"آپ کو معلوم نہیں کہ نواب زادہ صاحب کا انتقال ہوچکا ہے۔" شکیل نے آہستہ سے کہا۔

"ارے یہ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟" ڈاکٹر شیرازی ایک دم رک گئے۔

"کوئی چھ سات ماہ ہوئے۔ ان پر فالج آگرا تھا۔" شکیل نے بتایا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" ڈاکٹر شیرازی نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ منیرہ کے

سوراخ

ایک صاحب حجامت بنوانے گئے مگر حجام اتنا اناڑی تھا کہ حجامت کے دوران جگہ جگہ خراشیں آئیں اور خون رسنے لگا۔ ان صاحب نے حجام سے کہا۔

"ذرا ایک گلاس پانی تو دینا۔"

"کیا بات ہے صاحب! کیا منہ میں صابن چلا گیا یا پیاس لگی ہے؟"

انہوں نے سر جھکا کر کہا "نہیں ــــ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے گالوں میں کتنے سوراخ ہوئے ہیں۔"

سر پر رکھ دیا۔ "مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے بیٹی۔ اس ایجاد کے جنون نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اب ساری زندگی مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اپنے عزیز دوست کے حالات سے اس درجہ بے خبر رہا کہ ملاقات تو درکنار عیادت بھی نہ کرسکا۔ بہرحال موت سے کس کو رُستگاری ہے۔ ایک نہ ایک دن سب ہی کو جانا ہے خدا تمہیں صبر دے۔ میں کسی طرح تمہارے کام آسکتا ہوں تو بلا جھجک کہہ دینا۔"

منیرہ کچھ اداس ہوگئی۔ شکیل نے گفتگو کا رخ دوسرے موضوعات کی طرف پھیر دیا۔ وہ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے حویلی پہنچ گئے۔ جو گاؤں میں نواب صاحب کی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ شکیل دولت آباد سے کوٹھی کے باورچی کو ساتھ لیتا آیا تھا جب تک سب لوگ نہا دھو کر کھانے کے لئے تیار ہوئے باورچی نے کئی مرغابیاں بھون کر دسترخوان پر لگادیں۔

کھانے سے فارغ ہوکر کمرۂ نشست میں گفتگو کا آغاز ہوا تو منیرہ نے اپنا سابقہ سوال دہرایا۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ جنگل میں آپ کیا کر رہے تھے؟"

میں پہلے شاید اس سوال کا جواب نہ دیتا۔ ڈاکٹر شیرازی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا "لیکن اب معاملہ ہی دوسرا ہے۔ تم ایک طرح سے میری اپنی بیٹی نسرین کی طرح ہو۔ تم سے اور شکیل میاں سے میں کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔"

وہ سگار کا ایک گہرا کش لینے کے بعد رُکے اور پھر دھواں اگلتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"بات یہ ہے کہ جس طرح کچھ لوگوں کو علم کیمیا سے سونا بنانے کا جنون ہوتا ہے اسی طرح مجھے اپنے زمانہ طالب علمی سے سائنس کی مدد سے ہیرے بنانے کا شوق تھا۔ اس شوق نے مجھے سائنس کا بہترین طالب علم بنادیا۔ اگرچہ ہمارے معاشی حالات ایسے نہ تھے کہ میں اعلیٰ تعلیم کرسکتا۔ لیکن اپنی ذہانت اور محنت سے ہر کلاس میں اوّل آکر میں نے وظائف حاصل کئے اور ان وظیفوں کی مدد سے نہ صرف ایم ایس سی

میں شاندار کامیابی حاصل کی بلکہ برطانیہ اور امریکہ کی مشہور یونیورسٹیوں میں بھی تحصیل علم کی اور پھر اپنے وطن واپس آکر جس حد تک بھی میرے وسائل اجازت دیتے تھے ہیرے بنانے کا کیمیاوی فارمولا معلوم کرنے کی دھن میں لگ گیا۔ اور بارہ سال کی شب و روز جدوجہد اور اپنی تمام آبائی جائداد قربان کر کے آخر میں نے وہ فارمولا ایجاد کر لیا جس سے روزمرہ استعمال میں آنے والی عام صاف شدہ چینی کے کاربن سے ہیرے بنائے جا سکتے ہیں۔"

"اوہ کیا واقعی؟" منیرہ جوش سے اچھل پڑی۔ "پھر تو آپ دنیا کے امیر ترین آدمی بن سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر شیرازی کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی ہنسی نمودار ہوئی۔

"ممکن ہے ابتدا میں میرے تحت الشعور میں یہی خواہش ان تجربات کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہو۔" انھوں نے آہستہ لہجے میں کہا۔ "لیکن اتنی زندگی گزارنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ محض دولت انسان کو ذہنی سکون اور طمانیت قلبی فراہم نہیں کر سکتی میں اپنی ایجاد سے اپنی ذات کے لئے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتا البتہ اتنی خواہش ضرور ہے کہ سید نگر میں میری بیٹی نسرین اپنی ماں کے ساتھ جس کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے اور محض غریب ہونے کی وجہ سے اب تک اس کے لئے کوئی اچھا رشتہ نہیں آسکا ہے کم سے کم اتنی دولت ضرور فراہم کر دوں کہ نہ صرف اب تک کی تنگدستی کا ازالہ ہو جائے گا بلکہ وہ آئندہ کسی کی دست نگر نہ رہیں۔"

"یہ بات اب تک واضح نہ ہوئی کہ آپ جنگل میں کیا کر رہے تھے۔" شکیل نے کہا وہ بڑی توجہ سے ڈاکٹر شیرازی کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ غور سے انہیں دیکھتا بھی جا رہا تھا۔

"وہی بتا رہا ہوں میاں شکیل۔" ڈاکٹر صاحب نے سگار کا کش لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا فارمولا اگرچہ اپنی جگہ بے حد کامیاب ہے۔ اتنا کامیاب کہ اس کے ذریعہ بنائے ہوئے ہیرے قدرتی ہیروں سے کہیں زیادہ صاف و شفاف و بے داغ ہوتے ہیں اور زیادہ قیمت پاتے ہیں مگر چونکہ میں انہیں زیادہ بڑے پیمانے پر بنانے کی قدرت نہیں رکھتا اس لئے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اب تک جو بڑے سے بڑا ہیرا میں نے بنایا ہے اس کا وزن دس قیراط سے زیادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ انہیں تراشنے کے بعد ان کا وزن اور کم رہ جائے گا اس لئے مقامی مارکیٹ سے ان کی قیمت چند سو سے زیادہ نہیں ملتی۔ اس میں مجھے اپنے اخراجات بھی پورے ۔۔۔ کرنا ہوتے ہیں اور مزید ہیرے بنانے کے لئے کیمیکلز بھی خریدنا پڑتے ہیں جو ہمارے ملک میں نہایت گراں قیمت پر دستیاب ہوتے ہیں۔ اور پھر کمیاب بھی ہیں۔ چنانچہ ان حالات میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ فارمولے کے قیمتی اور بنیادی کیمیاوی اجزا انہیں خود تیار کر دوں۔ یہ کیمیاوی اجزا بعض مخصوص جڑی بوٹیوں سے کشید کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند بوٹیاں اسی علاقے کے جنگلات میں خودرو پودوں کی صورت میں پائی جاتی ہیں میں ان ہی جڑی بوٹیوں کو حاصل کرنے کے لئے دولت آباد سے یہاں آیا تھا۔ اور جنگل میں ان ہی کو تلاش کر رہا تھا۔"

"اس حملہ آور نوجوان کو آپ کے اس فارمولے کا علم کیسے ہوا؟" منیرہ نے سوال کیا۔

"میں اسے اپنی غفلت کا نتیجہ ہی کہہ سکتا ہوں۔" ڈاکٹر شیرازی نے جواب دیا۔ "دراصل میں نے اپنے تجربات میں مدد دینے کے لئے سائنس کے ایک ہونہار طالب علم کو ملازم رکھا تھا۔ آج جس نوجوان نے مجھ پر حملہ کیا وہ اس طالب علم کا بڑا بھائی تھا اور گاہے گاہے اپنے بھائی سے ملنے میری لیبارٹری آتا رہتا تھا شروع میں میں نے اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کی لیکن میرا خیال ہے کہ یا تو اپنے بھائی کے ذریعہ یا پھر تجربات کی نوعیت کو دیکھ کر یہ نوجوان جس کا نام سلطان ہے اور جو بے حد شریر اور چالاک آدمی ہے اس بات سے واقف ہو گیا کہ میں ہیرے بنانے کا فارمولا ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اگرچہ اس کا شبہ ہوتے ہی میں نے اس کے بھائی کو بھی ملازمت سے علیحدہ کر دیا تھا مگر اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کئی مرتبہ میرے گھر آکر مجھے لالچ دینے کی کوشش کی کہ وہ بڑے پیمانے پر ہیرے بنانے کے لئے سرمایہ فراہم کر سکتا ہے میں اسے اپنے ساتھ شریک کر لوں میرے انکار پر دھمکیاں دینے لگا تین چار مرتبہ میری عدم موجودگی میں میرے گھر اور لیبارٹری میں گھس آیا۔ اور فارمولا چرانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے حفاظت کے خیال سے ایک بینک کے لاکر میں رکھ دیا تھا اس لئے اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب آج یہ غالباً دولت آباد سے میرے تعاقب میں چلا آیا تھا اور جنگل میں مجھے تنہا دیکھ کر دھمکی دی کہ اگر میں نے لاکر کی چابی اس کے حوالے نہ کی تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ میرے انکار پر پہلے اس نے مار مار کر زمین پر گرا دیا جس سے میری عینک بھی ٹوٹ گئی اور پھر سر پر وار کرنے ہی لگا تھا کہ تم لوگ پہنچ گئے اور یوں میری جان بچ گئی۔"

"اور آپ کی ایجاد اتنی خطرناک ہے کہ ابھی تو ایک شخص آپ کی جان کے درپے ہے۔" شکیل نے کہا۔ "یہ راز اگر زیادہ لوگوں خصوصاً ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ جرائم پیشہ افراد کو معلوم ہو گیا تو آپ کا جینا دشوار کر دیں گے۔"

"مجھے بھی اس بات کا اندیشہ ہے۔" ڈاکٹر شیرازی نے فکرمندی سے کہا

"آپ ایسا کیوں نہ کریں کہ اپنا فارمولا ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں۔" شکیل نے اچانک کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" منیرہ چونک کر بولی۔ "خدا کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ہمیں مزید دولت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم سمجھیں نہیں۔ بلاشبہ ہمیں اپنے لئے دولت کی ضرورت نہیں۔" شکیل نے کہا۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم ہیرے بنا کر اور پھر انہیں فروخت کر کے ضرورت مند انسانوں کی کتنی مدد کر سکتے ہیں۔" اس نے ڈاکٹر شیرازی کی طرف دیکھا۔ "جلد یا بدیر یہ فارمولا آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آپ حکومت کا تحفظ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو حکومت خود فارمولے پر قبضہ کر لے گی جبکہ فارمولا ہمیں دینے کے بعد آپ ہر فکر سے آزاد ہو جائیں گے۔"

"تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے لیکن میری بیٹی اور ۔۔۔ ۔۔۔"

"ہم آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کر دیں گے۔" شکیل نے کہا۔

"تب پھر مجھے منظور ہے اور سچ پوچھو تو دنیا میں میں کسی اور پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتا جتنا تم دونوں پر۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے فارمولے کو یقیناً ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت میں استعمال کرو گے۔"

"ایک بات اور۔" شکیل نے سوچتے ہوئے کہا۔ "برا نہ مانئے گا۔ میں آپ

کی بات پر شبہ نہیں کر رہا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ فارمولا کی فروخت مکمل ہونے سے پہلے آپ ہمیں ہیرے بنانے کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک! تم نہ بھی کہتے تب بھی میں ایسا ضرور کرتا۔" ڈاکٹر شیرازی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر اس کے لئے کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ پہلے مجھے فارمولے کی تمام دوائیں خود تیار کرنا پڑیں گی۔ تب پھر ۔۔۔ ۔۔۔"

"آپ کو دوائیں تیار کرنے کی ضرورت نہیں۔" شکیل نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ "دوائیں خریدنے کے لئے جتنی رقم کی ضرورت ہے وہ آپ ہم سے لے لیں۔ کتنے میں کام چل جائے گا؟"

"ایک چھوٹے تجربے کے لئے پانچ ہزار روپے کافی ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آج شام آپ ہمارے ساتھ دولت آباد چلیں۔ میں آپ کو پانچ ہزار کا چیک دے دوں گا۔ کل صبح آپ چیک کیش کرا لیں۔ ضروری دوائیں خرید لیں اور شام کو کسی وقت بھی کوٹھی تشریف لے آئیں۔ میرے خیال سے تجربے کے لئے لیبارٹری لازمی تو نہ ہو گی۔"

"بالکل نہیں۔ میں دوائیں اور ضروری چیزیں لے کر تمہاری کوٹھی آجاؤں گا۔ تجربہ وہاں بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر شیرازی نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

٭ ٭ ٭

"کہو استاد کیا رہا؟" سلطان نے ڈاکٹر قاسم کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر استفسار کیا۔

"شاندار کامیابی!" ڈاکٹر قاسم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میری اور تمہاری دونوں کی اداکاری انتہائی مؤثر رہی۔ اس احمق نوجوان شکیل اور نوابزادہ مرحوم کی بیٹی منیرہ کو یقین ہو گیا ہے کہ میری زندگی واقعی خطرے میں ہے۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ شکیل نے خود ہی فارمولے کو خریدنے کی تجویز پیش کر دی۔"

"گویا شکار پھنس گیا۔"

"بس اب ذبح کرنے کی دیر ہے۔"

"تجربہ کرنا پڑے گا؟"

"وہ تو ہر حالت میں ضروری تھا۔ اگر کوئی بڑی رقم اڑانا ہے تو انہیں اپنی آنکھوں سے ہیرا بنتے دکھانا لازمی ہے۔"

"تم ہاتھ کی اتنی صفائی سے کام لے سکتے ہو کہ دوائیں ہاون دستہ میں ڈالنے سے پہلے ہیرا چینی میں چھپا دو۔"

"یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ تم اس بارے میں اطمینان رکھو۔"

"لیکن فرض کرو شکیل نے خود اپنے ہاتھ سے تجربہ کرنا چاہا تب؟"

"تب میں اسے کرنے دوں گا۔"

"لیکن ۔۔۔ ۔۔۔"

"ظاہر ہے ہیرا نہیں بنے گا۔" ڈاکٹر قاسم نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس پر میں کہوں گا کہ محض دوائیں ڈالنے سے ہیرا نہیں بنتا بلکہ انہیں فارمولے کے مطابق ایک خاص وزن اور تناسب سے ڈالنا ضروری ہے اور یہ تناسب اس وقت تک نہیں بتایا جا سکتا جب تک وہ رقم نہ دے دیں۔ رقم وصول کر کے کاغذ پر الٹا سیدھا جو بھی وزن اور تناسب سمجھ میں آیا لکھ کر شکیل کے حوالے کر دوں گا۔ اس وقت تک دوائیں ختم ہو چکی ہوں گی۔ اس لئے وہ فوراً ہی کوئی اور تجربہ نہیں کر سکے گا۔ اور دوسرے دن جب تک وہ دوائیں فراہم کریں گے ہم یہاں سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ تم نے ہوائی جہاز میں سیٹیں تو بک کرا لی ہوں گی۔"

"ہاں۔ سید نگر کے لئے دو نشستیں رات گیارہ بجے کی فلائٹ میں بذریعہ ہو چکی ہیں۔"

"ارررر ۔۔۔ ستیاناس!"

"کیا ہو گیا؟" سلطان چونکا۔

"میں نے تمہیں جزیرہ فردوس کے لئے کہا تھا۔"

"میں نے سوچا آج کل جو بھی کوئی بڑا ہاتھ مارتا ہے سیدھا جزیرہ فردوس کا رخ کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس ہماری تلاش میں وہاں پہنچ جاتے۔ سید نگر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ کسی کو خواب میں بھی گمان نہ ہو گا کہ ہم اتنا بڑا فراڈ کر کے ملک کے اندر ہی کہیں بھاگنے کی کوشش کریں گے۔"

"مگر تمہاری اس سوچ نے کام بگاڑ دیا۔ اب تم فوراً وہ سیٹیں منسوخ کرا دو اور ایسا ہی ہے تو مرشد آباد کے لئے ریزرو کرا لو۔ میرا خیال ہے کہ رات کو کوئی نہ کوئی فلائٹ وہاں بھی ضرور جاتی ہو گی۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ میں شکیل کو بتا چکا ہوں کہ سید نگر میں میری بیٹی اور بیوی رہتی ہیں۔ فراڈ کھلتے ہی پولیس سب سے پہلے ہمیں وہیں دیکھے گی۔"

"یہ بیٹی اور بیوی کہاں سے لے آئے؟"

"ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ مجھے دکھانا تھا کہ مجھے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی بیٹی

ڈائجسٹ سائز میں
دنیا بھر میں ارزاں ترین
ہر موضوع پر، حسین و جمیل
شاہکار
جریدی کتب
ہر گھر کی بنیادی ضرورت ہیں
اپنے اخبار فروش سے منگوائیے یا قریبی بک سٹال سے خریدیے
یا ہم سے براہ راست طلب کیجئے،
مکتبہ شاہکار، چوک اردو بازار۔ لاہور

کے لئے دولت کی ضرورت ہے۔ اس طرح تاثر اور شدید ہو گیا۔ پھر عام نفسیاتی بات ہے کہ ایک گھر بار والے آدمی سے کسی دھوکے کی توقع نہیں کی جاتی۔"

٭ ٭ ٭

دوسرے دن شام کے چھ بجے منیر لاج کے ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر شیرازی، شکیل اور منیرہ موجود تھے۔ کھانے کے کمرے سے بڑی ڈائننگ ٹیبل لا کر درمیان میں بچھا دی گئی تھی جس پر اس وقت چھوٹی بڑی بہت سی شیشیاں، بوتلیں، بیکر، فلاسک، اسپرٹ لیمپ، ہاون دستہ اور مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

"میں تجربے کے لئے بالکل تیار ہوں۔" ڈاکٹر شیرازی نے شکیل کی طرف دیکھا "مجھے اُمید ہے کہ تم نے بھی باہمی فیصلہ کے مطابق دو لاکھ روپے بینک سے نکلوا لئے ہوں گے۔ مجھے آج دوپہر سیتہ نگر سے ایک ٹیلی گرام ملا ہے۔ نسرین کی ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے فوراً بلایا ہے۔ چنانچہ میں نے ٹوئن میں سیٹ ریزرو کرا لی ہے۔ تجربے سے فارغ ہو کر اور فارمولا تمہارے سپرد کر کے میں اطمینان سے سیتہ نگر جا سکوں گا۔"

"جی ہاں، رقم اس وقت بریف کیس میں رکھی ہے۔" شکیل نے صوفے پر سیاہ رنگ کے ایک بریف کیس کی طرف اشارہ کیا "آپ تجربہ شروع کریں۔"

ڈاکٹر شیرازی نے اسپرٹ لیمپ جلا کر اسٹینڈ کے نیچے رکھ دیا اور اس پر ایک بڑا سا بیکر رکھ کر اس میں بوتلوں اور شیشیوں سے دوائیں ڈالنے لگے۔ جب ساری دوائیں جن کی تعداد تیس سے کم نہیں تھی، بیکر میں ڈالی جا چکیں تو وہ ان کے ابلنے کا انتظار کرنے کے لئے صوفے پر آ بیٹھے۔ ہاون میں پہلے ہی سیر بھر سے زیادہ شکر بھر دی گئی تھی۔ ہاون دستہ لوہے کی ایک پلیٹ پر رکھا تھا۔ مزید احتیاط کے لئے اس کے نیچے لکڑی کا ایک تختہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔ منیرہ اور شکیل خاموشی سے بیٹھے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔

بیکر کا محلول کھولنے لگا تو ڈاکٹر شیرازی صوفے سے اٹھے۔ شیشیوں سے کچھ اور دوائیں، سفوف وغیرہ ہاون دستہ میں ڈالے اور بیکر کا دستہ پکڑ کر کھولتا ہوا محلول ہاون دستہ میں الٹ دیا۔ محلول پڑتے ہی ہاون دستہ سے ایک زبردست شعلہ اٹھا جس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ اسے نظر جما کر دیکھنا مشکل تھا۔ اس کی حدت بھی بہت زیادہ تھی۔ کمرہ گرم ہو گیا اور ہاون دستے کے کنارے تپے ہوئے لوہے کی مانند سُرخ نظر آنے لگے۔ پانی کا ایک بڑا سا ابال پہلے سے تیار تھا۔ جیسے ہی شعلہ ختم ہوا، ڈاکٹر شیرازی نے سنسی سے ہاون دستہ اٹھا کر ٹب میں ڈال دیا۔

چینی ایک بڑے سے کوئلے کی شکل میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر شیرازی نے ٹب میں ہاتھ ڈال کر کوئلہ نکال لیا۔

"ہیرا بن گیا ہے۔" وہ فاتحانہ لہجے میں بولا۔

"مگر یہ تو کوئلہ ہے۔" منیرہ نے کہا۔

ڈاکٹر شیرازی مسکرائے۔ "ہیرا اس کے اندر ہے۔ ذرا سل اور بٹہ لاؤ۔"

سل اور بٹہ آ گئے۔ ڈاکٹر شیرازی نے کوئلہ سل پر رکھا اور اس پر پوری طاقت سے بٹہ مارا۔ کوئلہ دو ٹکڑیوں سے کئی ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ اندر سے ایک چنے کے برابر سفید پتھر سا اُچھل کر دور جا گرا۔ ڈاکٹر شیرازی نے لپک کر اُسے اٹھا لیا۔

"یہ رہا ہیرا۔" انہوں نے کہا "میرا خیال ہے پندرہ بیس قیراط کا ضرور ہو گا۔"

"ذرا دکھایئے!" شکیل نے ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر شیرازی نے ہیرا اُسے دے دیا۔

"آپ نے تو کمال کر دیا۔" منیرہ خوش سے بولی۔

"معلوم تو ہیرا ہی ہوتا ہے۔" شکیل نے سنجیدگی سے کہا "مگر ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر شیرازی چونکے۔

"کوٹھی کے بیرونی کمرے میں دو جوہری بیٹھے ہوئے ہیں۔" شکیل نے بتایا "دونوں میرے اچھے واقف کار ہیں۔ میں نے انہیں اسی خیال سے بلایا تھا کہ تجربہ کے بعد ہیرے کی پرکھ کرائی جا سکے۔"

"اوہ، تو تمہیں بوڑھے ڈاکٹر پر اعتماد نہ تھا۔" شیرازی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری "مگر نہیں تم نے بہت اچھا کیا۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ بہرحال مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم ہیرا انہیں دکھا کر اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔"

شکیل ڈاکٹر شیرازی کو ساتھ لے کر کوٹھی کے بیرونی کمرے میں پہونچا، جو پورچ سے ملحقہ برآمدے میں سب سے پہلا کمرہ تھا۔ کمرے میں دو آدمی ——— ایک نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر گجراتی ٹوپی اور کچھ اسی طرح کا لباس پہنے بیٹھے تھے۔ شکیل کو دیکھ کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

"یہ ہیں موسیٰ جی اسماعیل بھائی جیولرز کے پارٹنر۔" شکیل نے تعارف کرایا "موسیٰ جی۔" اس نے ادھیڑ عمر کی طرف اشارہ کیا "اور اسماعیل بھائی۔" اب اشارہ نوجوان کی طرف تھا۔

"ذرا دیکھیے گا موسیٰ جی۔ اس پتھر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔" اس نے ہیرا ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھا دیا۔

موسیٰ جی نے بڑی احتیاط سے ہیرا اٹھایا پہلے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ پھر جیب سے ایک آئی گلاس نکالا اور کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک ہیرے کو ہر زاویے سے جانچتے اور پرکھتے رہے۔

"بہترین اور بے داغ ہیرا ہے۔" آخر انہوں نے کہا "مگر بہت چھوٹا ہے۔ اگر یہ اس سے دگنا ہوتا تو تراشے جانے کے بعد دس ہزار روپے سے کم قیمت نہ پاتا۔"

"شکریہ۔ بس اتنا ہی معلوم کرنا تھا۔ آپ لوگ تشریف رکھیں۔ ابھی چائے آتی ہو گی۔" شکیل نے کہا اور ڈاکٹر شیرازی سے مخاطب ہوا "آیئے ڈاکٹر صاحب۔"

وہ لاؤنج ڈرائنگ روم میں پہونچے۔

"اب تو تمہارا اطمینان ہو گیا؟" ڈاکٹر شیرازی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ لیکن آپ تو چلے جائیں گے۔ ایک مرتبہ میں آپ کے سامنے اپنے ہاتھ سے تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور۔" ڈاکٹر شیرازی صوفے پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگار نکال کر پینے لگے۔

شکیل نے پہلے رقم کا بریف کیس اٹھا کر ڈاکٹر شیرازی کی گود میں رکھ دیا۔

"آپ اپنی رقم سنبھالیں۔" اس نے کہا "ہمارا سودا طے ہو چکا ہے۔ یہ تجربہ میں محض اس لئے کر رہا ہوں کہ اگر کوئی غلطی کر جاؤں تو آپ کے سامنے اس کی اصلاح

ہو جائے۔"

"بے شک، بے شک۔" ڈاکٹر شیرازی نے دھواں اگلتے ہوئے سر ہلایا۔ پھر بریف کیس کھول کر نوٹوں کی ایک جھلک دیکھی اور اسے دوبارہ بند کر دیا۔ اسی وقت منیرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ مہمانوں کو چائے بھجوا کر واپس آ رہی تھی۔

"کہئے کیا رہا؟" اس نے شکیل سے پوچھا۔

"میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔" شکیل مسکرایا۔ "مگر آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"اب میں خود اپنے ہاتھ سے تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔" شکیل نے فارمولے کا کاغذ دیکھتے ہوئے جواب دیا جس پر دواؤں کے نام اور وہ ترتیب جس سے انہیں بیکر میں ابالنا یا ہاون دستہ میں ڈالنا تھا وضاحت سے تحریر تھی۔

شکیل نے بیکر میں دوائیں ڈال کر اسپرٹ لیمپ جلا دیا۔ ہاون میں مزید چینی بھری۔ اس میں مقررہ دوائیں ڈالیں اور جب بیکر کا محلول کھول گیا تو اسے ہاون میں الٹ دیا۔ اس دوران ڈاکٹر شیرازی اطمینان سے صوفے پر بیٹھے سگار کے کش لگاتے ہوئے انہیں دیکھتے رہے۔ بیکر کا محلول ہاون دستہ میں الٹتے ہی متوقع ردِعمل ہوا۔ پھر جب شعلہ بجھ گیا تو شکیل نے ہاون دستہ اٹھا کر پانی کے ٹب میں ڈال دیا۔ چند منٹ بعد وہ ٹب سے شکر کے بنے ہوئے کاربن کا ٹکڑا نکال رہا تھا۔ "یہاں تک تو غالباً سب ٹھیک ہوا ہے۔" وہ بولا "اب دیکھنا چاہیئے کہ اس کاربن کے اندر ہیرا بھی بنا ہے یا نہیں۔"

اس نے کوئلہ پتھر کی سل پر رکھ کر بٹہ مارا۔ یہ کوئلہ کچھ سخت تھا۔ تیسری ضرب میں ٹوٹا اور اس کے اندر سے پہلے تجربے کے مقابلہ میں کچھ بڑا ہی ہیرا برآمد ہوا۔

"میں نے ہیرا بنا لیا۔" شکیل جوشِ مسرت سے اچھل پڑا۔ وہ انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ہیرے کو پکڑے ڈاکٹر شیرازی کو دکھا رہا تھا۔

ڈاکٹر شیرازی کے ہاتھ سے سگار چھوٹ گیا۔ ان کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ خود پر قابو پا کر شکیل کی طرف جھپٹے۔

"ذرا مجھے دکھانا۔" انہوں نے ہیرا تقریباً اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ غور سے دیکھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو روکنے کی وہ پوری کوشش کر رہے ہیں۔

"ایک مرتبہ پھر یہ تجربہ دُہراؤ۔" انھوں نے شکیل سے کہا "تمہیں یاد ہے نا کہ تم نے کونسی دوا کتنی مقدار میں ڈالی تھی؟"

"جی ہاں بالکل!"

"بس تو پھر ایک بار اسی مقدار میں دوائیں ڈالو۔"

"مگر کیوں؟"

"سوال مت کرو۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے جو بعد میں بتاؤں گا۔ دوائیں ڈالنے کے ساتھ ساتھ فارمولے کے کاغذ پر ان کا صحیح وزن بھی لکھتے جاؤ۔"

شکیل نے ایک مرتبہ پھر تجربہ کیا اور ڈاکٹر شیرازی کے کہنے کے مطابق دواؤں کی مقدار بھی نوٹ کرتا گیا اور اس بار بھی پتھر کی سل پر ایک اور ہیرا موجود تھا۔

"کتنا عجیب اتفاق ہے۔" ڈاکٹر شیرازی بڑبڑائے۔

"آپ نے کچھ کہا؟" شکیل نے پوچھا۔

"ہاں۔" ڈاکٹر شیرازی سنبھل کر بولے۔ "میں ایک بہت ضروری بات بھول گیا تھا۔ اس تجربے میں ایک اور سائنسداں بھی میری مدد کر رہے تھے۔ بلکہ ایک طرح سے یہ فارمولا انھی کی ایجاد ہے۔ مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ میں یکطرفہ طور پر فارمولے کی فروخت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا جب تک مجھے اپنے دوست کی رضامندی حاصل نہ ہو۔ اس لئے تم اپنے دو لاکھ لے لو اور فارمولا مجھے دے دو۔"

"گستاخی معاف ڈاکٹر صاحب، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا سودا ہو چکا ہے۔ اب یہ فارمولا میری ملکیت ہے، اور میں اسے واپس کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اپنے دوست کی اجازت کے بغیر میں فارمولا فروخت نہیں کر سکتا۔"

"یہ آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" شکیل نے سرد مہری سے جواب دیا۔

ڈاکٹر شیرازی نے بے بسی سے منیرہ کی طرف دیکھا۔

"بیٹی کچھ تم ہی مدد کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے دوست کو سمجھا بجھا کر فارمولا انہیں واپس دلا دوں گا۔ لیکن پہلے مجھے ان سے اجازت لینا ضروری ہے۔" انہوں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ ڈاکٹر صاحب کی بات مان لیں۔" منیرہ نے سفارش کی "ظاہر ہے کہ ہم اپنے فائدے کے لئے ہیرے بنانا نہیں چاہتے تھے۔ انسانیت کی فلاح مقصود تھی اور ڈاکٹر شیرازی کو خطرات سے بچانا بھی مدِنظر تھا۔ اگر فارمولا انہوں نے اپنے کسی دوست کی مدد سے ایجاد کیا ہے تو اس کی فروخت کے لئے ان کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ اور پھر جبکہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے دوست کی اجازت حاصل کر کے فارمولا واپس لا دیں گے۔"

"بالکل۔ بالکل۔" ڈاکٹر شیرازی نے جلدی سے کہا۔ شکیل جیسے کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"ہم اپنا سیر و شکار ترک کر کے یہاں آئے تھے۔" آخر وہ بولا۔ "یہ دو دن سے کافی وقت اور توجہ بھی صرف کر چکے ہیں۔ ہمیں اس کا کچھ نہ کچھ نعم البدل ضرور ملنا چاہیئے۔ اگر ڈاکٹر شیرازی فارمولا واپس چاہتے ہیں تو اب انہیں تین لاکھ روپے ادا کرنا ہوں گے۔"

"میرے پاس ایک لاکھ روپیہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر شیرازی نے جواب دیا۔

"شاید میرے دوست کے پاس کچھ رقم ہو لیکن وہ بھی ایک لاکھ نہیں ہو گی تم اپنا مطالبہ کم نہیں کر سکتے؟"

"جی نہیں۔" شکیل نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا چلو ڈھائی لاکھ لے لو۔ دیکھو انکار مت کرنا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں مان لینا چاہیئے۔" منیرہ نے ایک بار پھر سفارش کی۔ شکیل نے گہری سانس لی۔

"اچھی بات ہے تم کہتی ہو تو میں زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔ ڈاکٹر شیرازی پچاس ہزار روپیہ لے آئیں اور فارمولا لے جائیں۔"

اس سے قبل کہ اس کا فقرہ مکمل ہو ڈاکٹر شیرازی لپکتے ہوئے کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

"میں تم سے حلفیہ کہتا ہوں کہ تقدیر کے ایک عجیب اتفاق کے تحت اس احمق شکیل نے صحیح صحیح وہ مقدار اور تناسب معلوم کر لیا جس سے ہیرے بن جاتے ہیں" ڈاکٹر قاسم نے پرجوش لہجے میں سلطان سے کہا۔ "اس نے دو مرتبہ میری نظروں کے سامنے ہیرے بنائے۔ اگر بعض دوائیں ختم نہ ہو جاتیں تو میں تیسرا تجربہ ضرور کراتا۔"

"اگر ایسا ہے تو پچاس ہزار میں یہ سودا مہنگا نہیں" سلطان نے بھی جوش میں بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "اپنی روانگی کے پیشِ نظر میں نے بینک سے تمام رقم نکلوا لی تھی۔ تم اس میں سے پچاس ہزار لے جاؤ۔ تم نے شکیل سے دواؤں کی مقدار تو لکھوا لی ہے نا؟"

"ہاں اور اسی فارمولے کے کاغذ پر" ڈاکٹر قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس بیوقوف کو احساس تک نہیں ہو سکا اور نہ اس نے ذہن پر زور دینے کی ضرورت سمجھی کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ اب تم جلدی سے رقم دے دو۔ یہاں اتنی دوائیں موجود ہیں کہ تین چار مرتبہ کے استعمال کے لئے کافی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ اگر چینی کی مقدار اور زیادہ کر دی جائے تو ضرور بڑا ہیرا بنے گا۔"

"ابھی نہیں" سلطان نے جلدی سے کہا۔ "پہلے تو اسی وزن اور مقدار کے مطابق تجربہ کرنا ہوگا جس طرح شکیل نے کہا تھا پھر دیکھیں گے کہ چینی کی مقدار اور بڑھانے سے کچھ فرق پڑتا ہے یا نہیں۔ تم بیٹھو میں روپے لاتا ہوں۔"

٭ ٭ ٭

ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈاکٹر شیرازی ایک مرتبہ پھر منیرہ لاج میں موجود تھے۔

"لو میاں شکیل میں پچاس ہزار روپیہ لے آیا ہوں۔ اچھی طرح گن لو اور فارمولا مجھے دے دو۔"

"گننے کی ضرورت نہیں" شکیل نے سرسری لہجے میں کہا۔ "آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی ہوں گے۔ فارمولا میز پر رکھا ہے اٹھا لیں۔"

ڈاکٹر شیرازی نے جھپٹ کر اس طرح میز سے کاغذ اٹھایا جیسے ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ کہیں غائب ہو جاتا۔ اس کے بعد جلدی جلدی دواؤں کی شیشیاں اور بوتلیں وغیرہ اس بکس میں رکھنے لگے جس میں رکھ کر وہ تمام چیزیں کوٹھی لائے تھے۔

"اگر آپ کے دوست نے اجازت دے دی تو آپ فارمولا ہمیں دے دیں گے؟" منیرہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں ضرور مگر اب تمہیں کچھ زیادہ رقم دینا پڑے گی آخر میرے دوست کو بھی زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ سہارا درکار ہوگا۔" ڈاکٹر شیرازی نے جواب دیا اور بکس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

٭ ٭ ٭

ڈاکٹر قاسم نے ٹب سے کوئلہ نکال کر پتھر کی سل پر رکھا۔ ہتھوڑا اٹھایا اور زور سے کوئلہ پر مارا۔ سلطان قریب ہی اشتیاق آمیز بےچین نظروں سے ضرب کا انجام دیکھنے کے لئے جھکا کھڑا تھا۔ ضرب ترچھی پڑی تھی۔ کوئلہ اچھل گیا۔

"یہ پہلا ثبوت ہے" ڈاکٹر قاسم نے کہا۔ "صحیح تناسب سے بننے والا کاربن زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کے اندر ہیرا ضرور نکلے گا۔" اس نے دوبارہ کوئلہ پتھر کی سل پر رکھا اور اس مرتبہ زیادہ قوت سے ہتھوڑا مارا۔ کوئلہ کئی ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ سلطان اور ڈاکٹر قاسم بیتابی سے ان ٹکڑوں میں ہیرا تلاش کرنے لگے۔ مگر جلد ہی ان کے اشتیاق سے چمکتے ہوئے چہروں پر مایوسی نمایاں ہونے لگی۔

"ہیرا تو نہیں بنا" سلطان پہلے بولا پھر سیدھا کھڑا ہو کر ہاتھ جھاڑنے لگا۔

"ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے" ڈاکٹر قاسم بڑبڑایا۔

"غلطی نہیں حماقت" سلطان نے غصے سے کہا۔ "اور اس حماقت کے ذمہ دار تم ہو۔ دو لاکھ تو کیا ہاتھ آتے اپنی گرہ سے پچاس ہزار دے آئے۔"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر قاسم نے حیرت سے پوچھا۔

"تم شکیل کو بیوقوف کہہ رہے تھے مگر اس نے ... ہم دونوں کو احمق بنا دیا۔ جس طرح تم نے ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہیرا پہلے سے چینی میں ڈال دیا تھا شکیل نے وہی ترکیب ہم پہ آزمائی اور تم دھوکہ کھا گئے۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ ہو رہا تھا مگر تم ہمارے بیان پر اعتماد کر کے رقم دے دی۔"

"لیکن .... لیکن وہ ہیرے بالکل اسی طرح کے تھے جس طرح کے ڈاکٹر انصاری نے بنائے تھے" ڈاکٹر قاسم نے کہا۔

"تم بھول گئے کہ ہم ان میں سے بارہ ہیرے بازار میں فروخت کر چکے ہیں شکیل کے لئے انہیں خریدنا کیا مشکل تھا۔"

"اگر تم اتنے ہی عقل مند تھے تو پہلے کیوں نہیں بتایا" ڈاکٹر قاسم نے غصہ سے کہا۔ "اس معاملہ سے شروع سے اب تک تمہاری وجہ سے ہر کام بگڑا ہے۔ ہم کبھی اس پریشانی میں مبتلا نہ ہوتے اگر تم نے ڈاکٹر انصاری کو قتل کرنے میں جلد بازی نہ کی ہوتی میرے فائل چیک کرنے سے پہلے تم نے اسے گولی مار دی۔ اب ہم قیامت تک دواؤں کی صحیح مقدار اور ان کا باہمی تناسب معلوم نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر ابھی پتہ نہیں اور کیا کچھ کہتا کہ دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر رک گیا۔ سلطان بھی چونک گیا۔ دونوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ایک نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر قاسم نے اسے فوراً پہچان لیا وہ ادھیڑ عمر جوہری موسیٰ جی کا دوسرا ساتھی اسماعیل بھائی تھا جسے اس نے کوٹھی میں دیکھا تھا۔

"اسماعیل بھائی تم یہاں کیسے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"اسماعیل بھائی نہیں۔ انسپکٹر ریاض۔ تم دونوں کا شکریہ کہ تم نے خود ہی اقبالِ جرم کر کے ہمارا کام آسان کر دیا۔"

"انسپکٹر ریاض!" بیک وقت ڈاکٹر قاسم اور سلطان کی زبان سے نکلا۔

"ہاں۔ اور اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ بعد میں اس گفتگو سے انکار کر دو گے تو تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں کہ کمرے کی کھڑکی میں مائکروفون لگا کر نہ صرف یہ گفتگو سنی جا چکی ہے بلکہ ٹیپ بھی کر لی گئی ہے۔" ریاض نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔ "میں تم دونوں کو ڈاکٹر انصاری کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں قانونی طور پر تمہیں اختیار ہے کہ تم چاہو تو خاموش رہ سکتے ہو لیکن کوئی بیان دینا چاہو تو اسے مقدمہ کی سماعت کے دوران تمہارے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

٭ ٭ ٭

ادھر ڈاکٹر شیرازی اپنا بکس اٹھائے کمرے سے باہر نکل کر نظروں سے اوجھل

ہوئے ادھر شکیل نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ منیرہ جو اس تمام واقعہ کے دوران بار بار اس کے غیر متوقع طرزِ عمل پر الجھ رہی تھی اب خاموش نہ رہ سکی۔

"دو چار دن سے آپ بہت پراسرار نظر آ رہے ہیں" وہ بولی۔ "میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس بے موقع قہقہہ کی غایت کیا ہے؟"

"یہ قہقہہ بے موقع ہرگز نہیں ہے" شکیل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "رہا غایت کا سوال تو مجھے یہ سوچ سوچ کر ہنسی آ رہی ہے کہ جب ڈاکٹر شیرازی المعروف بہ ڈاکٹر قاسم اپنی لیبارٹری میں پہنچ کر ہیرا بنانے کی کوشش ناکام پائیں گے اور ان پر یہ انکشاف ہوگا کہ کوئی ان سے بھی بڑا استاد ہاتھ کی صفائی دکھا گیا تو تگنی کا ناچ ناچ اٹھیں گے یا پھر زندہ دل قسم کے آدمی ہوئے تو تالیاں بجا کر اور ایک ہاتھ کان پر رکھ کر گائیں گے شکار کرنے گئے تھے شکار ہو کے چلے۔ اے واہ شکار ہو کے چلے۔"

"ڈاکٹر قاسم" منیرہ چونکی۔ "یہ وہ تو نہیں جنہیں پولیس ڈاکٹر انصاری کے قتل کے سلسلے میں تلاش کر رہی ہے؟"

"قتل کے سلسلے میں نہیں قتل کے الزام میں" شکیل نے جواب دیا۔

"مگر ڈاکٹر شیرازی تو بوڑھے ہیں جبکہ ڈاکٹر قاسم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ......"

"اگر ان کے چہرے سے مصنوعی سفید داڑھی اور میک اپ شدہ جھریاں نیز سر سے بالوں کی وگ اتار دی جائے تو اندر سے تازہ بہ تازہ چھلے چھلائے ڈاکٹر قاسم نمودار ہو جائیں گے۔"

"مگر ...... مگر آپ کو یہ شبہ کب اور کیسے ہوا؟"

"مجھے پہلے ہی دن ان کی صورت جانی پہچانی لگ رہی تھی پھر جس شخص نے ان پر حملہ کیا تھا یعنی وہی نوجوان اس کا حلیہ بھی اخبار میں خبر کی تفصیل میں دیا گیا تھا میں نے کوٹھی واپس آتے ہی اخبار نکال کر ڈاکٹر قاسم کی تصویر دیکھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر شیرازی کے بھیس میں وہی ہیں اور یہ کہ وہ ہمیں کسی خاص مقصد سے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خبر میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر انصاری کسی خاص ایجاد پر تجربہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر قاسم نے جب ہیرے بنانے کا فارمولے کا ذکر کیا تو مجھے تقریباً یقین ہو گیا کہ اس ایجاد کا تعلق ہیرے بنانے سے ہوگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر ڈاکٹر انصاری کا فارمولا مکمل طور پر ڈاکٹر قاسم کے ہاتھ آ گیا ہوتا تو انہیں یہ کھیل کھیلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فارمولے میں کوئی خامی رہ گئی ہے جسے ڈاکٹر انصاری کے مقتول ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر قاسم دور کرنے سے قاصر ہیں اور اب وہ اس نامکمل فارمولے سے دوسری طرح یعنی ہم جیسے دولت مند لوگوں کو بیوقوف بنا کر فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں چنانچہ ایک جانب میں نے انسپکٹر ریاض سے رابطہ قائم کیا جو جوہری اسماعیل بھائی کے میک اپ میں وہ یہاں آئے اور انہوں نے ڈاکٹر قاسم کو فوراً پہچان لیا۔ دوسری طرف میں نے جوہری بازار میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ حال ہی میں دس بارہ غیر تراشے ہوئے ہیرے فروخت کئے گئے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر قاسم ہیرے بنانے کے تجربہ میں ہاتھ کی صفائی دکھانا چاہتے ہیں چنانچہ میں نے تین ہیرے خرید لئے اور پھر ان کی طرح ہیرا بناتے ہوئے ان میں سے ایک ہیرا چینی میں چھپا دیا پھر جس طرح ڈاکٹر قاسم نے مجھ سے دواؤں کی تعداد لکھوائی اس سے ظاہر ہوا کہ انہیں یہی مشکل درپیش تھی کہ دواؤں کا صحیح تناسب معلوم نہیں تھا میں نے ہیرا بنا کر دکھایا تو وہ یہ سمجھے کہ محض حسن اتفاق ہے میں وہ تناسب معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور انہوں نے فوراً بہانہ بنا کر فارمولا واپس لے لیا۔ مجھے امید ہے کہ انسپکٹر ریاض جو جوہری کے میک اپ میں سادہ لباس پولیس کے ساتھ کوٹھی کے باہر موجود تھے یہاں سے ڈاکٹر قاسم کی خفیہ قیام گاہ تک تعاقب کرتے ہوئے پہنچ گئے ہوں گے اور جب ڈاکٹر قاسم کو یہ معلوم ہوگا کہ میں نے ان کی ترکیب ان ہی پر الٹ دی ہے تو ان کے اور سلطان کے درمیان اس پچاس ہزار کے نقصان کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی گفتگو وہاں ضرور ہوئی ہوگی جس سے انسپکٹر ریاض کو ان کے جرم کا ثبوت مل ......"

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی شکیل نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے انسپکٹر ریاض بول رہا تھا شکیل چند منٹ تک اس سے گفتگو کرتا رہا پھر مسکراتے ہوئے ریسیور رکھ کر منیرہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"لو مبارک ہو" اس نے کہا۔ "ہماری اسکیم کامیاب رہی اور ڈاکٹر قاسم اور اس کے ساتھی سلطان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"تعجب ہے۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شبہ نہیں ہو سکا کہ وہ ڈاکٹر شیرازی کے علاوہ کوئی اور ہو سکتے ہیں" منیرہ نے حیرت سے کہا پھر قدرے مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ کو تو کوئی جاسوس ہونا چاہیئے تھا۔"

"انسپکٹر ریاض بھی یہی کہہ رہے تھے" شکیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بلکہ انہوں نے تو پیشکش بھی کی ہے کہ مجھے سنجیدگی سے پولیس کی ملازمت کے بارے میں غور کرنا چاہیئے۔"

"مگر اب سوال یہ ہے کہ ہم ان پچاس ہزار روپوں کا کیا کریں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر قاسم اور سلطان نے یہ رقم ڈاکٹر انصاری کے بنائے ہوئے ہیرے فروخت کر کے حاصل کی ہے" شکیل نے جواب دیا۔ "سر دست تو اس رقم کی حیثیت ایک ثبوت کی ہے اور ہمیں یہ پولیس کے حوالے کرنا پڑے گی لیکن مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد مجھے یقین ہے کہ یہ اور اگر اور رقم بھی ہوئی تو وہ سب ڈاکٹر انصاری کے اہل و عیال کو دے دی جائے گی جس کی انہیں موجودہ حالات میں ضرورت بھی ہوگی۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ ڈاکٹر قاسم جیسے پڑھے لکھے افراد بھی دولت کے لالچ میں جرم و تشدد پر اتر آتے ہیں" منیرہ نے کہا۔

"آدمی کا زعمِ باطل اسے مختلف خوش فہمیوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے" شکیل نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تو صرف ایک فرد کے ایک فرد کی جان لینے کا معاملہ ہے یہاں تو ایسے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں جو جاہ و اقتدار کے لالچ میں قوموں کی زندگی سے کھیلتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہر مجرم کو ایک نہ ایک دن یوم احتساب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔"

کینہ

شائستہ وحید

مرقع کی تیسری کہانی

بالآخر میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا گیا اور جو کچھ فیصلہ ہوا تھا وہ میری توقع کے برعکس نہیں تھا، یعنی سزائے موت۔ بجلی کی کرسی کیسی ہوتی ہوگی۔ وہ ایک بار بدن میں کرنٹ لگا تھا۔ ایک شدید جھٹکا، ذہن ساکت ہو جاتا ہے اور پورے بدن میں گدگدی سی۔ لیکن وہ برقی رو جو سزائے موت کے وقت الیکٹرک چیئر میں دوڑائی جاتی ہے اس معمولی سے جھٹکے سے لاکھوں گنا زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اچھا ہے جیسے معمولی سا جھٹکا لگنے سے ذہن ایک لمحے کے لئے سو جاتا ہے اسی طرح اتنی طاقتور برقی رو تو سوچنے سمجھنے کی قوت ہی مفلوج کر دیتی ہوگی۔ سائنس نے جہاں لوگوں کو تکلیف پہنچانے کی بہت سی ایجادات کی ہیں، وہیں انسان کی آسانی کے لئے بھی بہت سے کام ہوئے ہیں۔ پہلے پھانسی کے تختے ہوتے تھے۔ رسّی میں گردن باندھ دی جاتی تھی اور پھر پیروں کے نیچے سے رکاوٹ ہٹا دی جاتی تھی، بڑی تکلیف ہوتی ہوگی، لیکن اب مرنے میں بڑی آسانیاں ہوگئی ہیں۔ کرسی پر بٹھاؤ، بٹن آن کرو اور پلک جھپکتے میں کوئلے کے ڈھیر کے علاوہ اور کچھ باقی نہ رہ جائے۔

موت ایک بھیانک تصور ہے، کون مرنا چاہتا ہے۔ کسی سو سالہ ... بوڑھے کو موت پیش کرو، وہ آخری کوشش کرے گا کہ زندگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ حالانکہ اس کی زندگی کی ساری خواہشات پوری ہو چکی ہوتی ہیں۔

لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ جس وقت مجھے سزائے موت سنائی گئی، میں نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔ بعض اوقات انسان کی زندگی اس نہج پر پہنچ جاتی ہے جہاں وہ خود زندہ نہیں رہتا بلکہ ایک مقصد اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا رہتا ہے وہی مقصد روح کہلاتا ہے اور جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو زندگی مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اب اگر آپ اس غلیظ مٹی سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں تو اس کا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھریں۔ ورنہ جب مقصد پورا ہو گیا تو پھر زندگی کیا معنی رکھتی ہے۔

اور میں خوش نصیب انسان ہوں، جو میرا مقصد تھا میں اسے پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ٹھاکر لچھن سنگھ کے چھ جوان بیٹے، اس کی بیوی، وہ خود، ایک بیٹی ایک داماد، پورے دس آدمی تھے۔ اور میں نے ان دسوں کے دسوں کو انہی کے گھر میں بند کر کے جلا دیا تھا۔

ہاں میں نے جو کہا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا۔ اپنے باپ کی لاش پر کھڑے ہو کر میں نے اس کے سینے سے ابلتا ہوا خون اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چہرے پر ملا تھا اور پوری بستی کے سامنے کہا تھا "بستی والو! سن لو، تم نے دیکھا لچھن سنگھ نے میرے بوڑھے باپ کو کس طرح قتل کیا ہے۔ خدا کی قسم! حکومت لچھن سنگھ کو اس سلسلے میں کوئی سزا دے یا نہ دے۔ میں اس کے خاندان کو نیست و نابود کر دوں گا۔ میں لچھن سنگھ کی نسل کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ سنو بستی والو! میں جا رہا ہوں، تم میں سے کسی کی جرأت ہو تو میرے باپ کو کفن پہنا دینا، نہیں تو اس لاش کی تقدیر میں جو بھی ہو۔ میری زندگی کا اب صرف ایک مقصد ہے۔

اور پھر برسات کی ایک رات جب تین دن تک بارش لگاتار برسنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے رکی تو بستی والوں نے دیکھا کہ ٹھاکر لچھن سنگھ کی حویلی شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کی اور اس کے اہل خانہ کی دردناک چیخیں رات کے سناٹے میں دور دور تک گونج رہی تھیں اور جب بستی کے ہمدرد لوگ حویلی کی طرف دوڑے تو سنساتی گولیوں نے ان کا استقبال کیا اور رات کے سناٹے میں گونجنے والی آواز میری ہی تو تھی۔

"بستی والو! میں عصمت خان تم سے مخاطب ہوں طارق خان کا بیٹا جس کی لاش میں تمہارے حوالے کر گیا تھا، آج میں اپنے باپ کا انتقام لے رہا ہوں میرے نزدیک مت آؤ، میں نہیں چاہتا کہ کسی اور کو نقصان پہنچے۔ ہاں اگر تم لچھن سنگھ سے وفاداری کا اظہار ہی چاہتے ہو تو رات گذر جانے دو، ان جسموں کو خاکستر ہو جانے دو۔ صبح کو ان جلی ہوئی لاشوں کے ساتھ میں بھی نہیں ملوں گا۔"

اور وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ میں نے انتہائی پرامن انداز میں خود کو بستی والوں کے سپرد کر دیا اور بستی والوں نے مجھے پولیس کے سپرد۔ بات وہی ہوئی نا۔ یعنی مقصد، باپ کی موت کے بعد میں نے قسم کھائی تھی اور قسم کھاتے وقت مجھے پورا پورا احساس تھا کہ جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں اس کا نتیجہ کیا ہوگا، سو میں نے سوچ لیا کہ لچھن سنگھ نے صرف میرے باپ کو قتل نہیں کیا بلکہ مجھے بھی مار دیا ہے، کیونکہ اب میں زندہ نہ تھا، صرف ایک مقصد زندہ تھا، اور جب وہ پورا ہو جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے صرف مٹی کا ڈھیر۔ تو پولیس نے اس مٹی کے ڈھیر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ نہ مجھے یاد ہے اور نہ ہی یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر بھی حیران تھے کہ کس سرپھرے سے پالا پڑ گیا ہے، بستی والوں کی بھلا کیا مجال تھی کہ میری ہمدردی کرتے۔ حکومت نے ہی میرے لئے وکیل صفائی مقرر کر دیا تھا اور وہ بے چارہ بھی مجھ سے عاجز آ گیا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ مجھ سے کہتا میں اس کو الٹا ہی کرتا تھا سو نہایت آسانی سے میں نے اپنے لئے سزائے موت کی راہ ہموار کر لی اور مجھے موت کی سزا سنا دی گئی۔

یہ چند روز عجیب و غریب احساسات کے روز تھے، نہ جانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے وقت کا کوئی تعین نہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے۔ آج سے چار دن بعد سوا چھ بجے مجھے سزائے موت دے دی جائے گی۔ کیسے مزے کی بات ہے مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے، ساری روایتیں جھوٹی ہو جاتی ہیں۔

لیکن صاحب کیا کہا جا سکتا ہے، روایتوں کا قیام بہرحال کوئی معنی ضرور رکھتا ہے اور بعض اوقات انسان جو خود کو بہت زیادہ ذہین سمجھنے لگتا ہے، بری طرح چوٹ کھاتا ہے۔ سو یہی میرے ساتھ ہوا۔ غالباً میری موت میں صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے ایک ایسی کوٹھری میں بند کیا گیا تھا جہاں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے تھے۔

تنگ و تاریک کوٹھری موت کے انتظار کا کوئی مونس نہیں ہوتا، ایک قبر کی مانند اور میں خود منکر تھا اور خود نکیر۔ اپنا حساب آپ لے رہا تھا۔ زندگی میں کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے، کس پر ظلم کیا اور کس کے ساتھ نیکی۔ اونہہ! نیکی اور بدی کا فیصلہ ہونے میں اب کتنی دیر باقی رہ گئی ہے، جس کا جو کام ہے، کرے گا، میں کسی کے معاملات میں ٹانگ کیوں اڑاؤں؟

تو صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب تنگ و تاریک کوٹھری میں کوئی انسانی آواز نہیں سنائی دے گی۔ گویا یہ قبر ہے جو مجھے زندگی ہی میں عطا کر دی گئی ہے۔ لیکن رات کے نہ جانے کونسے پہر جبکہ نیند آنکھوں میں بھر آتی ہے خواہ اس کے بعد موت ہی کیوں نہ نصیب ہو جائے۔ مجھے ہلکی سی چاپ محسوس ہوئی، شاید اس کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ پھر روشنی کی ایک رمق اندر آئی۔ اور اچانک کوئی دھڑام سے میرے اوپر آ گرا۔

میں بوکھلا کر اٹھ گیا اور ٹٹول ٹٹول کر اسے دیکھنے لگا، اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ کوئی انسانی جسم ہے۔ اس نے بھی مجھے محسوس کر لیا اور اس کے ہاتھ میرے بدن کو میری مانند ٹٹولنے لگے۔ پھر ایک غراہٹ نما آواز سنائی دی:

"ہا۔ کون ہو بھائی اور اس کوٹھری میں کیوں ہو؟"

"پکنک پر آیا ہوں" میں نے مسخرے پن سے کہا اور دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ سوچنے لگا تھا کہ پھانسی کی کوٹھری میں یہ کون بے جگر ہے جو اس مزاحیہ انداز میں گفتگو کر سکتا ہے۔ پھر جب حیرت کا دور ختم ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا:

"نوجوان ہو؟"

• اور تم شاید بوڑھے معلوم ہوتے ہو؟

• یہی بات ہے؟

• بڑے میاں یہ پھانسی کی کوٹھری ہے، کیا یہ بات بھی تمہیں معلوم ہے؟

• ہاں میں بھی سزائے موت پانے والا ہوں؟ بھاری آواز نے جواب دیا۔

• میرے بارے میں کیا پوچھا تھا تم نے؟

• آواز سے جوان معلوم ہوتے ہو؟ بوڑھے نے کہا۔

• ہاں۔ بڑے میاں میری جوانی کے اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں۔ پورے اٹھارہ گھنٹے اور اس کے بعد میں بوڑھا ہو جاؤں گا، پھر مر جاؤں گا۔ اب بتاؤ کیا میں پیدا ہو گیا، کیا میں جوان ہوں، بوڑھا ہو چکا ہوں یا مر چکا ہوں۔ کیا تم اٹھارہ گھنٹے کی زندگی کو کوئی حیثیت دے سکتے ہو، ہاں کہو گے تو میں تمہیں احمق سمجھوں گا؟

چند ساعت خاموشی طاری رہی پھر بوڑھے کی آواز ابھری: کیا موت کے خوف نے تمہارا ذہن ماؤف کر دیا ہے؟ اور میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر گئیں، میں نے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا۔

• کیا بکواس کرتے ہو، موت کیا ہے۔ خوف کیسا ہوتا ہے۔ میں لاش ہوں لاش، خوف کسی زندہ انسان کے سینے میں تو بیدار رہ سکتا ہے لیکن تم لاش کا دل کہاں سے لاؤ گے۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ تمہیں موت سے پہلے ختم کر دوں گا۔ پورے دس انسانوں کو قتل کیا ہے میں نے۔

اور بوڑھے کی ہنسی بے حد ٹھنڈی تھی۔

" میرا گریبان چھوڑ دو نوجوان۔ دلچسپ انسان معلوم ہوتے ہو۔ زندگی نے کوئی مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ؟

" کہانی سننا چاہتے ہو؟ میں داستان گو نہیں ہوں؟ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

• کہانی — گندی ہوئی داستان کو کہتے ہیں اور جو گذر جائے وہ قابل ذکر نہیں ہوتا۔ میں مستقبل کی باتیں کرنا پسند کرتا ہوں؟

" کیوں آئے ہو یہاں؟

• یہ لوگ مجھے موت دینے لائے ہیں؟

• آہا۔ سزائے موت کے قیدی ہو؟ میں نے خوش ہو کر کہا۔

• ہاں؟

• کتنے مارے تھے، کیوں مارے تھے؟

• تم مجھ سے وہی بات پوچھ رہے ہو جس پر خود جھلا گئے تھے؟

• اوہ۔ بات درست ہے؟ میں نے اعتراف کیا۔ لیکن بڑے میاں موت کوئی خوف تو نہیں ہے، مرنے کا رنج تو نہیں ہے؟ اور بوڑھے نے پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

" موت مجھے پیش کی گئی ہے، میں نے اسے قبول نہیں کیا۔

• کیا مطلب؟

• اے میں زندہ انسان ہوں، موت نہیں چاہتا اور تم سن لو مروں گا بھی نہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص مرنا نہ چاہتا ہو اور اسے موت دے دی جائے ہم قدرت کی دی ہوئی موت کو نہیں ٹال سکتے لیکن انسان کی کیا مجال ہے کہ وہ کسی کو مار سکے؟

• بجلی کی کرسی پورے بدن میں سرور کی لہریں دوڑا دیتی ہے اور انسان اس قدر لذت محسوس کرتا ہے کہ پھر کبھی آنکھ نہیں کھولتا؟ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

• کہنا یہ چاہتے ہو کہ ہمارے لئے سزائے موت تجویز کرنے والے ہمیں کسی طرح نہ جینے دیں گے؟

• ہاں میرا مقصد یہی ہے؟

• تو تم بزدل ہو؟ بوڑھے نے حقارت سے کہا۔ مجھے دیکھو انہوں نے مجھے سزائے موت دے دی ہے لیکن میں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا اور میں قبول کروں گا بھی نہیں، اب سے کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا؟

• بہت خوب؟ میں نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

• چلو گے میرے ساتھ؟

• نہیں۔ دیکھوں گا کہ تم کس طرح باہر جاتے ہو؟

• زندگی کی آرزو نہیں ہے؟

• نہیں؟

• اوہ۔ پھر تمہاری بزدلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، احمق نوجوان مجھے دیکھ میں بوڑھا ہوں، معذور ہوں۔ لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تو اتنی چھوٹی سی عمر میں کیوں مرنا چاہتا ہے؟

• میری ایک منطق ہے۔ میں مقصد کو زندگی سمجھتا ہوں اور جب مقصد پورا ہو جائے تو زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے؟

• تو تمہارا مقصد پورا ہو گیا؟

" ہاں؟

" لیکن نوجوان تم نے اتنی طویل زندگی کو صرف ایک مقصد کے قابل کیوں سمجھا۔ یہ تو خوش بختی ہے کہ انسان کو کچھ مقصد حاصل ہو جائے۔ تمہارے نظریے کے مطابق اگر تم زندگی کا سب سے بڑا مقصد حاصل کر چکے ہو اور اپنی دانست میں زندگی ختم کر چکے ہو تو پھر ان بقیہ سانسوں کو کسی اور مصرف میں کیوں نہیں لگا دیتے تمہیں کیا معلوم جس زندگی کو تم اس بے دردی سے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہو ممکن ہے وہ کسی کے کام ہی آ جائے۔ نہ جیو اپنے لئے، اپنے آپ کو کسی دوسرے کے حوالے کر دو، ممکن ہے اس کی زندگی کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہو؟

بوڑھے کے الفاظ نے نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعی میری سوچ غلط ہو، لیکن بڑے میاں بھی پاگل ہی معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی صرف چند گھنٹوں کے لئے رہ گئی تھی اور وہ نکل جانے کی باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ بھی خاموشی سے کچھ سوچ رہے تھے، پھر وہ بولے۔

" میرے خیال میں تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر رہے ہو؟

• تم نے میرا ذہن الجھا دیا ہے؟ میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

" ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں تمہیں زندگی کی راہ پر لے جانا چاہتا ہوں۔ تم نہ جانے کیوں موت کی وادیوں میں گم ہو جانا چاہتے ہو؟

• اوہ۔ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، زندگی اور موت میرے لئے یکساں ہے، غور تو کرو اس دنیا میں اربوں انسان ہیں۔ زمین کے ایک ایک حصے پر لاکھوں جاندار ہیں۔ ان میں رشتے ہیں، ناطے ہیں، محبتیں ہیں، اپنائیت ہے۔ میں نہیں کہتا کہ دنیا میں میرے جیسے نہ ہوں گے لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ انہیں میری مانند جینے کی خوشی نہ ہو گی۔ میری زندگی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں مر جاؤں گا تو کوئی آنسو نہیں بہائے گا۔ ایسے بے مقصد انسان کو کیوں جینا چاہیئے۔

• مرنا بھی نہیں چاہیئے، تم اپنے لئے کیوں جیتے ہو، میں نے کہا، تمہاری زندگی اگر کسی کے کام آ جائے تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے؟

• کیوں آ جائے جب کہ مجھ سے ہمدردی نہیں رکھتا، ساری دنیا میرے لئے اجنبی ہے تو میں ان اجنبیوں سے محبت کیوں کروں، کیوں کسی کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دوں۔ ان سے انتقام لینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ خود کو فنا کر دیا جائے؟

تب بوڑھے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے انداز میں بڑی محبت تھی۔ بڑی اپنائیت تھی۔

• ٹوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہو، بڑی توڑ پھوڑ ہوئی ہے تمہاری شخصیت میں، نہ جانے کون سنگدل تھا جس نے تمہیں زندگی سے اتنی دور دھکیل دیا ہے۔ بہر حال میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ یوں سمجھو میں ایک خود غرض انسان ہوں اور اپنے لئے تمہاری زندگی چاہتا ہوں؟

• لیکن میرے بزرگ! ہم دونوں سزائے موت کے مجرم ہیں، جیل کی کوٹھری میں ہیں اور تم اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو، یہاں سے نکلو گے کس طرح؟

• بہت آسانی سے، بات یہ ہے کہ میں ابھی زندگی چاہتا ہوں۔ میں نے موت قبول نہیں کی، اور جو موت قبول نہیں کرتے، وہ موت سے جنگ کرنا بھی جانتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد میں زندگی کے لئے موت سے جنگ کروں گا۔ اگر اس جدوجہد میں مارا گیا تو سمجھ لوں گا کہ اس جنگ میں شکست ہو گئی، ممکن ہے زندگی ہی کامیاب ہو جائے؟

• اگر مجھے میری زندگی کا کوئی مصرف بتا دو تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا؟

• مصرف ہے، اور ایسا ہے کہ تمہیں اس سے دلچسپی ہو جائے گی، لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا؟

• ہوں؟ میں اس کی باتوں پر غور کرنے لگا، درحقیقت میں نے پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا اور نہ خود کو اس طرح بستی والوں کے سپرد نہ کرتا۔ اسی وقت اپنے بچاؤ کی جدوجہد کرتا، لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی واقعی ایسی بے حقیقت چیز نہیں ہے، زندگی کے بہت سے دور ہوتے ہیں۔

" کیا سوچا؟

" میں تیار ہوں؟ میں نے جواب دیا اور بوڑھے نے مجھے ٹٹول کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

• یقین کرو زندگی بہت خوبصورت ہوتی ہے بشرطیکہ اسے گذارنے کے

واپسی کا کرایہ

شوہر اور بیوی کی لڑائی ہو رہی تھی۔ جب بیوی سے بس نہ چلا تو روتی چلاتی ہوئی آئی اور بولی "میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں ابھی اپنی ماں کے گھر جا رہی ہوں۔"

شوہر نے فوراً چند نوٹ نکال کر اسے تھمائے اور بولا۔ "لو بھئی! یہ ہوائی جہاز کا کرایہ لو اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

بیوی اسی طرح روتی ہوئی بولی۔

"اور واپسی کا کرایہ بھی تو دو۔"

گر سیکھ لیے جائیں۔ میں اب بھی اور کبھی بھی تم سے یہ بات نہیں پوچھوں گا کہ تم یہاں تک کس طرح پہنچے، لیکن اپنے بارے میں اتنا ضرور بتاؤں گا کہ میں جان بوجھ کر یہاں تک آیا ہوں؟

• کیا مطلب؟

• میں نے صرف چند روپوں کے لئے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، بھرے بازار میں تاکہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے ان روپوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی!

• اوہ؟ میں نے حیرت سے کہا۔

• یہ حقیقت ہے میرے بچے، میں تمہیں اس کا ثبوت دے دوں گا؟

• لیکن آخر کیوں، تم یہاں کیوں آنا چاہتے تھے؟

• اس داستان کو ہم کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ برسات کا موسم دور ہے اور امن کا... دور ہے، ہم کچھ وقت سکون سے گذار سکتے ہیں؟ بوڑھے کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بہر حال مجھے اس کی شخصیت دلچسپ محسوس ہوئی تھی اور میں اس کی باتوں میں بھی دلچسپی لے رہا تھا۔

" پھر اب کیا کیا جائے؟

" کیا وقت ہوا ہو گا؟ بوڑھے نے پوچھا۔

• مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے؟

• اوہ۔ کیا یہاں بہت تاریکی ہے؟

• تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟ میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

" مجھے؟ بوڑھا چند ساعت کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر ایک گہری سانس لیکر بولا۔ "یا تو یہاں گہری تاریکی ہے، یا پھر تم مذاق اڑا رہے ہو؟

• کیا مطلب؟ میں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"میں اندھا ہوں" بوڑھے نے جواب دیا اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ اب تک کی گفتگو سے کہیں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ بوڑھا اندھا بھی ہے۔ میری خاموشی سے ہی بوڑھے نے اندازہ لگا لیا کہ میں ابھی تک اس بات سے لاعلم تھا، چنانچہ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے اس وقت گہری تاریکی ہے اور تم میری صورت نہیں دیکھ پائے۔"

"ہاں یہ حقیقت ہے، لیکن محترم دوست! کیا تمہاری ساری باتیں ناقابلِ فہم نہیں ہیں۔ تم اندھے بھی ہو، تم نے ایک قتل بھی کیا ہے اور تم یہاں سے نکل جانے کی باتیں بھی کرتے ہو۔"

"بلاشبہ تمہیں میری یہ باتیں حیرت انگیز محسوس ہو رہی ہوں گی۔ لیکن میرے پیارے بیٹے! کچھ عرصے کے لئے اپنے تجسس کی آنکھ کو بند کر لو اور صرف میری ہدایات پر عمل کرو۔ میرا خیال ہے بہت مختصر وقت میں تمہیں میرے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔" بوڑھے کے لہجے میں عاجزی تھی اور میں کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اب تک میں نے صرف جذباتی انداز میں سوچا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ مقصد کے حصول کے بعد زندگی ضروری نہیں ہوتی۔ لیکن بوڑھے سے گفتگو کرنے کے بعد نہ جانے کہاں سے میرے ذہن میں بھی زندگی کی روشنی کی ایک کرن در آئی تھی، اور میں زندہ رہنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا، تب بوڑھے کی آواز ابھری۔

"کیا تم تیار ہو؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "میں تیار ہوں۔"

"بہت خوب۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں زندگی کی اہمیت سے آشنا کر دیا۔ بہت ہی عمدہ۔ تو میرے بچے۔ ہم اب سے چند منٹ کے بعد کام شروع کر دیں گے، ہاں تمہیں اس جیل میں کتنا عرصہ گذر گیا؟"

"تقریباً ڈیڑھ سال۔" میں نے جواب دیا۔

"یقیناً تم اس کی پوری پوزیشن سے واقف ہو گے، کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس وقت تم جہاں موجود ہو یہ جگہ جیل کی آخری دیوار سے کتنی دور ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تم صرف ایک بار مجھے اس کا نقشہ سمجھا دو۔" بوڑھے نے کہا اور میں اپنی یادداشت کے سہارے اسے صورتحال سمجھانے لگا۔ بوڑھا بہت غور سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے غالباً گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے، اس طرح تو معمولی چالاکی سے ہم جیل کی دیوار عبور کر سکتے ہیں بیٹے۔"

"لیکن اس آہنی کوٹھری سے کیسے نکلو گے؟"

"سنتری یہاں سے خاصی دور ہے، اور تم بتا چکے ہو کہ کوٹھری کے پیچھے ایک ناکارہ گلی موجود ہے جو کوڑا کرکٹ پھینکنے کے کام آ سکتی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر ممکن ہے ہم سنتری کو قتل کئے بغیر ہی دیوار تک پہنچ جائیں اور پھر باہر نکلنے کے لئے ہم گٹر لائن استعمال کریں گے، وہی گٹر لائن جو دیوار کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔"

"لیکن چچا جان! اوّل تو اس کوٹھری کی موٹی سلاخیں، اور پھر جس گٹر لائن سے آپ فرار کا پروگرام بنا رہے ہیں اس کے اوپر بھی آہنی جنگلا زمین کی خاصی گہرائیوں میں نصب ہے۔ وہاں سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے اس طرف محافظ خاص نگرانی بھی نہیں رکھتے۔"

"واہ۔" بوڑھا خوش ہو کر بولا۔ "اور تم کہتے ہو فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، چلو آؤ۔" بوڑھا اٹھ گیا، اور پھر وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور دوسرے لمحے کوٹھری کے آہنی جنگلے کے قریب پہنچ گیا۔ میں متحیرانہ انداز میں اس کے سائے کو دیکھتا رہا اور پھر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے جنگلے تک پہنچ گیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ کچھ ہو رہا تھا۔ تاریکی کی کسی حد تک عادی آنکھوں نے اس کے چوڑے سائے کو محسوس کیا تھا اور پھر کچھ اور بھی محسوس ہوا۔ اس کے بعد بوڑھے کی طویل سانس ابھری۔

"آؤ۔" اس نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ باہر نکل گیا۔ میں بھی متحیرانہ انداز میں جنگلے کو ٹٹولنے لگا، اور پھر مجھے سلاخوں کے درمیان کافی چوڑا خلا نظر آیا۔ اتنا چوڑا کہ میں بآسانی اس سے نکل گیا۔ اب نہ جانے کیوں مجھے بوڑھے کی شخصیت پر کسی قدر اعتبار آ گیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ شاید ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" بوڑھے نے کہا اور وہ میری ڈھال بنا رہا۔ ایک بار پھر میرا ذہن ڈانواڈول ہونے لگا تھا۔ بوڑھا جس انداز میں چل رہا تھا اس سے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندھا ہے۔ محافظ اس کوٹھری سے کافی دور تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ رات کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی اور پھر وہ اس گٹر کے قریب رک گیا جس کے بارے میں میں نے اسے بتایا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے سرگوشی میں پکارا۔

"سنو۔ کیا یہی وہ جگہ ہے؟"

"ہاں۔" میں نے بے ساختہ کہا اور پھر خود ہی اپنی حماقت پر مسکرا دیا۔ بوڑھا مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ لیکن وہ خاموشی سے زمین پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پھر اس نے گٹر کی سلاخیں پکڑ لیں۔

"تھوڑے سے پیچھے ہٹ جاؤ۔" اس نے کہا اور میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ تب میں نے مٹی کا ایک تودہ زمین سے ہٹتے دیکھا۔ خوفناک بوڑھے نے گٹر اٹھا لیا تھا جو اپنے ساتھ قرب و جوار کی مٹی اکھاڑ لایا تھا۔ اور زمین میں ایک چوڑا سوراخ بن گیا، جس کے نیچے پانی بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

بوڑھے نے آواز پر کان لگا دیئے، پھر آہستہ سے بولا۔ "گہرائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں ہے، میرا خیال ہے ہم بآسانی نیچے کود سکتے ہیں، اور یہ اچھی بات ہے کہ گٹر کافی کشادہ ہے، آؤ۔ میری تقلید کرو۔" اس نے کہا اور دوسرے لمحے غڑاپ سے اندر کود گیا۔ اب میں بھی اتنا بزدل نہیں تھا کہ سوچنے میں وقت گنواتا۔ یوں بھی مجھے زندگی سے کوئی ایسی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ہر وہ کام کر سکتا تھا جو دوسرے نہ کر سکیں۔

چھپاک سے میں غلیظ پانی میں جا پڑا، جس میں شدید تعفن تھا لیکن پانی ٹخنوں سے تھوڑا سا ہی اونچا تھا اور اس کا بہاؤ بہت آہستہ تھا۔

بوڑھا بھی میرے نزدیک ہی کھڑا تھا، پھر اس نے کہا۔ "ہمیں بہاؤ کی مخالف سمت چلنا چاہیئے۔ ظاہر ہے پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور یہ نشیب کسی گہرے نالے یا ندی پر ختم ہوتا ہو گا، اس لئے اس طرف جانا خطرناک ہے۔"

"یقیناً۔" میں نے تائید کی۔

"آؤ۔" بوڑھے نے کہا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ پھر تھوڑی دور چلنے کے بعد بوڑھا بولا۔ "میرا خیال ہے تم آگے آ جاؤ، کیونکہ تم آنکھیں رکھتے ہو، کسی بھی خطرے سے آگاہ کر سکتے ہو، میرا خیال ہے یہاں بھی گہری تاریکی ہو گی؟"

"ہاں، یہاں بھی گہری تاریکی ہے۔" میں نے کہا۔

حالانکہ خود مجھے اپنی آواز عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے لہجے میں خود شکوک و شبہات تھے۔ میں اس کو اندھا کیونکر تسلیم کر لیتا، کس بنا پر کرتا۔ اس کی ساری حرکتیں آنکھوں والوں کی سی تھیں، وہ اندھا کیسے ہو سکتا ہے۔

کشادہ گٹر میں جس قدر تعفن پھیلا ہوا تھا، اس کے پیشِ نگاہ بڑی مشکلات سے گذرنا پڑ رہا تھا لیکن بہر حال ایک منزل تک تو پہنچنا ہی تھا۔ موت کے قریب جاتے جاتے جس طرح میں زندگی کے قریب لوٹ آیا تھا، وہ بس انھونی ہی تھی۔ لیکن زندگی نے مجھے ایک اور موقعہ دیا تھا تو اب میں اس سے گریزاں نہ تھا، یوں ہم چلتے رہے ــــ چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ چھت میں روشنی نظر آئی تو میں نے بوڑھے کو اس سے آگاہ کیا۔

"اوہ۔ میرا خیال ہے ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ اب اوپر نکل جانا نامناسب نہ ہو گا۔" بوڑھے نے کہا۔

چھت کافی اونچی تھی، لیکن گٹر میں اترنے کے لئے لوہے کی سیڑھیاں تھیں چنانچہ میں نے پہلے بوڑھے کو ہی ان سیڑھیوں تک پہنچایا، کیونکہ ابھی تو صورتحال کا اندازہ کرنا تھا۔ وہ خود کو اندھا کہہ رہا تھا، اس لئے اس کا احساس تو رکھنا ہی تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر وہ انتہائی اطمینان سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا، مین ہول سے باہر نکل گیا۔

میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی، تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اوپر تھے پتلی سی ایک گلی تھی جس کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے تھے، زیادہ روشنی نہیں تھی، بس دُور دُور پولز پر اسٹریٹ بلب لگے ہوئے تھے یا کہیں کہیں لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے، جن کی روشنی تھوڑے سے حصے کو منور کر رہی تھی۔ کافی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات کیونکہ زیادہ گذر چکی تھی۔ اس لئے جاگتے ہوئے لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید گلیوں کے کتے بھی سو گئے تھے۔

"کیا کیفیت ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔" میں نے جواب دیا۔

"یوں لگتا ہے جیسے رات کا آخری پہر ہو، لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ خاموشی چھائی ہو۔"

"ہوں۔" میں نے گردن ہلائی۔

"کیا تمہارے بدن پر بھی قیدیوں والا لباس ہے؟"

"ظاہر ہے۔" میں ہنس پڑا۔

"ہاں واقعی یہ کچھ بے تکا سوال تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے دوست کہ سب سے پہلے ہمیں اس لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔"

"لیکن کس طرح؟"

"چوری۔" اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں چوری۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔"

"لیکن یہ ترکیب بے حد خطرناک ہو گی محترم بزرگ۔"

"خطرناک ــــ بھئی تم نے اس لفظ کو قیمت دوسری دے رکھی ہے، ورنہ تو خطرات زندگی کے کس لمحے میں نہیں ہوتے۔ کونسا وقت ایسا ہوتا ہے جب ہم خطرات سے دور ہوتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے نوجوان دوست کہ ہمارا آنے والا لمحہ کتنے خطرناک لمحات سے بھرپور ہو گا۔ مجھے بتاؤ کیا سڑک پر چلتے وقت تمہیں یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ کسی کار کا ٹائی راڈ ٹوٹے گا اور وہ تمہارے اوپر آ چڑھے گی، کیسے بچ سکتے ہو میرے بچے۔ خطرات تو ہر جگہ موجود ہیں میرے دوست! انہیں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

بوڑھا دلچسپ انسان معلوم ہوتا تھا اور بہر حال اس کی باتیں حقیقت سے دور نہ تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے پسند آتا جا رہا تھا۔ "لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم کسی مکان میں داخل ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہی بہتر ہے۔"

"تب ٹھیک ہے، کسی بھی مکان کا انتخاب کر لیا جائے۔"

"لیکن اس سلسلے میں میں ناکارہ ثابت ہوؤں گا، سوائے اس کے کہ باہر کھڑا قدموں کی چاپ سنتا رہوں۔ میرے دوست تم کوشش کرو۔ یہاں صرف تم کام کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں، تم اس جگہ کھڑے ہو جاؤ اور ہاں اگر کوئی خاص خطرہ محسوس کرو تو سیٹی بجا دینا۔" میں نے کہا اور بوڑھے نے گردن ہلا دی۔

عجیب و غریب حالات تھے، خطرناک تھے بھی اور نہیں بھی۔ اب سے کچھ گھنٹے پہلے میرے ذہن میں تصور بھی نہ تھا کہ میں زندگی کے لئے کوئی جدوجہد کروں گا لیکن اب ــــ اب میں مکمل طور سے زندہ رہنے کا خواہشمند تھا۔

مکان میں داخل ہونے کے بعد اور اپنی مرضی کے لباس چرانے میں جو حالات پیش آئے۔ ان میں ایسا کوئی واقعہ نہ تھا جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہو۔ بس ہوا یوں کہ کچھ کرنسی اور چند لباس جو میری دانست میں ہم دونوں کے بدن پر آ سکتے تھے، حاصل کر لئے گئے اور میں باہر نکل آیا۔

شاید قسمت ہی یاور تھی کہ ان حالات میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا نہ کوئی ناخوشگوار بات ہوئی۔ بوڑھے کے نزدیک پہنچا تو اس نے بڑے تپاک سے

میری طرف اپنے ہاتھ بڑھائے۔

"کیا کامیاب آئے ہو میرے بچے؟" اس نے پوچھا۔

اور ایک بار پھر میں حیران رہ گیا، اس کا انداز ایسا نہیں تھا جس سے وہ اندھا معلوم ہوتا، تاہم میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ کام بن گیا۔"

"بہت خوب!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ہم ایک دیوار کی سمت بڑھ گئے۔ سب سے پہلے میں نے اور پھر بوڑھے نے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ جیل کے کپڑے ہم نے وہیں ایک طرف گٹھڑی بنا کر ڈال دیئے تھے۔ یہ لباس جو میں نے پہنا تھا وہ تو میرے بدن پر فٹ تھا، لیکن بوڑھے کی جسامت اچھی خاصی تھی، اس بنا پر لباس اسے کچھ تنگ تھا، تاہم کام چل سکتا تھا میں نے کرنسی احتیاط سے جیب میں رکھی اور ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

"اب کیا خیال ہے؟" بوڑھے نے پوچھا

"یہ تو تم ہی بتا سکو گے، میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس وقت ہم ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ میں نے بوڑھے کے چہرے پر نگاہیں دوڑائیں۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا اور ایک بار پھر مجھے ذہنی جھٹکا لگا۔ میرے خیال کے مطابق بوڑھا اندھا ہونے کا فریب کر رہا ہے، ورنہ اس میں کوئی بات بھی اندھوں جیسی نہ تھی۔ لیکن اب میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو احساس ہوا کہ روشنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں دو گڑھے تھے جن میں کچھ نہ تھا، یقیناً وہ اندھا تھا۔

لیکن ایک اندھا اس قدر تیز حسیات کا مالک۔ یہ بات بہت متحیر کن تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے نوجوان؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"آصف خان۔" میں نے جواب دیا، اور بوڑھا گردن ہلانے لگا۔ تب میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی بوڑھے کا نام پوچھ لوں۔

"اور تمہارا ...؟"

"میرا نام؟" بوڑھا چند لمحات کے لئے رکا اور پھر بولا "سوما۔"

"سوما؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں سوما۔"

"تمہاری قومیت کیا ہے؟" میں نے اس نام پر حیران ہو کر پوچھا۔

"قومیت — کچھ بھی سمجھ لو، کچھ بھی کہہ لو۔ یہ سب کچھ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بس ہم دوست ہیں، یہی کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے، مجھے بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اب ہم کہاں چلیں؟" چند منٹ کے بعد میں نے پوچھا۔

"آصف!" بوڑھے نے مجھے پکارا۔

"ہاں؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ، اگر تمہیں زندگی مل جاتی تو تم کہاں صرف کرتے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"یہ بات مجھ سے بار بار کیوں پوچھتے ہو؟ میں بتا چکا ہوں کہ پوری دنیا میں میرے باپ کے سوا میرا کوئی نہ تھا اور وہ مر چکا ہے اس کی موت کے بعد میں نے بھی مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور تم نے دیکھا میں موت کے کتنا نزدیک تھا۔ اب تم مجھے زندگی کے قریب لے آئے ہو تو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو، میرا کوئی نہیں ہے۔ میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔"

"اوہ۔ میرے بچے آصف، میں تمہارے رشتوں کو نہیں کریدنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں کوئی خاص خواہش تو نہیں ہے، اگر نہیں ہے تو میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"گڑھی مہابت خان۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"ہاں۔ میں اسی طرف کا رہنے والا ہوں۔"

"اوہ ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے جب میرا اس دنیا میں ٹھکانہ ہی نہیں تو پھر کہیں بھی چلو۔"

"تب پھر میرے دوست ہمیں اسی وقت اسٹیشن چلنا چاہئے۔"

"چلو۔" میں نے لاپرواہی سے کہا اور ہم دونوں اسٹیشن کی جانب چل پڑے۔ لباس تبدیل ہوئے تھے ہی اس لئے کسی نے خصوصی طور پر ہماری طرف توجہ نہیں دی اور ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں ہم نے گڑھی مہابت خان کے لئے ٹرین کا ٹائم دیکھا۔ اتفاق ہی کی بات تھی کہ اب سے پون گھنٹے کے بعد ایک ٹرین گڑھی مہابت خان سے گذرنی تھی۔ ہم نے فوراً ٹکٹ خرید لئے اور پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر وقت گذارنے لگے۔ رات کا چونکہ آخری پہر تھا، اس لئے پلیٹ فارم پر مسافر اکا دکا ہی تھے۔ چند دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ایک چائے خانے پر پہنچ گئے۔ چائے طلب کی اور دونوں چائے پینے لگے۔ بوڑھا سوما خاموش تھا۔ ویسے اس کے نام پر میں جب بھی غور کرتا مجھے عجیب سا لگتا، نہ جانے یہ کیسا نام تھا، کونسے علاقے کا تھا۔ ویسے تو یہ بوڑھا ہی پراسرار تھا، اس کی کون کون سی بات پر غور کرتا۔ بہرحال مجھ جیسے انسان کو ان ساری باتوں کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔

پون گھنٹہ گذر گیا اور ہماری مطلوبہ ٹرین آ گئی۔ کافی مسافر نیچے اترے، ہم دونوں کو بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ بوڑھا سوما ٹرین میں بھی آنکھوں والوں کی طرح ہی چڑھا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ البتہ سیٹ پر بیٹھنے میں اس نے میری مدد طلب کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ سوما بالکل خاموش تھا اور جب یہ خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے، تم ضرورت سے زیادہ خاموش ہو؟"

"کچھ سوچ رہا تھا، تم ہی گفتگو شروع کرو۔" سوما نے جواب دیا۔

"کیا گفتگو کروں، تم بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟"

"اوہ۔ میری بات مت کرو، میرا ذہن تو خیالات کا دفینہ ہے، بس نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔"

"دراصل ہم لوگوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا ہے یعنی ایک دوسرے

کا ماضی نہیں کریدیں گے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری پچھلی زندگی بے شمار واقعات سے پُر ہو گی اور یقیناً وہ واقعات میرے لئے بہت دلچسپ ہوتے لیکن خیر — ہم دوسری گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔"

"یہی مناسب ہے میرے دوست، ماضی کریدنے سے کچھ نہیں ملتا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن اب تم گڑھی مہابت خان پہنچ کر کیا کرو گے؟"

"تمہیں اپنی قدیم رہائش گاہ دکھاؤں گا۔ بڑی انوکھی جگہ ہے، تم اسے دیکھ کر یقیناً حیران ہو گے۔"

"کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"بس دیکھو گے تو اندازہ ہو گا۔"

"چلو ٹھیک ہے اس کی بات اس وقت تک گئی۔ تمہارے عزیز و اقارب تو ہوں گے؟"

"تم خوش ہو جاؤ بیٹے کہ اتفاق سے اس دنیا میں میرا بھی کوئی نہیں ہے۔"

"اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے روادری میں کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا تم پیدائشی اندھے ہو؟"

"نہیں۔" بوڑھے کی آواز میں اچانک سختی سی آ گئی۔ "میں پیدائشی اندھا نہیں ہوں لیکن آنکھیں کھوئے ہوئے مجھے دو سال سے زیادہ نہیں گذرے، میرے دشمن نے میری دونوں آنکھیں نکال لی ہیں۔"

"ارے!" میں چونک پڑا۔ "کون تھا وہ دشمن؟"

"تھا نہیں، تھی — بلکہ ہے۔"

"اوہو کوئی عورت تھی؟"

"ہاں — عورت نہیں ناگن، ایک خوفناک ناگن۔" بوڑھا نفرت زدہ آواز میں بولا۔

"کیا دشمنی تھی اس سے؟"

"ابھی نہیں بتاؤں گا دوست، اس کے لئے کچھ انتظار کرو۔"

"اچھا تمہاری مرضی، لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہے وہ یہ کہ تم کسی طور اندھے نہیں معلوم ہوتے۔ تمہاری تمام حرکات آنکھوں والوں کی سی ہیں جیل کی تاریک چہار دیواری میں تم نے جس انداز میں راستہ تلاش تھا وہ میرے لئے بڑی حیرت انگیز بات تھی۔"

"ہاں۔ انسان جب کسی حس سے محروم ہو جاتا ہے تو اس حس کی کمی دوسری چند خصوصیات پوری کر دیتی ہیں۔ میرا ذہن میری آنکھیں ہیں، میرے کان میری آنکھیں ہیں۔ تم نے جیل کے راستوں کا جو نقشہ کھینچا تھا میرے ذہن کی آنکھ نے اسے پہچانا اور میری رہنمائی کی، اس طرح میں اس کے مطابق چلتا رہا۔ میرے کان ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ میں ہوا کی سرسراہٹ سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ میں قدموں کی چاپ سے انسان کی پوری شخصیت پہچان لیتا ہوں۔ اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں مجھ میں جو تم پر آہستہ آہستہ کھل جائیں گی انتظار کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لیکر کہا اور پھر راستے بھر میں بوڑھے سوما کی پراسرار شخصیت کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے ذہن کی چولیں ہل گئی تھیں۔ ہر قدم پر یہ شخص مزیدار ہوتا تھا۔ بالآخر وہ پہاڑی اسٹیشن جس کا نام مہابت خان تھا، آ گیا۔ میں نے تو اس وقت تک اسٹیشن کا بورڈ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن بوڑھا سوما اس وقت اونگھ رہا تھا اور اچانک وہ اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھا اور پھر مجھے ٹٹولنے لگا۔

"کیا تم سو رہے ہو آصف! اگر سو رہے ہو تو جاگو ہماری منزل آ گئی ہے۔"

"میں جاگ رہا ہوں سوما لیکن تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ آنے والا اسٹیشن گڑھی مہابت خان ہے؟"

اور میری اس بات پر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ نہ پوچھو، یہ سب کچھ نہ پوچھو۔ اپنی زمین کی خوشبو روئیں روئیں میں بسی ہوتی ہے بشرطیکہ تمہارے دل میں وطن کی سچی محبت ہو۔ یہ ہوائیں مجھے میری سرزمین کی آمد کا پیغام دے رہی ہیں۔" اس نے جواب دیا اور درحقیقت آنے والا اسٹیشن گڑھی مہابت خان ہی تھا۔

ہم دونوں ٹرین سے نیچے اتر گئے، بوڑھا اس انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے سارے اس کے جانے پہچانے ہوں، میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ اچھی خاصی گنجی آبادی تھی۔ جھٹپٹا وقت تھا، سورج ڈوبنے کو تھا۔ زندگی کی گہما گہمی ماند نہیں پڑی تھی، لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

بوڑھا سوما چلتے چلتے چند ساعت کے لئے رک جاتا اور پھر چلنے لگتا۔ ایک جگہ رک کر اس نے کہا۔ "اپنے بائیں سمت دیکھو آصف، کیا تمہیں سرخ رنگ کا ایک مینار نظر آ رہا ہے؟"

"ہاں۔ مینار موجود ہے۔" میں نے بائیں سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"اندازاً کتنے فاصلے پر ہو گا؟"

"تقریباً سو گز پر ہے۔"

"ہوں۔" بوڑھے نے گردن ہلائی اور پھر تقریباً پچیس تیس قدم چلنے کے بعد وہ دائیں سمت مڑ گیا۔ اس طرف ایک پتلی سی گلی تھی جو کافی طویل معلوم ہوتی تھی۔ گلی کے آخری سرے پر بستی کا آخری مکان تھا اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا اور ہم کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر ہو لئے۔ بوڑھا سوما خاموشی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا، اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ اب کھیتوں پر تاریکی کی دبیز چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے میں تنگ آ گیا تب میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"تم نے کہا تھا یہی بستی تمہاری بستی ہے؟"

"ایں۔؟" بوڑھا چونک پڑا۔ "کیا کہا تم نے؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ تم تو دیکھ نہیں سکتے، اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھو کہ سورج چھپ چکا ہے اور تاریکی پھیلتی جا رہی ہے اور ہم طویل و عریض کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے ہیں۔ بستی کا آخری مکان بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اوہ۔ بس تھوڑی دور اور ان کھیتوں کے اختتام پر جنگلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بس وہیں ہماری قیام گاہ ہوگی۔"

"جنگلوں میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں کسی قدر تنہائی پسند بھی ہوں اور پھر ایک طویل عرصے تک میں اپنی قیام گاہ سے دور رہا ہوں۔ بہرحال اب ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑے گا۔"

کھیتوں کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ جنگلات کا سلسلہ گہری تاریکی میں لپٹ گیا تھا۔ مجھے تو تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن سماعت کی بینائی سے رہنے والا سوما اس وقت حیرت انگیز ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی رفتار سے چل رہا تھا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور پھر میں اس عمارت کو نہیں دیکھ سکا جس کے دروازے پر اس نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے کسی پرانی عمارت کا طویل عرصے سے بند دروازہ کھلا ہو۔ چوں چرر کی آواز بند ہو گئی اور پھر بوڑھے سوما کی آواز سنائی دی۔

"کیا تم خوفزدہ ہو؟"

بوڑھے کی بات مجھے پسند نہیں آئی تھی، اس لئے میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اس نے چونک کر میرے ہاتھ کو ٹٹولا اور پھر اسے پکڑ کر بولا۔ "غیر معمولی طور پر خاموش ہو، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں، تم بار بار احمقانہ گفتگو کرنے لگتے ہو۔ بھلا میں دنیا میں کسی چیز سے خوفزدہ ہو سکتا ہوں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اوہ مجھے افسوس ہے۔ واقعی میں نے غلط جملے استعمال کئے ہیں۔ مگر تمہاری خاموشی کیا معنی رکھتی ہے؟"

"بس میں حیران ہوں، میں اس عمارت کو بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔" میں نے جواب دیا اور سوما نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"کافی تاریکی ہے شاید۔"

"ہاں۔" میں نے گہری سانس لیکر کہا۔

"میرا ہاتھ پکڑ کے چلتے رہو۔ آؤ۔" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیسی عمارت ہے۔ مجھے تو اس کے در و دیوار تک نہیں نظر آ رہے تھے لیکن اندھا سوما بہ آسانی موڑ مڑ رہا تھا۔ ویسے کافی وسیع عمارت معلوم ہوتی تھی، کیونکہ اندر داخل ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک چلنا پڑا۔

پھر بوڑھا رکا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں ایک گہری سانس لیکر اس کے ساتھ اس دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کمرے میں سیلن کی بو بالکل نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کشادہ اور ہوادار ہے اور کسی طرف سے اس میں ہوا آتی ہے۔

"ٹھہرو، میں تمہارے لئے روشنی کر دوں۔ میں نے لفظ تمہارے لئے ٹھیک استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے میرے لئے روشنی اور تاریکی یکساں ہے، ہے نا؟" اس نے کہا۔ میں نے اس وقت بھی خاموشی مناسب سمجھی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ایک شمعدان روشن ہو گیا۔ پہلے ایک شمع جلی تھی اور اس کے بعد متعدد ــ خاصی روشنی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا، میں کمرے کی آرائش دیکھ رہا تھا ــ چاروں طرف انتہائی نفیس پرانے طرز کا فرنیچر موجود تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف حسین مسہری بھی تھی۔ غرض ہر لحاظ سے اسے ایک قیمتی کمرہ کہا جا سکتا تھا جس سے بوڑھے کے ذوق کا پتہ چلتا تھا۔

"یہ عمارت تمہاری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ــ آبائی، پشتوں کی۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن کیا یہاں تمہارے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے؟"

"ہے۔" اس نے کہا۔

"کون ہے؟"

"میرے دو ملازم۔"

"اوہ۔ مگر عمارت تو ویرانے میں ہے، یہاں وہ لوگ کس طرح رہتے ہوں گے؟"

"وہ بھی میری طرح سکون پسند ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" سوما نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ "یہ سکون کی جگہ ہے، مجھے خوشی ہے کہ ہم نہایت کامیابی سے یہاں تک آ پہنچے۔ اب یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اول تو پولیس جیل سے مفرور قیدیوں کو تلاش کرتی یہاں تک نہیں پہنچ سکتی اور اگر پہنچ بھی گئی تو اسے اس ویران عمارت میں کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں داخل ہونے والے باہر کے لوگ یہاں کچھ نہیں تلاش کر سکتے۔"

"ہاں۔ یہ جگہ مجھے ایسی ہی لگتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم بھوکے ہو گے، میں تمہارے لئے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ مجھے بےحد مسرت ہے کہ تم بےجگر انسان ہو اور خوفزدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو، یہاں تمہیں جو کچھ نظر آئے، اس سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں سب ہمارا اپنا ہے۔"

"ٹھیک ہے بڑے میاں، آپ میرے لئے پریشان نہ ہوں۔" میں نے جواب دیا اور پراسرار بوڑھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک آرام کرسی میں دراز ہو گیا۔ درحقیقت میں یہاں خوفزدہ نہیں تھا اور میری اس کیفیت کا جواز یہ ہے کہ میں نے طویل عرصہ موت کے تصور میں گذارا تھا۔ خوف کی بنیادی وجہ تکلیف، آزار یا موت ہوتی ہے، یعنی موت اس سلسلہ میں آخری اسٹیج ہوتا ہے اور میں اسی اسٹیج میں تھا۔ ایک جذباتی مقصد کے تحت میں نے موت اپنا لی تھی اور مجھے زندگی سے دلچسپی ہوتی تو اول تو میں اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لئے اتنا بھیانک کھیل ہی نہیں کھیلتا۔ یا پھر انتقام لینے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں نے خوشی سے خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ گویا مجھے اب زندگی کی ضرورت نہیں تھی اور اب بھی سپرمین بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جب مجھے سزائے موت سنائی گئی تو میں نے موت کے بارے میں سوچا ضرور تھا لیکن وہی عزم وہی استقلال برقرار رہا تھا۔ یعنی میں نے اپنی زندگی کی صدیاں اپنے مقصد سے منسلک کر دی تھیں۔ اس لئے مجھے موت سے ڈر نہیں لگا تھا۔

نہ جانے اس بوڑھے کی باتوں نے کیوں اس قدر جلد مجھے متاثر کر لیا تھا اور اب زندگی کی طرف آ کر بھی میں پشیمان نہیں تھا بلکہ اب تو مجھے زندگی سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی، لیکن میں عام انسانوں سے زیادہ بےجگر تھا۔ میں اس ماحول سے قطعی خوفزدہ نہیں تھا۔ ہاں اس کے بارے میں سوچ ضرور رہا تھا اور اس سوچ کی وجہ قدرتی تھی۔

بوڑھا بےحد پراسرار تھا، وہ آنکھوں سے اندھا تھا۔ اگر اس کی آنکھیں موجود ہوتیں اور صرف بینائی کھو جانے کی بات کرتا تو شاید ذہن تسلیم نہ کرتا۔ میں سوچتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن آنکھوں کی جگہ دو غار اس کی سچائی کا ثبوت تھے۔ اور پھر اس کی بےپناہ صلاحیت جو شاید آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں تھی۔ حیرت انگیز بات تھی، پھر اس عمارت کا ماحول۔ لیکن وہ مجھے یہاں لایا کیوں ہے، اور اب اس عمارت میں آ کر میں کیا کروں گا۔

نہ جانے ان سوچوں میں کس قدر وقت ہو گیا۔ پھر دروازے پر ہلکی سی آہٹ سن کر ہی میں چونکا تھا۔ دروازہ کھل رہا تھا اور پھر بوڑھے کے بجائے ایک اور شخص اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی جو اس نے انتہائی تہذیب سے ایک میز پر رکھ دی اور پھر پانی کا جگ درست کرنے لگا۔

لیکن جب وہ پانی وغیرہ رکھ کر سیدھا ہوا تو میں بری طرح چونک پڑا۔ آہ۔ اس کی بھی دونوں آنکھیں غائب تھیں اور ان کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ سیاہ گہرے غار ــ میں ششدر رہ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ کھانا لانے والے نے اپنے قریب میری موجودگی کو بخوبی محسوس کر لیا تھا پھر وہ نرم آواز میں بولا۔

"کھانا کھا لیجئے جناب!"

"اوہ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ سنو کیا تم اندھے ہو؟" میں نے پوچھا لیکن وہ اس طرح واپس مڑ گیا جیسے اندھا ہی نہ ہو بہرا بھی ہو اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے طویل سانس لے کر شانے ہلائے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہنم میں جائے سب کچھ۔ خواہ یہ اندھوں کی نگری ہو یا بہروں کی۔ میں جیل سے باہر نکل آیا ہوں اور اب زندگی کی طرف چل پڑا ہوں، یہ زندگی میری اپنی ہے۔ بوڑھا سوما بےشک مجھے جیل سے نکالنے میں میرا معاون ہے، میرا مددگار ہے، لیکن اب میری زندگی میری اپنی ہے۔ میں اس کا پابند تو نہیں ہوں۔ جب تک دل چاہے گا یہاں رہوں گا اور دل چاہے گا تو یہاں سے نکل جاؤں گا۔

میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا، بہت عمدہ کھانا تھا اور پھر میں برتن ایک طرف سرکا کر ملحقہ باتھ روم میں گیا، دانت وغیرہ صاف کئے، شیو کافی دن سے نہیں بنا تھا، وہ بنایا۔

بہرحال اس وقت میں نے اس کمرے سے نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاتا بھی کہاں، چنانچہ مسہری پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ عرصہ کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ جیل کی بجائے گھر میں ہوں، اب وہ گھر کسی کا بھی ہو۔ زمین پر ٹاٹ بچھا کر سوتے ہوئے نجانے کتنا وقت گذر چکا تھا۔ آرام دہ مسہری عجیب سی لگی اور نیند تو جیسے تلی بیٹھی تھی، گہری نیند سو گیا اور دوسرے دن صبح کو ہی آنکھ کھلی۔

ناشتہ بوڑھے سوما نے میرے ساتھ ہی کیا تھا اور ناشتہ کے لئے ہم جس کمرے میں گئے، وہ بھی باقاعدہ ڈرائنگ روم تھا، جس میں اخروٹ کی لکڑی کی منقش میز اور ایسی ہی کرسیوں کا سیٹ تھا۔ برتن بھی نہایت قیمتی تھے۔ بوڑھا خاصا صاحب حیثیت تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا۔

"سوما، میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات دیکھ کر تمہاری شخصیت کو محسوس کر کے تجسس اس قدر بڑھ گیا ہے کہ میں تمہارے بارے میں جاننے کے لئے بےچین ہو گیا ہوں، کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم دونوں اپنا عہد توڑ دیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ اور میں تمہیں اپنے بارے میں۔" میری بات سن کر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس کے بجائے کیوں نہ ہم کام کی باتیں کریں۔" اس نے کہا۔

"لیکن میرا تجسس؟"

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"نہیں، لیکن میں تمہارے اندھے ملازم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"اس ــ کیا جاننا چاہتے ہو اس کے بارے میں؟"

"کیا تمہارا دوسرا ملازم بھی اندھا ہے؟"

"ہاں۔"

"واقعی۔" میں اچھل پڑا۔

"ہاں۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔"

"لیکن معاف کرنا یہ اندھوں کی ٹیم تم نے کیوں جمع کی ہے؟"

"اسے میرا کمپلیکس سمجھ لو۔ میں خود اندھا ہوں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھی بھی اندھے رہیں۔" بوڑھے نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لیکن تم خصوصی حسیات کے مالک ہو، کیا یہ ملازم بھی تمہاری طرح ہیں؟"

"ہاں۔ یہ پوری عمارت کی نگرانی کرتے ہیں، باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہیں، کمروں کی صفائی کرتے ہیں، کوئی کام ایسا نہیں جو نہ کر سکیں۔"

"لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور تم کہہ چکے ہو کہ تم پیدائشی اندھے نہیں ہو۔"

"ہاں۔ میں نے غلط نہیں کہا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، آؤ میں تمہیں یہ عمارت دکھاؤں۔" ناشتہ کی میز سے بوڑھا اٹھ گیا، اس نے میرا یہ سوال بھی تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اٹھ آیا اور پھر اس نے مجھے یہ کھنڈر نما عمارت دکھائی۔ درحقیقت تاحدِ نگاہ ویران جنگلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کھنڈر کی موجودگی بھی حیرت انگیز تھی۔ نہ جانے آبادی سے دور یہ عمارت کس لئے بنائی گئی تھی۔ بوڑھا مجھے ایک ایک جگہ کے بارے میں بتاتا رہا اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

"بیٹھو۔" اس نے ایک طویل سانس لے کر خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا اور بوڑھا کسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر خاموشی سے گذر گئی۔

"میرا خیال ہے تم خصوصی طور سے مجھے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں تمہیں بہت جلد اپنے بارے میں سب

کچھ بتادوں گا۔ بہت جلد۔" اس نے پرخیال انداز میں کہا اور میں خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے بارے میں چھپانا چاہتا ہے تو مجھے بھی اتنی کرید نہیں ہے، میرا کیا ہے جب دل چاہے گا یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کس کی مجال ہے کہ مجھے روک سکے، اس کے بعد میں نے اس بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہا پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

" اچھا، تم آرام کرو، میں چلتا ہوں اور ہاں ذہن میں کسی وسوسے کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، میرے ساتھ رہ کر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

" تم بالکل فکر مت کرو۔ میں نے دوبارہ زندگی قبول کر لی ہے اور اب میں اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔"

" یقیناً۔ یقیناً۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اب یہاں سے کسی حد تک اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا اور ــــــ دوسرے انداز میں سوچ رہا تھا، کیوں نہ راہِ فرار اختیار کی جائے، جو فاصلہ طے کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا، اسی سے واپس بھی جا سکتا تھا، کون روکنے والا تھا، تھوڑی دیر اور سہی۔

اور پھر میں مسہری کی طرف بڑھ گیا، لیٹ گیا۔ اس کے علاوہ اور کام بھی کیا تھا لیکن اب ــــ اب کیا کرنا چاہئے؟ یہاں سے کہاں جاؤں، کس طرح زندگی بسر کروں، ظاہر ہے پولیس میرا تعاقب کرے گی، دس آدمیوں کا قاتل تھا اور سزائے موت کا مجرم، مہذب دنیا میں پتہ نہیں میرے خلاف کیا کیا کارروائیاں ہو رہی ہوں لیکن جب زندگی سے ہاتھ ہی دھو لئے تھے جب اپنے آپ کو مردہ ہی تصور کر لیا تھا، تو اب زندہ رہنے کے لئے خوف بے معنی تھا۔ آنکھ مچولی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ زندہ بچ گیا تو ٹھیک ہے اور پولیس کی گولی دل میں اتر گئی، تو بہرحال موت تو آنی ہی ہے لیکن اب اس بوڑھے سے کچھ گھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اونہہ اس بور ماحول میں زندہ رہنا ہی بے مقصد ہے جب زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تو پھر کیوں نہ چند سانسیں زندگی سے بھرپور ماحول میں گزاری جائیں۔

میں دل میں فیصلہ کر لیا کہ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دوپہر ہوئی اور پھر شام ہو گئی۔ رات کے کھانے پر بھی بوڑھا میرے ساتھ تھا۔ کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور مجھے کھانے کے بعد آرام کی تلقین کر کے چلا گیا۔ میں بھی بیزار سا کمرے میں واپس آگیا۔ اب تو بالکل ہی دل اکتا گیا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور ذہن نیم غنودہ ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہو۔ اس کا احساس گہرے گہرے سانسوں سے ہوا تھا اور سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی جیسے خراٹے لئے جا رہے ہوں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید میری سماعت کا دھوکہ ہے لیکن سانس اتنے تیز تھے کہ ذہن کی غنودگی دور ہو گئی اور میں آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن شمعدان کی روشنی میں کوئی نظر نہیں آیا۔

پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پورے طور سے غور کیا تو احساس ہوا کہ مسہری کے نیچے سے تیز سانسوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں اچھل کر نیچے کود آیا۔ یہ تو حیرت انگیز بات تھی، بھلا یہاں کون ہو سکتا تھا، بیساختہ میں نیچے جھکا اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا، یقیناً کوئی موجود تھا، دو پاؤں سامنے ہی نظر آ رہے تھے۔ چونکہ شمعدان کی روشنی مسہری کے اس رُخ پر نہیں آ رہی تھی اس لئے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ پاؤں بوڑھے سوما کے ہیں یا اس کے نوکر کے، بہرحال میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور اطمینان سے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور زور سے باہر گھسیٹ لیا اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ کمرے میں گونج اٹھی۔ چیخ کے ساتھ ہی میں نے گھبرا کر پاؤں چھوڑ دیئے اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن میں نے جس طاقت سے اسے گھسیٹا تھا اس سے وہ پوری باہر نکل آئی تھی اور اپنے کمرے میں ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر میری آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں جو کچھ ہو رہا تھا ناقابل یقین تھا کیونکہ ابتک میں نے صرف بوڑھے سوما کو دیکھا تھا یا اس کے دونوں اندھے ملازموں کو۔ اب تک نہ تو کسی سے کسی لڑکی کے بارے میں سنا تھا نہ ہی ایسے آثار نظر آتے تھے، لیکن یہ اچانک لڑکی کہاں سے ٹپک پڑی۔

وہ متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی، جیسے سوتے سے جاگنے والے ذہنی طور پر خالی الذہن ہوتے ہیں۔ اس کے چہرے کی تراش عجیب سی تھی۔ عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک نگاہ میں محسوس ہوتا کہ وہ ایک سادہ سی لڑکی ہے لیکن بغور دیکھنے سے چہرے پر بے حد سفاکی نظر آتی تھی۔ ہونٹوں کی تراش میں ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کے بدن پر سیاہ چست پتلون اور سفید مردانہ قمیص تھی بالوں کا اسٹائل کافی خوبصورت تھا اور اس کے پلکیں جھپکانے کا انداز۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ حواس کی دنیا میں واپس آ گئی ہو، اس نے دونوں کہنیاں زمین پر ٹکائیں اور بدن کو تھوڑا سا اٹھایا اور پھر ایک بے تعلق سی کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

" کب آئے تم؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا جیسے برسوں کی شناسا ہو۔

" کیا مطلب، کون ہو تم؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

" سونی:" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

" بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، لیکن آپ کون ہیں اور کہاں سے نازل ہوئی ہیں؟"

" اِس مسہری کے نیچے سے:"

" سبحان اللہ۔ کیا ابھی ابھی پیدا ہوئی ہیں؟"

" نہیں، میری عمر تو بائیس سال ہے:"

" تو اے بائیس سالہ حسینہ اب اپنی شانِ نزول بھی بتا دے:"

" کیسی باتیں کر رہے ہو تم، پورے چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ ڈک اور بیگ یقیناً مجھے تلاش کر رہے ہوں گے بلکہ شاید مایوس بھی ہو چکے ہوں بس میں چھپ کر آئی اور سیدھی مسہری کے نیچے آ گھسی۔ پتہ نہیں کس وقت نیند آ گئی۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے:"

" اوہ:" میں نے پریشانی سے گردن ہلائی، نہ جانے اس بھوت خانے میں کیا کیا تھا، اب اس لڑکی سے کیا کہا جائے اور یہ جو کچھ کہہ رہی ہے اسے کیا سمجھا جائے پتہ نہیں کون ہے اور اس عمارت میں کہاں سے آ گئی، سوما سے اس کا کیا تعلق ہے، بہت سے سوالات میرے ذہن میں مچل رہے تھے۔ چند ساعت میں اس کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے سہارا دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا، سہارا قبول کر لیا گیا۔ اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا تب وہ اٹھ گئی اور شکریہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

" خدا کے لئے اب تو بتا دو کہ کون ہو تم؟"

" ارے تم یہ نہیں جانتے؟"

" جی نہیں:"

" کہہ تو چکی ہوں کہ سونی ہوں، اور تمہیں ایک اہم اطلاع دینے آئی تھی:"

" اچھا تو فرمائیے:" میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر کہا۔

" بھاگ جاؤ فوراً ــــ فوراً بھاگ جاؤ۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گی:"

" کیوں خیریت، یہاں میری موجودگی آپ کو گراں گزر رہی ہے:" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا: "اور اگر تم سونی ہو تو سونی ہوتی کیا چیز ہے؟"

" بس بس رہنے دو، میں سمجھ گئی تم میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔ بھگتو گے خود، میں نے دوستانہ طور پر تمہیں بتا دیا ہے اور اس کے لئے میں تمہارے لئے چار گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی:" لڑکی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی جیسے وہ صحیح الدماغ نہ ہو، میں غور سے اسے دیکھتا رہا اور پھر میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا،

" سوما سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

" موت کا رشتہ ہے، مارے جاؤ گے تم کتے کی موت اور پھر یاد کرو گے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔ ارے مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے تمہارے لئے وقت ضائع کیا ہو۔" وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

" ارے نہیں نہیں بیٹھو، تم تو مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہو:" میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے، اور اس نے ایک جھٹکے سے شانے چھڑا لئے۔

" بولو جاؤ گے یا نہیں؟" اس نے پوچھا

" تم نہیں رہتی ہو؟"

" ہاں:"

" تب تو مجھے یہاں سے نہیں جانا چاہئے:" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" میں کہتی ہوں فضول باتیں مت کرو اور ...:"

اچانک اس کے حلق سے چیخ نکل گئی، دروازہ بہت زور سے کھلا تھا۔ سب سے آگے سوما اور اس کے پیچھے دونوں ملازم اندر گھس آئے، تینوں کے چہروں پر خوفناک تاثرات تھے۔ سوما منہ اٹھا کر کتے کی طرح سونگھنے لگا اور پھر غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

" ہوں۔ تو تم یہاں موجود ہو:"

" مم ـ میں تو ابھی آئی تھی:" لڑکی نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور اس کی آنکھوں سے خوف ٹپکنے لگا۔

" چلو بیگ اسے یہاں سے لے جاؤ:" اور دونوں ملازموں نے آگے بڑھ کر لڑکی کے بازو پکڑے اور اسے خاصی بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ لڑکی نے منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ سوما کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ چند ساعت وہ سوچتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پھیل گئی۔

" کیا بکواس کر رہی تھی یہ بے وقوف لڑکی؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

" جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اس سے تمہیں سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا، کیونکہ تم نے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا:" میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

" آصف تم بہت بے صبرے انسان معلوم ہوتے ہو، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا، لیکن نہ جانے کیوں تمہیں اس سلسلے میں اتنی جلدی ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں سنو، وہ میری بیٹی ہے سونی، اس کا دماغ الٹ چکا ہے۔ مکمل طور سے پاگل ہے، اس کی کسی بات کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب بتاؤ وہ کیا کہہ رہی تھی تم سے؟"

" بس میرا خیال ہے کوئی عقل کی بات نہیں کی تھی، کہہ رہی تھی یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے، بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا تھا اس نے:" میں نے کہا اور یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھے نے اطمینان کی سانس لی ہو، پھر وہ غمزدہ انداز میں بولا۔

" میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ بچی ہے، اس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت ہی مر گئی تھی اور اس کے بعد میں نے ہی اسے پرورش کیا، بے حد حساس ہے، ذرا ذرا سی بات کو ذہن سے چپکا لیتی ہے، اور بالآخر یہی بات اس کے ذہنی انتشار کا باعث بنی اب وہ صحیح الدماغ نہیں ہے، اس کی غیر موجودگی سے ہم بڑے پریشان ہو گئے تھے۔ بہرحال شکر ہے کہ وہ تمہارے کمرے میں مل گئی ہے اور ہمیں اس کی تلاش میں جنگلوں کا رخ نہ کرنا پڑا، میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہوگی۔ آرام کرو۔ احمق لڑکی نے تمہیں پریشان کیا:"

بوڑھا اٹھنے لگا لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک دیا۔

" بیٹھو سوما، مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی، تم مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور بتاؤ:"

" صبح کو سہی آصف میں خود بھی تھکن محسوس کر رہا ہوں:" سوما نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

" تمہاری مرضی سوما، ویسے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے بہت سی باتیں چھپا رہے ہو، اور مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ بہرحال تم میرے محسن ہو، تم نے مجھے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی ہے، میں تمہیں کسی سلسلے میں مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر تم اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ بلکہ سچ کہو اگر

تمہیں میری یہاں موجودگی ناگوار گذر رہی ہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں. ہم دونوں ایک دوسرے کو دوست کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔"

"غلط فہمی کا شکار نہ ہو آصف، ایک رات کی مہلت اور دے دو. کل صبح تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا، کوئی بھی بات تم سے پوشیدہ نہیں رہے گی. میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا. بس اب مجھے اجازت دو." وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں سے نکل گیا. میرا ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر مسہری پر آ گرا. لعنت ہے اس پاگل خانے پہ بوڑھا سوما کچھ بتائے یا نہ بتائے میں کل یہ کھنڈر چھوڑ دوں گا، بعد میں جس انداز کی بھی زندگی گذارنی پڑے اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد خاصی سکون کی نیند آئی تھی. ساری رات شاید کروٹ بھی نہیں بدلی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو ذہن پر بڑا خوشگوار تاثر تھا، بدن ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا. انگڑائی لینے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اور میں بری طرح اچھل پڑا. کیونکہ اب محسوس ہوا کہ نہ صرف ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ بدن پر جگہ جگہ ایسی بندشیں ہیں جو بظاہر محسوس نہیں ہوتیں لیکن ہلنے جلنے کی کوشش کی جائے تو اسے ناکام بنا سکتی ہیں۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا، یہ کیا ہو گیا تھا، کس نے باندھ دیا تھا مجھے اور کیوں؟ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی، لیکن اس میں بھی ناکام رہا. سر کے دونوں طرف بھی ایسی رکاوٹیں کر دی گئی تھیں کہ گردن نہ ہلائی جا سکے. میں نے چھت کی طرف دیکھا اور صاف اندازہ ہو گیا کہ میں اس کمرے میں نہیں ہوں جس میں پچھلی رات سویا تھا لیکن میں یہاں کیسے آ گیا اور یہ کونسی جگہ ہے، مجھے یہاں لانے والا کون ہے. عجیب بے بسی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اور پھر اسی وقت سوما کی کریہہ آواز کانوں میں گونجی۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

میں چونک پڑا، لیکن گردن گھما کر سوما کو نہیں دیکھ سکا تھا. اور اسی وقت سوما کا چہرہ میرے چہرے کے مقابل آ گیا. اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی، اس وقت اس کے چہرے میں تبدیلی تھی اور یہ تبدیلی بڑے بڑے شیشوں والی عینک سے ہوئی تھی، جو اس کی منحوس آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں اپنے بدن میں ایک خصوصی توانائی محسوس ہو رہی ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"یہ — یہ سب کیا ہے؟" میں نے غصیلے انداز میں پوچھا

"میری بات کا جواب دو؟"

"بکواس مت کرو، مجھے بتاؤ تم نے مجھے کیوں باندھ دیا ہے؟" میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ. تم بضد تھے نا کہ تمہیں سارے حالات سے آگاہ کر دیا جائے." بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے اور — اور مجھے میرے کمرے سے کیسے لایا گیا؟"

"بیہوش کر کے، بہر حال تمہیں یہاں آنا ہی تھا."

"یہ کونسی جگہ ہے؟"

"اسی عمارت کا تہہ خانہ، لیکن میں نے اس میں ترمیمیں کرائی ہیں. یہ میری لیبارٹری ہے."

"لیبارٹری؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا

"ہاں لیبارٹری." بوڑھے نے ایک گہری سانس لی." بہت کم لوگ ڈاکٹر سوما کو جانتے ہیں."

"ڈاکٹر سوما." میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر سوما، آنکھوں کا ماہر. میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کئے ہیں لیکن بہت سے لوگوں کو میرے طریق کار سے اختلاف تھا. میری لیبارٹری پر کئی بار چھاپے مارے گئے، اور مجھے کبھی سکون سے کام نہیں کرنے دیا گیا."

"مگر تم — تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟"

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا، میرے بارے میں پوری تفصیل سنو، یہ تو تمہاری سب سے بڑی خواہش تھی. ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کئے اور انہیں عام کر دیا. یہ جو آنکھیں بدلنے کے آپریشن عام ہو گئے ہیں. یقین کرو ان کا بنیادی تصور میں نے ہی دیا تھا، لیکن ہر تعمیر کے لئے پہلے قربانیاں دینا ہوتی ہیں. آنکھوں کے مؤثر علاج کے لئے مجھے انسانی آنکھوں کی ضرورت ہوتی تھی. چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لئے میں نے مردہ انسانوں کی آنکھیں خریدنا شروع کر دیں، عام طور سے لاوارث مرنے والوں کی آنکھیں مل جایا کرتی تھیں لیکن موت کے بعد بینائی پر جو جھلی چڑھ جاتی تھی، وہ میرے اس منصوبے کے لئے ناکارہ تھی جس پر میں نے سوچا تھا. اس پر عمل کرنے کے لئے زندہ انسانوں کی آنکھوں کی ضرورت تھی. میں نے بے اندازہ دولت خرچ کر کے بھی انسانی آنکھیں حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا. دوسری طرف میں اپنے تجربے کے لئے پاگل تھا اور اسی جنون کے عالم میں میں نے ایک زندہ انسان کی آنکھیں نکال لیں لیکن عجیب قانون ہے، عجیب لوگ ہیں. میری کوششوں سے بے شمار ایسے انسانوں کی آنکھوں کی روشنی واپس آئی جو اندھے ہو چکے تھے، مجھے کچھ نہیں ملا، لیکن میں نے انہی کے فائدے کے لئے صرف ایک انسان کی آنکھیں ضائع کر دیں تو دنیا میری دشمن ہو گئی اور میری زندگی دوبھر کر دی گئی. بالآخر مجھے اس دنیا کو خیرباد کہنا پڑا. ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے بعد میں لوگوں کی فلاح کے لئے یہ کام کرنا بند کر دیتا. میں کوئی قلاش انسان نہیں ہوں، ساری زندگی عیش و عشرت سے بسر کر سکتا ہوں. لیکن تم جانو شوق کا نشہ اتنا ہلکا نہیں ہوتا کہ آسانی سے زائل ہو جائے. میں اپنے تجربات کو اس حد تک وسعت دینا چاہتا تھا کہ میں کسی ایسے انسان کو بینائی دے سکوں، جو پیدائشی طور پر اندھا ہو، اس کی آنکھوں کی شریانیں تک نہ ہوں جس طرح پلاسٹک کے دوسرے اعضاء بنا لئے گئے ہیں جن میں ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ نازک ترین اعضاء یعنی دل، گردے، پھیپھڑے وغیرہ شامل ہیں اور وہ انسانی زندگی کے تار قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں، اسی طرح میں مصنوعی آنکھیں بنانا چاہتا تھا تاکہ ہم ان آنکھوں کے محتاج نہ رہیں جو عطیہ کے طور پر دی جاتی ہیں. تم غور کرو کیسی اچھی بات ہے کہ دنیا میں کوئی انسان بینائی سے محروم نہ رہے لیکن یہ دنیا والے کسی اچھے کام کی اس وقت تو تعریف کر دیتے ہیں جب وہ ہو چکے اگر اس کی تکمیل کے مراحل میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہو تو اسے قطعی نہیں برداشت کرتے، ہم لوگ بہت سے مسائل میں اس لئے مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں تعاون نہیں ملتا۔

لیکن میرا نظریہ مختلف ہے، میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے' دنیا سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے جو کرنا ہے کر ڈالو، چنانچہ میں نے آبادیوں کی گہما گہمی سے دور ان کھنڈرات کا انتخاب کیا، اور یہاں اپنی تجربہ گاہ قائم کی، مجھے زیادہ معاونوں کی ضرورت بھی نہ تھی. چنانچہ میں نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا. میرے ساتھ میری بچی سوفی بھی تھی، یہی میری معاون اور یہی میری اسسٹنٹ' جو بھی سمجھو، میں نے اپنا کام شروع کر دیا، لیکن مسئلہ وہی تھا یعنی انسانی آنکھوں کی ضرورت۔

بالآخر میں نے ایسے دو انسانوں کا انتخاب کیا جو دنیا کی سرد مہری سے تنگ آئے ہوئے تھے، معاشی مسائل نے انہیں خودکشی کی منزل تک لا پھینکا تھا، وہ مر جانا چاہتے تھے تب میں نے ان سے سودا کیا، میں نے ان سے ان کی آنکھیں خرید لیں، بھاری رقم کے عوض. اس دولت لے ان کے بچوں کے لئے اچھا مستقبل مہیا کر دیا اور میں نے ان کی زندگی بھی نہ برباد ہونے دی، میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور اب وہ دونوں میرے معاون ہیں، تم سمجھ گئے ہو گے یعنی پیک اور ڈک. اور اس کے بعد مسٹر آصف! اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بھی تجربے کی نذر کر دیں. میں اپنے کام میں اس سے زیادہ مخلص نہیں ہو سکتا تھا. مجھے بتاؤ فلاح انسانیت کے لئے اس سے بڑی قربانی اور کیا دی جا سکتی تھی کہ میں نے اپنی کائنات تاریک کر لی، اب بھی لوگ میرے خلوص پر شک کریں تو میں کیا کر سکتا ہوں — اس کے لئے مجھے کسی چیز کی. ضرورت پیش آئے تو میں کیا کروں سوائے اس کے کہ جائز ذریعوں کی تلاش میں وقت ضائع نہ کروں اور یہی ہوا تھا میں نے شہر جا کر ایک انسان کو قتل کر دیا اور پھر اس کی آنکھیں نکالی تھیں. لیکن اس جرم میں پکڑا گیا، دنیا کو تو میں نے اصلیت کی کوئی ہوا نہ لگنے دی، ہاں مجھے سزائے موت ضرور سنا دی گئی. نکلنا تو تھا ہی، میں نے سوچا کہ کوئی ساتھی بھی مل جائے. سو میں نے تمہارا انتخاب کیا اور تمہیں یہاں لے آیا، اب دیکھو نا میرے دو دو کام ہو گئے. ایک ساتھی بھی مل گیا اور اپنے تجربے کے لئے دو آنکھیں بھی."

"کیا مطلب؟" میں پھر اچھل پڑا۔

"انسانیت کی فلاح کے لئے میرے دوست!"

"کیا بکواس ہے." میرے بدن میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں۔

"تھوڑی سی فراخ دلی سے کام لو، غور تو کرو، اگر تمہاری آنکھیں میرے تجربے کا آخری دور پورا کر سکیں تو اس سے سینکڑوں ایسے لوگوں کو روشنی مل جائے گی جنہوں نے کبھی یہ دنیا نہیں دیکھی، جنہوں نے کبھی باغوں میں کھلے پھولوں کے رنگ نہیں دیکھے، جنہوں نے کبھی معصوم بچوں کی مسکراہٹیں نہیں دیکھیں، کائنات کی سب سے انمول شے بینائی جس سے وہ محروم ہیں، تمہاری آنکھیں ان کے درد کا درماں بن جائیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے."

"نہیں نہیں، میں تمہاری بات نہیں مان سکتا."

"کیوں آخر کیوں؟ تم تو سزائے موت کے مجرم تھے، تم تو موت اپنا چکے تھے. پھر اگر میں تمہاری زندگی میں تھوڑا سا خلاء پیدا کر رہا ہوں تو تم اس سے اس قدر منحرف کیوں ہو رہے ہو، خود کو اس تجربے کے لئے وقف کر دو، وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کامیاب ہو گیا تو تعاون کرنے والوں میں تمہارے نام کو نظر انداز نہیں کروں گا. تم بھی محسن انسانیت کہلاؤ گے."

"لیکن آنکھوں کے بغیر زندگی کا تصور بے حد بھیانک ہے."

"تم ہمیشہ اندھے نہیں...... رہو گے دوست، تمہاری بینائی واپس مل جائے گی، تم نے دیکھا کہ میں خود بھی اسی کیفیت میں ہوں، ہمارا تجربہ ہماری آنکھوں کے ان دو گڑھوں کو دو خوبصورت اور روشن آنکھوں سے پر کر دے گا."

بوڑھے کی آواز میری سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی میں متحیر بھی تھا. بھلا یہ اندھا بوڑھا یہ تجربات کیسے کر رہا ہے، اس نے اپنی آنکھیں بھی داؤ پر لگا دی ہیں، کیسی انوکھی بات ہے۔

"تم نے اب تک ایک دلیر انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے آصف! میں چاہتا ہوں تم اب بھی اسی انداز سے پیش آؤ اور خوشی خوشی اپنی آنکھوں کا عطیہ پیش کر دو، تم یہاں رہو گے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم تینوں کو سب سے پہلے آنکھیں واپس کروں گا."

میں اس کی بات پر غور کرنے لگا، یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا. آنکھیں کھونے کا تصور بڑا ہی اذیت ناک تھا. بھلا آنکھوں کے بغیر بھی زندگی کو زندگی کہا جا سکتا ہے، بوڑھا پاگل کیا ضروری ہے کہ اپنے تجربات میں کامیاب رہے، وہ دونوں بے چارے اندھے جو زندگی گذار رہے تھے وہ افسوسناک تھی، نہ جانے انہیں کب تک انتظار کرنا پڑے اور بوڑھا کامیاب ہو یا نہ ہو۔

"تم نے کیا سوچا؟" بوڑھے کی آواز ابھری۔

"کیا تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے؟"

"فیصلے لمحوں میں کئے جانے چاہئیں، ان کے لئے وقت درکار نہیں ہوتا."

"لیکن یہ فیصلہ"... میں نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"آصف خان! میں نے تمہیں جس انداز میں پایا تھا اس کے لئے میں نے سوچا تھا کہ تم جیسا دلیر انسان زندگی کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا، کیوں نہ تم خود کو مردہ ہی تصور کر لو."

"تب میں تمہیں رائے دیتا ہوں میرے دوست کہ پہلے مجھے ختم کر دو اور اس کے بعد میری آنکھیں نکال لو."

"نہیں تم اس قدر مایوس نہ ہو، ایک وعدہ تم سے کرتا ہوں کہ جب تم دنیا دیکھنا چاہو گے، دیکھ سکو گے، وقتی طور سہی، مصنوعی طور پر سہی."

میں نہیں سمجھا: میں نے کہا
سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرو۔"
لیکن تم مجھے تھوڑا سا وقت تو دو، تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے:
نہیں آصف! میں اپنی سانسوں کے بارے میں ہی کیا کہہ سکتا ہوں، موت کا تو کوئی تعین نہیں ہوتا، جب بھی آجائے، پھر ہم انتظار میں کیوں وقت ضائع کریں جو کام کرنا ہے جلد از جلد کر لیا جائے۔"
" بکواس مت کرو، مجھے کھول دو:"
" ہرگز نہیں دوست، ہرگز نہیں۔ تم اس خوبصورت موقع کو ضائع کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ میری زندگی میں یہ آپریشن بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، بہتر تھا کہ تم رضا کارانہ طور پر خود کو اس کے لئے پیش کر دیتے لیکن تم اتنے فراخ دل نہیں ہو، جتنا میں سمجھا تھا، مجھے اجازت دو کہ میں اپنا کام کر لوں۔" اس کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔

میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا، یہ سب کچھ تو توقع کے بالکل خلاف تھا ظاہر ہے میں بزدل انسان نہیں تھا، میں نے تو موت کو گلے لگا لیا تھا لیکن اس وقت جب زندگی سے محبت ہوئی تو یہ تکلیف دہ دور شروع ہو گیا، آنکھوں کے بغیر تو کچھ نہیں۔ اندھا رہ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ، اور اب جب کہ یہ بوڑھا خبیث اپنی مقصد براری کے لئے مجھے زندگی کے بدترین لمحات سے آشنا کرنے والا تھا تو میں ہر قیمت پر اس سے بچاؤ چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بدن کے گرد کسی ہوئی بندشوں کو توڑنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی لیکن خبیث اور طاقتور بوڑھے نے جس طرح مجھے باندھا تھا اس سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی، نہ جانے میرے بدن کے کون کون سے حصوں پر زخم آئے لیکن میں اس وقت تک جدوجہد کرتا رہا جب تک سکت رہی، پھر میرا ذہن جواب دینے لگا۔ بوڑھا کتنا نہ جانے کون سے کاموں میں مصروف تھا۔

پھر نیم غنودگی کی کیفیت میں ہی میں نے اپنے باندھے انجکشن کی چبھن محسوس کی، ہلکی سی سی میرے منہ سے نکلی اور اس سے بعد کی کیفیت عجیب تھی۔ پتہ نہیں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں لیکن ذہن ان کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا۔ ہاں البتہ جب مکمل طور سے ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔

رات ـــــ یہ کیسی رات تھی، میں نے سوچا، پھر مجھے بوڑھا خبیث یاد آگیا اور میں نے اپنے ہاتھوں میں اینٹھن سی محسوس کی۔ ایک بار پھر میں نے بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی، لیکن بندشیں تو اب میرے گرد نہیں تھیں۔ سر بھی ہلا سکتا تھا، ہاتھ پاؤں بھی ہلا سکتا تھا۔ شاید رات کا آخری پہر ہے ورنہ اس قدر گھور تاریکی۔ میں نے پلکیں جھپکانے کی کوشش کی اور اچانک میری گھگھی بندھ گئی۔

آہ۔ یہ کیا ہے، میری پلکیں آنکھوں کے ان ڈیلوں کو محسوس تو نہیں کر رہی تھیں جن میں بینائی ہوتی ہے۔ دہشت زدہ ہو کر میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ٹٹولیں اور آنکھوں کے گڑھوں میں خون کی چھپچھاہٹ میری انگلیوں سے ٹکرائی اور پھر میرے حلق سے جو آواز نکلی وہ بڑی دہشت ناک تھی۔

" نہیں ـ نہیں ـ یہ ـ یہ کیا کیا تو نے کتے ـ سوما ـ سوما کتے میں تجھے جان سے مار دوں گا ـ آہ میری آنکھیں ـ میری آنکھیں ....."

میرے دماغ میں شعلے بھڑک چلے تھے، میں طوفان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا، جو چیز میرے سامنے آئی میں اسے نیست و نابود کرنے پر تل گیا۔ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں، میز کرسیوں کا شور اور پھر میں سامنے کی دیوار سے ٹکرایا اور اسے ٹٹول ٹٹول کر دروازے تک پہنچ گیا، میرے بدن میں اس وقت بے پناہ قوت تھی۔ میں نے دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا اور پھر میرے بدن کی ٹکروں نے دروازہ توڑ دیا۔

" سوما ـ سوما تو کہاں ہے، میرے سامنے آ کتے، تو نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے، میری آنکھیں مجھے واپس دے دے، میں کہتا ہوں میری آنکھیں مجھے واپس دے دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تو سوچ بھی نہ سکے گا۔ سو ... ما ....."

میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر گیا۔

میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اور ذہن پھر تاریکیوں میں کھو گیا۔

نہ جانے کب تک ـــ نہ جانے کب تک ـــ لیکن زندگی تھی تو ہوش بھی آگیا اور ذہن جاگا تو کسی کے گفتگو کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس طرف کان لگا دیئے۔

آہ۔ یہ اسی ذلیل بوڑھے کی آواز تھی، کسی سے کہہ رہا تھا۔

" نہیں، اسے پائپ سے خوراک دو، ہوش میں لانا ٹھیک نہیں ہے، ابھی وہ برداشت نہیں کر سکے گا:"

" جو حکم سر، کیا اس کی آنکھوں پر دوا لگا دی جائے:"

" اوہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کی شریانیں بند کر دی ہیں۔ آنکھوں کے گڑھے بالکل بے جان ہیں، اسے تکلیف محسوس نہ ہوگی، لیکن بس اسے ہوش میں نہیں آنا چاہیئے:"

" بہت بہتر جناب:" دوسرے شخص کی آواز سنائی اور پھر کوئی مجھے نزدیک آتا محسوس ہوا، میرے دانت ایک دوسرے پر بھینچ گئے تھے، میں نے اس کے قدموں کی چاپ کو محسوس کیا اور جونہی آنے والا میرے قریب آیا، میری دونوں ٹانگیں پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑیں اور وہ ایک بے ساختہ چیخ کے ساتھ شاید دوسری طرف الٹ گیا۔

میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ درحقیقت آنکھوں کے خالی حلقوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی بوڑھے کتے نے میری آنکھیں نکال کر کوئی ایسی دوا ان حلقوں میں لگا دی تھی جس سے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا، اس کے علاوہ بدن میں توانائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی میں نے بوڑھے سوما کی آواز سنی۔

" اوہ۔ ہیگ کیا ہوا، کیا تم ٹھیک ہو:"

" نہیں جناب، شاید وہ ہوش میں آگیا ہے:"

" اوہ:" سوما نے مخصوص انداز میں منہ اٹھا کر فضا میں سونگھنے کی کوشش کی اور پھر اس نے مجھے آواز دی۔

" آصف کیا تم نے ہیگ کو نقصان پہنچایا ہے:"

" میرے نزدیک آ کتے! دھوکے باز، کیا تو مجھے اس لئے جیل سے نکال لایا تھا۔ دیکھ، سن۔ میری آنکھیں مجھے واپس کر دے ورنہ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔ میں نے دونوں ہاتھ خلا میں پہنچاتے ہوئے کہا تب اچانک میرے ہاتھ کسی کے جسم سے ٹکرائے اور میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

یہ بوڑھا سوما ہی تھا۔ "کتے ـ کتے:" میں نے اس کی گردن ٹٹولی اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا تب بوڑھے سوما کے چوڑے ہاتھ میری کلائیوں پر آ جمے اور اس نے نہایت اطمینان سے اپنی گردن سے میری گرفت چھڑا لی۔

" آصف خان! میں آخری بار کہہ رہا ہوں ہوش میں آجاؤ، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے، ایک خوبصورت مستقبل کے لئے تم تھوڑے سے عرصے کے لئے تاریکی برداشت کر لو:"

" میں ـ میں تجھے مار ڈالوں گا:" میں نے دانت بھینچ کر اس کا لباس کھینچا

" اچھا تو مار ڈالو:" اس نے سرد لہجے میں کہا اور میں اپنی جدوجہد کرنے لگا، لیکن جیل کی موٹی سلاخوں کو موم کی طرح توڑ دینے والا، زمین میں ایک فٹ گہرے گڑے ہوئے آہنی جنگلہ کو اکھاڑ پھینکنے والا میرے بس کا روگ نہیں تھا، اس نے ایک ہاتھ سے میرے دونوں بازو پکڑے اور دوسرا ہاتھ میری کمر میں ڈال کر مجھے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا، اور پھر نہایت اطمینان سے بستر پر لا پٹخا۔

" اگر تم شرافت سے باز نہ آئے تو اب تمہارے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا، تمہاری آنکھوں کے گڑھوں میں کوئی تکلیف نہ ہوگی، میں جانتا ہوں۔ اور اب بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے تعاون کرو، اور اگر تم نے تعاون نہ کیا تو پھر یہی ہوگا کہ میں تمہیں کسی بھری پری بستی میں چھوڑ آؤں گا۔ اور پھر تم ایک اندھے کی حیثیت سے بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہ کر سکو گے:"

بوڑھے نے جس طرح میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس سے یہ احساس تو یقین پا گیا تھا کہ میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ میرا دل چاہا کہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں، کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا میں، لیکن بہرحال شان مردانگی کے خلاف تھا۔ چنانچہ دل گھونٹ کر رہ گیا، چند ساعت خاموشی رہی، پھر سوما کی آواز سنائی دی۔

" اگر تم نے فیصلہ اثبات میں کیا ہے تو مجھے بتا دو۔ اور اگر تم اب بھی کوئی جدوجہد کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے تمہاری جدوجہد تمہیں آنکھیں واپس نہیں دے سکے گی، سوائے اس کے کہ میں تمہیں عدم تعاون کرنے والوں میں شمار کر دوں گا:"

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ سب باہر چلے گئے تھے اور درحقیقت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

زندگی چلی جاتی تو کوئی غم نہ تھا لیکن آنکھیں ..... آنکھوں کے بغیر زندگی بے کار تھی اور اب کوئی جدوجہد بھی بے مصرف ہی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر کیا زندگی کو ڈگ اور ہیگ کی طرح ہی گذارا جائے، آہ۔ بڑی غلطی ہوگی، اے کاش اس سے

سسپنس موشن

ایک شخص سیڑھی پر چڑھا ہوا بلب لگا رہا تھا کہ سیڑھی ہلی اور وہ نیچے گر گیا۔ مگر اسے چوٹ نہیں آئی۔ اس کا چار سالہ بچہ جو ٹی وی دیکھنے کا شوقین تھا، کھڑا دیکھ رہا تھا۔ سمجھا کہ ابو نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی ہے۔ خوب ہنسا اور بولا ـــ "ابو! دوبارا کیجئے مگر سلو موشن میں۔"

تو موت ہی آجاتی۔

شاید زندگی میں پہلی بار رویا تھا، آنسو نہ جانے کہاں سے نکلے تھے، دیر تک، یہ نمکین پانی بڑا ہی دلنی ہوتا ہے، ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے جیسے منوں بوجھ ـــ بہہ جاتا ہے تو طبیعت کیسی سبک ہو جاتی ہے۔ رونے سے میں بھی خود کو ہلکا محسوس کرنے لگا تھا اور پھر میں سنجیدگی سے آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔

زندگی کی جو امنگ سینے میں جاگی تھی وہ تو اب ختم ہو گئی تھی، اب اس بے کار بوجھ کو لئے لئے جگہ جگہ گھسٹتے رہنا کیا معنی رکھتا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ اسی ویران کھنڈر میں دوسروں کی مانند زندگی گذار دی جائے، بڑی مایوسی بڑی بددلی چھائی تھی، میرے ذہن پر اور پھر میں اپنے اس فیصلے پر اٹل ہو گیا۔

چنانچہ جب مجھے خوراک دی گئی تو میں نے خاموشی سے قبول کر لی۔ ٹٹول ٹٹول کر کھانا کھایا، پانی پیا اور پھر لیٹ گیا اور جب میں نے کئی دن تک کوئی حرکت نہ کی تو جیسے بوڑھے سوما کو میرے اوپر اعتبار آگیا۔ پانچویں یا چھٹے دن اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

" آصف! کھنڈرات کے حصوں میں چہل قدمی کیا کرو۔ آواز کے سہارے چلنے کی کوشش کیا کرو، میرا خیال ہے تم بہت جلد اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ جتنا وقت تاریکی میں گذرنا ہے، ایک جگہ پڑے پڑے گذارنے سے کیا فائدہ، چلنے پھرنے سے بدن میں قوت بھی رہے گی:"

" ٹھیک ہے مسٹر سوما، آپ مجھے میرا کام بتا دیں، میں کیا کام کروں گا:"

" کیا مطلب:"

" کیا آپ ہیگ اور ڈگ کی مانند کوئی کام میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں مسٹر سوما:"

" احمقانہ انداز میں مت سوچو، تمہاری حیثیت ان سے مختلف ہے، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے انہیں ان کی زندگی کی پوری پوری قیمت ادا کر دی تھی جبکہ تم میرے دوستوں میں شامل ہو، ٹھیک ہے تم نے میرے ساتھ اس انداز میں تعاون نہیں کیا جیسا میں چاہتا تھا، پھر بھی میں تم سے انسیت رکھتا ہوں، یہاں سکون سے رہو میرے دوست! تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی:"

دلوں میں پپا کی کیا حیثیت ہوگی، کیا احترام ہوگا، اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے، مجھے اعتراف ہے لیکن بات ان کی آنکھوں کی تھی۔"

"جب انھیں کوئی نہ ملا تو انھوں نے خود اپنی آنکھیں اپنے تجربے کی نذر کر دیں۔"

"لیکن اس کے بعد سوما کو مشکلات کتنی پیش آئی ہوں گی؟"

"اوہ کسی کو معلوم نہیں، صرف مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنے لئے ایک خاص انتظام کیا ہے۔" سونی نے کہا اور اسی وقت عقب سے سوما کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آج پھر تیرا دماغ پھر گیا ہے سونی۔ تو کیوں چاہتی ہے کہ میں تجھ پر تشدد کروں۔"

"نہیں پپا۔ آج میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" سوما کا انداز کسی قدر بدل گیا "کیا باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

"میری سوچ میں معمولی سا فرق آگیا ہے پپا۔"

"اوہ۔ تو پھر اندر چلو۔" سوما نرم لہجے میں بولا۔

"یہاں کیا حرج ہے۔ میں مسٹر آصف کو بھی اپنی گفتگو میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں آصف میرا دوست ہے۔ میں جانتا ہوں وہ مجھ سے ناراض ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ مجھ سے مکمل اتفاق کرے گا۔"

"میں بھی مسٹر آصف کو یہی سمجھا رہی تھی۔" سونی نے کہا اور میں ایک لمحے کے لئے چونک پڑا حالانکہ لڑکی نے مجھ سے یہ گفتگو نہیں کی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ وہ سوما کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہے چنانچہ میں بھی اس سے تعاون پر آمادہ ہوگیا۔

"کیا بتا رہی تھیں؟"

"یہی کہ اب تک میں نے پپا سے اختلاف کیا تھا لیکن اگر گہری نگاہوں سے جائزہ لیا جائے تو پپا کا مقصد عظیم ہے۔ اندھے انسان کو آنکھیں مل جانا کتنی بڑی بات ہوگی۔ میں نے جو پپا سے اختلاف کیا تھا وہ صرف اس لئے تھا کہ مجھے زندہ انسانوں سے ہمدردی تھی۔ لیکن بہر صورت یہ بات اب میری سمجھ میں آگئی ہے کہ وسیع تر مفاد کے لئے کچھ قربانیاں دینا ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس تجربے کی کامیابی کے لئے کچھ انسانوں کو تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے تو وہ بہر حال تعمیری حیثیت رکھتی ہے۔"

"یقیناً۔ یقیناً۔" سوما نے خوش ہو کر کہا۔

"پپا میں پیش کش کرتی ہوں کہ اب تمہارے تجربے کے لئے میری آنکھیں بھی کام آجائیں تو میں تیار ہوں۔"

"اوہ ہاں، ہاں۔" میں نے سوما کی آواز میں نمایاں لرزش محسوس کی۔ ظاہر ہے یہ اولاد کا معاملہ تھا۔ وہ اس کی اکلوتی بچی تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنی آنکھیں دے سکتا تھا لیکن اپنے جگر گوشے کے ساتھ یہ سلوک کسی طرح ممکن تھا۔

"آؤ، آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔" اس نے سونی سے کہا اور پھر معذرت آمیز انداز میں بولا "مسٹر آصف! مجھے امید ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گے۔"

پھر میں نے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ صورت حال کسی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھی۔ لڑکی نے یقیناً چال چلی تھی۔ ظاہر ہے وہ سوما سے متفق نہیں تھی لیکن اس نے جو فوری طور پر پلٹا کھایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوڑھے سوما سے فریب کرنا چاہتی ہے۔

بہر حال میں تھوڑی دیر تک یں وہیں بیٹھا رہا۔ اور پھر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ مجھے بھی اس قدر اندازہ تو ہو چکا تھا کہ میں عمارت کے کسی حصے سے اپنی رہائش گاہ پر واپس آجاؤں۔ میں اپنے کمرے میں آکر مسہری پر لیٹ گیا۔

دن اور رات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اب تو سب دن تاریک تھے اور ساری راتیں سیاہ۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا، کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔ چائے آئی اور چائے پینے کے بعد میں چہل قدمی کے لئے نکل آیا۔ ایک محدود دنیا تھی، اس کے سوا کچھ نہ تھا اور اسی محدود دائرے میں کچھ وقت گزارنے کے بعد میں پھر واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

اور اس وقت شاید رات ہو چکی تھی جب مجھے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ "ہیگ!" میں نے پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ "ڈک؟" لیکن آنے والا ڈک بھی نہیں تھا۔ پھر دروازہ شاید اندر سے بند کر دیا گیا۔ میں حیران رہ گیا تھا، یہ کون ہو سکتا ہے۔ تب مجھے اپنے شانے پر ایک ہاتھ محسوس ہوا اور یہ ہاتھ سونی کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ تب مجھے سونی کی آواز سنائی دی۔

"آصف!"

"اوہ۔ سونی؟"

"ہاں۔ میں ہی ہوں۔"

"اس وقت؟۔۔ شاید رات ہو چکی ہے۔"

"ہاں۔"

"کیا سوما سو چکا ہے؟"

"نہیں۔ وہ اس وقت اپنی تجربہ گاہ میں ہیں۔"

"اوہو۔ تو کیا تم قید سے فرار ہو کر آئی ہو؟"

"نہیں۔ مجھے قید نہیں کیا گیا۔ صبح کی چال کارگر رہی۔"

"اوہ! تو میرا اندازہ درست تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسا اندازہ؟"

"صبح کو جب میں نے سوما سے گفتگو کی تھی تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ تم سوما کو شیشے میں اتار رہی ہو۔"

"ہاں آصف! پپا اس سلسلے میں بہت ہی شدت سے سوچنے کے قائل ہیں۔ لیکن میں تم سے یہ کہنے میں عار نہیں محسوس کرتی کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ پپا اب مکمل طور پر ناکام ہو جائیں۔ تاکہ انسانی زندگیاں یوں خاک میں نہ ملیں۔" سونی نے کہا۔

"اوہ۔ کیا تمہارے خیال میں، سوما اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا؟"

"یہ کوشش ایک دیوانگی ہے۔"

"کیا تم یقین کرو گی سونی کہ میں بہر حال دل سے سوما کے جذبے کی عظمت کا قائل ہوں۔"

"ہاں آصف! پپا برے انسان نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔"

اور میں صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا، اس کے خلاف میرے دل میں جو نفرت تھی اسے تو۔ ئی نہیں نکال سکتا تھا لیکن میں خاموشی کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ خود کو ذلیل و خوار کرانے سے کیا فائدہ۔

کئی دن مزید گزر گئے۔ اب یہاں رہنا میں نے اپنی عادت بنالی تھی، چہل قدمی بھی کر لیتا تھا لیکن اس ویرانے سے باہر جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ آنکھیں کھولنے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک شام میں عمارت کے ایک حصے میں ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا، خاموش اور سوچ میں گم۔ میری زندگی میں جو ویرانے در آئے تھے، ان سے نجات تو اس زندگی میں ممکن نہیں تھی۔ موت چونکہ میرا مقدر بن گئی تھی اور میں تقدیر کے خلاف زندگی کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اس لئے مجھے اس دوڑ کی سزا مل رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ ہوگا کوئی۔ میں نے لاپرواہی سے سوچا، اور پھر مجھے اپنے قریب وہی نسوانی آواز سنائی دی جو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

"ارے تم یہاں موجود ہو؟" اس نے کہا اور پھر شاید وہ میرے سامنے آگئی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ "نہیں نہیں۔ آہ نہیں!" وہ شاید رو پڑی تھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ آہ یہ کیا ہوگیا۔" اس نے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر میرا رخ اپنی جانب کر لیا اور پھر بے اختیار مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ بڑی بے اختیارانہ کیفیت تھی اس کے انداز میں۔ میں نے بھی تعرض نہ کیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان وہ کہتی جا رہی تھی۔

"کہا تھا نا میں نے تم سے، بھاگ جاؤ۔ لیکن نہ سنی تم نے۔ پاگل سمجھا تھا نا۔ دوسروں کی مانند۔ کیوں نہیں گئے، بتاؤ۔ کیوں نہیں چلے گئے یہاں سے؟" وہ روتی رہی۔

درحقیقت میرے ذہن میں اب اس کی باتیں آرہی تھیں۔ بلاشبہ اس نے مجھ سے چلے جانے کے لئے کہا تھا لیکن سوما نے اسے پاگل قرار دیا تھا اور اس وقت میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے شاید میرا چہرہ اپنے چہرے کے مقابل کیا۔ مجھے دیکھتی رہی اور پھر غمزدہ لہجے میں بولی:

"آہ کس قدر بدنما کر دیا تمہارا چہرہ۔ کیسی حسین آنکھیں تھیں لیکن اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بتاؤ میں اب تمہارے لئے کیا کروں؟"

"شکریہ سونی۔ تمہاری ہمدردی نے مجھے کافی سکون بخشا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں لیکن میرا سکون ختم ہوگیا ہے۔ پپا جو کچھ کرتے رہے وہ مجھے سب ناپسند تھا۔ لیکن انھوں نے یہ جو کیا ہے اس پر۔۔۔۔۔ اس پر۔۔۔۔۔ میں انہیں معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے سونی؟"

"کس بارے میں؟"

"جو کچھ تمہارے پپا کرتے رہے ہیں۔"

"ہاں! مجھے معلوم ہے۔"

"کیا تم نے کبھی ان سے اس بات پر اختلاف کیا؟"

"ہاں میں سخت احتجاج کرتی رہی ہوں۔"

"ظاہر ہے سوما نے تمہاری بات قبول نہیں کی ہوگی۔"

"ہاں پپا بہت سنگدل ہیں لیکن انہوں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر میں انہیں معاف نہیں کروں گی۔" وہ پھر رونے لگی، اور میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس لڑکی کو آلۂ کار بنایا جائے اور اس سے سوما کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ میں سوما سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کم بخت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بے حد بھیانک تھا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا لیکن اب اگر یہ لڑکی مجھ سے تعاون پر آمادہ ہو جائے تو شاید اس خبیث بوڑھے کے خلاف کچھ کر سکوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ متاثر ہے ورنہ کسی کے لئے آنکھوں میں آنسو کہاں آتے ہیں۔

"سونی! تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے نا؟"

"ہاں میں تم سے متاثر ہوں۔ ان سارے دنوں میں مسلسل کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح اگر مجھے قید سے رہائی مل جائے تو میں تم سے ملاقات کروں لیکن مشکل ہوگیا تھا۔ آج بڑی مشکل سے ہیگ کو دھوکا دے کر بھاگی ہوں۔ اسے پتہ بھی نہیں چل سکا۔ کھانا دینے کے بعد اس نے میرے قید خانے کا دروازہ حسب معمول بند کر دیا۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ میں چپ چاپ دروازے سے نکل آئی ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں تلاش کرتی رہی۔ اور بڑی دیر سے تلاش کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔"

اس نے پھر ایک سسکی لی اور میں نے حیران ہو کر پوچھا:

"تو کیا تمہیں قید رکھا جاتا ہے؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے پپا کے کام سے اختلاف ہے۔ میں نے ان سے کھل کر کہہ دیا تھا کہ میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اس پر انھوں نے مجھے پاگل قرار دے کر قید کر دیا۔"

"اوہ سوما بے حد سنگدل ہے!" میں نے کہا۔

"تم پپا کے چنگل میں کیسے پھنس گئے تھے؟" اس نے پوچھا اور میں نے مختصراً اپنی کہانی سنا دی۔

"اوہ۔ تو پپا اتنے دن تک جو غائب رہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حکومت کی قید میں تھے۔ لیکن یقیناً ان کے بارے میں لوگوں کو معلومات نہیں ہو سکی ہوں گی کہ وہ کون ہیں۔ ورنہ اس حادثے کی نوعیت بدلی ہوئی ہوتی۔"

"لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی سونی کہ سوما نے اپنی آنکھیں کیوں گنوا دیں؟"

"پپا بے حد جذباتی انسان ہیں۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ وہ اپنے کام میں مخلص ہیں لیکن ان کی یہ جذباتیت شدت پسندی کی حدود میں داخل ہوگئی ہے۔ تم غور کرو کہ اگر وہ اپنے تجربے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دنیا کو کیا مل جائے گا۔ کیا ساری دنیا سے اندھوں کا وجود نہیں ختم ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو کائنات میں رہ کر حسین کائنات کی دید سے محروم ہیں۔ کیا وہ خود کو ایک نئی دنیا میں نہیں محسوس کریں گے۔ اس کے بعد ان کے

"لیکن وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ انداز شدت پسندی میں بدل گیا ہے۔ کون جانے کب وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوں، اور اس وقت تک کتنی زندگیاں برباد ہو جائیں۔ اگر وہ کامیاب نہ ہو سکے تو پھر یہ لوگ ہمیشہ اندھے رہیں گے۔ میں اب کسی اور کو اندھا دیکھنا نہیں چاہتی آصف۔ اب میں کسی اور کو پپا کی دیوانگی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔"

"لیکن سوما کرتا کیا ہے؟ کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

"ہاں۔"

"مجھے بتاؤ۔"

"وہ انسانی آنکھوں کا لعاب الگ الگ کر لیتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر لعاب کا انھوں نے ایک خصوصی محلول تیار کیا ہے۔ یہاں ایک اور انسان ہے جسے تم نے نہ دیکھا ہوگا۔"

"اوہ۔ وہ کون ہے؟"

"اس بدنصیب کا نام جوزف ہے۔ پپا کا پرانا ساتھی۔ پپا نے سب سے پہلے اس کی آنکھیں نکالی تھیں۔ اور اب وہ اس کی آنکھوں پر تجربہ کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کاش تم دیکھ سکتے۔"

"ہاں اب تو میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"نہیں آصف۔ تم دیکھ سکو گے۔" سونی نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں اس کے لہجے پر غور کرنے لگا۔ اس لہجے میں محبت تھی اخلوص تھا، امید تھی۔

"نہ جانے کب۔ یا شاید کبھی نہیں۔"

"نہیں آصف! میں تمہاری مدد کروں گی۔"

"لیکن کس طرح؟"

"ابھی نہیں بتاؤں گی۔"

"تمہارے الفاظ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے سونی۔ بہرصورت کوئی بات نہیں میں انتظار کروں گا۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا کرے میں تمہیں پھر سے دیکھ سکوں۔ اس وقت جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تمہاری کیفیت دوسری تھی۔ میرے ذہن میں تمہارے لئے وہ جگہ نہیں تھی جو اب تم نے قائم کر لی ہے۔"

"آصف!" سونی نے میری گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اور پھر اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے آملے۔

میں نے پہلی بار کسی دوشیزہ کے ہونٹوں کی حلاوت چکھی تھی اور میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ سونی جلدی سے میرے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکل گئی اور میں خیالات میں گم ہو گیا۔ سونی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی، جسے میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ بہرصورت یہ لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور پھر وہ رات میں نے عجیب وغریب خیالات میں گزاری۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ دوسرا دن بھی حسب معمول تھا۔ سونی دن بھر میرے پاس نہیں آئی اور میں حسب معمول کھنڈرات میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ لیکن شام جس کے بارے میں میں صرف اندازہ کر سکتا تھا جب آئی تو سونی بھی میرے پاس پہنچ گئی۔

"آصف!" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"اوہ سونی تم آگئیں؟"

"ہاں۔ کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے؟"

"دن بھر انتظار کرتا رہا ہوں سونی۔" میں نے اداس آواز میں کہا اور وہ میرے سینے سے آ لگی۔ بڑی شدت پسند لڑکی تھی۔ جذبات کے اظہار میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ جس شدت سے مجھ سے لپٹی تھی، اس میں بڑی اپنائیت، بڑی چاہت تھی۔ میں نے کچھ نہ کہا اور اس نے میرے سینکڑوں بوسے لے ڈالے۔

"آصف۔ میں تمہیں جس شدت سے چاہنے لگی ہوں، اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔"

"میں بھی سونی!" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔"

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا اور سونی نے کوئی چیز میرے ہاتھ میں تھما دی۔

آہ! اب تو ٹٹول کر ہی چیزوں کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا بڑے بڑے شیشوں والی کوئی عینک تھی۔

"چشمہ!" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اسے لگاؤ۔"

"کیوں؟"

"بس میں کہہ رہی ہوں، اسے لگا لو۔" سونی نے کہا اور میں نے صرف اس کی خاطر عینک اپنی مکروہ آنکھوں کے گڑھوں پر چڑھالی۔ بھلا فائدہ بھی کیا تھا۔ سوائے ایک نقص چھپانے کے وہ اور کیا کام دے سکتی تھی۔

"آصف ــــ!" سونی نے مجھے چومتے ہوئے کہا "کچھ محسوس ہوا؟"

"کیا سونی؟"

"اوہ ــــ تم میرے بارے میں تصور کرو۔ سوچو میرے بارے میں ــــ پلیز آصف! جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔" اور میں نے سونی کے کہے پر عمل کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا، اور پھر یہ روشنی بڑھتی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا، جیسے اس روشنی کا تعلق میرے دماغ سے ہو۔ میں سونی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور پھر اَمیرا دل دھک سے ہو گیا۔ سونی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔

"یہ کیسے ممکن تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ سونی۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیئے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ "سونی، مجھے یقین نہیں آرہا۔ خدا کے واسطے مجھے بتاؤ۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیوں ہے؟"

"آصف یہ ایک مخصوص عینک ہے۔ میرے پپا کی ایجاد۔ وہ اسے تصوّر کی عینک کہتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنی آنکھیں نکالنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کا بھی بندوبست کیا کہ ان کے کام میں رکاوٹ نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے ایک ایسی عینک ایجاد کی جو آنکھوں کا نعم البدل ہو۔ وہ اسے آنکھوں پر لگا کر ہی اپنے تمام کام کرتے ہیں۔ بات صرف میری ذات تک محدود نہیں ہے تم اسے لگا کر کہیں کا تصور کر لو۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوگا۔"

"واقعی؟" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔" سونی نے جواب دیا اور میں نے سوما کی لیبارٹری کے بارے میں سوچا اور وہ ہال میری نگاہوں میں گھوم گیا جس کی میں نے صرف چھت دیکھی تھی اور جہاں میری آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ چاروں طرف مشینیں نصب تھیں۔ ان میں عجیب عجیب سیال کھول رہے تھے۔ ہیگ اور ٹاک لیبارٹری میں کام میں مصروف تھے۔ البتہ سوما ایک کرسی پر خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے ہیگ کو آواز دی اور ہیگ کسی آنکھوں والے ہی کی مانند اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ مجھے ان سب کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ عجیب پُراسرار عینک تھی۔ سوما نے ہیگ سے کوئی چیز طلب کی اور ہیگ نے ایک چھوٹے سے بلوریں پیمانے میں ایک مٹیالا سیال اس کے سامنے لا رکھا۔ تب سوما نے ایک ڈراپر سے سیال کھینچا اور اس کے چند قطرے اپنی دونوں آنکھوں میں ٹپکا لئے۔ اس کے بعد وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ میں دیوانوں کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ ..... یہ صرف تصوّر کا کمال تھا۔ حیرت انگیز بات تھی۔ اور میں اس دلچسپ عینک میں کھو گیا۔ سونی چند لمحے کے لئے میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ پھر میں نے واشنگٹن کا تصور کیا اور امریکی صدر کے بارے میں سوچا۔ رچرڈ نکسن وہائٹ ہاؤس میں اپنے خوبصورت آفس میں فائلوں پر جھکا بیٹھا تھا۔ فیڈل کاسترو ٹیلیویژن کے لئے اپنی تقریر ریکارڈ کرا رہا تھا۔ چیئرمین ماؤ قوم کے نام کسی پیغام کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

آہ کیسی حیرت انگیز چیز تھی، کیسی عجیب غریب۔ میں نے پھر سونی کو دیکھا، اس کے سرخ لباس کے بٹن میری نگاہوں کے سامنے آگئے اور پھر سرخ لباس کے نیچے چمکدار سفید جلد، چھوٹے چھوٹے سینے کے ابھار، پھر کچھ اور نیچے سرخ سرخ گوشت پسلیوں کے درمیان دھڑکتا ہوا دل صاف نظر آرہا تھا۔ نگاہیں کچھ اور پیچھے گئیں اور اس کی پشت کے پیچھے کی دیوار صاف نظر آئی، میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ میں نے گھبرا کر عینک اتار دی۔

"سونی یہ عینک، یہ عینک؟"

"یہ اب تمہاری ہے۔" سونی نے کہا۔

"میری؟ میری؟ لیکن" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"ہاں! میں تمہاری آنکھیں تو نہیں واپس کر سکتی، لیکن یہ عینک اب تمہاری آنکھوں کا بدل ہے۔"

"لیکن سوما؟"

"پپا نے جو کچھ کیا ہے وہ اس کے لئے خود بھگتیں گے۔" اور میں دیر تک خالی خالی انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ بالکل نہیں محسوس ہوا تھا کہ میری آنکھوں کے حلقے بالکل خالی ہیں۔ ہر چیز صاف نظر آرہی تھی، پھر میں نے کہا۔

"لیکن تمہارے پپا اسے تلاش تو کریں گے۔ تم یقیناً اسے چھپا کر لائی ہو گی؟"

"ہاں آصف۔ اور اسی کے لئے صرف اسی کے لئے میں نے پپا سے گفتگو شروع کی تھی۔" سونی کافی دیر تک میرے پاس رہی اور پھر چلی گئی۔

لیکن میرے لئے وہ حیرت کا سمندر چھوڑ گئی تھی۔ جس جگہ کا تصور کروں چشم زدن میں نگاہوں کے سامنے دیواروں کے پار بھی دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایسا بیش بہا چیز مجھے مل گئی تھی جس کے بارے میں، میں پوری طرح سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اب کیا کروں، اس بیش بہا چیز کو کس طرح استعمال کروں، کیا یہاں سے فوراً نکل بھاگوں۔ عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی، حواس کام نہیں کر رہے تھے، مسہری پر لیٹ گیا، عینک اٹھا کر سینے میں چھپالی، اب یہ میرے لئے بیش بہا تھی۔

سونی چلی گئی تھی، لیکن اب مجھے یہاں ٹھہرنا دو بھر محسوس ہو رہا تھا خاموشی سے میں مسہری سے نیچے اتر آیا۔ دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔

دروازے سے باہر نکلا اور اچانک ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ سونی، محبت کرنے والی لڑکی، جس نے میرے لئے اپنے باپ کے خلاف کام کیا تھا، وہ تو سوما کی دیوانگی کی شریک بھی نہ تھی، اگر میں سوما کے ہتھے چڑھ گیا تو اس میں سونی کا کیا قصور تھا۔

لیکن وہ بے چاری اپنے باپ کے کرتوتوں سے شرمندہ تھی۔ سوما۔ میں نے بوڑھے خبیث کے بارے میں سوچا نہ جانے کتنے لڑکوں کی زندگی برباد کرے گا۔ کیوں نہ میں سونی کو یہاں سے نکال لے چلوں اور پھر پولیس کو بوڑھے کے کرتوتوں کے بارے میں اطلاع دے دوں، یہی عمدہ ترکیب ہے۔ اس طرح وہ کیفر کردار کو پہنچ جائے گا۔ لیکن اس کے ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں آیا۔ اگر بوڑھا گرفتار ہو گیا تو میرے بارے میں بھی پولیس کو اطلاع دے دے گا۔ لیکن مجھے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ میں تو یوں بھی مجرم تھا اور پولیس ہر حال میں تلاش میں ہو گی۔ مجھے پولیس سے تو روپوش ہونا ہی ہے۔ پہلے بوڑھے کا قصہ پاک کر دیا جائے۔

میں اپنے فیصلے پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور پھر میں سو کی تلاش میں چل پڑا۔ سونی کا کمرہ تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس وقت وہ اداس سی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔

"سونی!" میں نے اسے مخاطب کیا اور وہ چونک پڑی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور خوشی سے اچھل پڑی۔ "اوہ۔ آصف آپ؟"

"حیران کیوں ہو گئیں سونی؟"

"حیران نہیں خوش ہوئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے، تم کسی حد تک اپنی آنکھوں کی کمی پوری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"ہاں سونی۔ اور یہ تمہاری مہربانی سے ہے۔ ورنہ" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"میرے پپا نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا تھا نا؟"

"اوہ۔ تو اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟" میں نے اس کی دلجوئی کی۔

"میرے پپا کا تو ہے۔" اس نے اداسی سے جواب دیا اور پھر کئی منٹ کی خاموشی چھا گئی۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ کئی منٹ تک نہ بولی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

"لیکن اب تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے سونی؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ کیا مجھے اسی طرح زندگی گزارنی ہو گی؟"

"پھر میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں لیکن تنہا نہیں۔"

"پھر؟"

"تم بھی میرے ساتھ چلو گی سونی؟"

"کہاں؟"

"اس ویرانے سے دور، سوما کی پرہوس دنیا سے بہت دور۔ بے شک میں ماں کے جذبے سے بہت متاثر ہوں لیکن وہ بھٹک گیا ہے اور اس بھٹکے ہوئے انسان کو راہ پر لانا کسی طور ممکن نہیں ہے۔ کیا تم سوما کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو؟"

"آصف ساری خرابیوں کے باوجود وہ میرا باپ ہے میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے سونی لیکن میں تو یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے اجازت دو میں اس ویرانے میں زندگی کی تلاش میں آیا تھا اور روشنی کھو کر جا رہا ہوں۔ ہاں تمہاری مہربانی نے جو کچھ مجھے دے دیا ہے وہ جب تک میری زندگی کے کام آئے گا۔ تمہاری یاد میرے سینے میں رہے گی اور شاید اس کے بعد بھی۔"

"لیکن آصف تم یہاں سے جا ہی کیوں رہے ہو یہاں میں ہوں کیا میری ذات تمہارے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دو محبت کرنے والے جس جگہ یکجا ہو جائیں وہ ویرانے آباد ہو جاتے ہیں۔ تم یہیں رہو میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"لیکن سونی سوما مجھے پسند نہیں کرے گا وہ بے حد چالاک ہے۔ اسے یقیناً احساس ہو جائے گا اور وہ ہمارے تمہارے درمیان آنے کی کوشش کرے گا۔"

"تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو میں اسے نمٹ لوں گی۔"

"لیکن اگر اسے عینک کی گمشدگی کا علم ہو گیا تو؟"

"ظاہر ہے وہ برآمد نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ تمہاری حماقت ہے سونی۔ سوما اتنا احمق نہیں ہے تم اسے دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ آستین کے سانپ۔" دروازے سے سوما کی آواز آئی اور ہم دونوں دہشت سے اچھل پڑے۔ خونخوار سوما اپنی بھیانک شکل لئے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہیگ اور ڈک بھی موجود تھے اور اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ساری گفتگو سن چکا تھا اور عینک کے بارے میں بھی اسے معلوم ہو چکا تھا چنانچہ اس سے کچھ چھپانے کی کوشش بے سود تھی لیکن اب کرنا کیا چاہیئے۔

"مجھے احساس نہیں تھا کہ تم اس قدر سازشی ثابت ہو گے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ٹھیک ہے میں موت کے قریب تھا تم نے مجھے زندہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن روشنی کے بغیر زندگی بے معنی ہے اس سے تو موت کی تاریکی ہی بہتر ہے۔ بتاؤ دنیا میں میرا کیا مقام ہے جواب دو میں کیسے زندہ رہوں۔ کیا تم سازشی نہیں ہو۔ تم نے مجھے فریب دیا۔ زندگی کے قریب لا کر مجھے دھوکے سے جہنم کی تاریکیوں میں دھکیل دیا۔ کیا حق تھا تمہیں اس کا اور اب اگر میں نے سازش کی ہے تو تم اس پر حیران کیوں ہو؟"

"آصف خان میں زندگی کی تمام قدروں سے بے نیاز ہوں میں اخلاقیات سے مستثنیٰ ہوں میں نے صرف اس لئے یہ بات کہہ دی تھی کہ تم مجھے دوست سمجھتے تھے۔ میرے دوست یہ دنیا کسی بھی صاحب فن کی قدر اس وقت نہیں کرتی جب تک اس کا فن اس کے کام نہ آسکے لیکن فن تکمیل کی منزل تک پہنچنے کے لئے بہت سے کٹھن مراحل سے گزرتا ہے اور ان کٹھن مراحل میں کوئی فنکار کا ساتھی نہیں بنتا سب دور سے دیکھنے والے ہوتے ہیں اور اگر فنکار دلدل میں پھنس کر دم توڑ دے تو دیکھنے والے قہقہے لگا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ اسے منزل پر پائیں تو پھر خود کو اس کا ساتھی بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں ہاں ہم اس کے نزدیک تھے مگر میری سوچ مختلف ہے میں قرب کی بھیک نہیں مانگتا۔ میں بازو پر اپنی انگلیوں کی مضبوط گرفت قائم کرتا ہوں اور اپنے نزدیک کھینچ لیتا ہوں تاکہ قریب آنے والا کچھ نہ کہہ سکے۔ میں تو زبان بند کرنے کا قائل ہوں۔ مجھے کچھ بھی سمجھا جائے میرے بارے میں کچھ بھی سوچا جائے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔"

"لیکن تم بھول گئے سوما کہ مقابل بھی جیتی جاگتی زندگی کا مالک ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں تو فیصلہ کئے لیتے ہیں۔ آؤ میں واپس تمہیں موت کی منزل پر پہنچا دوں۔" سوما نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ پھر سونی کو مخاطب کر کے بولا۔ "سونی تو میری بیٹی ہے۔ میں تیرا باپ نہیں ماں بھی ہوں تیری رگوں میں میرا خون ہے ہمارے درمیان اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن کیا تو اس خون کو کسی دوسرے کے ہاتھوں بہتے دیکھنا پسند کرے گی؟"

"تم خود غرض ہو پتا۔ تم قانون قدرت میں ترمیم کرنا چاہتے ہو۔ ہم سب مشیت کے محکوم ہیں۔ خدا کسی کو اندھا کرنا چاہتا ہے تو اسے اندھا کر دیتا ہے ہم اسے روکنے والے کون۔ تم صرف اپنی شہرت چاہتے ہو پتا اور تم اسی کے لئے ساری جد و جہد کر رہے ہو۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔ میں اب آصف کے ساتھ ہوں۔"

"اوہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد تو دیکھے گی کہ آصف اس دنیا میں نہ ہوگا لیکن اس کے بعد میری ہمدردی تیرے ساتھ نہ ہوگی۔" بوڑھے نے کہا۔ اور پھر مجھے زور سے آواز دی۔

"آصف۔" اور میں بے اختیار بول پڑا۔ یہ میری غلطی تھی کیونکہ خونخوار بوڑھے نے میری آواز پر میری سمت کا یقین کر لیا تھا اور پھر اس نے وحشیانہ انداز میں میرے اوپر حملہ کر دیا لیکن مصنوعی آنکھیں، سونی کا دیا ہوا عطیہ میرے کام آ گیا۔ میں نے فوراً چھلانگ لگا کر اس کا وار خالی دیا۔ اور بوڑھا دیوار سے ٹکرایا۔ لیکن وہ بے حد پھرتیلا تھا میرے قدم جونہی زمین پر ٹکے اس نے پلٹ کر قدموں کی چاپ پر چھلانگ لگا دی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دبوچنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے لئے بھی یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں نے پھر اس کا وار خالی دیا اور ایک زوردار گھونسہ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ بوڑھا چکرا گیا تھا لیکن پھر وہ ایک دم رک گیا اور پھر اس نے مضطربانہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ڈک ہیگ اس پر حملہ مت کرنا۔ عینک اس کے پاس ہے کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔" اور پھر وہ کھڑا ہو کر بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔

"دیکھو عینک کو نقصان نہ پہنچنے پائے میں تم سے جنگ نہیں کروں گا۔ عینک مجھے واپس کر دو۔ یہ میری زندگی کی سب سے اہم چیز ہے میں اس کے بغیر کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میری کامیابی کا انحصار اسی پر ہے۔"

میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں جس طرح دو بار اس کے حملوں سے بچا تھا اس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ عینک میری آنکھوں پر موجود ہے۔ اور اب یہ عینک میرے لئے بھی ایک اہم حیثیت رکھتی تھی۔

"میں تمہیں یہ واپس نہیں کروں گا ذلیل کتے تو نے میری آنکھیں نکالی ہیں۔ تو نے میری زندگی تاریک کر دی ہے۔ میں تمہارے سارے منصوبے خاک میں ملا دوں

خواتین کا سب سے مقبول سب سے پسندیدہ ماہنامہ

پاکیزہ

اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپریل میں

سالگرہ نمبر

پیش کر رہا ہے

- ۱۲ پاکیزہ افسانے
- ۳ پُراثر سچی کہانیاں
- ماہ مبین کے ناول مضراب کی آخری قسط اور ایک مشہور خاتون ناول نگار کے نئے ناول کی پہلی قسط
- کارآمد مضامین اور تمام مستقل سلسلے

مارچ کے آخر میں شائع ہوگا۔

پاکیزہ پوسٹ بکس نمبر ۶۶۲ کراچی

گا" "نہیں نہیں ان منصوبوں کا صرف میری ذات سے تعلق نہیں ہے۔ یہ رفاہِ عام کے لئے ہیں۔ مجھے عینک واپس کردو۔ اس کے عوض مجھ سے جو چاہو طلب کرو۔"

"تب پھر میری آنکھیں واپس دے دو میں چلا جاؤں گا۔"

"اوہ۔ آصف۔ آصف۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ میری مجبوری سمجھو۔ بوڑھے نے لرزتی آواز میں کہا وہ جس قدر خونخوار ہو رہا تھا مجھے اس کا احساس تھا لیکن عینک کی وجہ سے بے بس تھا اور میں اس تاک میں تھا کہ جونہی دروازہ خالی ملے میں باہر چھلانگ لگا دوں۔ میں نے آہستہ سے سوفی کو اشارہ کیا اور سوفی آہستہ آہستہ دروازے کی جانب کھسکنے لگی۔ اس دوران میں نے بوڑھے کو باتوں میں لگا لیا۔ اس وجہ سے وہ سوفی کے قدموں کی چاپ پر توجہ نہ دے سکا۔ اور سوفی بالآخر دروازے سے نکل گئی۔ میں نے سوما کو خاصی حد مطمئن کر دیا تھا اور اب وہ مجھ سے مصالحت کی گفتگو کر رہا تھا اور اسی دوران مجھے بھی موقع مل گیا۔ بڑی ہی جچی تلی تھی میری چھلانگ بھی۔

پھر میں بھی سوفی کے قریب پہنچ گیا۔ بوڑھا دھاڑتا ہوا ہمارے پیچھے بھاگا تھا۔ اور اس کتے پیچھے ہیگ اور ڈک بھی لیکن میں سوفی کا ہاتھ پکڑے ہوئے بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔ ہم کھنڈر نما عمارت سے نکل آئے۔ سوفی میرا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔

بوڑھا طاقتور ضرور تھا لیکن بہر حال دوڑنے میں ہمارا مقابل ثابت نہ ہوا۔ اور ہم اسے بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ پھر ہم نے گڑھی مہابت خان پہنچ کر ہی دم لیا۔

اور اس کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ گڑھی مہابت خان ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ سیدھے، سادے لوگوں پر مشتمل ہم اس بستی میں ضم ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے کسی وقت بھی پولیس میری گردن ناپ سکتی ہے اس کے لئے میں نے حلئے میں تبدیلی ضروری سمجھی چنانچہ مسماۃ سوفی جو عام طور سے مغربی لباس میں ملبوس رہتی تھی اب برقعہ پوش خاتون بن گئی تھی میرے گالوں پر سیاہ گھنگریالی داڑھی تھی۔ مسجد کے ایک مولوی صاحب نے ہم دونوں کو رشتۂ حیات میں منسلک کر دیا تھا میری حیثیت ایک درویش صفت انسان کی سی تھی۔ اکثر بیمار لائے جاتے اور میں ان کے جسم میں جھانک کر ان کی بیماری کی نشاندہی کر دیتا۔ گمشدہ لوگوں کے پتے ان کے ورثاء کو بتا دیتا اور یہ سب تصدق کا کمال تھا۔ عینک میری بڑی ہی مددگار ثابت ہوئی۔ گو میری آنکھوں کی واپسی کا کوئی سوال نہیں تھا لیکن عینک کی موجودگی ان کی کسر پوری کر دیتی تھی۔ یہ عینک مجھے اپنی بینائی کی مانند عزیز تھی۔ درحقیقت اگر یہ میری زندگی میں نہ ہوتی تو میں کیا تھا۔

لیکن میں نے زندگی کو یہیں تک محدود رکھنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ہاں کچھ وقت گزرنے کا منتظر تھا تاکہ پولیس کی فائلوں میں میرا ریکارڈ کافی نیچے دب جائے اور میں وفاشعار سوفی کے ساتھ زندگی کے لمحات کچھ اور خوبصورت انداز میں بسر کر سکوں۔ سوما کو میں نے معاف کر دیا تھا کیونکہ یہ سوفی کی فرمائش تھی اور بہر حال وہ میری بیوی تھی۔

تقریباً چار سال میں نے سوفی کے ساتھ بستی مہابت خاں میں بسر کئے اور پھر چھوٹی سی، خوبصورت سی، ننھی سی نورین کے ساتھ ایک شہر کا رُخ کیا۔ میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے جنہیں میں تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اس عجیب و غریب ایجاد سے میں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جسے میں اس کی خصوصی صلاحیتوں کی بنا پر عینک کی بجائے "غینک" کہتا تھا۔ ہم نے ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کیا جس کی حیثیت بڑی پُراسرار تھی۔ ہم لوگ ڈاکٹروں کو ان کے مریضوں کی بیماریوں کی شناخت میں مدد دیتے تھے جن کی بیماریاں نامعلوم ہوتی تھیں۔

ہم ایسے لوگوں کی بھی امداد کرتے تھے جنہیں کسی کا پتہ معلوم کرنا ہوتا تھا۔ ان کے حالات معلوم کرنا ہوتے تھے۔ اکثر پولیس کے لوگ ہمارے پاس مفرور مجرموں کی تلاش کے سلسلے میں آتے تھے۔ ایک عجیب سی پراسرار سی حیثیت مل گئی تھی مجھے۔ اور بہر صورت ان تمام کاموں سے آمدنی بھی نہایت مناسب تھی۔ میں نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے ملازم بھی رکھے تھے جن کے بارے میں یہ اظہار کرتا تھا کہ میرے لئے کام کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ اس طرح بینائی کھونے کے باوجود میری زندگی کو ایک مناسب سہارا مل گیا تھا اور یہ سہارا تھی میری غینک۔ مجھے نہیں معلوم کہ بوڑھے سوما کے ساتھ کیا گزری۔ بہر صورت میں ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہوں اور ایک مخصوص حلقے تک اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اپنے شہر کا نام نہیں بتایا اور نہ آپ اسے معلوم کر سکتے ہیں۔ خدا حافظ!

مُطالعہ کرنے امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب

امتحان میں کامیابی حاصل کیجیے

قیمت: ۵۰/۶ روپے

مکتبۂ نفسیات ۵ - ای - ناظم آباد، کراچی